زمانہ

جلد ۵۲ جنوری ۱۹۲۹ء نمبر ۱

افغانستان

(از جناب بابو امنت پرشاد نگم بی۔اے، ایل ایل بی ایڈوکیٹ)

دنیا کی مشتاق نگاہین آج کل کابل کی چھوٹی سی سلطنت اور اسکے بادشاہ امیر امان اللہ خان کی طرف لگی ہوئی ہین۔ افغانستان گو بہت چھوٹا سا ملک ہے اور تعلیم و تہذیب کے میدان مین اکثر اقوام سے منزلون پیچھے ہے۔ لیکن ایک عرصہ تک روس اور برطانیہ کی سیاسی جدوجہد کا تختہ مشق رہ چکا ہے اور تھوڑے عرصہ سے امیر امان اللہ خان کی شخصیت نے اسکو ایسی اہمیت دے رکھی ہے کہ آئیوالے زمانے مین افغانستان کی اصلاحی تحریک اور اسکی پولٹیکل رفتار روز افزون دلچسپی کا باعث ہوگی۔

ابتدائی زمانہ افغانی نسل کی ابتدا کے بارے مین مورخین متفق الراے نہین ہین [illegible] جو تہ تہال سے افغانی نسل کی ابتدا یہودی یا عربی نسل سے ہے۔ دوسرے طبقہ کا یہ خیال ہے تشریف مین پناہ لینا پڑی ہندوؤن کی تھی جب اسلام کی لہر عرب سے فارس ہوتی ہوئی افغانستان میر یعقوب خان تخت نشین کیے نے اپنا مذہب ترک کرکے اسلام قبول کرلیا۔ افغانیون کا یہ خیال! برطانوی غم و غصہ مین پھر اضافہ ہوا چنانچہ جس نے پیغمبر اسلام کے مذہبی مشن کی کامیابی مین احمن خان تخت نشین ہوئے مگر امیر عبدالرحمن خان کے ساتھ پناہ لینا پڑی تھی اور جو بعد مین یہان سے چلکر معہ اپنے چالیس ہیر

افغانستان پر ایک عرصہ تک یونانیون کی حکومت رہی ہے - وہان کے کھنڈرات اور پرانی یادگارین بُودھ مت کا پتہ دیتی ہین - قریب پچاس سال قبل سنہ عیسوی کے افغانستان مین کنشکا کی باقاعدہ حکومت تھی - ساتوین صدی کا چینی سیاح ہون سینگ گرد و نواح کابل مین دونون ہندوستانی اور ترکی راجاؤن کا ہونا بیان کرتا ہے - مگر دسوین صدی مین جب سبکتگین نے اپنا دارالحکومت غزنی مین قائم کیا تو ہندوون کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا - بعد کے فرمانرواؤن مین محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری سب سے زیادہ قابلِ ذکر ہین - بعدازان یہ مُلک چنگیز خان کے حملون کا شکار رہا - بالآخر تیمور نے اپنی حکومت قائم کی - تیمور کے بعد بدخشان، کابل اور قندہار بابر کے قبضہ مین رہے - جب بابر نے سلطان ابراہیم لودی کو ۱۵۲۶ء مین پانی پت کے میدان مین شکست دیکر اپنا پایۂ تخت دہلی مین قائم کیا - اُسوقت سے مغلون کی نگاہ مین افغانی مقبوضات کی اہمیت کم ہوگئی - غزنی اور کابل مغلون کے قبضہ مین رہ گئے - لیکن ہرات اور قندہار پر فارس کے صفوی خاندان کی حکومت قائم ہوگئی - ۱۷۰۹ء مین قندہار کے غلزئی خاندان نے صفوی حکومت کا تختہ پلٹ دیا اور خودمختاری کا اعلان کردیا - ۱۷۳۸ء آخر فارس کے نامور حملہ آور نادر شاہ نے افغانستان فتح کیا - اور ۱۷۳۹ء مین ہندوستان پر بھی حملہ کیا - ہندوستان سے واپسی پر نادر شاہ کا راستہ مین قتل ہوجانا افغانستان کے لیے ایک نئے خاندان کی حکومت قائم ہونے کا باعث ثابت ہوا - ہندوستان کا مالِ غنیمت مقتول کے فوجی سردار احمد شاہ دُرّانی کے ہاتھ آیا جو افغانستان کی ابدالی نسل مین سے سدوزئی فرقہ کا سرغنہ تھا - اس نے اس خزانہ کی امداد ۱۷۴۷ء مین افغانستان پر اپنی حکومت کا اعلان کردیا جس سے افغانی حکومت کی بُنیاد پڑی -

احمد شاہ دُرّانی کی حکومت رفتہ رفتہ بلوچستان - سندھ - پنجاب اور کشمیر تک پھیل گئی - اِسنے بدخشان سے بھی خراج وصول کیا اور فارس کے کچھ حصہ پر بھی اپنے قدم جمائے - مگر اُسکی وفات کے بعد جو ۱۷۷۳ء مین واقع ہوئی بلخ اور سندھ اسکی سلطنت سے علیحدہ ہوگئے - پنجاب پر سکھون کا غلبہ ہوگیا - احمد شاہ کے بیٹے تیمور نے ۲۰ سال تک حکومت کی لیکن اسکی وفات کے بعد سلطنتِ افغانستان خانہ جنگیون کا [illegible] بیٹے زمان سے محمود نے اور محمود سے شجاع الملک نے عنانِ حکومت چھینی خفیہ سازشون [illegible] شجاع سے محمود کے ہاتھون مین پھر منتقل ہوگیا - ۱۸۱۸ء مین محمود بھی حکومت [illegible] بارک زئی خاندان کے سرغنہ دوست محمد خان نے اپنے آپ کو کابل [illegible] خاندان اُس وقت سے برسرِ حکومت ہے

[illegible] روس اور برطانوی سلطنتِ ہندوستان کے درمیان اسطرح

واقع ہے کہ ان ہردو سلطنتوں کو ایک دوسرے کی دست درازیوں سے بچنے کی غرض سے افغانستان کا دست نگر ہونا لازمی ہے۔ اسلیے دونوں کے لیے اس ملک کو اپنے رعب حکومت سے متاثر رکھنا ضروری ہے۔ دوست محمد خان کے خیالات روس سے موافقت رکھتے تھے۔ اور شاہ شجاع برطانیہ کے وفاداروں میں تھے۔ لارڈ آکلینڈ نے سوچا کہ شجاع کی حکومت برطانیہ کے لیے مفید ہوگی اس لیے برطانوی فوجیں شاہ شجاع کو تخت نشین کرانے کے لیے متعین ہوئیں۔ اس فوج کشی کا نام جو ۱۸۳۹ء سے ۱۸۴۲ء تک رہی تھی اول جنگ افغانستان ہے۔ شاہ شجاع کو حقیقتاً حکومت کی گدی پر بٹھا دیا گیا مگر افغانیوں کو ایسا امیر منظور نہ تھا جو انگریزوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کا کام دیتا ہو چنانچہ شاہ شجاع قتل کر دیے گئے اور دوست محمد خان افغانستان پر ۱۸۶۳ء تک حکومت کرتے رہے۔

جب انگریزوں نے ۱۸۴۹ء میں سکھوں پر فتح پائی اور برطانوی سلطنت پنجاب تک پہونچگئی۔ اور برطانوی ہندوستان اور افغانستان ایک دوسرے کے ہمسایہ ہو گئے تو درمیانی حدود قائم نہ ہونے کی وجہ سے مزید کشمکش کا موقعہ پیدا ہو گیا۔ لیکن ۱۸۵۵ء میں ہردو سلطنتوں کے درمیان ایک عہدنامہ ہو گیا جسکے بموجب دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے۔

دوست محمد خان نے بلخ، قندہار اور ہرات کو بھی یکے بعد دیگرے فتح کر لیا۔ غرض موجودہ افغانستانی سلطنت دوست محمد خان کی حیات میں نہایت مضبوط بنیادوں پر قائم ہو گئی۔ دوست محمد خان کے بعد اُسکے بیٹے امیر شیر علی خان نے کافی کشت و خون کے بعد حکومت کرنا شروع کی۔ اسکا زمانہ امن چین کا زمانہ ثابت نہوا۔ امیر شیر علیخان نے لارڈ میو سے انبالہ میں ملاقات کر کے برطانوی گورنمنٹ سے مراعات کی درخواست کی۔ لیکن لارڈ میو نے امیر کی پیش کردہ شرائط کو پورے طور پر منظور نہ کیا۔ ۱۸۷۳ء میں رُوسی دست درازیوں سے تنگ آکر امیر نے پھر انگریزی گورنمنٹ سے نامہ و پیام جاری کیا لیکن برطانوی گورنمنٹ کا اصرار تھا کہ کابل میں برطانوی سفیر انگریز ہونا چاہیے۔ امیر کو اپنی جنگجو قوم پر پورا بھروسہ نہ تھا بلکہ یہ خوف تھا کہ کسی کشمکش کے موقعہ پر افغان انگریزی سفیر کی جان پر حملہ آور نہو جائیں اور والی ملک کو اسکا خمیازہ بھگتنا پڑے۔ اس کشمکش کا نتیجہ دوسری جنگ افغانستان ہے جو ۱۸۷۸ء سے ۱۸۸۰ء تک رہی۔ انگریزوں نے کابل پر فوجکشی کی۔ امیر کو شکست کھا کر مزار شریف میں پناہ لینا پڑی جہاں بالآخر اسکا انتقال ہو گیا۔ امیر شیر علیخان کے پایۂ تخت چھوڑ دینے پر امیر یعقوب خان تخت نشین کیے گئے اس دَوران میں انگریزی سفیر کو افغانی قاتلوں کا شکار ہونا پڑا۔ برطانوی غم و غصہ میں پھر اضافہ ہوا۔ چنانچہ امیر یعقوب خان پر عتاب نازل ہوا اور امیر عبدالرحمن خان تخت نشین ہوئے۔ مگر امیر عبدالرحمن خان کے ساتھ

جو شرائط عائد کی گئین وہ ایک خودمختار والیٔ ملک کے شایانِ شان نہ تھین۔ انکو ممالکِ غیر سے نامہ و پیام کا براہِ راست اختیار نہین دیا گیا بلکہ یہ قید لگادی گئی کہ جو خط و کتابت دوسرے ممالک سے کیجائے وہ ہمیشہ برطانوی گورنمنٹ کے توسّل سے ہو۔ اسطرح بیرونی معاملاتِ حکومت مین افغانستان برطانیہ کا دست نگر ہوگیا۔

امیر عبدالرحمٰن خان کے بعد سنہ ۱۹۰۱ء مین اُنکے بیٹے امیر حبیب اللہ خان تخت نشین ہوئے۔ امیر عبدالرحمٰن خان اور امیر حبیب اللہ خان دونون ہی افغانستان کی تاریخ مین قابل اور بیدار مغز حاکم گذرے ہین۔ ایسے مُلک مین جہان کی رعایا اسقدر جاہل و خونخوار ہو ایک مدّت دراز تک شخصی حکومت کو کامیابی کے ساتھ قائم رکھنا غیر معمولی قابلیت کی دلیل ہے۔ اِس دَور مین افغانستان کے نظامِ مملکت مین پہلے سے بدرجہا ترقی ہوئی۔ محکمۂ افواج مین اصلاحات جاری کی گئین۔ امیر حبیب اللہ خان کی حب الوطنی۔ بے تعصبی اور وسیع الخیالی کا ثبوت اِس قابلِ یادگار واقعہ سے ملتا ہے۔ کہ سنہ ۱۹۰۷ء مین جب وہ ہندوستان تشریف لائے تھے تو بقر عید کے موقعہ پر گاؤکشی کی ممانعت کردی تھی۔ ہندو مُسلم تعلقات کی تواریخ مین حُسنِ سلوک اور باہمی رواداری کی اِس سے بہتر کوئی مثال نہین مل سکتی ہے۔ افسوس ایسا ہر دلعزیز بادشاہ بھی خفیہ سازشون کا شکار ہوا۔ ۲۰۔ فروری سنہ ۱۹۱۹ء کو اپنی دارالسلطنت سے دُور دراز مقام پر جہان امیر موصوف دَورہ پر تھے صرف ۴۶ سال کی عمر مین قتل کردیے گئے۔

افغانستان کی آزادی | موجودہ امیر امان اللہ خان مرحوم کے پسرِ اکبر نہین ہین۔ قتل کے واقعہ کے بعد مرحوم کے چھوٹے بھائی نصر اللہ خان نے اپنی تخت نشینی کا اعلان کردیا اور امیر مرحوم کے بڑے بیٹے نے اِنکے حق مین دست برداری بھی دیدی۔ لیکن امان اللہ خان جو مرحوم امیر کے تیسرے بیٹے ہین اِس انتظام پر راضی نہوئے۔ جنگی اسلحہ اور خزانہ امان اللہ خان کی زیرِ نگرانی کابل مین تھا۔ فوج نے بھی امان اللہ کی طرفداری کا اعلان کردیا۔ چنانچہ نصر اللہ خان کو حکومت سے دست کش ہونا پڑا اور امان اللہ خان امیر کابل ہوئے۔ امیر امان اللہ خان نے تختِ شاہی پر بیٹھتے ہی برطانوی گورنمنٹ کو جو مراسلت بھیجی اُسمین خودمختاری کا اشارہ تھا۔ عنانِ حکومت ہاتھ مین لینے کے دو ماہ کے اندر ہندوستان کے مغربی صوبجات مین ہندوستان کی برطانوی قوّت اور افغانی فوج کے درمیان زور آزمائی شروع ہوگئی۔ ایک طرف غیر تربیت یافتہ سپاہیون کا ہجوم دوسری طرف ہوائی جہازون اور جدید طرز کے آلاتِ حرب کی بھرمار۔ ایسی حالت مین زیادہ عرصہ تک جنگ کا جاری رہنا دشوار تھا۔ ایک طرف افغانستان فنونِ جنگ کی نئی ایجادون سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ہوائی آفتون اور قلعہ جات اُڑانیوالی توپون سے عاجز تھا۔ دوسری طرف برطانوی لشکر افغانستان کے خونخوار اور غیر تربیت یافتہ سپاہیون کے

خلاف امید کارنامون سے حیران - غرض جولائی ۱۹۱۹ء مین صلح کانفرنس کی نشست ہوئی - اور ۸ - اگست کو عہدنامے پر دستخط ہوگئے - اس عہدنامے کی رُو سے امیر کابل کو اٹھارہ لاکھ روپیہ سالانہ کا جو وظیفہ ہندوستان سے ملتا تھا وہ آیندہ کے لیے بند کردیا گیا اور اس مدمین جو رقم بقایا تھی وہ بھی ضبط کرلی گئی - افغان گورنمنٹ اپنی فوج کے لیے اسلحہ ممالک غیر سے براہ ہندوستان منگایا کرتی تھی یہ رعایت بھی منسوخ کردی گئی - ادھر افغانستان کی مکمل آزادی تسلیم کرلیگئی اور اُسکو ممالک غیر سے نامہ وپیام مین جو قیود وپابندیان تھین وہ بھی دُور ہوگئین - کسی ملک و قوم کے لیے اس سے زیادہ قابل فخر کوئی بات نہین ہوسکتی ہے کہ وہ تمام ملکی معاملات مین خودمختار رہے اور کسی معاملے مین کسی دوسری قوم کا دست نگر نہو - آزادی دنیا کی بہترین نعمت ہے - اور یہ نعمت افغانستان کو امیر امان اللہ خان کے آغاز عہد حکومت مین ہی حاصل ہوگئی -

اسلحہ کی براہ ہندوستان درآمد کی موقوفی گو افغانستان کے لیے باعث نقصان تھی کیونکہ افغانستان کے چارون طرف خشکی ہے ہندوستان کی جانب کے علاوہ افغانستان کے لیے کوئی اور بحری راستہ کھلا ہوا نہین ہے - لیکن اسمین برطانیہ کے لیے بھی مضرت رسان نتائج مضمر تھے - کیونکہ ایک مدت سے روس کو افغانستان کے ساتھ دوستی کا اشتیاق تھا - اور اب جبکہ بالشویک فرقہ وسط ایشیا مین اپنا مرکز بنا رہا تھا اور وہان کی قدیم سلطنتون کو جمہوری بنانے مین کامیاب ہوچکا تھا تو اس موقعہ کو افغانستان مین اپنا اثر جمانے کا بہترین ذریعہ بنا سکتا تھا - خوش قسمتی سے نومبر ۱۹۲۱ء مین برطانوی گورنمنٹ اور افغانستان کے درمیان عہدنامہ ہوگیا جسکے بموجب ہردو سلطنتون مین رابطۂ اتحاد قائم ہوگیا - اور امن وامان کے زمانے مین افغانستان کو اسلحہ و دیگر سامان ہندوستان کے راستہ سے منگوانیکا اختیار دے دیا گیا -

دور جدید شاہ امان اللہ خان دنیا کی اُن برگزیدہ ہستیون مین ہین جو گرد و پیش کی مشکلات اور رکاوٹون سے مرعوب نہوکر اپنے ارادون پر استقلال کے ساتھ عملدرآمد کرتے ہین اور سچے معنون مین رہبران قوم کہے جانیکے قابل ہوتے ہین اور ملکی ترقی و آزادی پر ذاتی عیش وآرام نثار کرکے تواریخ عالم مین ابدی زندگی حاصل کرلیتے ہین - موصوف نے اپنے باپ کے بڑے بیٹے نہونے کی وجہ سے نہ بادشاہت اور شخصی حکومت کے خیال مین تعلیم و تربیت پائی تھی اور نہ انکے دماغ مین شاہانہ کیفیت پیدا ہوئی تھی - آپکو ہمیشہ سے عوام کی راحت مین دلچسپی تھی - اب بھی آپ ملک کی ترقی کو اپنی شاہانہ شان وشوکت کی انتہائی منزل سمجھتے ہین - آغاز عہد حکومت ہی سے آپ نے قوم کی تعلیم مین دلچسپی لی - بازارون اور گلیون مین جابجا اشتہار چسپان کرائے جس مین قوم سے اپنے بچون کو اسکول بھیجنے کی اپیل تھی - سرکاری ملازمین کے ساتھ یہ شرط لگادی گئی کہ اگر وہ اپنے بچون کو اسکول نہ بھیجین تو سرکاری ملازمت سے برطرف کردیے جائین - افغانستان

مین اسوقت اعلیٰ تعلیم کے لیے دو کالج ہین - ایک حبیبیہ جو امیر حبیب اللہ خان کا قائم کردہ ہے - دوسرا امانیہ جو موجودہ امیر کے نام پر قائم ہے - کابل مین ایک اسکول نسوان بھی ہے جس مین تقریباً دو ہزار لڑکیان تعلیم حاصل کر رہی ہین - لڑکون کے لیے افغانستان مین کثرت سے ابتدائی اسکول ہین - اسکولون مین دوپہر کو طلباء کا کھانا گورنمنٹ کی طرف سے دیا جاتا ہے - ٹیلیگراف اسکول کے طلباء کو تو کھانا مکان اور تعلیم سب ہی گورنمنٹ کی طرف سے مفت ہے - یہ اسکول جسکو کھلے ہوئے قریب ایک سال کا زمانہ ہوا - شاہ امان اللہ خان کی جدید وسعتِ خیال کا نتیجہ ہے - لڑکون نے لاطینی حروف سیکھ لیے ہین اور انگریزی زبان مین پیغامات وصول کرنے کی کوشش کر رہے ہین - کابل مین ایک بہت بڑا فرانسیسی اسکول بھی ہے - لڑکے اور لڑکیان ساتھ بیٹھکر پڑھتی ہین - شاہ کابل کی خواہش ہے کہ نوجوانانِ ملک یورپ جاکر وہان سے بہترین علوم و فنون حاصل کرین اور ملک مین واپس آکر قومی ترقی مین امداد دین - اس غرض سے ملک کے اکثر نوجوانان سرکاری وظائف حاصل کر کے مغربی ممالک کو روانہ ہو چکے ہین - آپ نے زراعت اور تجارت کی ترقی کیطرف بھی توجہ مبذول کی ہے - انکا تازہ اور محبوب کارخانہ دیا سلائی کا ہے جس مین عورتون کو بھی ملازمتین دیگئی ہین - فن انجنیرنگ سے آپکو خاص دلچسپی ہے -

آپکا گرمائی مقام جو آیندہ دار الحکومت بھی ہونے والا ہے سلسلۂ کوہستان مین کابل سے ۱۰ میل کے فاصلے پر دار الامان کے نام سے قائم ہے - اس سلسلے مین پغمان مین ایک جدید یوروپین طرز کے شہر کی تعمیر عرصۂ پانچ سال سے جاری ہے - سڑکون پر دو رویہ چنار کے درخت نصب کیے گئے ہین - جابجا باغات لگائے گئے ہین کشادہ سڑکین - اور بلند و خوشنما عمارتین بنائی گئی ہین - ایک عالیشان ایوان پارلیمنٹ بھی تعمیر کیا گیا ہے - غرض اپنی شان و شوکت مین پغمان دنیا کے بہترین شہرون سے مقابلہ کریگا - اسکا نقشہ فرانسیسی انجنیرون نے بنایا تھا - اور اسکی تعمیر کا کام جرمن انجنیرون اور ٹھیکہ دارون کے سپرد کیا گیا ہے - افغانستان کی موجودہ ترقی کے زمانے کی تواریخ مین ایک امر قابلِ غور ہے کہ جدید افغانستان کے تعمیری پروگرام کے مختلف شعبون مین یورپ کی مختلف ترقی یافتہ اقوام سے مدد لی گئی ہے لیکن اس سلسلے مین انگریزون کی توقعات پوری نہین ہوئی ہین - جرمنی کی ڈیوش افغانش تجارتی کمپنی نے کابل سے دار الامان تک ریلوے لائن تعمیر کی - جدید دار السلطنت کی تعمیر کے متعلق جملہ سامان کی فراہمی بھی اس کمپنی کے تعلق ہے صرف سیمنٹ ہند سے جاتا ہے - افغانستان کی سڑکون کا کام بھی جرمنی کے ماہرانِ فن کے چارج مین ہے ہوائی جہازون کا محکمہ بھی انھین کے ذمہ ہے - عنقریب ہی کابل سے قندھار تک ہوائی جہازون کے سفر کا سلسلہ بھی جاری ہونے والا ہے - تعلیمی صیغہ جات مین فرانسیسیون اور ترکون کا ہاتھ ہے - انجنیرنگ مین اٹلی سے بھی

مدد لی گئی ہے - محکمۂ افواج کے متعلق ہوائی صیغے میں رُوس افغانستان کی رہنمائی کر رہا ہے - دیگر صیغے جرمنی، اٹلی اور ٹرکی کے چارج میں ہیں - تجارتی میدان میں کئی متذکرۂ بالا، قوام کے نمایندے افغانستان میں موجود ہیں - کابل سے پغمان تک اٹلی اور امریکہ کی موٹر کاروں کی کثرت ہے - ہوٹلوں میں فرانس اٹلی، امریکہ اور رُوس کے لوگ بکثرت ٹھہرے ہوئے ملتے ہیں - فارس اور ٹرکی کے لوگوں نے تو اپنی عمارتیں بھی تعمیر کر لی ہیں لیکن باوجود اسکے کہ افغانستان کا دروازہ رُوئے زمین کی ترقی یافتہ قوموں کے لیے بلا تکلف کھول دیا گیا ہے لیکن مُلک کی چہار دیواری کے اندر انگریزوں کا پتہ نہیں - انگریزوں کے گذشتہ برتاؤ میں افغانیوں کے لیے محبت کا سامان کہاں؟ یہ خیال افغانستان میں کیا بلکہ قریب قریب ساری دنیا میں پھیل گیا ہے کہ کسی ملک پر غیر محسوس طریقے سے بتدریج اپنا اثر جما کر اُسکو اپنے شکنجہ میں اِسطرح جکڑ دینا کہ جس سے اُسکی گلو خلاصی مشکل ہو انگریزوں کی خاص قابلیت ہے - کیا تعجب ہے کہ افغانستان بھی اسی خوف سے انگریزوں سے دُور رہنے کی پالیسی پر عمل کر رہا ہو -

پچھلے سال شاہ امان اللہ خان سیر و سیاحت کی غرض سے یورپ گئے تھے - امیر موصوف فطری طور پر بلند حوصلہ واقع ہوئے ہیں مگر اس سفر نے انکے خیالات کی پرواز میں اس قدر اضافہ کر دیا کہ اہل وطن کے لیے اِن کا ساتھ دینا مشکل ہو گیا - موجودہ یورپین تہذیب کے نمونوں - سائنس کے حیرت انگیز کرشموں اور جدید طرز معاشرت کی کرتوتوں نے مشرقی کوہستان کے تربیت یافتہ امیر کی طبیعت میں ہیجان پیدا کر دیا - تار اور بے تار خبر رسانی، ہوائی جہازوں کی کثرت، موٹروں کا معرکہ آرا سفر، غرض کونسی چیز مغرب کی آب و ہوا میں ایسی تھی جس نے شاہ امان اللہ کے دل کو نہ ہلا دیا ہو اور انکے خون میں جوش نہ پیدا کر دیا - جس شان و شوکت کے ساتھ اِن کا خیر مقدم لندن - پیرس - ماسکو اور آزاد حکومت کے دیگر مرکزوں میں ہوا اُس نے امیر کے دل میں آزادی کی قدر و قیمت میں خاص اضافہ کر دیا - آپنے یورپ میں خاصکر ٹرکش فوج کا معائنہ کیا - یورپ میں عورتوں کو مردوں کے ساتھ شانہ بشانہ کام کرتے دیکھا آپکے قلب کو جوش میں لانے والی سب سے بڑی شخصیت کمال پاشا کی تھی جس نے محض اپنے شخصی اقتدار کی بنا پر ٹرکی کو آناً فاناً معراجِ ترقی پر پہونچا دیا - غرض شاہ امان اللہ خان یورپ کی حیرت انگیز ترقی اور اُسکے اسباب سے متاثر ہو کر وطن واپس آئے - دربار شاہی منعقد کیا گیا - اور تمام افغانستان نے آزادی کا دن منایا - عوام الناس کے چہروں پر تبسم ہے - منتظمین جلسہ کی کامیابی کی فکر میں ڈوبے ہوئے ہیں - پولیس مستعدی سے اپنا کام کر رہی ہے - ممبرانِ پارلیمنٹ تعداد میں قریب نو سو جنکو اپنی نشستوں پر مقررہ وقت پہ بیٹھ جانا ہی کیا کم فرض ادائی ہے - حیرت انگیز نگاہوں سے چاروں طرف

دیکھ رہے ہین گو چہرے سے استقلال اور خودداری نمایان ہے۔سب سے اگلی قطار مین وزرا محفل کو زینت دے رہے ہین پچھلی صف مین عام تماشائیون کا ہجوم ہے۔فوٹوگرافر اپنا کیمرہ لیے ہوے ہیکل کے دربار مین داخلہ کی مؤثر تصویر کھینچنے کی فکر مین ہے، حاضرین کے دلون مین ولولہ ہے، جوش ہے، اشتیاق ہے کہ نوجوان امیر سیاحت یورپ کے بعد اپنی عزیز رعایا کے لیے کیا پیغام لاتے ہین۔یکایک شاہ امان اللہ شاہی عظمت وشوکت کے ساتھ ڈائس پر تشریف لاتے ہین اور تمام محفل مین سناٹا سا چھا جاتا ہے "عورتون کی آزادی" "رشوت کا خاتمہ" "تعلیم" "یورپین تہذیب سے سبق" "افغانستان کی ترقی"۔یہ پیغام ہے۔جسکے لیے تمام اہل دربار بیچین تھے۔حسرت کے ساتھ مگر پرزور لہجہ مین شاہ امان اللہ اپنی قوم سے اپیل کرتے ہین کہ آؤ ہم اور تم قوم پر نثار ہو جائین۔ہماری اور تمھاری قوتین آج سے ملکی ترقی کے لیے مخصوص کر دیجائین۔افغانستان نے آج تک دنیا کو کچھ نفع نہین پہونچایا وہ دنیا کی قومون کی دوڑ مین سب سے پیچھے ہے۔آؤ ہم اور تم اپنی کمزوریون اور نقائص کو دور کر کے اس قابل ہو جائین کہ دنیا کو کچھ دے سکین۔آج فرمانروائے کابل کے دل مین اگر کوئی عشق ہے تو وہ حب وطن کا عشق ہے۔اگر کوئی جذبہ ہے تو افغانستان کی ترقی کا جذبہ۔اگر کوئی خواہش ہے تو یہ ہے کہ کسی طرح افغانستان کا شمار دنیا کے سربرآوردہ ممالک مین ہو جائے۔

امیر امان اللہ خان نے اُسی دُھن مین کمال پاشا کی طرح اپنے مُلک مین اصلاحات کا نفاذ کرنا شروع کر دیا۔عورتون کے پردے کے خلاف تحریک جاری کی اور دیسی لباس کے بجائے یورپین لباس عوام مین پھیلانا شروع کیا۔عام طور پر اعلیٰ طبقے کی عورتون سے نقاب پوشی دُور ہو گئی ہے۔سُست رفتار طبیعتون مین ابھی ہلکا سا نقاب باقی ہے۔انکے گھرون مین جب اُنکے شوہرون کے دوست احباب آتے ہین عورتین خود خاطر مدارات کرتی ہین نومبر ۱۹۲۸ء مین شاہ امان اللہ خان نے یورپین ٹوپی کے استعمال کا حکم بھی دیدیا۔افغانی آبادی کا وہ طبقہ جو جدید روشنی سے منور ہو چکا ہے۔ان اصلاحات کی قدر کرتا ہے لیکن اس مُلک مین کثیر تعداد ایسے لوگون کی ہے جو جدید تعلیم اور تہذیب سے قطعی بے بہرہ ہین۔جو کٹر ملاؤن کے فتوے کو احکام الٰہی کی سچی تعبیر سمجھتے ہین اور اُنکے مطابق عمل کرنا اپنا فرض منصبی جانتے ہین۔جدید اصلاحات سے ان ملّاؤن کے اثر کی بیخ کنی ممکن ہی نہین۔بلکہ اغلب ہے۔چنانچہ انھون نے جدید معاشرتی اصلاحات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا شروع کر دی۔اور شنواری قبائل جو افغانستان کی آبادی کا ایک اہم جزو ہے بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔سلطنت کابل فوجی حیثیت سے ابھی اسقدر مضبوط نہین ہے کہ اس عظیم شورش کا فوراً ہی قلع قمع کر سکے۔چنانچہ رفتہ رفتہ بغاوت زور پکڑتی گئی چند

ذکا خیل آفریدیون نے سرکاری امداد کے بہانے سے اسلحہ حاصل کرکے بعد مین باغیون سے مل گئے۔ الغرض موجودہ شنواری بغاوت افغانستان کا ایک ہولناک واقعہ ہے۔ ابھی تک جو خبرین موصول ہوئی ہین اُنسے یہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ اِس شورش کا خاتمہ ذرا دقت سے ہوگا باغیون مین سے بکثرت جانین ضائع ہو چکی ہین۔ لیکن اُنکی سرکشی نے شاہ امان اللہ کو کابل چھوڑکر قندہار مین پناہ لینے پر مجبور کردیا ہے۔ اگر بدامنی اور بےچینی کی یہی صورت کچھ عرصے تک جاری رہی تو کیا عجب ہے کہ افغانستان آیندہ بین الاقوامی جدّ وجہد کا مرکز ثابت ہو۔

شنواری بغاوت سے شاہ امان اللہ خان کو یہ سبق سیکھنا چاہیے کہ کابل ٹرکی نہین ہے۔ ٹرکی مین کمال پاشا اگر معاشرتی اصلاحات جاری کرنے مین کامیاب ہوئے تو اسکی وجہ ایک یہ بھی ہے کہ قوم اِن اصلاحات کے قبول کرنیکے لیے تیار تھی۔ ٹرکی اور یورپ ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہین اور صدیون سے تُرک یورپین تہذیب سے متاثر اور یورپین تعلقات سے مستفید ہوتے چلے آئے ہین۔ یہی وجہ تھی کہ کمال پاشا کا اشارہ پاتے ہی تُرکی عورتون نے اپنے چہرے سے نقاب اُلٹ دیا۔ اِسکے برعکس افغانستان مین انھین باتون پر عملدرآمد مشکل ثابت ہو رہا ہے یہان آہستہ خرام بہترین مُلکی پالیسی سمجھنا چاہیے۔ بحالات موجودہ یہ کہنا مشکل ہے کہ اصلاحی جدّ وجہد کا مستقبل کیا ہوگا۔

مظلوم کی بددعا سے بچو۔ کیونکہ وہ خدا سے اپنا حق مانگے گا اور خدا کسی حقدار کا حق ضایع نہین کرتا۔

پیمبر اسلام

جس شخص کے دل مین ایک رائی کے دانے کے برابر بھی کبر و غرور ہوگا وہ بہشت مین داخل نہوگا۔ اور جس شخص کے دل مین ایک رائی کے برابر بھی ایمان ہوگا وہ دوزخ مین داخل نہ ہوگا۔

پیمبر اسلام

جب تک آدمی اپنے بھائی یا ہمسایہ کے لیے وہی چیز پسند نہین کرتا جو اپنے لیے پسند کرتا ہے اُسکا ایمان کامل نہین ہوتا

پیمبر اسلام

حضرت امیر خسرو دہلوی

(از پروفیسر محمد حبیب بی۔ اے (آکسن) پروفیسر مسلم یونیورسٹی)

(مترجمہ جناب محمد داؤد خان خویشگی خورجوی)

ضیاء الدین برنی نے اپنی مشہور تاریخ "فیروز شاہی" مین لکھا ہے کہ علاء الدین خلجی کے زمانۂ حکومت مین ایسے ذی کمال شعراء موجود تھے جنکی مثل نہ زمانۂ گذشتہ مین پائی جاتی ہے اور نہ اس کے بعد کے زمانے مین۔ چنانچہ کیا بلحاظ تصنیفات اور کیا بخیال ایجاد خیالات کوئی شخص امیر خسرو کا مقابلہ نہین کر سکتا ہے۔ امیر خسرو علمی دنیا کے ہر شعبہ مین ایک خاص درجہ رکھتے تھے۔ انکے بعد ایسا قادر الکلام شاعر جسکو ہر صنف شاعری پر پوری قدرت حاصل تھی آجتک پیدا نہین ہوا۔ ایک عالی قدر عالم ہونے کے علاوہ انھین ولایت کا درجہ بھی حاصل تھا۔ تمام عمر روزہ رکھا۔ اور آپ کا زیادہ وقت تلاوت قرآن پاک اور وظائف مین صرف ہوتا تھا۔ آپ شیخ نظام الدین اولیاؒ کے خاص مرید تھے اور اپنے پیر پر انکو پورا عقیدہ تھا۔ محبت کا بھی کافی حصہ پایا تھا اور زندہ دلی آپ مین کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ علم موسیقی اور سرود کا بھی شوق تھا۔ قادر مطلق نے آپکو ان تمام صفات کا جو ایک باہنر اور مہذب آدمی مین موجود ہونا چاہئین مجموعہ بنایا تھا۔ درحقیقت وہ ایک عجیب ہستی تھے اور اس آخری دور مین جو قحط الرجال کے واسطے مشہور ہے انکا وجود خالی از تعجب نہین۔

برنی لکھتا ہے کہ ان سے اور صوفی شاعر امیر حسن سے میرے بڑے دوستانہ تعلقات رہے ہین۔ نہ انکو بغیر میرے لطف آتا تھا اور نہ مجھکو ہی انکے بغیر کوئی تفریح حاصل ہوتی تھی اور میری ہی وجہ سے ان دونون باکمال اشخاص مین باہم دوستانہ مراسم ہو گئے تھے۔

زمانۂ حال کے مشہور مبصر مولانا شبلی نے بھی امیر خسرو کے اوصاف بیان کرنے مین برنی کی تائید کی ہے۔ موصوف "شعر العجم" مین فرماتے ہین کہ ہندوستان مین چھ سو برس سے آجتک اس درجہ کا جامع کمالات نہین پیدا ہوا اور سچ پوچھو تو اسقدر مختلف اور گوناگون اوصاف کے جامع ایران و روم کی خاک نے بھی ہزارون برس کی مدت مین صرف دو ہی چار پیدا کیے ہونگے۔ ایک شاعری کو لیجیے تو انکی جامعیت پر حیرت ہوتی ہے۔ فردوسی۔ سعدی۔ انوری۔ حافظ۔ عرفی اور نظیری بے شبہہ اقلیم سخن کے جم و کے ہین لیکن انکی حدود حکومت ایک اقلیم سے آگے نہین بڑھی۔ فردوسی مثنوی سے آگے نہین بڑھ سکتا۔ سعدی قصیدے کو

ہاتھ نہین لگا سکتے - انوری مثنوی اور غزل کو چھو نہین سکتا - حافظ - عرفی اور نظیری غزل کے دائرے سے باہر نہین نکل سکتے - لیکن خسرو کی جہانگیری مین غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی سب کچھ داخل ہے اور چھوٹے چھوٹے خطہ ہا سخن یعنی تضمین، مستزاد، اور صنایع و بدایع کا تو شمار ہی نہین - تعداد کے لحاظ سے دیکھو تو اس خصوصیت مین کسی کو انکی ہمسری کا دعویٰ نہین ہو سکتا - فردوسی کے اشعار کی تعداد کم و بیش ستر ہزار ہے - صائب نے ایک لاکھ شعر سے زیادہ کہا ہے لیکن امیر خسرو کا کلام کئی لاکھ سے کم نہین - اکثر تذکرون مین خود امیر خسرو کے حوالے سے لکھا ہے کہ انکا کلام تین لاکھ اشعار سے زیادہ اور چار لاکھ سے کم ہے لیکن اسمین غالباً ایک غلط فہمی ہے - امیر نے "ابیات" کا لفظ لکھا ہے اور قدما کے محاورے مین بیت ایک سطر کو کہتے ہین -

ان سب پر مستزاد یہ کہ اوحدی نے تذکرۂ عرفات مین لکھا ہے کہ امیر کا کلام جس قدر فارسی مین ہے اُسی قدر برج بھاکا مین ہے - کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ اس مجموعہ کا آج نام و نشان بھی باقی نہین رہا - مختلف زبانون کی زباندانی کا یہ حال ہے کہ ترکی اور فارسی اصلی زبان ہے - عربی مین ادبائے عرب کے ہمسر ہین - سنسکرت کے ماہر ہین - چنانچہ مثنوی "نہ سپہر" مین تواضع کے لہجہ مین اسکا ذکر کیا ہے ع

من قدرے بر سر این کار شدم -

شاعری کے بعد نثر کا نمبر ہے - انھون نے ایک مستقل کتاب "اعجازِ خسروی" تین یا پانچ جلدون مین لکھی اور اگرچہ افسوس ہے کہ اسمین زیادہ تر زور صنایع و بدائع پر صرف کیا ہے لیکن اُنکی طباعی اور ذہانت سے کون انکار کر سکتا ہے؟

موسیقی مین یہ کمال پیدا کیا کہ نایک کا خطاب انکے بعد آجتک پھر کوئی شخص حاصل نکر سکا - ان مختلف حیثیت مشغلون کے ساتھ فقر و تصوف کا یہ رنگ ہے کہ گویا عالمِ قدس کے سوا دُنیائے فانی کو نظر اُٹھا کر نہین دیکھتے - ان سب باتون کے ساتھ جب اسپر نظر کی جاتی ہے کہ امیر خسرو کو کامون مین مشغول ہونے کے لیے وقت کس قدر ملتا تھا تو سخت حیرت ہوتی ہے - وہ ابتدا سے ملازمت پیشہ تھے - دن دن بھر دربار دن مین حاضری دینی پڑتی تھی - کام جو سپرد تھا وہ صرف شاعری ہی نہ تھی بلکہ اور اور اشغال بھی تھے - ان حالات کے ساتھ اگر صانعِ قدرت اُن پر ناز کرے تو چندان ناموزون نہوگا،،

امیر خسرو ایک ترکی نو آمدہ قوم کی یادگار تھے - اُن بد قسمت لوگون مین جنکو چنگیز خانی حملون نے گھر سے بے گھر کر کے ہندوستان آنے پر مجبور کیا ایک لاچین نامی ترکی خاندان بھی تھا جسکا قدیم وطن غالباً شہر کش واقع صوبۂ ماوراء النہر تھا - سلطان شمس الدین التمش نے ان پردیسی لوگون کے ساتھ عمدہ برتاؤ کیا اور اپنے ملک مین جگہ دی - خسرو کے والد سیف الدین لاچین قوم کے ترکون کے سر آوردہ

لوگوں مین سے تھے اور خسرو کی والدہ عماد الملک ابن کے وزیر جنگ کی دختر تھین۔

خسرو ۶۵۲ھ مین بمقام پٹیالی (جو کمشنری آگرہ کے ضلع ایٹہ مین ایک چھوٹا سا قصبہ ہے) پیدا ہوئے نوزائیدہ لڑکے کو ایک خرقہ مین لپیٹ کر ایک مجذوب کے پاس جو قریب ہی رہتے تھے لے گئے۔ اُس مجذوب نے امیر صاحب کے والد صاحب سے کہا کہ اے امیر لاجین آپ میرے پاس ایسے لڑکے کو لائے ہین جو خاقانی سے بھی زیادہ رُتبہ پائیگا۔ سیف الدین کے انتقال کے وقت امیر خسرو کی عمر سات سال کی تھی لیکن خاندان مرفہ الحال تھا اس لیئے انکی تعلیم و تربیت اچھی ہوئی۔ انکی بعد کی تصنیفات سے صاف ظاہر ہے کہ وہ علوم متداولہ اور فلسفہ کے پُورے ماہر تھے۔ لیکن انکو اصل ذوق و شوق شاعری ہی سے تھا۔ انھوں نے بچپن ہی سے اشعار کہنے شروع کر دیے تھے اور بیس سال کی عُمر ہونے تک انکی رائے انکے مقصد زندگی کے متعلق قائم ہو چکی تھی۔

عام خیال ہے کہ شاعرانہ مذاق رکھنے والے لوگ اپنی تیز مزاجی کی وجہ سے اس دنیا سے علیحدہ رہتے ہین جسمین زندگی کو کامیابی کے ساتھ بسر کرنے کا پہلا راز نرم مزاجی مین مُضمر ہے۔ لیکن امیر خسرو دُنیا کے اُن بڑے بڑے ارباب تخیل مین شمار نہین کیے جا سکتے۔ وہ صرف شاعر ہی نہ تھے بلکہ ایک باہنر آدمی ہونے کے علاوہ بہت سے دُنیوی شُعبوں مین بھی مہارت کامل حاصل تھی۔ وہ جس زور و شور سے اپنے قلم سے کام لے سکتے تھے اُسی طرح میدان جنگ مین تلوار کو بھی استعمال کر سکتے تھے۔ انکو زمانے سے کبھی کوئی شکایت نہین ہوئی۔ ہر چیز کا وجود بہتری کی طرف محمول کرتے تھے جسکا نتیجہ یہ ہُوا کہ انکا کلام اور شاعرون کے کلام کی طرح زمانے کی بیجا شکایات سے لبریز نہین ہے۔

دہلی کو دار السلطنت ہوئے تقریباً پچھتر برس ہو چکے تھے اور اب یہ شہر بغداد ثانی کہلانے کا مستحق ہو گیا تھا۔ یہان پر بیرونی ممالک کے بہت سے اُمرا و مُدبرین جو مُغل حملوں کے باعث ہندوستان میں پناہ گزین ہوئے تھے جمع ہو گئے تھے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ سوسائٹی کے لوگ جنمین اہل نجوم، مطرب اور دیگر اہل کمال سے لیکر قاتل، ٹھگ اور ہر قسم کے دغاباز لوگ شامل ہیں سبھی یہان موجود تھے۔ دہلی اس زمانے مین اچھے سے اچھے اور بُرے سے بُرے افعال کا مرکز بنا ہوا تھا اور ذی استعداد و اہل ہنر کے واسطے اسکا دروازہ کھلا ہُوا تھا۔ شہر کے حوالی اور خراب حصّوں مین طوائفین اور قمار باز جمع ہو جاتے تھے اور اپنے مکروہ پیشوں مین مشغول رہتے تھے۔ لیکن انکے برخلاف لاتعداد صوفی اور واعظ بھی موجود تھے جنکی متحدہ کوششین شہر کی حالت سنبھالنے مین مصروف رہتی تھین۔ امیر خسرو کے جوہر دماغی کے واسطے یہ شہر ایک قدرتی تعلیم گاہ ثابت ہوا۔ یہان پر بے شمار ایسی چیزین تھین جن سے وہ بہت کچھ سیکھ سکتے تھے اور انھون نے اُن سب سے بہت

شوق اور سرگرمی کے ساتھ افادہ کیا۔ واعظین کی فصاحت، صوفیون کے پُرجوش مباحث اور معشوقون کے دلکش ناز وادا یہان تک کہ امیر خسرو نے دہلی کو ہر پہلو سے دیکھا اور جب کہ انھون نے قلم ہاتھ مین لیا تو اِن کا دل انسانی جذبات سے لبریز تھا۔ شیخ سعدی نے فرمایا ہے کہ مین نے ہر ایک درخت سے ثمر چُن لیے ہین خسرو بھی اپنے مشہور پیشرو کے قدم بقدم چلے اور شاہی محلات سے لیکر غریب مزدور پیشہ لوگون کی بود و باش اور خانقاہون سے لیکر کسب خانون تک انسانی زندگی کے ہر پہلو کا انھون نے نظارہ کیا۔ خسرو کی تصنیفات اگرچہ زیادہ تر رسمی ہین اور تصنع سے خالی نہین ہین مگر انکی یہ خامی اُس وقت کے رواج کے مطابق ہے۔ اِس سے یہ نتیجہ نہین نکالا جا سکتا کہ وہ حقائقِ زندگی سے بیخبر تھے۔

خسرو کے لیے روزی کمانا بھی ضروری تھا ترکی اُمرا کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ بڑے سخی و لاپروا ہوتے تھے حتیٰ کہ اُنکو اپنی سخاوت کے سامنے دوسرے دن کے کھانے کی بھی فکر نہ رہتی تھی۔ امیر خسرو مین بھی یہ خصوصیت کسی سے کم نہ تھی۔ آئینِ سکندری مین وہ اپنے لڑکے کو اِن الفاظ مین نصیحت کرتے ہین۔

"جو کچھ خدا تمکو از راہ مہربانی عطا کرتا ہے اُسمین سے حاجتمندون کو بھی حصّہ دُو، خود غرضی چھوڑ دو، اور تنگ مزاجی سے باز آؤ، جو کچھ تمھارے پاس ہے وہ خوشدلی کے ساتھ دوسرون کو دو اور پھر دیکھو کہ خدا تمکو تمھاری سخاوت کا دوچند بدلہ دیگا، اپنی چیزون کا تحفہ دوسرون کو ایک شیر کے مانند بھیجاؤ جو تمام جنگل کے جانورون کو اپنے صید پر دعوت دیتا ہے، ایک بلّی کی طرح نہ رہو کہ جب کھانے کے لیے ایک لقمہ باقی ہے تو کونے مین گھسکر سب سے علیحدہ جا بیٹھتی ہے، اپنی سخاوت سے اجنبی لوگون کو بھی حصّہ دُو کیونکہ اپنی بیوی اور بچون کی طرف تو ایک گدھا بھی سخی ہوتا ہے، جو شخص صرف اپنے اہلِ خاندان پر ہی مہربانی کرتا ہے وہ واقعی خود غرض ہے"

اس قسم کے دریادل آدمی کے واسطے معمولی قسم کی آسودہ حالی بھی تکلیف دہ ہوتی ہے اِس لیے خسرو کو غریب رہنا پسند نہ تھا۔ اور دوسرے اہلِ جوہر کے مانند آہستہ آہستہ اور متواتر کوششون کے بعد امیر ہونا بھی اُنکو اچھا نہ معلوم ہوتا تھا اِسلیے اُنھون نے ایسا پیشہ پسند کیا جس مین کم سے کم محنت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ آمدنی ہو مگر اِس زرطلبی کے باوجود وہ اپنی زندگی کے مقصد کے قریب ہی رہے۔ انھون نے ایک درباری شاعر کا پیشہ اختیار کر لیا۔ اُس زمانے کے اہلِ دُوَل اِسی طرح شاعرون کی سرپرستی کرتے تھے۔ شاعر کے قصائد عام پبلک کے خیالات کو ممدوح کے موافق کر دیتے تھے۔ انھین کی بدولت ان لوگون کا نام زبانزدِ خلائق ہو جاتا تھا۔

خسرو کی طبیعت اِس کام کے واسطے نہایت موزون تھی۔ جسطرح موجودہ زمانے کے اخبار نویس بے تکان اپنے ایڈیٹوریل مضامین لکھتے ہین اسی طرح امیر خسرو قصیدے اور غزلیات کہتے تھے۔ وہ ہر قسم کے خیالات کی جماعت کے ساتھ موافقت سے رہ سکتے تھے۔ انکی شکل و صورت دلکش، فہم تیز اور گفتگو دلپذیر تھی۔ اُس زمانے کی

سیاسات مین حصّہ لینا خطرات سے خالی نہ تھا۔ لیکن خسرو نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا اور کبھی بھی سیاسی دنیا مین کوئی مرتبہ حاصل کرنے کی کوشش نہ کی۔ یہ سچ ہے کہ سیاسی معاملات مین حصّہ لیے بغیر کوئی شخص دربار مین ممتاز حیثیت قائم نہین رکھ سکتا تھا لیکن خسرو نے معمولی سازشون اور اپنے سرپرستون کے ملکی جھگڑون مین بھی کوئی حصّہ نہ لیا۔ وہ اُنکی تعریف بھی صرف اسلیے کرتے تھے کہ اُنکو اسکے بدلے مین انعام ملتا تھا۔ درحقیقت خسرو ہمیشہ زیادہ سے زیادہ روپیہ پیدا کرنے کی کوشش مین لگے ہی رہتے تھے۔ مسرّت کامل کسی انسان کی قسمت مین نہین ہے لیکن امیر خسرو کی زندگی ایسی تھی کہ اہلِ دُنیا انکو حسد کی نگاہ سے دیکھ سکتے ہین۔

خسرو کے اوّلین مُربّی علاءُ الدین محمد کشلی خان تھے جو عام طور سے ملک چھجو کے نام سے مشہور ہین اور جنکی خدمت مین خسرو قریباً ۱۲۷۱ء تک رہے معلوم ہوتے ہین وہ غیاث الدین بلبن کے چچازاد بھائی اور امیر حاجب تھے۔ برنی نے اپنی تاریخ مین لکھا ہے کہ "مین نے خود امیر خسرو کو یہ کہتے ہوئے سُنا ہے کہ سخاوت تیراندازی اور بال کھیلنے مین کوئی شخص ملک علاء الدین کشلی خان کا ہم پلّہ پیدا نہین ہوا" لیکن ملک چھجو کی شُہرت جتنی عالمگیر تھی اتنی پائدار نہ تھی۔ ہلاکو نے اِنکو ایک تلوار ہدیتہً بھیجی اور عراق کی صوبداری بھی پیش کی۔ کہتے ہین شہنشاہ بلبن جو نہایت بدصورت اور بخیل واقع ہوا تھا اپنے چچازاد بھائی کی زیادہ سخاوت سے ناخوش رہتا تھا۔

جب علاء الدین کشلی خان کڑا (الہ آباد) کے گورنر مقرّر ہوئے تو اُنھون نے اپنے اصطبل کے کُل گھوڑے ایک شاعر مسمّی بخواجہ شمس موئن کو ایک عمدہ قصیدہ سُنانے پر بخشدیے۔ اور دس ہزار ٹنکے (ایک سکّہ ہوتا ہے) مُطربون کو دیدیے۔ برنی لکھتا ہے کہ ملک چھجو اِسقدر سخی تھا کہ بعض اوقات اپنا تمام مال واسباب دے ڈالتا اور اپنے لیے ایک پہننے کے لبادے کے سوا اور کچھ بھی باقی نہ رکھتا تھا۔ دوسرے شاعرون کی طرح خسرو نے بھی اس چشمۂ سخاوت سے فیض پایا۔ اور جلد جلد ترقّی کی منزلین طے کین۔ اِنکا مشہور قصیدہ جو ملک چھجو کی تعریف مین ہے مشرقی سخنورون کے مبالغے کا اچھا نمونہ ہے۔ کچھ شعر ملاحظہ ہون۔

صبح چون از رُوئے مشرق رُو نمود		صحن مینا روضۂ مینو نمود
بود پنہان آفتاب آن دم کہ صبح		ہمدمی با بادِ عنبر بُو نمود
صبح را گفتم کہ خورشیدت کجاست		آسمان رُوئے ملک چھجو نمود

لیکن اِنکی خدمت مین ابھی خسرو کو دُو سال کا عرصہ ہی گذرا ہوگا کہ ایک معمولی بات پر ملک چھجو کا دل خسرو سے آزردہ ہوگیا اور وہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہوگئے۔ بلبن کا دوسرا لڑکا نصیر الدین بغرا خان ایک تجر

ملک چھجو کے یہاں ایک ضیافت مین شریک تھا۔ خسرو کے اشعار سے متاثر ہو کر اُسنے اِنکو ایک اشرفیون سے بھرا ہوا لگن پیش کیا۔ خسرو نے اُسکو قبول کر لیا۔ اِسپر چھجو کو برا معلوم ہوا۔ حالانکہ خسرو نے اُسے خوش کرنے کی پیہم کوششین کین لیکن سب بے سود ہوئین۔ اور آخر کار اِنکو بغرا خان کے یہان جانا پڑا جو اُس زمانے مین لکھنوتی کا حاکم تھا۔ اِس ہمدرد مُربی کے یہان کچھ زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ لکھنوتی کے گورنر طغرل نے علم بغاوت بلند کیا اور اسکو فرو کرنیکے واسطے بادشاہ کو خود جانا پڑا۔ بغرا خان کو بھی جو نہایت پست ہمت تھا مجبوراً اپنے والد کے ساتھ جانا پڑا۔ بغاوت فرو ہوگئی۔ چنانچہ باغیون کو سخت سزائین دینے کے بعد بلبن نے بغرا خان کو فتح شدہ ملک کا گورنر مقرر کیا۔ بلبن کی واپسی کے کچھ دن بعد تک خسرو کا قیام لکھنوتی مین رہا لیکن ایک مشرقی شہر کی آب وہوا اور عقائد وغیرہ انکے مزاق کے موافق ثابت نہوئے اس لیے اپنے آقا سے رخصت لیکر دہلی آئے جہان پر وہ اتفاق سے بلبن کے بزرگترین فرزند محمد کے پاس پہنچ گئے۔ وہ ایک بڑا سخی، بامذاق اور مہذب شخص تھا اور بعد کو خانِ شہید کے نام سے مشہور ہوا۔

سلطان محمد اُس زمانے کے معیار کے مطابق ایک کامل شہزادہ تھا وہ نیکی، خلق، مہربانی اور بہادری سب کا مجموعہ تھا۔ اُسکی زبان سے کبھی ناپاک الفاظ نہین نکلے اور نہ کبھی اُس نے اعتدال سے زیادہ میخواری کی۔ اراکین سرکاری، صوفیون اور شعرا کی مجلس کی صدارت کا کام اس سے بہتر کوئی انجام نہ دلیسکتا تھا۔ تہذیب ومتانت کا یہ حال تھا کہ جب کبھی دربار مین بیٹھتا تو اگرچہ کبھی کبھی دن بھر گذر جاتا لیکن زانو نہین بدلتا تھا۔ باہنر لوگون کی دستگیری کرتا تھا اور شعرا کا قدرشناس تھا۔ اسکے ذاتی اشعار کی بیاض مین تقریباً بیس ہزار منتخب اشعار درج تھے اسکی نظر انتخاب کی بڑے بڑے علماء نے تعریف کی ہے۔

لیکن بدقسمتی سے بادشاہ نے اپنے اِس عزیز از جان فرزند کو اس زمانے کی مشکل ترین خدمت یعنی سرحدی افواج کی سپہ سالاری سپرد کی۔ تقریباً نصف صدی تک مغل حملہ آور ان مغربی ملکون پر آتشباری کرتے رہے وہ مشرقی ملکون کو بھی ہمیشہ دھمکی دیتے رہے۔ ان حملہ آورون کا خوف اسقدر بیٹھا رہتا تھا کہ ہندوستان کے باشندے کیا دہقانی اور کیا شہری سب انکے نام سے سہم جاتے تھے۔ یہ لوگ جہان بھی حملہ کرتے تھے وہان کے باشندون کے ساتھ بڑی بیرحمی سے پیش آتے تھے۔ اور تمام ملک کو ویران کر جاتے تھے۔ اہل نظر کو دہلی کی سلطنت کا نیست ونابود ہونا نظر آرہا تھا اور بظاہر کسی کو بھی اس وحشی قوم کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہ تھی۔ بلبن کے چچازاد بھائی شیر خان نے مدت تک پنجاب کی حفاظت کرکے ایک اہم خدمت انجام دی تھی لیکن بلبن نے اپنی حکومت کے شروع ہی مین اُسکو زہر دلوا کر مروا دیا تھا

جس سے سرحدی ملک کی حالت پھر خطرناک ہو گئی۔ سلطان محمد اپنے چچا کی جگہ مقرر کیا گیا اور یہ تقرر عالم پسند ثابت ہوا۔ اسکا ملتان کا دربار سارے فارسی دان لوگون مین مشہور ہو گیا کیونکہ سلطان کی مجلس مین ہمیشہ فضلا اور باہنر لوگون کا مجمع رہتا تھا۔ اسکے اہلِ دربار شاہنامہ۔ دیوانِ ثنائی۔ خاقانی اور نظامی کے نغمون کو پڑھتے اور ان پر تبصرہ کرتے تھے۔ جب ۶۷۹ھ مطابق ۱۲۸۰ء مین پنجاب اور سندھ کا خراج لیکر شہزادہ دہلی آیا تو امیر خسرو سے اسکی ملاقات ہوئی اور وہ انکا کمال فن دیکھکر اپنے ساتھ لے گیا۔ پانچ سال تک امیر خسرو اور امیر حسن اسکی خدمت مین ملتان مین رہے۔ شہزادے نے انکی قدر و لیاقت کو فوراً پہچان لیا اور انکو اپنے دوسرے درباریون سے بلند جگہ دی۔ انکے واسطے بیش قرار وظیفہ مقرر کیے اور انعام و خلعت بھی دیے۔ شہزادہ محمد بڑا حوصلہ مند تھا اسنے خسرو سے بھی بلند مرتبہ شاعر کو اپنی دار السلطنت مین بلانے کی کوشش کی۔ چنانچہ دو مرتبہ شیخ سعدی شیرازی کے پاس قاصد کو معہ اخراجاتِ سفر بھیجا اور انکے واسطے ملتان مین ایک خانقاہ بھی بنا دینے کا وعدہ کیا لیکن شیخ صاحب نے پیرانہ سالی کی وجہ سے انکار کر دیا اور خود اپنے قلم سے چند غزلین لکھکر شاہزادے کے واسطے بھیجدین۔

لیکن یکایک آفتِ ناگہانی برپا ہوئی۔ اور مجلسِ احباب کا شیرازہ اس طرح منتشر ہو گیا جیسے بادِ خزان پھول کی پتیون کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتی ہے ایک مغل حملے مین سلطان محمد مارا گیا گویا اسکو بلبن کے شیر خان کو قتل کرنے کی سزا ملی۔ ماہ صفر ۶۸۳ھ مین ایک مغل سردار مسمیٰ بہ اتمار نے تیس ہزار فوج کے ساتھ ہندستان پر حملہ کیا۔ سلطان محمد اسکے مقابلے کو بڑھا لیکن قضاء ایزدی سے ایک فاش غلطی ہو گئی یعنی سلطان فوج کی تعداد کو تیس ہزار کے بجائے تین ہزار پڑھ گیا اور جب لاہور کے نزدیک اسکا دشمن سے سامنا ہوا تو اسکو معلوم ہوا کہ اسکی چھوٹی سی فوج دشمن کے زیر کرنے کے واسطے کسی طرح کافی نہین ہے۔ یہ دیکھکر وہ راوی کے مشرقی کنارے پر قیام کرکے رسد کا منتظر تھا کہ یکایک مغلون نے ایک روز دوپہر کے وقت دریا پار کرکے حملہ کر دیا اور خیمے مین گھس آئے۔ اس موقعہ پر مقابلہ کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا مگر اسکی بے مثال بہادری کے باوجود شام کے وقت تک اسکی فوج کو شکست فاش ہوئی اور ایک تیر نے اسکا بھی خاتمہ کر دیا۔ تمام دہلی اور ملتان کو اسکی اچانک موت پر رنج ہوا اور ضعیف بادشاہ کو تو ایک بڑا دھکا لگا۔ دن بھر اسنے اس غم کو برداشت کیا اور کام کرتا رہا لیکن رات کو اس سے نہ رہا گیا اور بہت آہ و زاری کی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسکی موت بھی قریب ہے۔

امیر خسرو محض درباری مصاحب نہ تھے بلکہ فوجی سردار بھی تھے۔ اس لڑائی مین بھی اپنے آقا کے ہمراہ تھے۔ یہان تک کہ مغلون کے ہاتھ گرفتار بھی ہو گئے۔ انکا بیان ہے کہ شہیدانِ اسلام نے تمام ریگستان کو

اپنے خون سے رنگ دیا اور بہت سے مسلمان گرفتار ہوئے اور اُنکی گردنین اِسطرح باہم باندھدی گئین جیسے کہ گلدستہ مین پھول یکجا کردیے جاتے ہین۔ خسرو کا بیان ہے کہ مَین بھی گرفتار ہوگیا اور جان کے خوف سے بدن کا خون خشک ہوگیا۔ مَین اِدھر اُدھر بھاگتا پھرتا تھا جس سے پانوٗن مین چھالے پڑگئے۔ پیاس کی شدّت سے زبان پر کانٹے پڑگئے تھے اور بھوک کے مارے پیٹ پیٹھ سے جا لگا تھا۔ مغلون نے میرے کپڑے بھی اُتار لیے اور مجھکو ایک خزان رسیدہ درخت کی طرح برہنہ چھوڑدیا۔ وہ مغل سردار جس نے مجھکو گرفتار کیا تھا گھوڑے پر اِسطرح سوار تھا جیسے کوئی شیر پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھا ہو۔ اسکے دہن اور بغلون سے سخت بدبوٗ آتی تھی۔ اگر مَین کبھی کمزوری کے باعث پیچھے رہجاتا تھا تو وہ مجھکو اپنا نیزہ دکھاکر دھمکاتا تھا۔ مَین نہایت غمگین تھا اور اس ظالم کے پنجے سے رہائی پانے کی قطعی امید نہ تھی لیکن خداے پاک کا شکر ہے کہ کسی قسم کا زخم کھائے بغیر مجھکو آزادی حاصل ہوگئی۔ راوی کے کنارے پہنچکر پیاسے مغل سردار اور اُسکے گھوڑے نے بیحد پانی پی لیا جس سے دونون اُسی وقت راہیِ مُلکِ بقا ہوئے۔ مَین نے یہ موقع غنیمت جانکر تھوڑا سا پانی پیا جس سے بدن مین کچھ طاقت آئی اور وہان سے بھاگ آیا۔

دہلی پہنچکر امیر خسرو نے اپنی مان کو بہت پریشان و متفکر پایا۔ اِنھون نے اُسوقت کے اضطراب و جوش کو شہزادۂ شہید کا ایک مرثیہ لکھکر ظاہر کیا ہے۔ اِس مرثیے مین چونکہ سب باتین امیر خسرو نے اپنی آنکھ سے دیکھی ہوئی لکھی ہین اور درواقعی امیر خسرو کو اپنے اولوالعزم و باہمت آقا کی جدائی کا بیحد ملال ہُوا تھا اِسلیے یہ مرثیہ نہایت ہی پُر اثر ہے۔ عوام مین بھی یہ بہت مقبول ہُوا۔ تقریباً ایک ماہ سے زیادہ تک خسرو کے اشعار زبان زدِ خلائق رہے۔ یہ مرثیہ فنِ شاعری کا ایک بےنظیر نمونہ ہے۔ تمام مُلک کی خوف زدہ حالت، اور ملتان سے روانگی کے وقت شہزادے کا فتح کامل پر یقین، مغلون کا یکایک حملہ، ہندوستانی افواج کا انتہاے گرمی مین بہادرانہ مقابلہ، اور لڑائی کے میدان سے بھاگنے کی بےنتیجہ کوششین اِن سب کا بیان امیر خسرو نے بڑی فصاحت و بلاغت سے کیا ہے۔

ابھی تک امیر خسرو کا نام تعلیم یافتہ طبقے ہی مین سُنا جاتا تھا لیکن اِس مرثیے نے عام آدمیون کو بھی اُن سے شناسا کردیا۔ اِس اندوہناک سانحے کے کچھ دن بعد تک امیر خسرو اپنی والدہ کے پاس رہے جو اُنکو بےحد عزیز تھین۔

اِسوقت مُلکی سیاسات کے اندر ایک انقلاب برپا ہورہا تھا۔ بلبن کی وفات کے بعد کیقباد تختِ سلطنت پر متمکّن ہوا جسکی عمر اٹھارہ سال کی تھی۔ اسنے اپنی حکومت لاپرواہی اور آوارگی کے ساتھ شروع کی اور تمام مُلکی معاملات نظام الدین وزیرِ اعظم کے ہاتھ مین چھوڑدیے۔ نظام الدین ایک عقلمند مدبّر تھا۔ حتیٰ کہ خود اسکے

چھجا فخرالدین نے جو دہلی کا کوتوال تھا اسکے متعلق کہا ہے کہ نظام الدین مین ایک گیدڑ پر پتھر پھینکنے کی بھی جرأت نہتھی اور نہ کسی بقال کو معمولی سی تنبیہ بھی کرسکتا تھا - ہر ایک چیز بدانتظامی کی حالت مین تھی اور اہل بصیرت کو آیندہ انقلاب کے آثار صاف نظر آرہے تھے - موجودہ شہنشاہ کے اُمرا کو سلطان محمد سے کسی قسم کی محبت نہ تھی حتے کہ لوگون نے اُسکے لڑکے کیخسرو کو بھی تہ تیغ کردیا تھا - جبتک نظام الدین امور سلطنت پر قابض تھا اُس وقت تک امیر خسرو شاہی دربار مین کسی قسم کی عزت حاصل نکرسکتے تھے - اِسلیے انھین کسی حاکم صوبہ کے دربار مین جانے کے سواے کوئی چارہ نہ تھا - امیر علی خان جہان جو عام طور سے حاتم خان کے نام سے مشہور ہے ایک پرانا افسر تھا اور اس پُرخطر زمانے مین اسکی دستگیری سے صدہا آدمیونکو پناہ وحفاظت نصیب ہوئی - ابتدا مین وہ شہنشاہ بلبن کا صرف ایک آزاد شدہ غلام تھا لیکن رفتہ رفتہ وہ مُلک کے بڑے آدمیون مین شمار ہونے لگا اور اپنی دریا دلی کے واسطے مشہور ہوگیا - دربدر پھرنے والے فقیرون کو بھی وہ طلائی ٹنکے ہی دیتا تھا جبتک کا نام کبھی اسکے لبون پر بھی نہ آتا تھا - اور لوگون کے مانند خسرو بھی اسکی سخاوت کے ثنا خوان ہین -

جسوقت حاتم خان اودھ کا صوبہ دار مقرر ہوا تھا امیر خسرو اسکی خدمت مین تھے لیکن وہان پر دو سال رہنے کے بعد انکو پھر دہلی جانے کی خواہش پیدا ہوئی - اُنکی والدہ بھی ان سے ملنے کی مشتاق تھین اور اب نظام الدین کا زمانۂ عروج بھی ختم ہوچکا تھا - حاتم خان نے اُنکو بخوشی جانے کی اجازت دیدی اور دو سونے کے طبق بطور زاد راہ پیش کیے لیکن انھین ابھی دہلی پہنچے دو روز بھی نہوئے تھے کہ شہنشاہ کیقباد کا قاصد اُنکو شاہی دربار مین بُلانے کے واسطے آیا خسرو دربار مین پہنچکر تعظیم بجالائے اور قصیدہ پڑھا - شہنشاہ نے اُنکو ایک کمربند مُرصّع اور دو سونے کے توڑے انعام مین دیے - اور ان سے اپنے اور بغرا خان کی ملاقات کے حالات لکھنے کو کہا - امیر خسرو خاص درباریون مین داخل ہوئے - اور اپنی اوّل مثنوی قران السعدین کو آغاز کیا - چھ ماہ کی پیہم کوششون کے بعد ۶۸۸ھ مطابق اکتوبر ۱۲۸۹ء مین اُسکو ختم کیا - لیکن جب امیر خسرو اس مثنوی کی تصنیف مین مشغول تھے تو شہنشاہ کی حالت روز بروز ابتر ہورہی تھی بد قماشی کی عادات نے جن پر اُسکو قابو پانا مشکل تھا اسکو بائیس ۲۲ سال کی عمر مین ہی مُہلک امراض کا شکار بنادیا - اسکی موت کے ساتھ ہی اُن ترکی سردارون کے عروج کا چراغ بھی گُل ہوگیا جنکے ہاتھون مین شہاب الدین کے زمانے سے اب تک تمام مُلکی انتظام چلا آتا تھا - ترکی اُمرا مین بھی امیر خسرو کے بہت سے رفیق اور دوست تھے - لیکن انھون نے ان سب کے زوال کا قطعی خیال نہ کیا - ان کا اُصول زمانے کے موافق چلنا تھا نہ کہ اُسکے خلاف ◆

باقی (آیندہ)

بالشویزم

(از مسٹر سری نراین نگم ایم اے۔ ایل ایل بی)

بالشویزم کے لغوی معنی "اکثریت" کے ہیں لیکن جن معنوں میں آج کل یہ لفظ مستعمل ہے اُس کی ابتدا اس طریقہ سے ہوئی کہ زار کے عہد کے حکومت میں ایک جماعت جو سوشل ڈیموکریٹ پارٹی (جمہوری سلطنت کی طرفدار جماعت) کے نام سے موسوم تھی اس غرض سے عالم وجود میں آئی کہ زار کی حکومت کا خاتمہ کر کے مارکس[۵۱] کے مجوزہ طریقہ پر ایک نئی حکومت کی بنیاد ڈالی جائے چند دنوں کے بعد اس پارٹی کے دو ٹکڑے ہو گئے جو بلحاظ تعداد بالشوک (اکثریت) اور مانشوک (اقلیت) کے نام سے مشہور ہوئے سنہ ۱۹۱۲ء کے بعد اُن کے جلسے بھی علیحدہ علیحدہ ہونے لگے لیکن دو سال کے اندر ہی بالشوک گروہ اپنے مخالف گروہ پر غالب آیا اور مانشوک جماعت کا خاتمہ ہو گیا۔

یہ پارٹی شروع سے کمیونزم[۵۲] (اشتراکیت) کی قائل اور موجودہ جمہوریت کی جگہ سوویٹ سسٹم کو رائج کرنے کی خواہشمند تھی اس جماعت کی یہ آرزو تھی کہ حکومت ایک مرکزی جماعت کے ہاتھ میں ہو جس میں صرف پختہ کار انقلاب پسند مدبر ہوں اور جنہیں غریب طبقہ کے علاوہ اور کسی جماعت سے سروکار نہ ہو۔ اس پارٹی کے خیالات بالشویزم کے نام سے موسوم ہوئے اور جب یہ پارٹی ان کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہوئی تو اس طرزِ حکومت کا نام (جو آجکل روس میں رائج ہے) بالشوزم مشہور ہو گیا۔ اس پارٹی نے عنان حکومت ہاتھ میں لیتے ہی کمیونزم کے اصولوں پر فوری عملدرآمد کرنے کی کوشش کی اور روس کے سیاسی۔ تمدنی اور اقتصادی صیغوں کو ان جدید اصولوں کے مطابق از سر نو ترتیب دیا۔ لہذا بالشویزم کی حقیقت سے پورے طور پر واقف ہونے کیلئے انقلاب کے بعد روس کے حالات جاننا ضروری ہے۔

۷ نومبر ۱۹۱۷ء کو جبکہ مملکت روس کی عنان حکومت بالشوک جماعت کے ہاتھ میں آئی اور اس جدید حکومت کا صدر لینن (LENIN) مقرر ہوا تو اُس نے سب سے پہلے یہ اعلان کیا کہ مُلک کی کل اراضی کاشتکاروں کی ملکیت ہے

---

۵۱ مشہور سوشلسٹ اور اقتصادی ریفارمر جس کی تصنیف "سرمایہ" مشہور عالم ہے۔

۵۲ ایک اقتصادی نظریہ جس کی رو سے دُنیا کی کل جنس و دولت اشتراکیت میں ہونا چاہئے تاکہ ہر شخص اُس سے بقدر ضرورت فائدہ اُٹھا سکے اس اصول کے ماتحت کسی فرد واحد کا کسی کام میں بڑا منافع نہیں ہوتا بلکہ اس منافع میں سب ہی شریک ہیں۔

اور وہ لگان وغیرہ کی قید سے آزاد ہو کر اُس کو استعمال کر سکتے ہین۔ اس کے ساتھ ہی مزدورون اور کاریگرون کے لئے صرف آٹھ گھنٹے کا دن مقرر کیا گیا۔ تمام فیکٹریون کا کل انتظام کونسل آف پبلک اکانومی کی زیر نگرانی مزدورون کے سپرد کیا گیا۔ تمام خطابات جو رُوسا و معززین کو دیے گئے تھے منسوخ کر دیے گئے۔ رائے دینے کا حق صرف انھین لوگون کو عطا کیا گیا جو خود محنت مزدوری کرتے تھے۔ اس طرح سوسائٹی کے اعلے طبقے حکومت مین حصّہ لینے سے محروم کر دیے گئے۔ مزدور پیشہ جماعت کو مُسلح رہنے کا حکم دیا گیا اور سرمایہ دارون کو ہتھیار باندھنے کی ممانعت کر دی گئی۔ سابق حکومت کے خفیہ صلح نامے تقویم پارینہ سمجھ کر منسوخ کر دیے گئے اور تمام ملکی انتظامات سوویٹس (SOVIETS) کی ایک منتخب شدہ جماعت (فیڈریشن) (FEDERATION) کے سپرد کر دیا گیا

انقلاب کی تکمیل مین جو کسر باقی رہ گئی تھی وہ اتحادیون کی مداخلت نے پوری کر دی۔ انجام وہی ہوا جو فرانسیسی انقلاب کے وقت ہوا تھا۔ بالشوک پارٹی کی حکومت اور مضبوط ہو گئی۔ تمام روس مین انتہائی جبر اور ظلم کا دور دورہ ہو گیا رعیت نے ملک کو دشمنون سے بچانے کی خاطر سب کچھ خاموشی سے برداشت کیا۔ جنگ کے دوران مین صنعت و حرفت کی طرح کاشتکاری کا انتظام بھی حکومت کے ہاتھ مین آگیا تھا۔ کاشتکارون کی ذاتی ضروریات سے جتنا غلہ بچتا تھا اُسے حکومت لیتی تھی اور عوام کے لئے غلہ کی تجارت ممنوع قرار دیدی گئی۔ ہر شخص کو اُس کی محنت کے اندازہ سے غلہ مہیا کیا جاتا تھا مثلاً جسمانی مشقت کرنے والون کو حسب ضرورت زیادہ غلہ ملتا تھا۔ سکّون کا استعمال بھی بہت کم ہو گیا اس کے علاوہ پیروان بالشوزم نے اپنی انتہائی کسر نفسی کا بھی ثبوت دیا۔ ان کے غول کے غول فرصت کے وقت لکڑیان کاٹتے۔ گاڑیون سے مال اُتارتے اور ہر قسم کی محنت کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ اُن کی تقلید مین بہت سے اور لوگ بھی اُن کی امداد کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ مزدور پیشہ جماعت کی باقاعدہ فوجین قائم ہو گئین جو خود سب کام کرنے لگین لیکن فیکٹریون اور کارخانون کے انتظام مین اس اصول کو کچھ زیادہ کامیابی نہین ہوئی اس لیے اُن کے متعلق قوانین مین مجبوراً نرمی سے کام لینا پڑا۔

یہ حالت صرف جنگ کے دوران مین قائم رہی صلح کے بعد جب اُن کے اصولون پر عمل کرنے کی کوشش کی گئی تو اُن پر پوری طور سے کاربند ہونا مشکل ہی نہین بلکہ ناممکن ثابت ہوا اور ان اصولون مین کچھ نرمی برتنے کی ضرورت ہوئی۔ چنانچہ ۸ مارچ ۱۹۲۱ء کو کمیونسٹ پارٹی کا دسوان اجلاس منعقد ہوا جس مین یہ طے پایا کہ کاشتکارون سے فاضل غلہ لینا ترک کر دیا جائے اور اسکے بجائے اُن پر ایک ٹیکس عاید کیا جائے اور غلہ کی تجارت کے متعلق بھی اُن کو پوری آزادی دیدی جائے۔ البتہ حکومت کو جس قدر غلہ کی ضرورت ہو تجارتی اشیاء کے تبادلہ مین خرید لے۔ انفرادی[ط] اُلوالعزمی کے متعلق بھی کمیونزم کو اپنے اصولون مین تبدیلی کرنا پڑی اور تھوڑے ہی

[ط] PRIVATE ENTERPRISE

عرصہ مین اُن کو معلوم ہوگیا کہ مستقل کرنسی کے بغیر حکومت کا قائم رہنا محال ہو جائیگا اُس کے لئے انفرادی ملکیت اور انفرادی حق کو تسلیم کرنا لازمی ہوگیا لہذا مُلک بھر مین فری ٹریڈ (FREE TRADE) آزادانہ تجارت جائز کر دی گئی کرنسی کے ساتھ ہی اس امر کی بھی ضرورت ہوئی کہ مُلک کی صنعت و حرفت کے انتظامات پر نظر ثانی کی جاے چنانچہ مختلف صیغون کے علیحدہ علیحدہ ٹرسٹ قائم کئے گئے۔ ان ٹرسٹون کو ابتداً حکومت کی طرف سے سامان تجارت مہیا کیا جاتا تھا لیکن اب وہ اپنا سارا سامان خود ہی بہم پہونچاتے ہین۔ حکومت ان پر صرف نگرانی رکھتی ہے روپیہ کی فراہمی کا انتظام بنکون سے کیا جاتا ہے جو سب کے سب حکومت کے ہاتھ مین ہین۔

آج کل سلطنت کا انتظام سودیٹ سسٹم پر قائم ہے ۱۹۱۷ء کے انقلاب مین یہ طریقہ حکومت نہایت کارآمد ثابت ہوا تھا اسی لئے اس کو اختیار کیا گیا۔ روسی زبان مین سودیٹ، کونسل، کو کہتے ہین ۱۹۰۵ء مین مزدور جماعت کے نمائندون کی کمیٹیان قائم ہوئی تھین جو آگے چل کر "سودیٹ" کے نام سے مشہور ہوئین روس کی حکومت کی موجودہ صورت فیڈرل (FEDERAL) ہے یعنی ملک کئی چھوٹی چھوٹی جمہوری حکومتون (REPUBLICS) پر منقسم ہے۔ خارجی امور، بیرونی تجارت اور ملک کے علاوہ اسکو کامل آزادی حاصل ہے ہر موضع قصبہ اور شہر کی جداگانہ سودیٹ قائم ہے دیہی رقبہ مین ہر سو ووٹرون کو ایک ڈیلی گیٹ منتخب کرنیکا حق حاصل ہے۔ ان موضعون کی سودیٹ کے اوپر ضلع بھر کی سودیٹس کی ایک وولسٹ (VOLOST) کانگریس ہوتی ہے جسکے ممبر ماتحت سودیٹس کے منتخب شدہ ڈیلی گیٹ ہوتے ہین۔ اس کانگریس کا سال مین ایک اجلاس ہوتا ہے جسمین ایک کارکن کمیٹی کا انتخاب عمل مین آتا ہے۔ یہی کمیٹی دیہی علاقہ کی سب سے مقتدر جماعت ہوتی ہے شہری رقبہ مین ہر ہزار باشندون کو ایک ڈیلیگیٹ منتخب کرنے کا حق حاصل ہے اور موضعون اور شہرون کی سودیٹس مل کر پھر ایک محدود حلقہ کی سودیٹ کانگریس کا انتخاب کرتی ہین لیکن اس انتخاب مین شہر اور دیہات کی سودیٹس کے اختیارات مین فرق رکھا گیا ہے۔ شہر کی سودیٹ کو تو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ ہر دو سو اشخاص پر ایک کے حساب سے ڈیلیگیٹ بھیج سکتی ہے لیکن دیہات مین ہزار ووٹرون کو ایک ڈیلی گیٹ بھیجنے کا حق ہوتا ہے۔ ان حلقون کی سودیٹ کانگریس پھر ایک اگزیکیٹو کمیٹی منتخب کرتی ہے جو اس حلقہ کی سب سے زیادہ مقتدر جماعت ہوتی ہے۔ ان حلقون کی کانگریس شہر کی سودیٹون کے ساتھ ملکر گورنمنٹ سودیٹ کا انتخاب کرتی ہے۔ یہان بھی شہر والون کو زیادہ حق حاصل ہے۔ ہر دس ہزار ووٹرون پر وہ ایک ڈیلی گیٹ کا انتخاب کرتے ہین لیکن حلقون کی کانگریس کو دس ہزار آبادی پر صرف ایک نمائندہ بھیجنے کا اختیار ہے گورنمنٹ اور کانگریس پھر شہر کی سودیٹون کے ساتھ مل کر ہر جمہوری صوبہ کی مجلس عاملہ اور مملکت روس کی سب سے بڑی یونین کانگریس کا انتخاب کرتی ہے۔ اس موقع پر بھی شہر والون کے ساتھ رعایت کی جاتی ہے کیونکہ اُن کو زیادہ حقوق حاصل ہین جنکی وجہ سے

شہر کی مزدور پیشہ آبادی کو نظام سلطنت مین زیادہ دخل مل گیا ہے لیکن اسکے ساتھہی کاشتکارون کو بھی پوری آزادی حاصل ہے کہ وہ جس طرح چاہین اپنے موضع کا انتظام کرین۔

مرکزی حکومت کا اصول بھی یہی ہے۔ روس کی سب سے بڑی قانون ساز مجلس سودیٹ کانگریس ہے اور جن دنون مین یہ مجلس اپنی نشست نہین کرتی ہے اُسکے اختیارات ایک اکزیکیٹو کمیٹی کے سپرد کردیے جاتے ہین جس کو حسب ضرورت کانگریس اور اُسکی ماتحت جماعتون کی تجاویز رد کردینے کا پورا حق حاصل ہے۔ صرف یونین کی سودیٹ کانگریس ہی اُس سے جواب طلب کرسکتی ہے۔ کانگریس کا اجلاس سال مین کم از کم ایکبار ضرور ہوتا ہے اور کمیٹی کارکن کے سال مین تین اجلاس ہوتے ہین ان اجلاسون کے درمیانی وقفہ مین اسکے اختیارات ستائیس ممبرون کی ایک پریسیڈیم کو عارضی طور پر سپرد کردیے جاتے ہین یونین کی مرکزی کمیٹی کی بھی خاص کارکن جماعت بارہ اشخاص کی ایک چھوٹی کمیٹی ہے جسکو کونسل آف پیپلز کمیسار (COUNCIL OF PEOPLES COMMISSARS) کہتے ہین جسمین پریسیڈنٹ اور وائس پریسیڈنٹ بھی شامل ہین یہی یونین کی سب سے بڑی جماعت ہے۔

ملک کے ہر محنت و مشقت کرنے والے کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ اسکی عمر اٹھارہ سال سے کم نہ ہو ووٹ دینے کا حق حاصل ہے لیکن وہ لوگ جو اُجرت دیکر غیرون سے محنت کراتے ہین یا کسی مذہبی عہدہ پر مامور ہین یا سود خواری پر زندگی بسر کرتے ہین یا روس کے سابق شاہی خاندان کے رکن ہین یا شاہی حکومت کے زمانہ مین خفیہ پولیس وغیرہ مین ملازم رہ چکے ہین ووٹ دینے کے حق سے محروم کردیے گئے ہین

روس کی اصلی طاقت وہان کی کمیونسٹ پارٹی کے ہاتھ مین ہے جو وقتاً فوقتاً اپنے اجلاس کرتی رہتی ہے جس مین اس پارٹی کی مقامی شاخون کے ڈیلی گیٹ شریک ہوتے ہین اسکے اجلاس بند کمرون مین ہوتے ہین لیکن مباحثہ کی رپورٹ شائع کردی جاتی ہے۔ تجاویز حتی الوسع اتفاق رائے سے پاس کیجاتی ہین اور اختلاف رائے کی صورت مین باہمی مصالحت کی کوشش کی جاتی ہے۔ قواعد کی پابندی مین بڑی سختی برتی جاتی ہے کسی ممبر کو کمیٹی کے باہر اپنے اختلاف رائے کے اظہار کا حق حاصل نہین ہے اس پارٹی کی تجاویز کا حکومت پر بہت اثر ہوتا ہے۔ گورنمنٹ کے ہر فعل پر کامل آزادی سے بحث کی جاتی ہے اگر کوئی اہم واقعہ ہوتا ہے یا کسی پالیسی مین کوئی تبدیلی کرنا مدنظر ہوتی ہے تو اُس پر فوراً تبادلہ خیال کرلیا جاتا ہے۔ اس طرح پارٹی کے ہر ممبر کو ملکی اُمور سے پوری واقفیت رہتی ہے اور وہ ہر معاملہ مین گورنمنٹ کا ساتھ دینے کیلئے تیار رہتے ہین۔

کمیونسٹ پارٹی فقط روس مین سودیٹ گورنمنٹ قائم کرنیسے مطمئن نہین ہے بلکہ اسکی خواہش بین الاقوامی انقلاب پیدا کرنے کی ہے۔ اسی غرض سے ۱۹۱۹ء مین "بین الاقوامی کمیونسٹ" نامی مجلس کا افتتاح کیا گیا تھا جس کی وجہ سے تمام دول یورپ مین بہت بےچینی پھیلی ہوئی ہے۔ یہ ہے بالشوزیم کا مختصر حال۔ ہمارے لئے

اس کی اہمیت صرف اس قدر ہے کہ دنیا کی تاریخ مین یہ پہلا موقعہ ہے کہ اشتراکیت کے نظریہ پر اس درجہ عمل کیا گیا ہو۔ یون تو کمیونزم کا خیال یورپ مین صدیون سے موجود ہے لیکن کبھی اسکو عملی جامہ نہین پہنایا گیا جس سے معلوم ہوتا کہ اس پر عمل درآمد کرنا کہانتک ممکن ہوسکتا ہے۔ بالشوک پارٹی نے ہی سب سے پہلے روس مین کمیونسٹ اصولون کے مطابق سلطنت کی بنیاد قائم کی۔ اس تجربہ سے ثابت ہوگیا ہے کہ جہانتک اشتراکیت کا تعلق ہے اس کا پورے طور سے نفاذ ہونا ناممکن ہے۔ اس مین شک نہین کہ روس مین سرمایہ دار بالکل پامال کردے گئے ہین اور گو عنان حکومت کمیونسٹ پارٹی کے چند افراد کے ہاتھ مین ہے تاہم ملک مین مزدور پیشہ جماعت کو کافی اقتدار حاصل ہے۔ دوسرے لوگون کو ملکی انتظام سے کوئی سروکار نہین۔ فیکٹریون اور کارخانون کے انتظامات خود اُن کے کاریگرون کے سپرد ہین اور ملک کی بڑی بڑی صنعتین حکومت کے ہاتھ مین ہین "لیبر فورسن" کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے لیکن کمیونزم کا یہین پہ خاتمہ ہوجاتا ہے۔ انفرادی اولوالعزمی کے مٹانے کی کوشش بالکل بیسود ثابت ہوئی چنانچہ آج روس مین سینکڑون دوکانین نجی اشخاص کی ہین اُن سے بیشتر کل دوکانین حکومت کی تھین لیکن اُن مین خسارہ ہوا اور وہ تجربہ ناکامیاب ثابت ہوا۔ اسیطرح اندرونی تجارت مین بھی لوگون کو کامل آزادی دینا پڑی اور فری ٹریڈ کے مسئلہ کو تسلیم کرنا پڑا لیکن کمیونزم کو سب سے بڑی شکست انفرادی املاک کے معاملہ مین ہوئی اس اصول کے بموجب دُنیا کی کل اراضی و دولت شمولیت مین رہنا چاہیئے تاکہ ہر شخص ان سے بقدر ضرورت فائدہ اٹھاسکے لیکن اس اصول کے نفاذ کی کوشش اس مین بے سود ثابت ہوئی چند دنون تک تو کاشتکارون سے فاضل غلہ لیکر حکومت رعایا مین تقسیم کردیتی تھی گویا وہ اراضی کے برائے نام مالک تھے آلات زراعت اور دیگر اشیا حکومت سے مفت ملتی تھین کاشتکارون کی لاگت نکال کر جو بچ رہتا تھا اُسکو مزدورون مین بانٹ دیا جاتا تھا پرائیوٹ تجارت ممنوع تھی لیکن یہ اصول زیادہ نہ چل سکے۔ جنگ کے اختتام کے بعد کاشتکارون مین اس سے سخت بے چینی پھیل گئی اور قوانین کی خلاف ورزی ہونے لگی۔ مجبوراً ان احکام مین ترمیم کرنی پڑی کاشتکارون کو اپنی پیداوار پر پورا اختیار دیدیا گیا گویا اب وہ اراضی اور اُس کی پیداوار کے پورے طور پر مالک ہین۔ انفرادی املاک کا مسئلہ کمیونزم کی کشتی کے لئے ایک خوفناک چٹان ثابت ہوا چونکہ ملکیت کی خواہش انسانی سرشت مین داخل ہے اس لئے اُس کے خلاف کوشش کرنا قانون فطرت سے جنگ کرنا ہے۔

نواب سعادت علیخان کی توصیف مین کہا ہے اُس کی تشبیب قابل دید ہے ۔

تشبیب قصیدہ

سختی دوران سے ایسے ہین جو ہین اہل صفا   دانۂ شبنم ہو رزق دہانِ آسیا
بہر کسب نور عرفان جوہر ذاتی ہے شرط   دیدۂ بادام کو روشن کرے کیا توتیا
پائمال خلق ہوتا ہے نہال سرکشی   انقلاب دہر نے کرتا ہے صرف بوریا
رفع ہمسایہ سے ہمسایہ کا ہو کیا انقباض   ناخن ابرو کرے عقدہ نہ پیشانی کا وا
مژدہ دل کی ہو نہ راحت مین خلل انداز چرخ   سبزۂ خوابیدہ کو افسانہ ہے آوازِ پا
غیر کے ممنون نہین ہوتے جو ہین روشن ضمیر   کب ہو آئینۂ خورشید محتاج جلا
کج طبیعت سے توقع دستگیری کی نہ رکھ   کس نے دیکھا ہے کمان کی چوب کو بنتے عصا
عرض مطلب سے ہے ارباب قناعت کو گزند   روکش تبخالہ یان لب پر ہے حرف مدعا
کب ملوث ہون کسی سے طبع جنکی پاک ہے   تر کبھی ہوتے نہ دیکھا دامن موج ہوا
مائل تزئین نہون جو کہ ہین مقبول ازل   پنجۂ خورشید تابان ہو نہ ممنون حنا

غزلیات مین اُن کا رنگ بہت دلکش ہے شکوہ الفاظ اور ترکیب بندش کے ساتھ ساتھ ایسا مضمون پیدا کر جاتے ہین جو اُن کے حصے کا ہوتا ہے. سادگی اور درد مین میر تقی میر کے قدم بقدم ہین

سورج کو دم صبح جو وہ مہ نگران تھا   مغرب پہ بھی مشرق کا منجم کو گمان تھا
وہ منھ نہ رہا اب جو دکھاؤن مین کسی کو   کیون حسرت پیری کبھی مین بھی تو جوان تھا

مزا آدم نے پایا کیا جہان سفلہ پرور کا   نہ شفقت باپ کی دیکھی نہ چین آغوش مادر کا

دیوانہ کس قدر ہے یہ موسم شباب کا   تصویر کے لبون سے ہون خواہان جواب کا
پیری مین تو معاف ہو تکلیف بندگی   ہنگام صبح وقت ہے افراط خواب کا

شغل شب تنہائی کس سے کہین ہم اپنا   دو چار گھڑی رو کر بہلاتے ہین غم اپنا

آشنائے لذّت دردِ اسیری ہون ہوسؔ   مُنھ اُجل جائے گر شکوہ کرون صیّاد کا

تُم نے ظاہر مین گلے ملنے سے انکار کیا   خواب مین ہم نے تمھین دیر تلک پیار کیا
خون کا دعویٰ نہین محشر مین بھی قاتل سے ہوسؔ   مین مکر جاؤن کا اُس نے اگر اقرار کیا

غم و رنجِ ہستی بسر ہو چکا   چلو اب وطن کو سفر ہو چکا

گو ہوسؔ یارانِ رفتہ کا بہت ماتم کیا   حق صحبت یاد کر کے جو کیا سو کم کیا
شوق دیدِ گُل کہان اور عالمِ پیری کہان   قصد سیرِ باغ ہم نے آہ بے موسم کیا

اے ہمسفران بہرِ خدا یاد دلا دو   غربت مین ہمین بھول گیا نام وطن کا

مدت شادی و غمِ دُنیا کی ہم کس سے کہین   ایک ساعت مُسکرائے عمر بھر شیون کیا

شوق خراشِ خار مرے دل مین رہگیا   پائے تلاش پہلی ہی منزل مین رہگیا

شب کو پشت بام پر بے پردہ وہ مہ پارہ تھا   جو ستارا تھا فلک پر دیدۂ نظّارہ تھا

پلک جھپکتے ہی عہد شباب خواب ہوا   ہماری عمر کو کیا جلد انقلاب ہوا

آیا تھا کون جلوہ کنان شب کو بام پر   نور قمر نثار تھا طرزِ خرام پر

مجھ گرفتارِ قفس کا کوئی دمساز نہین   ہائے بے بال و پری طاقت پرواز نہین

بیہودہ گو نہین جون جرسِ کاروان نہین   تصویر ضبط ہون مرے منھ مین زبان نہین

گو خلد مین ہے عیش و طرب پر ہزار حیف　　فکر تلاش و بیم و امید جہان نہین

دن عمر کے اپنے بھی کیا خوب گزرتے ہین　　اک نزع کی حالت ہے جینے مین نہ مرتے ہین

ناحق تو جی دیتا ہے مونس اس غم مین کہ میرا کوئی نہین　　آنکھین کھول کے دیکھ او نادان دنیا مین کسی کا کوئی نہین

یاران عدم کا شغل ہے کیا ظاہر مین تو کوئی کام نہین　　اندیشۂ فوت صبح نہین تشویش چراغ شام نہین

راہ جنون مین ہم کو مونس یہ دو ملے ہین　　آنکھون مین اشک خونین پاؤن مین آبلے ہین

کہہ باد صبا جا کے اسیرون سے قفس مین　　بھولے ہین تم آتے ہی صیاد کے بس مین

رشک گل شگفتہ ہون اب رنج چمن ہون مین　　شمع حرم چراغ دیر قشقۂ برہمن ہون مین

مثل گل باغ جہان سے خندہ زن جاتا ہون مین　　رنج غربت ہو چکا بس اب وطن جاتا ہون مین

غفلت سے دہر مین کوئی خالی بشر نہین　　اس بزم مین کسی کو کسی کی خبر نہین

کم کرو ذکر جوانی مانو پیرو بات کو　　منع ہے دن کو کہانی خواب کہنا رات کو

فراق روح سے اے جسم بے قرار نہ ہو　　عزیز اس کو نہ رکھ جس پہ اختیار نہ ہو

راحت ملک عدم یاد نہین یارون کو　　عالم آزادی کا بھولا ہے گرفتارون کو

تمھارا دھیان اب آٹھون پہر ہے　　کہو یاران رفتہ کیا خبر ہے

نیرنگ گلستان جہان سب پہ عیان ہے
یان فصل خزان ہر ورق گل میں نہان ہے

اس عالم ہستی میں شادی ہے کبھی غم ہے
کل اور ہی عالم تھا آج اور ہی عالم ہے

رہ ورسم دنیا تحیّر فزا ہے
بقا میں فنا ہے فنا میں بقا ہے

گر خراش ناوک مژگان نہیں تو کیوں مدام
ٹیس سی اٹھتی جگر کے زخم میں ہر بار ہے

نیند بھر کوئی نہ سویا مرے زندان میں کبھی
صلح اک دن نہ ہوئی دست و گریبان میں کبھی

زندان سے چھوٹنے کی ہم کو ہوس نہیں ہے
پر غم یہ ہے کہ کوئی فریادرس نہیں ہے

غیر سے ہو جو کوئی دم تری محفل خالی
دو گھڑی بیٹھ کے کر لوں میں وہاں دل خالی
یہ لطافت ہے کہ آئینہ نہیں عکس پذیر
نہیں ہر چند کہ تجھ سے کوئی محفل خالی

اے باد صبح کہنا یاران رفتگان سے
لینا خبر ہماری بچھڑے ہیں کاروان سے

دوستو مجنون سے ثابت ایسی کیا تقصیر ہے
پاؤں میں تصویر کے بھی آج تک زنجیر ہے
تاب کب لاتے ہیں باد تند کی آتش نفس
شمع کو موج نسیم صبح دم شمشیر ہے

ہوائے صحرا فضائے گلشن ضیافت عمر بے بقا ہے
مسافرو دیکھ لو تماشا سرائے فانی عجب سرا ہے

کیا ہی خوش ہو قفس آج اس کا جو گلزار میں ہے
برگ گل مرغ گرفتار کی منقار میں ہے

اب شہر میں رہنا مجھے دشوار ہوا ہے
پابوسی کا مشتاق ہر اک خار ہوا ہے

بہار میں جو کوئی نخل بوستان کاٹے — الٰہی دست ستم اُس کا باغبان کاٹے

نہیں میں خوب روشنی غم سے خالی باغ عالم میں — سحر کو دیکھ لو رخسار گُل پر اشک شبنم ہے

زاہد کا دل نہ خاطر میخوار توڑیئے — سو بار توبہ کیجئے سو بار توڑیئے
رشتہ عشق کا ہے جُدا سب سے اے ہوس — تسبیح پھینک دیجئے زنار توڑیئے

انتخاب کلام میں غزلوں کا مجموعہ ختم ہوچکا۔ انکی اکثر غزلیں میر انشا کے ردیف وقافیہ میں ہیں کیونکہ ہوس بھی نواب یمین الدولہ سعادت علی خان کے مصاحب تھے اور انشا بھی اسی سرکار سے توسل رکھتے تھے اس وجہ سے دونوں کی اکثر غزلیں ہم طرح ملتی ہیں۔ رباعیاں ہوس نے کم کہی ہیں گر جو لکھی ہیں اُن میں ایک خاص رنگ ہے

لڑکوں سے کہیں کھیل مزا دیتے ہیں — دنیا کی فنا یاد دلا دیتے ہیں
پائی جاتی ہے بے نیازی کی شان — آپ اپنے گھروندوں کو مٹا دیتے ہیں

کب پہلے تمیز نیک و بد تھی ہمکو — ماں باپ کو دی نہ تھی کہ ہم کو پالو
کس ناز سے پرورش کیا ہے تم نے — اب تھوڑی سی مہلت میں ہمیں رنج نہ دو

میر تقی میر کا آخر زمانہ ہوس نے دیکھا ہے۔ اُن کی ایک غزل کو مخمس کیا ہے ملاحظہ ہو۔

مالک نہ سکندر رہا خشکی و تری کا — حاکم نہ سلیمان ہی رہا دیو و پری کا
نیرنگ کہوں کیا میں جہان سفری کا — جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا
کل اُس پہ یہیں شور ہے اک نوحہ گری کا

یہ غمکدہ زنہار نہیں جائے اقامت — عالم ہے پریشان شدہ وادی غربت
سب زاد سفر چھوڑ کے جاتے ہیں بحسرت — آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

مرثیے بھی ہوس نے بہت کہے اور مرثیہ گوئی اُن کے خاندان میں ہمیشہ سے چلی آتی تھی۔ ان کے والد ہمیشہ اپنی مجلس میں نیا مرثیہ کہہ کر پڑھتے تھے اور تمام شعرا اس کی داد دیتے تھے۔ ہوس نے جتنے مرثیے کہے سب اپنی مجلس میں پڑھے لیکن افسوس کہ مرثیہ کا مکمل مجموعہ دستیاب نہ ہوا۔ البتہ کلیات کے ساتھ میں دو تین مرثیے شامل ہیں۔ کچھ ہوس ہی پر موقوف نہیں اہل کمال کے ساتھ زمانہ نے ایسی ہی رفاقت کی ہے۔ بہت سے

مشہور و معروف شعرا کا کلام پردۂ گمنامی میں پوشیدہ ہے۔ ہندوستان میں اُردو کی سینکڑوں انجمنیں ہیں اور بہت سی کافی سرمایہ بھی رکھتی ہیں مگر کسی کو یہ توفیق نہیں ہوتی کہ اُردو زبان کے جو خادم اس جہان سے ایسے رخصت ہو چکے ہیں کہ جنکی قبروں کا بھی آج پتہ نہیں ہے کم سے کم اُن کی یادگار میں اُن کا ایک مختصر دیوان چھپوا دے کوئی دلّی کی طرفداری میں سینہ سپر ہو رہا ہے کوئی لکھنؤ کی ترجیح کرتا ہے کوئی اردو ہندی کا جھگڑا نکال کر خوش ہو رہا ہے کوئی زبان کی ترمیم اپنی مرضی کے موافق کرنا چاہتا ہے مگر ان سے کوئی پوچھے کہ جب تم گذشتہ بزرگوں کے نقوش قدم کو مٹا رہے ہو تو سوا ے گمراہی کے تم کو اور کیا حاصل ہوگا۔

مبادیٔ نباتات

از پروفیسر جگ موہن لال چترویدی بی۔ ایس سی۔ ایل۔ ٹی۔

اس کتاب میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ نباتات کے متعلق ابتدائی معلومات جمع کی گئی ہیں۔ مثلاً بیجوں کی ساخت۔ بیجوں کا اُگنا۔ جڑوں کی قسمیں۔ پھول۔ پھل۔ پودوں کے احساسات وغیرہ اور جا بجا حسب ضرورت پودوں۔ پتیوں وغیرہ کی تصاویر دے کر ان کے متعلق ضروری باتیں بتائی ہیں جو حضرات دنیائے نباتات سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لیے اسکا مطالعہ یقیناً دلچسپ ہوگا۔
تقطیع چھوٹی قیمت عمر ملنے کا پتہ۔ مکتبۂ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ۔ حیدرآباد دکن۔

محاورات اُردو

مرتبہ پنڈت اندرجیت شرما

اس مختصر رسالہ میں لائق مرتب نے اُردو زبان کے تقریباً نو سو ایسے الفاظ اور جملے جمع کیے ہیں جو اپنی لغوی معنی کے علاوہ اصطلاح و محاورہ میں دوسرے معنی ظاہر کرتے ہیں۔ اکثر و بیشتر محاوروں کی سند میں شعرا کے اشعار نقل کرکے ان کو مستند بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہ رسالہ طلبا کے کے لیے مرتب کیا گیا ہے اور اُن ہی کے لیے مفید ہے۔ تعلیم یافتہ اصحاب کو اسکے مطالعہ سے کوئی خاص فائدہ پہنچنے کی اُمید نہیں کی جا سکتی۔ تقطیع چھوٹی قیمت مر ملنے کا پتہ۔ اسکول بکڈپو اچھیرہ ضلع میرٹھ

گورو منتر

(ازجناب سدرشن)

(۱)

آدھی رات کے وقت نوجوان اکیناتھ نے نہایت آہستہ اپنے مکان کا دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ گلی، بازار، گاؤن سب سنسان اور تاریک تھے اکیناتھ نے ایک لمحہ کیلیے رُک کر اپنے مکان کی طرف پُرشوق نگاہون سے دیکھا۔ اپنے ضعیف دادا اور دادی کا خیال کیا۔ اپنے یار دوستون کے متعلق سوچا اور اُس کی آنکھون مین آنسو بھر آئے۔ لیکن یہ پست ہمتی چند ہی لمحون کیلیے تھی جیسے بعض وقت طائر پرواز کھولتے کھولتے رُک جاتا ہے یکایک اُس نے آنسو پونچھ ڈالے اور جلد جلد قدم اُٹھاتا ہوا گاؤن سے باہر چلا گیا۔ پنجرے مین دانا پانی بھی کچھ پڑا تھا لیکن پنچھی نے کسی کا بھی خیال نہ کیا اور اُڑ گیا۔ چارون طرف بھیانک تاریکی تھی۔ دور فاصلے پر درختون کے سیاہ سایہ تلے کتون اور گیدڑون کی مدھم آوازین سنائی دیتی تھین۔ گھر مین بوڑھے والدین کی محبت آہ وزاری کر رہی تھی مگر اکیناتھ آہنی استقلال سے جھاڑیون مین اُلجھتا ہوا، گڑھون مین گرتا ہوا، اندھیرے مین پتھرون سے ٹھوکرین کھاتا ہوا آگے بڑھتا چلا جاتا تھا اور اُسے اس امر کی ذرا بھی پروا نہ تھی کہ راستہ خطرناک ہے اور شب کی تاریکی مین بلائین پوشیدہ ہو سکتی ہین۔

صبح کے وقت جب اُس کے بوڑھے دادا اور دادی کے دلخراش نالون سے گاؤن بھر مین کہرام مچا ہوا تھا، وہ کئی کوس کا فاصلہ طے کر چکا تھا اور ایک ندی کے کنارے بیٹھا اپنے پاؤن دھو رہا تھا جنھین جنگل کے کانٹون نے مجروح کر دیا تھا اُس کا جسم شب بیداری اور سفر سے چُور چُور ہو رہا تھا لیکن اُس کے خیالات اُمیدون کے آسمان مین اُڑے چلے جاتے تھے جنھین روکنے کی طاقت زمین کی کسی چیز مین نہ تھی تھوڑی دیر کے بعد وہ اُٹھا اور اپنے گاؤن کی طرف منھ کر کے کھڑا ہو گیا اُس وقت وہ اپنے گھر کی حالت کا تصور کر رہا تھا اور اُس کے مناظر تخیل کی آنکھون سے دیکھ رہا تھا۔ ہم گھر چھوڑ سکتے ہین لیکن اُس کی محبت کو دل سے بھلا دینا آسان نہین۔

اتنے مین ایک مسافر گھوڑے پر سوار اُدھر سے گزرا اور اکیناتھ کے پاس پہنچ کر رُک گیا۔ اکیناتھ نے دونون ہاتھ باندھ کر نمسکار کیا

مُسافر نے دُعا دی اور پوچھا "کہاں جاؤ گے؟"
اکیناتھ نے اپنے گاؤن کی طرف پیٹھ کر لی اور اپنے سامنے پھیلے ہوئے وسیع جنگل کی طرف اشارہ کرکے
جواب دیا "بڑی دُور"
مسافر۔ مگر کہاں؟
اکیناتھ۔ گورو کے چرنوں مین۔
مُسافر گھوڑے سے اُتر آیا اور اکیناتھ کے کندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر بولا تمھارا گورو کون ہے؟
اکیناتھ۔ پنڈت جنارون پنت۔
یہ کہہ کر اکیناتھ نے دونوں ہاتھ باندھ کر عالم خیال مین گورو کو نمسکار کیا اور سر جھکا دیا جیسے وہ فی الحقیقت گورو کے سامنے کھڑا ہو۔ مُسافر کو اکیناتھ کی عقیدت پر تعجب ہوا۔ کون جنارون پنت؟ جو دولتگڑھ کے دیوان مین
اکیناتھ۔ جی ہان! وہی جن کا آج کل دُور دُور تک ثانی نہین ہے۔ کیا آپ نے اُن کے درشن کئے ہین؟
مسافر۔ کئی مرتبہ۔ مگر وہ تو کسی کو گورومنتر نہین سکھاتے۔ مین نے اُن کے یہان کوئی چیلا نہین دیکھا۔ حیرت ہے کہ انھون نے تمھارے جیسے نوجوان کو اپنا چیلا کیسے بنا لیا۔
اکیناتھ۔ (اُداس ہوکر) اُنھون نے مجھے اپنا چیلا نہین بنایا؟
مسافر۔ ارے!
اکیناتھ۔ مگر مین نے اُنھین اپنا گرو بنا لیا۔ اب جا کر قدمون سے لپٹ جاؤن گا دیکھتا ہون کیسے کرپا نہین کرتے؟
مسافر۔ تمھاری عمر بہت کم ہے۔
اکیناتھ۔ سمجھدار کے لئے کم بھی بہت ہے۔
مسافر۔ تمھین دُنیا کا تجربہ ہے؟
اکیناتھ۔ گوروجی مہاراج کی نگاہ کرم ہوجائے تو تجربہ بھی ہوجائے گا۔
مسافر۔ یہ رستہ بڑا کٹھن ہے۔
اکیناتھ۔ ہمت ہو تو سب مشکلین آسان ہوجاتی ہین۔
مسافر۔ مگر دولتگڑھ تک کیسے پہونچو گے۔ بڑی دُور ہے۔
اکیناتھ۔ جن کے دل کو لگی ہو اُن کے لئے فاصلہ کوئی معنی نہین رکھتا
مسافر۔ کوئی گھوڑا کیون نہین لے لیتے
اکیناتھ۔ گوروجی کے پاس ننگے پاؤن جانا چاہیئے۔

مسافر نے یہ باتین نہین تو بہت خوش ہوا۔ اُس نے ایک دُنیا دیکھی تھی مگر ایسا نوجوان اُس کی نگاہ سے آجتک نہ گذرا تھا۔ یہ نوجوان نہ تھا عقیدت اور ہمت کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ اُس نے اکیناتھ کو محبت کی نظر سے دیکھا اور گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے راستے پر چلا گیا۔

(۲)

کتنی تکلیفون، کتنی مصیبتون اور کتنی جانکاہیون کے بعد نوجوان اکیناتھ دیوگڑھ پہنچا۔ اس کا اندازہ لگانا آسان نہین لیکن دیوگڑھ پہنچ کر اکیناتھ کی تمام کلفتین رفع ہو گئین۔ پیاسا ہرن پانی کی تلاش مین کتنا دوڑتا ہے کیسا پریشان ہوتا ہے اُس کا جسم تکان سے کس طرح چُور چُور ہو جاتا ہے لیکن پانی کے چشمہ شیرین کے قریب پہنچ کر اُس کی ساری تکان جاتی رہتی ہے اور وہ آن واحد مین تازہ دم ہو جاتا ہے اکیناتھ کی بھی یہی حالت تھی۔ وہ اب گورو کی نگری مین آپہنچا تھا۔ وہ جنتی خوابون کی سرزمین مین پہنچ چکا تھا۔

تیسرے پہر کا وقت تھا۔ اکیناتھ پنڈت جناردن پنت کی خدمت مین حاضر ہوا۔ اُس وقت پنڈت جی سرکاری کاغذات دیکھنے مین ہمہ تن محو تھے اکیناتھ چُپ چاپ ایک کونے مین کھڑا ہو گیا۔ عقیدتمندانہ انداز سے اپنے گورو کی طرف دیکھنے لگا۔ "یہی وہ شخص ہے جو دنیا مین رہتے ہوئے بھی دُنیا کی آلائشون سے پاک صاف ہے جو گھر بار والا ہوتے ہوئے بھی اپنے عہد کا سب سے بڑا عابد مرتاض ہے جو صرف ریاست دیوگڈھ کا دیوان ہی نہین بہادر سپاہی زبردست جرنیل اور نہایت قابل ریاضی دان بھی ہے جس کا ہندو مُسلمان دونون احترام کرتے ہین جس کے سامنے سر اُٹھانے کی بادشاہ کو بھی مجال نہین"۔ اکیناتھ کے دل و دماغ پر فخر و مسّرت کی وجدانی کیفیت طاری ہو گئی اُس کی انکھو مین آنسو بھر آئے۔ یکایک پنڈت جی نے سر اُٹھایا اور اکیناتھ کی طرف دیکھا۔ اکیناتھ کے جسم مین بجلی کی لہر دوڑ گئی۔ یہ تو وہی مسافر تھا جو اکیناتھ کو اپنے گانون کے قریب ملا تھا جو مُسکرا مُسکرا کر باتین کرتا تھا جسکی آنکھون مین من کو موہ لینے والی طاقت تھی۔ اکیناتھ دوڑ کر آگے بڑھا اور پنڈت جی کے چرنون سے لپٹ گیا اُس وقت اُسکے آنسو پنڈت جی کے پاؤن پر گر رہے تھے مگر یہ آنسو معمولی آنسو نہ تھے اکیناتھ کا پریم تھا جو گورو کے چرنون پر قربان ہو رہا تھا۔ یہ اُسکی عقیدت تھی جو اپنے دیوتا کو ریجھانے کیلئے خانۂ دل سے نکلی تھی۔

پنڈت جی نے اکیناتھ کو اپنے پاؤن پر سے اٹھایا اور سنگدل سے سنگدل آدمی کو بھی بس مین کر لینے والے انداز سے مُسکرا کر پوچھا۔ آخر کار تم یہان آ گئے۔ مگر بہت تکلیف پائی۔

اکیناتھ نے پنڈت جی کے پاؤن طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ آپکے درشن کر کے ساری تکلیف بھول گئی۔

پنڈت جی تو اب کیا ارادہ ہے ؟

ایکناتھ۔ آپ سب کچھ جانتے ہیں میں کیا کہوں ۔

پنڈت جی گورومنتر چاہتے ہو

ایکناتھ۔ یہ میری زندگی کا سب سے بڑا خواب ہے

پنڈت جی میں معمولی گرہستی ہوں مجھ سے تمہارا کیا بھلا ہوگا کسی پرم ہنس کے پاؤں کیوں نہیں پکڑتے کہ بیڑا پار ہو جائے۔

ایکناتھ میں نے سب سے بڑا پرم ہنس چن لیا اب اور کہاں جاؤں گا۔ آپ گرہستی ہیں لیکن آپ کا درجہ سادھو سنیاسیوں سے بھی بلند ہے۔

پنڈت جی۔ یہ تمہارا خیال ہے میں تو بادشاہ کا ایک ادنیٰ ملازم ہوں۔

ایکناتھ۔ لیکن میرے لئے آپ بادشاہوں کے بھی بادشاہ ہیں۔ اب مایوس نہ کیجئے بڑی دور سے آیا ہوں یہ کہکر ایکناتھ پھر جھکا اور پنڈت جی کے پاؤں سے لپٹ گیا۔ پنڈت جی لاجواب ہو گئے۔ انکسار اور محبت کے سامنے منطق و دلیل کی بھی پیش نہیں جاتی۔ رگھوگڈھ کا دیوان ایک سادہ لوح نوجوان کے سامنے چپ تھا اور نہ جانتا تھا کہ اس کا کیا جواب دے۔ آخر انھوں نے اسے پھر اٹھایا اور کہا۔ دیکھو ہمیں گورومنتر بتانے میں اعتراض نہیں لیکن اس کے لئے تمہیں اپنے آپ کو مستحق ثابت کرنا ہوگا کہو امتحان دینے کو تیار ہو؟ ایکناتھ خودداری کے انداز سے تن کر کھڑا ہو گیا مگر فوراً مودبانہ طرز سے سر جھکا کر بولا "جی ہاں بڑی خوشی سے"۔

یہ کہہ کر اس نے گورو کے پاؤں کی مٹی اٹھائی اور اپنی پیشانی پر مل لی۔ گویا یہ مٹی مٹی نہ تھی چندن کا برادہ تھی ۔

(۳)

تین سال گذر گئے ایکناتھ نے گورو جی کی خدمت میں دن رات ایک کر دیا ایسی تندہی سے کسی غلام نے اپنے آقا کی بھی خدمت کم کی ہوگی ۔ وہ گورو جی کے کپڑے دھوتا، ان کے لئے دھان کوٹتا پانی بھرتا۔ بچوں کو کھلاتا اور یہی نہیں ان کے دفتر کا سارا کام اپنے ہاتھ سے کرتا۔ گورو جی اب کاغذوں کو دیکھتے بھی نہ تھے۔ سارا سیاہ و سفید ایکناتھ کے ہاتھ میں تھا۔ ریاست کے لوگ اس کی خداداد قابلیت پر عش عش کرتے تھے یہانتک کہ بادشاہ بھی اس کا مداح تھا مگر ایکناتھ اس تعریف و ثنا سے مغرور نہیں ہوا نہ اسے کبھی خیال آیا کہ میں کسی شمار میں ہوں۔ وہ صرف یہ سمجھتا تھا کہ گورو جی امتحان لے رہے ہیں۔ کامیابی ہوئی تو جنم مرن کے پھندے سے آزاد ہو جاؤں گا۔

صبح کا وقت تھا۔ پنڈت جی اپنے مندر میں بیٹھے ایشور کا بھجن کر رہے تھے اور ایکناتھ باہر کھڑا تھا کہ کوئی مخل نہ ہو۔ اتنے میں گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ ایکناتھ ڈر گیا۔ اُسے اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ آوازیں گورو جی کے ایشور بھجن میں مخل نہ ہوں۔ اُن کا دھیان ہٹ گیا تو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا۔ وہ جلدی سے باہر نکلا کہ سوار کو صورت حال سے آگاہ کرے لیکن یہ سوار کوئی راہگیر مسافر نہ تھا۔ شاہی سوار تھا جو بادشاہ کا خاص پروانہ لے کر آیا تھا۔ ایکناتھ نے آگے بڑھ اُسے روک دیا اور آہستگی سے کہا۔ گورو جی بھجن کر رہے ہیں گھوڑے سے اُتر آؤ۔

سوار گھوڑے سے اُتر پڑا اور جیب سے ایک سر بمہر لفافہ نکال کر بولا شاہی پروانہ ہے ابھی دیوان جی کے پاس پہنچا دو۔

ایکناتھ۔ مگر وہ تو سمادھی میں ہیں۔

سوار۔ کوئی پروا نہیں۔ اُٹھا دو۔

ایکناتھ۔ یہ تو مشکل ہے کیا بہت ضروری کام ہے؟

سوار۔ اب میں تم سے کیا کہوں ضروری ہے کہ نہیں۔ جہاں پناہ کا حکم ہے۔ اسی وقت پہنچاؤ ورنہ میں پاگل تھا جو تم سے بحث کرتا۔"

ایکناتھ نے کاغذ کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور پوچھا اگر ایسی کون سی ضروری بات ہے جو ذرا بھی انتظار نہیں کر سکتے؟

سوار۔ واللہ اعلم۔ میرا کام حکم کی تعمیل کرنا ہے اب تم جا کر اطلاع کرتے ہو۔ یا میں خود جاؤں۔ بہرحال یہ پروانہ اُن کے پاس پہونچنا چاہیئے اور اسی وقت۔ ذرا سی دیر میں ریاست بھر کے لئے ......"

ایکناتھ اُن کے پاس اِس وقت کوئی نہیں جا سکتا۔ یہاں تک کہ اگر بادشاہ سلامت آجائیں تو اُن کو بھی باہر ہی رُکنا پڑے گا۔

سوار نے کچھ دیر تک کچھ سوچا اور اس کے بعد آہستہ سے کہا کہ میں تم سے صاف ہی کیوں نہ کہہ دوں۔ شہر پر کسی دشمن نے حملہ کیا ہے۔ بادشاہ سلامت یہ پروانہ بھیج کر اپنے فرض سے سبکدوش ہوگئے شہر بچے یا برباد ہو، اُن کی بلا سے اور کسی کو اس کی فکر نہیں۔ لے دے کے ایک دیوان صاحب ہیں جن کو شہر کی حفاظت کا خیال ہے اور جن کے اشارہ پر ایک ایک سپاہی مر کٹنے کو تیار ہے۔ اب تم ہی سوچ لو کہ اُن کو اسیوقت اطلاع کرنی مناسب ہے یا نہیں مگر میں اتنا کہے دیتا ہوں کہ اگر اُن کو اطلاع نہ ہوئی تو دشمن قلعہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔

یہ کہہ کر سوار چلا گیا مگر اُس کے لفظ ایکناتھ کے کانوں میں گونج رہے تھے اُس نے پروانہ دیوان صاحب کے ضروری کاغذات میں رکھ دیا اور گھٹنوں پر سر رکھ کر سوچنے لگا کہ کیا کرنا چاہیئے۔ گورو جی کو اُٹھاؤں یا نہ اُٹھاؤں سمادھی میں ہیں بادشاہوں کے بادشاہ کے دربار میں ہیں کہیں ناراض ہو جائیں، غصہ نہ آجائے اور سب کئے کرائے

بانی پھر جائے۔ ایک دن فرماتے تھے پرماتما اپنے بھگتون کے کام خود کر دیتے ہین۔ کہین گے یہ سبق تو نے کیسے بھلا دیا۔ شرمندہ ہو جاؤن گا جواب نہ دے سکون گا، اُن کے سامنے سر نہ اُٹھا سکون گا۔ تو ٹھیک ہے۔ مجھے اُن کو نہ اُٹھانا چاہیئے۔ دیکھون پردۂ غیب سے کیا ظہور مین آتا ہے؟

ایکناتھ بے فکر سا ہو گیا اور صحن مین ٹہلنے لگا۔ مگر فکر شہد کی مکھی کے مانند ہے کہ جتنا اُسے ہٹاؤ اُتنا ہی ادھر چمٹتی ہے۔ ایکناتھ کو پھر اسی خیال نے آگھیرا کہین دشمن قریب ہی نہ ہو۔ بادشاہ نے الیا ضروری پروانہ کبھی نہین بھیجا۔ ضرور دشمن قریب آچکا ہوگا۔ کہین ایسا نہ ہو کہ مین اُن کی حفاظت ہی کرتا رہون اور شہر پر دشمن کا قبضہ ہو جاے۔ اُس وقت گوروجی کے دل کی کیا حالت ہوگی۔ بہت خفا ہون گے۔ کہین گے تجھے اتنی بھی تمیز نہین کہ وقت کو پہچان سکے۔ ہم سمادھی مین بیٹھے رہے۔ اُدھر شہر کی صفائی ہو گئی۔ اس کا ذمہ دار تو ہے جس نے ایسی حماقت کی۔ ایکناتھ تذبذب کی حالت مین تھا۔ کبھی سوچتا اُٹھا دینا چاہیئے۔ وقت کا یہی تقاضا ہے۔ کبھی سوچتا نہین اُٹھانا چاہیئے خفا ہو جائین گے۔ وہ دونون طرف دیکھتا تھا۔ مگر اُسے دونون طرف تاریکی نظر آتی تھی کہین بھی روشنی نہ تھی۔ وہ پس و پیش کے عالم مین اِدھر اُدھر پھر رہا تھا۔ اُس کی ایسی حالت آج تک کبھی نہ ہوئی تھی۔ اپنے ارد گرد سیاہ سانپون کو پھنکارین مارتے دیکھ کر بھی اُس کا حوصلہ پست نہ ہوتا مگر اُس وقت وہ بے حد پریشان تھا۔ اُس کی پیشانی سے پسینہ کے قطرے ٹپک رہے تھے اُس کے چہرے کا رنگ لحظہ لحظہ متغیر ہو رہا تھا جیسے یہ اُس کی زندگی اور موت کا سوال تھا۔ اِس وقت اُس کو کون بچا سکتا ہے اِس نااُمیدی کے دریا سے کون اُسکی بانھہ پکڑ کر پار لگا سکتا ہے سوائے گورو کے اور کوئی نہین۔ اور گوروجی دُاس نے اُن کی طرف دیکھا: ابھی تک اسیطرح آنکھین بند کئے بیٹھے تھے۔ ایکناتھ زمین پر گر پڑا اور پھوٹ پھوٹ کر رویا لیکن اس سے کچھ حاصل نہ ہوا۔ وقت تیزی سے اُڑا چلا جا رہا تھا۔

اتنے مین قلعہ کے باہر دشمن کی توپین گرجنے لگین۔ ایکناتھ کا زرد چہرہ اور بھی زرد ہو گیا۔ سوچنے کا وقت تھا کام کرنے کا وقت تھا ایک لحظہ مین اِدھر یا اُدھر۔ ایکناتھ نے اپنے دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھا۔ اپنے غور و فکر کی قوت کو یکجا کیا۔ ایک منٹ کیلیئے سر جھکایا اور فیصلہ کر لیا۔ دس منٹ بعد وہ گوروجی کا جنگی لباس پہنے اُن کے جنگی گھوڑے پر سوار تھا اور دیوگڈھ کے سپاہی اُس کے پیچھے "بم بم مہادیو" کہتے ہوئے قلعہ کے دروازے سے باہر نکل رہے تھے۔ ایکناتھ لڑا اور فتح یاب ہوا اور دشمن کو بھگا کر واپس آگیا لیکن اُس وقت یہ کسی کو بھی علم نہ ہوا کہ یہ ایکناتھ ہے پنت جی نہین ہین۔ ایکناتھ نے جلدی سے گھوڑا اصطبل مین باندھ دیا۔ زرہ بکتر اتاری اور اپنے زرد رنگ کے کپڑے پہن کر چپ چاپ اپنی جگہ پر آبیٹھا جیسے کچھ ہوا ہی نہین۔

(۴)

تھوڑی دیر کے بعد گوروجی کی سمادھی کھلی اور وہ باہر نکلے۔ وہان ہر ایک کی زبان پر اسی واقعہ کا ذکر تھا

ئے تھے آج دیوان صاحب نے کمال کیا۔ اُن کی تلوار اِس طرح چلتی تھی جیسے قینچی کپڑے پر چلتی ہے دشمن
راق سے آیا تھا گویا دیوگڈہ مین سپاہی نہین بستے جانور بستے ہین لیکن دیوان صاحب نے اُن کے
ئے کر دیئے۔ دیوان صاحب حیران تھے کہ یہ کہتے کیا ہین کون آیا کس نے حملہ کیا کس نے دانت کھٹے کئے
ی بات کا بھی علم نہ تھا اس حیرت مین آگے بڑھے چلے جاتے تھو کہ ایک جگہ چند آدمی کچھ باتین کرتے نظر آئے
صاحب اُن کے پیچھے کھڑے ہو گئے اور سُننے لگے۔
آدمی کہہ رہا تھا آج تو دیوان صاحب کی پھُرتی اور چُستی و چالاکی قابل دید تھی۔
را۔ ہم جوان ہین مگر ہم مین بھی اُتنا جوش نہ ہوگا۔ غضب کا آدمی ہے۔
ا۔ آدمی۔ اُنھین آدمی کون کہتا ہے؟ کوئی رشی ہین۔ گنہگار آدمیون مین یہ طاقت کہان۔ جوانی اور بڑھاپا
اُن کے اختیار مین ہے۔ جب چاہین بُڈھے بن جائین جب چاہیں جوان ہو جائین
یا (مُسلمان تھا) وہ سنجیدگی سے بولا ضرور ضرور ولی اللہ ہین۔ آج بالکل نوعمر معلوم ہوتے تھے وہ بڑھاپا
نظر بھی نہ آتا تھا۔
را۔ اور جناب ہم تو دیکھ رہے تھے۔ دشمن اُن کو دیکھتے ہی حواس باختہ ہو گئے جیسے کسی نے منتر پڑھ کر
نہ چھین لی ہو۔
ا۔ آنکھون سے آگ نکلتی تھی۔ خدا رسیدہ بزرگون کی یہی علامتین ہین جس کی طرف دیکھ لیتے ہین
بس ہین ہو جاتا ہے۔ کچھ کرنا چاہے جب بھی نہین کر سکتا۔
را۔ اور اُن کا گھوڑا کیسا اُڑتا چلا جاتا تھا۔ یہ شاید آپ نے نہین دیکھا۔
را۔ خوب دیکھا صرف دو گھنٹے کے عرصہ مین دشمن میدان چھوڑ بھاگا۔ بڑی تیاری کر کے آیا تھا۔
ا۔ اب کبھی اِدہر کا رُخ بھی نہ کرے گا۔
را۔ سمجھتا ہوگا۔ بادشاہ عیاش ہے فتح کرلون گا۔ مگر یہ معلوم نہ تھا کہ دیوان صاحب کا سامنا ہے۔ کیسا بھاگا؟
را۔ اچھا سبق ملا۔ ساری عمر یاد رکھے گا۔ مگر ایک بات اور بھی سُننے مین آتی ہے۔
تھا۔ کیا؟
را۔ بعض آدمی کہتے ہین جب وہ دشمن سے لڑ رہے تھے اُسوقت ہم نے اُنھین سبھا ہی مین بیٹھے دیکھا ہے۔
تھا۔ ہان ہان! سُنا تو ہم نے بھی ہے۔
دوسرا (حیرت سے) ایک ہی وقت مین دو جگہ! یہان بھی، وہان بھی!! عجیب بات ہے۔"
تھا۔ بھئی جن کی پیٹھ پر خدا کا ہاتھ ہو اُس کے لئے کچھ بھی عجیب نہین ہے۔ وہ جو چاہے کر دے، وہ چاہے تو

تم ابھی ہوا مین اڑنے لگو۔ ہم منہ دیکھتے ہی رہ جائین۔ خدا کی دین ہے۔

پہلا۔ اور کیا۔ ورنہ ایسا کبھی ہو سکتا تھا ؟

دوسرا۔ یہ دیوان نہین شہر کا محافظ ہے۔

یکایک ایک آدمی نے پیچھے مڑکر دیکھا اور دوسرون کو دکھایا۔ تو سب سناٹے مین آ گئے۔ یہ کیا، دیوان صاحب چلے جا رہے ہین۔ ایک بولا۔ لو یہ بھی دیکھ لو۔ شکل بدل کر ہم مین کھڑے تھے۔ اب اپنی اصلی صورت مین جا رہے ہین۔ ہم نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ مہاراج جو چاہین کر سکتے ہین۔ عجب نہین جو اب بھی کسی کی صورت مین کھڑے ہون۔

دیوان صاحب سب کچھ سمجھ گئے۔ یہ کام اکیناتھ کے سوائے کسی دوسرے کا نہین ہو سکتا۔ ضرور اسی نے ہمارا لباس پہنا اور دشمن کو بھگا کر لوٹ آیا۔ یہ لڑکا کتنا سمجھدار ہے، کتنا بہادر۔ بادشاہ کا پروانہ آیا ہوگا ہم سمادھی مین تھے۔ ہمین نہین اٹھایا، خود لڑنے چلا گیا۔ کوئی بیوقوف بے پرواہ گرید ہوتا۔ تو کہتا، شہر تباہ ہوتا ہے تو ہوا کرے، ہمین کیا۔ بیٹھے گورو کے حکم کی تعمیل کر رہے ہین۔ پنڈت جی نے مندر مین پہنچتے ہی اکیناتھ کو گلے لگا لیا اور کہا تو نے میری لاج رکھ لی۔ ایکناتھ بار بار قدمون پر جھکتا تھا اور کہتا تھا آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہین مین نے تو کچھ بھی نہین کیا۔

پنڈت جی نے اسے محبت کی نگاہون سے دیکھا جیسے باپ بیٹے کو دیکھتا ہے اور کہا۔ تمھاری بہادری کی لوگ بڑی تعریف کرتے ہین۔ مجھے یہ معلوم بھی نہ تھا کہ تم تلوار کے بھی دھنی ہو۔

اکیناتھ۔ یہ سب آپکی دعا ہے، ورنہ میرے بازؤن مین ایسی طاقت کبھی نہ تھی۔

پنڈت جی۔ لوگون کو شبہ تک نہین ہوا کہ تم ہو مین نہین ہون۔

اکیناتھ۔ مہاراج! یہ سب آپ ہی کی بدولت ہے۔ ورنہ مین کس قابل تھا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ مین نے آپکا لباس پہنا اور گھوڑے پر سوار ہوا۔ اِس کے بعد کیا ہوا مجھے خبر نہین۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی غیبی طاقت مجھے اڑائے لئے جاتی ہے جیسے مین اپنے آپ مین نہ تھا۔ یقیناً آپ کی طاقت میرے بدن مین آ گئی تھی ورنہ یہ فتح کبھی حاصل نہ ہوتی جسم میرا تھا طاقت آپ کی تھی۔

پنڈت جی۔ لوگ ابھی تک یہی سمجھتے ہین کہ یہ مین ہی تھا۔

اکیناتھ۔ خود میرا بھی یہی خیال ہے کہ آپنے مجھے اپنا ذریعہ بنا لیا۔

عقیدتمندی کا یہ انتہائی جذبہ دیکھ کر پنڈت جی آبدیدہ ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد بولے۔ بیٹا! مین اب بڈھا ہو گیا۔ میرے لئے یہ ذمہ داری کا کام اب مشکل ہوتا جاتا ہے۔ مین چاہتا ہون۔ اب چار دن

آرام کرون - دیوان کا کام تم سنبھالو - مجھے چھٹی دو آج کے واقعہ نے میری آنکھیں کھول دی ہیں - مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم اس عہدے کے پورے اہل ہو - بادشاہ سلامت کو اس مین ذرا بھی اعتراض نہ ہوگا - میرا جا کر دو لفظ کہدینا ہی کافی ہے - وہ فوراً منظوری دیدین گے - کہو جا کر کہدون ؟

ایک ناتھ کی آنکھون مین آنسو آ گئے، اُس نے دونون ہاتھ باندہ لئے جیسے کوئی قصور ہو گیا ہو وہ زمین پر گر پڑا اور نہایت انکساری سے بولا - مجھے کچھ نہین چاہیئے - صرف آپ کے قدمون مین پڑا ہون میرے لئے یہی سب کچھ ہے -

پنڈت جی، ایکناتھ کا مطلب سمجھ گئے، مگر خاموش رہے ابھی ایک مرحلہ اور باقی تھا اور چند دن بعد وہ مرحلہ بھی طے ہو گیا

(۵)

صبح کا وقت تھا - ایکناتھ پنڈت جی کے نہانے کیلئے پانی بھر رہا تھا - اتنے مین پنڈت جی کھڑاؤن پہنے ہوئے آئے اور مسکرا کر بولے - بیٹا ایکناتھ ! کل نئے سال کا پہلا دن ہے - اس سال کا تمام حساب تیار کرلو - وقت تھوڑا ہے - صرف آج کا دن اور آج کی رات مگر تمھارے جیسے قابل نوجوانون کیلئے یہ کام چندان مشکل نہین -

ایک ناتھ نے پانی کا گھڑا ہاتھ سے رکھ دیا -

پنڈت جی - بادشاہ سلامت کل حساب دیکھین گے - طیار ہو جائیگا یا نہین - اگر تمھین شک ہو تو مین بھی جاؤن ؟

ایکناتھ - (آہستہ سے) مین کرلون گا -

پنڈت جی - تو جاؤ - وقت کم ہے -

ایکناتھ نے ہاتھ باندھ کر نمسکار کیا اور دفتر پہنچ کر حساب کتاب دیکھنے لگا - کام معمولی نہ تھا - تمام سال کا حساب تھا اور وہ بھی کسی ساہوکار کا نہین ایک ریاست کا - مگر ایکناتھ کے دل مین ذرا بھی گھبراہٹ نہ تھی نہ چہرے پر پریشانی تھی - اُس نے کتابون کا ڈھیر سامنے رکھ لیا اور پالتی مار کر بیٹھ گیا - سورج آسمان پر آہستہ آہستہ بلند ہوا اور پھر عین سر پر پہنچ گیا - مگر ایکناتھ اسیطرح بیٹھا حساب دیکھتا رہا - شام ہو گئی مگر ایکناتھ کو خبر نہ تھی، اُسکے سامنے صرف یہ سوال تھا کہ کام ختم کرنا ہے - نوکر آکر دیا جلا گیا - ایکناتھ کام کرتا رہا - اُسے کھانے پینے کی سُدھ نہ تھی - نہ سونے کا خیال تھا - خیال یہ تھا کہ کسی طرح کام ختم ہو جائے ورنہ بادشاہ کے سامنے گورو جی کا سر جھک جائے گا -

آدھی رات گذر گئی ایکناتھ نے سارا حساب کتاب ختم کر لیا - سب کچھ ٹھیک تھا صرف ایک پیسے کا

فرق تھا۔ ایکناتھ کے تیور بدل گئے سوچنے لگا کیا اب کئے کرائے پر پانی پھر جائیگا۔ بڑی بڑی رقوم کی از سرِ نو میزان دی پھر بھی وہی فرق۔ پھر حساب کیا، مگر نتیجہ وہی، ایک پیسہ کا فرق جوں کا توں موجود تھا۔ ایکناتھ گھبرا گیا آدھی رات سے زیادہ گذر چکی تھی چاروں طرف سناٹا تھا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں چین کی نیند سو رہے تھے مگر ایکناتھ شمع دان کے سامنے بیٹھا حساب کتاب کر رہا تھا اور ایک پیسہ کی غلطی کہاں ہے یہ نہ سمجھ سکتا تھا

پچھلے پہر کے قریب پنڈت جنارون کی آنکھ کھلی دریچہ سے دیکھا دفتر میں ابھی تک روشنی ہے سمجھ گئے ایکناتھ جاگتا ہے۔ وہ آہستہ سے اُٹھے اور مکان کا دروازہ کھول کر باہر آ گئے۔ دفتر کے باہر چوکیدار سو گیا تھا۔ ایکناتھ جاگتا تھا۔ پنڈت جی نے آہستہ سے کہا۔ ایک ناتھ!

لیکن ایک ناتھ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اپنے حساب کتاب میں ہمہ تن محو تھا۔

پنڈت جی نے پھر پکار کر کہا۔ ایک ناتھ!"

ایکناتھ نے کچھ نہیں سُنا۔

پنڈت جی اور آگے بڑھے اور قدرے زور سے بولے ایک ناتھ!

مگر جواب میں وہی خاموشی طاری تھی۔ جیسے ایکناتھ اس دنیا ہی میں نہ تھا۔

پنڈت جی کو تعجب ہوا، وہ اور آگے بڑھے اور شمع دان کے آگے اس طرح کھڑے ہو گئے کہ ان کے جسم کا سایہ ایکناتھ کی کتاب پر پڑا مگر ایکناتھ کو اب بھی خبر نہیں ہوئی۔ اس کے لئے کتاب کے حروف اسیطرح روشن تھے۔ اس کی آنکھیں کتاب پر تھیں اور بائیں ہاتھ کا انگوٹھا ہاتھ کی دوسری انگلیوں پر حرکت کر رہا تھا اسیطرح آدھ گھنٹے کے قریب گذر گیا

یکایک ایکناتھ کو اپنی غلطی کا پتہ لگ گیا اور اس نے مسرت کا نعرہ مار کر آمدنی خرچ برابر کر دیا۔ اس کے بعد اس نے کتاب بند کر دی اور دونوں ہاتھ ملا کر اوپر اُٹھائے اور جماہی لینے لگا۔ ناگاہ اس کی نظر پنڈت جی کی طرف اُٹھ گئی وہ گھبرا کر آگے بڑھا اور پنڈت جی کے پاؤں پر جھک گیا۔ پنڈت جی نے پوچھا حساب کتاب ہو گیا

ایکناتھ۔ جی ہاں! آپ کیسے آئے؟"

پنڈت جی۔ ہم یہاں بڑی دیر سے کھڑے ہیں۔

ایکناتھ۔ چونک پڑا۔ پنڈت جی نے کہا ہم نے تمھیں کئی آوازیں دیں مگر تم نے ایک کا بھی جواب نہ دیا
ایکناتھ نے سر جھکا کر کہا میں نے ایک بھی آواز نہیں سُنی۔

پنڈت جی۔ ہمارا سایہ کتاب پر پڑ رہا تھا تمھیں یہ بھی معلوم ہوا۔

ایکناتھ (ہاتھ باندھ کر) اب کیا عرض کروں مجھے شبہ تک نہیں ہوا کہ کوئی یہاں کھڑا ہے

پنڈت جی کھڑے تھے بیٹھ گئے اور ایکناتھ کے چہرے کی طرف دیکھ کر بولے کل صبح سے اسیطرح بیٹھے تھے کیا؟

ایکناتھ۔ جی ہاں اسی طرح۔

پنڈت جی۔ کچھ کھایا پیا بھی یا نہیں؟

ایکناتھ۔ جی نہیں۔

پنڈت جی۔ نیند بھی نہیں آئی۔

ایکناتھ۔ ذرا بھی نہیں۔

پنڈت جی۔ اسوقت کیا کر رہے تھے۔

ایکناتھ۔ ایک پیسے کا فرق پڑتا تھا۔ اُسے نکال رہا تھا۔ بڑی مشکل سے پتہ چلا۔

پنڈت جی۔ ایک پیسہ کیلئے اتنی مغزپچی کیوں کی معمولی بات تھی؟

ایکناتھ۔ مگر مہاراج غلطی آخر غلطی ہے خواہ پیسہ کی ہو خواہ لاکھ روپے کی

پنڈت جی کا چہرہ مسرت کے نور سے چمکنے لگا۔ نہایت سنجیدگی سے بولے۔ بیٹا! تو نے مجھے خوش کر دیا۔ میرا امتحان بڑا سخت تھا۔ بڑے بڑے سادھو سنت بھی اس میں کامیاب نہ ہو سکتے۔ مگر تو سب میں کامیاب ہوا۔ تو نے کالے کوسوں کا سفر پیدل طے کیا اور ثابت کر دیا کہ تیرا سینہ عقیدت کا لازوال خزینہ ہے تو نے دن رات میری خدمت کی اور ثابت کیا کہ تجھ میں سیوا بھاؤ ہے۔ تو نے میدان جنگ میں فتح پائی جو دلیل اس امر کی ہے کہ تو سرفروش اور جانباز بھی ہے اور پھر دیوان کے عہدے کو ٹھکرا دیا۔ کوئی بوالہوس اس عہدے کے لئے اپنی زندگی بھر کی کمائی لٹانے سے بھی دریغ نہ کرتا۔ یہ ترک دنیا آسان نہیں لیکن میں نے تجھے اس وقت بھی گورو منتر نہ سکھایا کیونکہ ابھی ایک امتحان باقی تھا آج وہ بھی ختم ہو گیا میں نے دیکھنا چاہا تھا کہ تجھ میں یکسوئی کی طاقت ہے یا نہیں۔ میں آیا، میں نے آوازیں دیں میں نے روشنی روک لی لیکن تجھے خبر بھی نہ ہوئی۔ اب مجھے کوئی اعتراض نہیں میں تجھے گورو منتر سکھانے کو تیار ہوں۔

اس وقت ایکناتھ کے چہرے پر ایسی روشنی تھی جو اس فانی دنیا میں شاذ ہی نظر آتی ہے۔ آج وہ امتحان میں کامیاب ہوا ہے آج اسکی برسوں کی محنت ٹھکانے لگی ہے

پنڈت جی نے سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا اور مجھے یہ بھی امید ہے کہ تو جس نے ایک پیسہ کی حقیر رقم کے لئے اپنا اتنا وقت قربان کیا ہے۔ ایشور بھگتی کے راستہ پر چلتے ہوئے

اس اصول کو یاد رکھے گا اور روحانی دنیا کی حقیر سی حقیر برائی کو بھی نظر انداز نہ کرے گا۔ جا اس وقت آرام کر کل میں تجھے روشنی اور پاکیزگی اور ابدی زندگی کی شاہراہ پر چلنے کی ہدایتیں دوں گا۔
ایک ناتھ کا چہرا اور بھی چمکنے لگا

فیروز اللغات عربی

لاہور کے مولوی فیروز الدین صاحب مولف "فیروز اللغات اردو" کی ایک مبسوط لغت مرتب کرنے کی بنا پر علمی و ادبی دنیا میں کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ یہ لغت بھی آپ ہی کی مرتب کی ہوئی ہے۔ اسمیں انگریزی لغات کے اصول پر رائج الوقت عربی زبان کے تقریباً سونہ ہزار الفاظ کے معنی اُردو میں درج ہیں۔ عربی زبان کے طلباء کے لیے یہ لغت یقیناً کار آمد ہوگی۔ اور عربی کی قدیم ضخیم لغات کے مقابلہ میں اسمیں الفاظ کے معنی دیکھنے میں آسانی ہوگی۔ اسکی لکھائی چھپائی صاف اور کتاب مجلد ہے۔ حجم ۴۰۴ صفحات قیمت سے ر۔

مخزن ادب

مخزن ادب، درحقیقت اسم باسمیٰ ہے۔ خان بہادر شیخ عبدالقادر صاحب بالقابہ سابق اڈیٹر مخزن اپنے صحیح ذوق علمی و ادبی کی بدولت دنیا، ادب میں ایک لازوال شہرت و عزت کے مالک ہیں اس مجموعہ میں "مخزن" کے منتخب مضامین کتابی صورت میں پیش کئے گئے ہیں۔ جنمیں زیادہ مضامین خود شیخ صاحب کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔ باقی مختلف اہل قلم کے ہیں۔ آخر میں نظمیں اور غزلیں بھی ہیں۔ جو سر اقبال۔ مولانا حسرت موہانی۔ جناب سرور جہان آبادی مرحوم۔ حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم۔ سید نیرنگ۔ آغا شاعر وغیرہ مشاہیر شعراء کے رشحات افکار ہیں۔ شروع میں شیخ عبدالقادر صاحب بالقابہ کی تصویر اور مختصر سوانح عمری بھی ہے۔ غرض مختلف اہل قلم و سخنگو طبائع کے افکار عالیہ اس مجموعہ میں موجود ہیں جو اس قابل ہیں کہ ہر وہ شخص جسکو اُردو زبان سے دلچسپی ہو ان کے مطالعہ سے مستفید ہو۔ اسکا حجم ۲۵۶ صفحات کتابت و طباعت عمدہ کتاب مجلد قیمت سے ر۔

دونوں کتابوں کے ملنے کا پتہ۔ مولوی فیروز الدین اینڈ سنس۔ سرکلر روڈ۔ لاہور۔

تنقید کتب

مضامین چکبست[1]

(از جناب پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی بی اے دہلوی)

"لیکن باوجود ان اُمنگوں کے ہمارے قدیم شاعروں کے مذاق سخن کے آئینے پر بہت کچھ مصنوعی شاعری کا گرد و غبار جم گیا۔ اُنکا دامن اکثر غیر پاکیزہ خیالات و جذبات کے کانٹوں میں اُلجھکر رہ گیا" (صفحہ ۲۶)

"ہم دیکھتے ہیں کہ اب بیسویں صدی کے آغاز میں جب کہ انگریزی تہذیب کا سکّہ ہمارے اوپر چل رہا ہے۔ جبکہ مغربی قومیں اتحاد اور جمہوری اُصولوں کی ترقی کی بدولت روئے زمین کا نقشہ بدلتی جاتی ہیں ہماری مبارک سرزمین پر ایسی خدا کی مخلوق انسان کی شکل میں موجود ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ ہندو مسلمانوں کا پولیٹکل اتحاد ایک امر محال ہے اور جسکے مذہب میں ایکدوسرے کا گلا کاٹنا ثواب میں داخل ہے" (صفحہ ۲۸۳)

"مایوسی کا کوئی مقام نہیں ہے۔ سچائی اور نیک نیتی کی قوتوں کو دنیا میں ہمیشہ فتح ہوئی ہے عارضی ناکامیاں مردوں کا دل نہیں توڑ سکتیں" (صفحہ ۲۸۹)

(چکبست مرحوم)

ایسا کم ہوتا ہے کہ ایک شخص نظم میں حسن شگفتگی، تازگی، عالی خیالی اور معنی آفرینی کا مالک ہو وہی اوصاف اُسکی نثر کا بھی جوہر ہوں، آجکل اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض لوگ نظم تو اچھی خاصی لکھتے ہیں لیکن نثر لکھتے وقت مجسم معما ہو جاتے ہیں۔ ایسی سلجھی ہوئی، خوش اسلوب، سلیس اور

---

[1] "کلام چکبست" کے بعد "مضامین چکبست" کو شایع کرکے انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد نے اردو ادب کی بیش بہا خدمت کی ہے۔ کتابت و طباعت نفیس اور کاغذ عمدہ ہے۔ حجم ۴۴۳ صفحات بڑی تقطیع۔ قیمت عہ

پر مغز نثر آج کل کے انشا پردازوں کے قلم سے کم نکلتی ہے۔

تاریخی ترتیب سے دیکھئے تو اس مجموعے کا اولین مضمون سنہ ۱۹۰۵ء کا لکھا ہوا ہے جسکا موضوع "نسیم لکھنوی" ہے۔ سب سے آخری مضمون سنہ ۱۹۱۸ء کا لکھا ہوا ہے جسکا موضوع ہے "اُردو شاعری" اگرچہ چند ہی مضامین مصنف مرحوم نے غیر ادبی موضوع پر لکھے جیسے "ذات کی تفریق" وغیرہ لیکن اُنکی مضمون نگاری کی ابتدا اور انتہا ادبی نوعیت کی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ چکبست مرحوم اُن برگزیدہ اصحاب میں سے تھے جنکا مذہب ادب اور شعر ہے۔ اس مجموعے میں اکثر کوائف ایسے درج ہیں جو اُن بزرگوں کے ساتھ ہی رہگراے عدم ہو جاتے جن سے اُنکا تعلق ہے اگر مرحوم اُنھیں ضبط تحریر میں نہ لاتے مثلاً "اودھ پنچ اور اُسکے معرکے" اور منشی سجاد حسین برق لکھنوی۔ مرزا پچھو بیگ۔ پنڈت لچھمی رام سرور وغیرہ کے حالات زندگی اور اُن کی ادبی خدمات"

جو شگفتگی اور تازگی چکبست کے کلام منظوم کے محاسن میں داخل ہے وہی اوصاف انکی نثر میں بھی نمایاں ہیں۔ جو شخص حیات وممات جیسے اہم حوادث ہستی نہایت سادہ اور سہل الفہم الفاظ میں نظم کرسکتا ہے جیسے یہ شعر ہے:-

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

وہ نثر میں کیونکر ژولیدہ بیاں اور مغلق ہو سکتا ہے۔ اُن کی نثر سادگی اور سلاست کے ساتھ نہایت فصیح اور دلاویز ہوتی ہے۔ تحقیق و تلاش کی یہ کیفیت ہے کہ اُنکا استدلال فریق مخالف کو ساکت کر دیتا ہے۔ اس مجموعے میں کئی ایسے معرکۃ الآرا مضمون ہیں جنھوں نے ادبی دنیا میں مرحوم کی ادبی دانست اور معقولیت کا سکہ بٹھا دیا۔ یہ خصوصیت کم ناثروں کو نصیب ہوئی ہے کہ اُن کی انشا فصیح و بلیغ ہونے کے علاوہ مباحثہ میں دلوں پر اثر کرنیوالی ہو۔ گلزار نسیم کے تصفیہ کو جانے دیجئے۔ اُردو شاعری اور تاریخ جیسے اہم موضوع پر جو کچھ لکھا کس خوبی اور معقولیت سے لکھا ہے۔ آج کوئی ان موضوعات پر لکھنے بیٹھے تو غرابت اور اغلاق سے اپنی تحریر کو گراں بار کر دے

چکبست کی نثر مولوی عبدالحق کی معقولیت۔ شبلی کی تحقیق و تدقیق۔ مولانا سلیم مرحوم کی روانی، اور آزاد کی فصاحت و بلاغت کا نچوڑ ہے۔ آگے کہا گیا ہے کہ چکبست کا مذہب ادب تھا۔ ادب کے عشق کا جذبہ جوش پر آتا ہے تو جو کچھ وہ کہتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ آزادی کی آواز ہے کہ جنت سے آرہی ہے۔ دیکھئے:-

"اللہ اللہ اردو شاعری نے بھی کیا کیا رنگ دیکھے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ میر و سودا کے آغوش ناز میں اس نے پرورش پائی۔ ایک وہ زمانہ آیا کہ آتش و غالب و ذوق وغیرہ نے اسکے شباب کی بہار دیکھی۔ اب آخر وقت میں اسکے مٹے ہوئے حسن کے چراغ سحری کی روشنی سے داغ نے آنکھیں سینکیں۔ لیکن آج اسکے آخری عاشق زار (داغ) کے ساتھ اس شاعری کا بھی خاتمہ ہوگیا اب دیکھئے کون مسیحا نفس پیدا ہو جو اردو شاعری کی مردہ ہڈیوں میں نئی روح پھونکے اور زمانے کے رنگ سے اس کے پیراہن کو رنگے۔" (صفحہ ۱۰۱)

یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ ایک شخص جہاں پیدا ہوا ہو۔ تعلیم و تربیت پائی ہو۔ اور عمر بھر رہا ہو وہاں کی محبت سے اسکا دل معمور ہوگا۔ ذوق کا یہ کہنا ع

کون جائے ذوق پر دلّی کی گلیاں چھوڑ کر

دلّی سے اُسکی عصبیت ثابت کرتا ہے۔ رہا تعصب مقامی اُس سے چکبست کا دل و دماغ پاک تھا جو سطریں ابھی اقتباس کی گئی ہیں آپ سمجھے وہ کس سے تعلق رکھتی ہیں اُنکے ساتھ وہ مضمون ختم ہوتا ہے جو مرزا داغ کی یادگار میں لکھا گیا۔ اگر مصنف کا دل لکھنوی اور غیر لکھنوی کے تعصب سے ملوث ہوتا تو کہیں یہ فقرے اُسکے قلم سے نکل سکتے تھے؟ اس مضمون کے شروع میں اصول شاعری سے جو فلسفیانہ بحث کی گئی ہے وہ اکثر اہل دہلی کو ناپسند ہوئی ہوگی اسی طرح آخر میں جو موازنہ داغ اور امیر کا کیا ہے اُسکو اہل لکھنؤ نے پسند نہ کیا ہوگا۔ لیکن شاعری کے جو اصول چکبست نے قائم کئے اُن کی تردید کوئی نہ کر سکا۔ افراط و تفریط سے قطع نظر اُنکو ماننے بغیر چارہ نہیں۔

تاریخ والے مضمون میں جو درجہ چکبست نے آزاد مرحوم کے دربار اکبری کو دیا ہے اور جس معرفانہ لہجے اور عقیدتمندانہ انداز سے آبحیات کا ذکر کرتے ہیں بیّن ثبوت اس امر کا ہے کہ مقامی تعصب جو ہمارے ادب اور شاعری کو سخت نقصان پہنچا رہا ہے مصنف سے کوسوں دور تھا ہاں لکھنؤ سے اُسے عشق تھا ایک جگہ لکھا ہے:-

"لکھنؤ کی اس مٹی ہوئی حالت پر بھی ایک عالم ہے۔ اس شہر مرحوم کے باشندوں کا طرز معاشرت اسکی گزشتہ عظمت کی یاد دلاتا ہے۔ اور دلمیں درد محبت پیدا کرتا ہے۔ ہاں نگاہ عبرت کا ہونا لازمی ہے۔ میرے دوستو! یہاں کی خاک کو یہ فخر حاصل ہے کہ یہیں کبھی امیروں اور شہزادوں کی آنکھوں کا سرمہ تھی۔" .... (صفحہ ۱۸۸)

"باوجود ہزاروں عیوب کے یہاں کے باشندوں کے طرز معاشرت میں اب بھی ایک لطافت ہے جو کہ

بیرونجات کے رہنے والوں کو نصیب نہیں۔ زبان کی شستگی، طبیعت داری، علو ہمتی، جوہر شناسی، ادب، سلیقہ، حسن تقریر تو گویا شرفاء لکھنؤ کی گھٹی میں پڑے ہیں" (صفحہ ۱۴)

چکبست کا کلام نظم ہو یا نثر لکھنؤ کے روزمرّہ اور مستعملات خصوصی کا ایک بہترین نمونہ ہے اسے تو مقامی تعصب نہیں کہہ سکتے۔

مولانا آزاد، سید انشا کے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ عام مقولہ ہے "جو شخص اپنی زندگی میں بہت ہنستا ہے اُسے آخری عمر میں بہت رونا پڑتا ہے"۔ ہنسنا ہنسانا تو ذوق کے شعار میں نہ تھا لیکن شہرت اور عالمگیر شہرت جیسی ذوق کو اپنی زندگی میں نصیب ہوئی تھی ویسے ہی کوئی آج اسکا نام تک نہیں لیتا۔ نہ معلوم یہ مومن کی روح کا سراپ تھا کہ آزاد کی سرتوڑ کوششوں کے باوجود ذوق کو آج ادبی دنیا بھولے ہوئے ہے عالمگیر شہرت قطعی گمنامی سے مبدل ہوگئی۔ جہاں دیکھو غالب اور آتش ہی کا نام نظر آتا ہے۔ مومن کے وکیل اب کچھ پیدا ہوتے ہیں، یہ ایک ادبی گناہ ہے جسکے ارتکاب میں پنجاب کی سب سے زیادہ شرکت ہے اور اگر پوچھیے کہ ذوق کس جرم میں اس سزا کو پہنچا تو اسکے سوا کچھ نہ سنیگا کہ وہ تو زبان کا شاعر تھا، آجکل زبان کو مانجھنا، محاورہ کی صحت، روزمرہ کی درستی، اور فصاحت "ادب لطیف" کے عالم میں گناہ کبیرہ سمجھے جاتے ہیں، خیر یہ لمبی داستان ہے، کہنا یہ تھا کہ چکبست نے ذوق کو طاق نسیاں پر جگہ نہیں دی، بلکہ وہ اُنکے دل پر غالب اور آتش اور انیس کے ساتھ قابض تھا، آپ بہت کم اقتباس ذوق کے کلام سے بطور تمثیل دیکھینگے مگر چکبست کے مضامین میں حسب موقع اکثر پائے جاتے ہیں۔ چکبست جیسا نقاد سخن اُس شاعر کو کیونکر پس پشت پھینک سکتا تھا جسکے ایک شعر پر غالب پنا دیوان نثار کرنے کو تیار تھے۔

ان مضامین کے بالاستیعاب مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف اُن تنگ نظر اصحاب کے اجتہاد کا حامی نہ تھا جو رات دن ترک تیرک کا وظیفہ رٹتے رہتے ہیں، وہ اردو زبان کے دامن کو وسیع کرنا چاہتا تھا حالانکہ وہ سب کچھ اُس کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا لیکن اُنکی معقول پسند طبیعت محض خذ ما صفا کی طرف مائل تھی۔ اس جگہ صرف یہ کہا جائیگا کہ کئی کلمات اردو زبان میں ایسے ہیں جن سے کلام کو ایک طرح کا سہارا ملتا ہے، لوگ اُنکو بھی ترک کرنے کے درپے ہیں۔ مفصل بحث کا یہ محل نہیں، راقم اس پر شرح وبسط کے ساتھ رسالۂ اُردو میں لکھ چکا ہے۔

یہ الفاظ اس مجموعے میں جابجا آئے ہیں جنھیں چکبست جیسے ادیب اور ماہر فن کا سہو یا لغزش نہیں کہا جا سکتا:۔ "کیونکر۔ جونہ۔ جبکہ۔ مرتبہ (دفعہ)۔ عرصہ (مدت)۔ نیز۔ تصنع وبناوٹ۔ رنگ و روپ۔ پیر۔ وغیرہم۔

مصنف سے تو نہیں مگر دہلی اور لکھنؤ میں کئی بزرگوں سے رنگ زرد پڑ یا میل وتجول جیسی ترکیبوں کے متعلق استصواب ہوا تو انھوں نے صاف کہدیا کہ خواہ یہ ترکیبیں قاعدے کے خلاف ہوں مگر ہمارا محاورہ ہے اور یہ امر واقعہ ہے:

نہ صرف یہ کہ چکبست گریجویٹ تھے، انگریزی میں انکا مطالعہ بہت وسیع اور متنوع تھا، باوجود اس وسعت کے اگرچہ وہ اکثر انگریزی تخئیل و استدلال سے استفادہ کرتے ہیں لیکن نہ اُنکے جملوں کی بناوٹ انگریزیت کا رنگ لیے ہوتی ہے نہ مضمون اوپرا معلوم ہوتا ہے بلکہ اُردو کی شان برابر قائم رہتی ہے۔ کلام نہ تو ترجمہ معلوم ہوتا ہے اور نہ بعید الفہم ہوتا ہے، اس کا ایک ثبوت وہ سارے کا سارا مضمون ہے جسکا موضوع تاریخ ہے، مختصر یہ کہ چکبست نے شرق اور غرب کے ادب کے محاسن کو اپنے کلام میں نہایت شعور سے سمویا ہے۔

راقم کا یہ عقیدہ ہے کہ صحیح ادبی مذاق رکھنے والا نفاق انگیزی اور عدم رواداری کا حامی ہرگز نہیں ہو سکتا۔ چکبست مرحوم کے ادبی مذاق کی صحت کے خلاف کیسے شک ہو سکتا ہے۔ پھر وہ کیونکر قومی اتحاد (اس مرکب کے وسیع معنی پر نظر رکھئیے) اور رواداری کے جذبہ سے محروم ہو سکتے تھے۔ یہ نہیں کہ وہ سیاسیات سے ناآشنا تھے۔ وہ اپنے وقت کی اعتدال پسند جماعت (ماڈریٹس) سے تعلق رکھتے تھے۔ باوجود اسکے دادا بھائی نوروجی والے مضمون میں انڈین نیشنل کانگرس کے ابتدائی منازل کے متعلق اُسکے خلاف سرسید احمد مرحوم کے مساعی کا جس سلیقہ اور خوش اسلوبی سے ذکر کیا ہے وہ چکبست ہی کا حصہ تھا آجکل تو خفیف اور فروعی امور میں اختلاف رائے بھی باپ مارے کا بیر بنجاتا ہے۔ خواہ وہ اختلاف رائے سیاسی معاملوں میں ہو یا ادبی امور میں، ایک اقتباس عنوان میں دیا جا چکا ہے اُسکے ساتھ یہ ملاحظہ ہو:-

"قومی اتحاد و قومی ترقی کی منزلیں دشوار گزار ہیں۔ بگڑی ہوئی قسمت ایکدن میں نہیں بنتی ہو مسلمان اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے کی کوشش کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہو کہ انمیں فطرتی طور سے ہندوؤں کی مخالفت کا مادہ موجود ہے۔ اصل وجہ یہ ہو کہ ابھی مغربی اصُول پورے طور سے اُن کے ذہن نشین نہیں ہوئے ہیں۔ ابھی زمانہ کے معلّم نے انھیں قومی یگانگت کا سبق نہیں دیا ہے لیکن وہ زمانہ بہت قریب نہیں ہو تو بہت دور بھی نہیں ہے۔ جب کہ یہ زمانہ سازی کا رنگ زمانہ شناسی سے بدل جائے گا۔ .... اور ہندوستان میں قومی یگانگت کا نیا دور شروع ہو گا۔ ـــ ۵

لذّت سیر و گر چشم تماشا لے گی
ایکبار اور بھی دنیا ابھی پلٹا لے گی" (صفحہ ۲۸۸)

ر دنیا کا یہ پلٹا لینا اب یقیناً شروع ہوگیا ہے۔ کاش چکبست آج زندہ ہوتا اور اپنی پیش گوئی کی راقت اپنی آنکھوں دیکھتا کہ وطنیت اور حریت کے میدان میں ڈاکٹر انصاری۔ مولانا ابوالکلام آزاد لانا ظفر علیخاں، ڈاکٹر عالم اور ڈاکٹر کچلو وغیرہم کس طرح پنڈت موتی لال نہرو۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل ر پنڈت مدن موہن مالوی کے دوش بدوش، اور ہم ردیف ہیں۔

لالہ لاجپت رائے کی وفات پر کیا قومی خادم، اور کیا پاپونیر سب نے یہ چبھتا ہوا فقرہ کہا تھا کہ اس ڑے وقت میں لالہ جی کی موت قومی مقاصد کے حق میں نہایت جانگزا صدمہ ہے، اردو ادب کی نیا میں جو ہل چل مچ رہی ہے وہ سیاسیات کی ہنگامہ خیزیوں سے کم نہیں ہے۔ ادبیات کو ٹھیک بنڈے پر لانے اور ترقی کے رستے پر ڈالنے کے اہم کام میں چکبست جیسے باخبر ادیب اور ادبی فدائی سخت ضرورت تھی۔ اگر چکبست آج ہم میں نہیں اُسکے ادبی کارنامے موجود ہیں اور وہ زندۂ جاوید ں، اُن سے سبق لینا اور فائدہ اُٹھانا حقیقت میں اردو ادب کا مفاد ہے۔

خمخانۂ جاوید[1] (جلد چہارم)

مرتبہ لالہ سری رام صاحب ایم اے

خمخانۂ جاوید معروف بہ تذکرۂ ہزار داستان ادبی دنیا میں اسقدر مشہور ہو چکا ہے کہ اسکے لیے عارف کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اسی تذکرہ کی چوتھی جلد اسوقت ہمارے پیش نظر ہے جسمیں صرف ں اور ص کی ردیفیں ہیں، اور ان شعرا کی تعداد جنکا ذکر و نمونۂ کلام اسمیں موجود ہے، چارسو تیس ہے جس سے اسکی جامعیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

لالہ سری رام صاحب مستحق مبارکباد ہیں جنھوں نے ایک مدت کی تلاش و جستجو کے بعد اُردو ربان کے شعرا کے حالات و کلام کو فراہم کیا اور پھر نہایت دماغ سوزی و جگر کاوی سے کام لیکر اس

---

[1] بڑی تقطیع حجم تقریباً چھ سو صفحات، قیمت فی جلد مجلد عمر؎ بلا جلد للعہ۔
ملنے کا پتہ:۔ مؤلف۔ ۱۷ علی پور روڈ۔ دہلی

تذکرہ کو مرتب فرمایا۔ تذکرہ کو بجہ وجوہ مکمل بنانے کے لیے ایسے شعراء کے حالات اور نمونہ کلام کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا جو عام طور پر مشہور نہیں ہیں۔ بعض شعراء کے نمونۂ کلام میں صرف ایک یا دو شعر درج کئے گئے ہیں کیونکہ مزید کلام دستیاب نہیں ہوسکا۔ مختصر یہ کہ اس تذکرہ کی جامعیت اسکی سب سے بڑی خصوصیت ہے جسکی وجہ سے بقول مرزا غالب مرحوم "ہر بوالہوس" کو "حسن پرستوں" کی محفل میں باریابی نصیب ہوگئی۔

اگرچہ شعراء کے حالات فراہم کرنے میں انتہائی کاوش سے کام لیا گیا ہے لیکن اکثر حضرات کے حالات پایۂ تحقیق سے گرے ہوئے ہیں۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ ہر نام نہاد شاعر کے حالات کی تحقیق کرنا کچھ آسان کام نہیں۔ علاوہ ازیں مؤلف کو جس طرح حالات ملے انھوں نے اسیطرح تذکرہ میں لکھدیئے کہ اسکے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ مثالاً ذیل میں ہم صرف دو اصحاب کے حالات کے متعلق کچھ عرض کرتے ہیں۔

(۱) منشی سخاوت حسین صاحب سخا شاہجہانپوری کو حضرت ناطق لکھنوی کا شاگرد بتایا گیا ہے اور ان کو "کبھی کسی کارخانہ میں محرری کرتے اور کبھی بچوں کو تعلیم دیتے" دکھایا ہے حالانکہ واقعہ کے لحاظ سے یہ دونوں باتیں بالکل غلط ہیں۔ سخا صاحب حضرت طاہر مرحوم فرخ آبادی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں اور ایک کارخانہ میں ایک شریک کی حیثیت رکھتے ہیں۔

(۲) منشی صمد یار خاں ساغر کے حالات میں ہے کہ "آپکے والد جناب ڈاکٹر احمد یار خاں مشہور لوگوں میں ہیں جنکی حکیمانہ قابلیت کا شہرہ تمام علیگڈھ میں ہے"۔ قدر دانان سخن کی جانب سے آپکو "نسیم الکلام" کا خطاب مل چکا ہے۔ جہانتک ہم کو معلوم ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ دونوں باتیں حقیقت سے بہت دور ہیں۔ ڈاکٹر احمد یار خاں صاحب صرف ویکسینیٹر ہیں۔ اب غالباً وہ اسی صیغہ میں کسی اور عہدہ پر ممتاز ہوگئے ہیں۔ "نسیم الکلام" کا خطاب خدا جانے کن قدر دانان سخن کی طرف سے ملا ہے؟ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ نہ صرف "نسیم الکلام" بلکہ آجکل کا "خیام العصر" دونوں خود ساختہ ہیں۔

خمخانۂ جاوید کی ایسی خامیوں کو دکھاتے ہوئے ہمیں دلی افسوس ہوتا ہے لیکن ایک تنقید نگار کا فرض ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم اپنے ناظرین کے سامنے صداقت کے ساتھ اپنی رائے ظاہر کردیں۔

آخر میں یہ عرض کرنا یقیناً ضروری ہے کہ اس قسم کی خامیوں کے ہوتے ہوئے بھی خمخانۂ جاوید ایسا تذکرہ ہے جسکی نظیر اردو دنیا میں کہیں نہیں مل سکتی اور ہر شاعر و سخن دوست کا فرض ہے کہ وہ اس تذکرہ کے مطالعہ سے لطف اندوز ہو۔

ارباب نثر اُردو ؎

(از سید محمد صاحب بی۔ اے (عثمانیہ))

اٹھارویں صدی کے آغاز سے پہلے ہی اُردو زبان کی ترقی کے کچھ ایسے قدرتی آثار پیدا ہوگئے تھے کہ آگے چلکر اس کم مایہ زبان نے ایک وسیع و ہمہ گیر زبان کی صورت اختیار کرلی۔ اسمیں شک نہیں کہ اُردو زبان کی ترقی میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے کارکنوں نے بہت کچھ حصّہ لیا اور ۱۸۰۰ء میں اس کالج کو قائم کر کے اُردو میں عام فہم و دلچسپ کتابوں کی تدوین و اشاعت کا معقول انتظام کیا۔ اگرچہ اس کالج کے قیام کی غایت صرف یہ تھی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازموں کو ہندوستان کی عام ملکی زبان سکھائی جائے لیکن اس سلسلہ میں عربی، فارسی، سنسکرت اور بھاشا کی اکثر کتابیں اُردو میں ترجمہ ہوکر مقبول عام ہوگئیں اور کالج کے ملازمین کے علاوہ دوسرے اہل قلم نے بھی اُردو میں تصنیف و تالیف کا کام شروع کردیا۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ جو ابتدا میں فورٹ ولیم کالج کے صدر مقرر ہوئے تھے حقیقت میں اُردو سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ اُن ہی کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان کے بہترین اہل علم کلکتہ میں جمع ہوگئے اور ان کی سرپرستی و نگرانی میں اپنے اپنے جوہر طبع دکھانے لگے۔

"ارباب نثر اُردو" فورٹ ولیم کالج کے اہل قلم حضرات کے ذاتی حالات اور انکے علمی و ادبی کارناموں کا ایک مبسوط تحقیقی تذکرہ ہے۔ اسمیں میر امن دہلوی، میر شیر علی افسوس۔ مرزا علی لطف۔ منشی بینی نراین جہاں، للو لال کوی، بہادر علی حسینی، نہالچند لاہوری وغیرہ انیس اہل قلم کی سوانحعمری اور اُنکی تصنیفات کا ذکر ہے۔

ہر کتاب کی طرز تحریر کا نمونہ دیکر اسپر زبان و انداز بیان کے لحاظ سے تبصرہ کیا گیا ہے جس سے اس تذکرہ کی شان بہت بلند ہوگئی ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے ارباب قلم کی اکثر کتابیں شائع نہیں ہوئیں اور جو شائع ہوئیں انمیں سے اکثر آجکل نایاب ہیں بعض کتابیں قدیم کتب خانوں میں پائی جاتی ہیں اور بعض یورپ کے عجائب خانوں کی زینت ہیں بعض ایسی ہیں جو دنیا میں کہیں موجود نہیں بلکہ صرف انکا نام ہی باقی ہے اس صورت میں کتابوں کا انداز تحریر دکھانا جسقدر مشکل ہو سکتا ہے ظاہر ہے۔ لائق مؤلف نے امکانی کوشش و تلاش سے کام لیکر جہانتک ممکن ہو سکا ہے اور جسقدر کتابیں دستیاب ہوئی ہیں انکے طرز تحریر کا نمونہ دیا ہے، بعض غیر مطبوعہ کتابوں کے اقتباسات برٹش میوزیم سے حاصل کیے ہیں، غرض جہانتک تلاش و تحقیق کا تعلق ہے کوئی کوشش اُٹھا نہیں رکھی، مختلف تذکروں، کتابوں اور بعض دوسرے ذرائع سے امداد لیکر ضروری مواد فراہم کر کے اس کتاب کو بہمہ وجوہ مکمل بنانے کی سعی بلیغ کی ہے۔ یہ تذکرہ اس قابل ہے کہ اُردو زبان کی تاریخ اسکی درجہ بدرجہ ترقی سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب اسکو ضرور مطالعہ کریں، ہم مؤلف کی تلاش و تحقیق کو بہ نظر استحسان دیکھتے ہیں اور اس کتاب کی تالیف پر انکو مستحق مبارکباد سمجھتے ہیں۔

؎ چھوٹی تقطیع مجلد قیمت ۲؎ ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ۔ اسٹیشن روڈ۔ حیدرآباد دکن۔

خوفناک مُشاہدہ

(از جناب جوش ملیح آبادی)

مین یکایک ہو گیا کیون اسقدر نازک مزاج
یہ تخیّل مجھکو کس عالم مین لے آیا ہے آج !

کس قدر اسرار سے معمور ہے یہ سرزمین
اک ادائے دلکشی کے ساتھ ہیبت آفرین

مُوتیے کی چاندنی چھٹکی ہوئی ہے دُور دُور
یاسمن کے بُرج ہین، شبنم کے ایوان و قصور

مُنجمد کرنون کی محرابین قطار اندر قطار
جن پہ ہین رنگ شفق کے پردہائے زرنگار

مُوتیون کو گوندھکر لکھّے گئے ہین جن پہ نام
"تیرگی کا ہے یہ مسکن، یہ تجلّی کا مقام"

جائیے جس سمت، پردون پر نیا القاب ہے،
"یہ ہے غم کی، یہ خوشی کے راز کی محراب ہے،"

اک فرشتہ میرے دل مین نور پھیلاتا ہُوا
پھر رہا ہے نوحسین محرابون کی دکھلاتا ہوا

"یہ حقیقت شادمانی کی ہے، یہ آلام کی
یہ حقیقت صُبحِ جان پرور کی ہے، یہ شام کی"

"یہ نکاتِ حُسنِ شیرین، یہ رموزِ کوہکن
یہ حقیقت ہے شمیمِ گُل کی، یہ رازِ چمن"

اے خدا! لیکن اس آگاہی مین ہین کیا صفات
دلفریبی سے ہوئی جاتی ہے عاری کائنات!

اُڑتا جاتا ہے برابر رنگ موجودات کا
جتنا جتنا بڑھ رہا ہے نور معلومات کا !

مُنکشف جس وقت ہو جاتا ہے رازِ جزو و کُل
رُوح فرسا خار مین تبدیل ہو جاتا ہے گُل !

عقل پالیتی ہے جس شئے کی حقیقت کا سُراغ
دل مین ہو جاتا ہے گُل اُسکی لطافت کا چراغ!

جہل کے پھُولون کو اے معبود اُمرجھانے نہ دے
آدمی کو بارگاہِ علم مین جانے نہ دے!!

انسان

(از پنڈت آنند نراین ملّا ایم-اے-ایل-ایل-بی)

کون ہے میرے سوا مالکِ افلاک و زمین نورِ فردا ہے نہان جس مین وہ میری ہے جبین
قصۂ دہر مین لیکن مجھے معلوم نہین اہرمن ہون کہ سلیمان ہون کہ خاتم کا نگین
طور ہون جذبۂ موسےٰ ہون کہ ذرہ بن ہون مین
لبِ خاموش بتا دے یہ مجھے کون ہون مین؟

مجھپہ کھلتا ہی نہین کچھ مری قسمت کیا ہے؟ پردۂ نقشِ ازل مین مری صورت کیا ہے؟
عقل کیا چیز ہے ارمان کی حقیقت کیا ہے؟ مین ہون مخلوق کہ خالق؟ مری فطرت کیا ہے؟
دستِ فرہاد ہون یا تیشۂ فرہاد ہون مین؟
آپ بہزاد ہون یا خامۂ بہزاد ہون مین؟

اپنی تقدیر کا بندہ بھی ہون مختار بھی ہون طالبِ دید بھی ہون کشتۂ دیدار بھی ہون
دردِ الفت کا مسیحا بھی ہون بیمار بھی ہون محفلِ دہر مین ساقی بھی ہون میخوار بھی ہون
بندگی دل مین کبھی ہے تو ہے الحاد کبھی
باغِ فردوس کبھی گلشنِ شداد کبھی

نورِ جان پیکرِ خاکی مین فروزان کیون ہے؟ مجھ مین پنہان ہے تو مجھ سے گریزان کیون ہے؟
جسم اور روح کا آپس مین یہ پیمان کیون ہے؟ عقل سے شوق مرا دست و گریبان کیون ہے؟
دوست کس کو کہون کس کو کہون دشمن ان مین
رہنما کون ہے اور کون ہے رہزن ان مین

مین مرد غیر سے لون - یہ مرا دستور نہین مثلِ پروانہ کے جلنا مجھے منظور نہین
گو شبِ تار ہے اور رہ مین کوئی نور نہین مین جو بھٹکا بھی تو جاؤنگا بہت دور نہین
میرے سینے مین ہے عصیان کی تجلی باقی
دلِ مضطر کو ہے اتنی تو تسلی باقی

وارثِ دہر کہین یہ دلِ شیدا تو نہین؟ خضرِ ظلماتِ جہان نورِ تمنا تو نہین؟
زندگی نام کہین ذوقِ طلب کا تو نہین؟ رازِ ہستی دلِ عاشق کا تقاضا تو نہین؟
بحر کہتے ہین جسے ہم کہین ساحل ہی نہو؟
راہ اب تک جسے سمجھے ہین وہ منزل ہی نہو؟

رباعیات اثر

(از مرزا جعفر علیخان صاحب بی - اے اثر لکھنوی)

حاصل کیسا امیدِ حاصل کیسی ہمت ہمت! یہ فکرِ ساحل کیسی؟
طوفان ہو جا کہ غرقِ طوفان ہو جا نادان من و تو کی حدِ فاصل کیسی؟

دنیا دو رخ ہوئی ہے مکارون سے شرمندۂ معصیت ہے کردارون سے
مذہب پردہ ہے جنکی غداری کا اللہ کی پناہ ایسے دیندارون سے

جادہ ہے کوئی اور نہ منزل میری حاصل سے جدا ہے سعیِ حاصل میری
پاتا ہون تجھے تو آپ کھو جاتا ہون ممنونِ کشائش نہین مشکل میری

دل میری طرف سے صاف ہوتا ہی نہین جرمِ اُلفت مُعاف ہوتا ہی نہین
تو وعدہ خلافی بھی وفا ٹھہری ہے جس سے کبھی انحراف ہوتا ہی نہین

دل کو جو غمِ ہجر نے لُوٹا لُوٹا دامانِ قرار و صبر چھوٹا چھوٹا
اک آبلہ باقی تھی نشانی دل کی وہ سینہ زنی مین آج پھوٹا پھوٹا

آخری تمنّا

(از جناب تسکین سورونوی)

مَین تو مرتا ہون مگر ہے یہ وصیت میری — مجھکو روئے نہ مرا سوگ منائے کوئی
چار پھولون کو ترستی رہے تربت میری — شمع کیا اسپہ دیا تک نہ جلائے کوئی

کچھ ہری گھانس نم آلودہ ہے درکار مجھے — جو تہِ سایہ مری خاک کو روپوش کرے
کیا پسِ مرگ زمانے سے سروکار مجھے — خواہ وہ یاد رکھے، خواہ فراموش کرے

نہ اندھیرا مجھے مرقد کا دکھائی دیگا — نہ مجھے بارشِ پیہم کی شکایت ہوگی
نغمۂ بلبلِ شیرین نہ سنائی دیگا — اپنے گانے سے اُسے خود ہی اذیت ہوگی

عالمِ شام و سحر مجھپہ رہے گا طاری — جو نہ بڑھتا ہے کبھی اور نہ گھٹتا ہے کبھی
جب نہ دنیا مین رہا مین تو خبر کیا اسکی — اہلِ دنیا کی مجھے یاد رہے یا نہ رہے

(سی جی راسٹی)

جذباتِ وحشی

(ترجمہ)

(از بابو کرشن سہاے صاحب تیکاری وکیل)

آ رہی ہے سازِ ہستی سے صدا میرے لیے — گونجتی ہے عشق کی ساری فضا میرے لیے
اک پیامِ روح افزا ہے قضا میرے لیے — اک نسیمِ صبح ہے بادِ فنا میرے لئے
چاہیے اک تجھ سے واقف رہنما میرے لیے — آشنائے دہر ہے ناآشنا میرے لیے
کشتیِ عمر اور طوفانِ حوادث کا خروش — اب کہان ملتا ہے کوئی ناخدا میرے لیے
بہرِ تسکین کچھ تو دیتی ہین مری آہین جواب — مَین نے مانا، ہین یہ گنبد کی صدا میرے لیے
ہو رہا ہے دل مین کیون اپنا خروشِ آرزو — آج کیا لائی ہے آہِ نارسا میرے لیے
ہون وہ وحشی جسکا ہے صد چاکِ داماں لمید — زندگی اب کیا بنے گی دلربا میرے لیے

ا

ا


نئے سال کا رعایتی اعلان
اٹھارہ روپیہ کی تین گھڑیوں کا سیٹ بارہ روپیہ میں
محصولڈاک معاف آپ کا نام سنہری حروف میں
گھڑیوں و ٹائم پیس کے ڈیل پر مفت چھاپ دیا جائیگا
نئے سال کی خوشی میں ولایت کے بہلے تازے چالان کی منتخب
گھڑیاں بہت بڑی رعایت کے ساتھ فروخت ہو رہی ہیں
ان گھڑیوں میں سے ایک ہی قسم کی یا مختلف قسم کی تین یا
۲ گھڑیاں اور ایک ٹائم پیس یکمشت خرید فرمائیں گے
اُن کو صرف بارہ روپیہ (۱۲) میں بھیجی جائیں گی۔
یہ رعایت محض مال کی نکاسی اور فرم کی شہرت کی وجہ سے ہے
اور یہ رعایت اسی وقت تک رہیگی جب تک یہ گھڑیاں اسٹاک میں
رہینگی اسکے بعد عدم تعمیل کے ذمہ دار نہ ہونگے آپ فوراً ہی آرڈر بھیجدیں
ایسا نہ ہو کہ اسٹاک ختم ہو جائے اور آپ کی فرمائش کی تعمیل نہ ہو سکے۔
نوٹ ایک یا دو گھڑی کے خریدار سے پوری قیمت لیجاویگی
المشتہر
منیجر جان سن واچ ہاؤس گمندر بازار میرٹھ (یو پی)
مشہور عالم
ڈبل الارم ٹائم پیس
گارنٹی ۵ سال
گارنٹی ۵ سال



اس زکام کو پیپس سے اچھا کر لیجئے

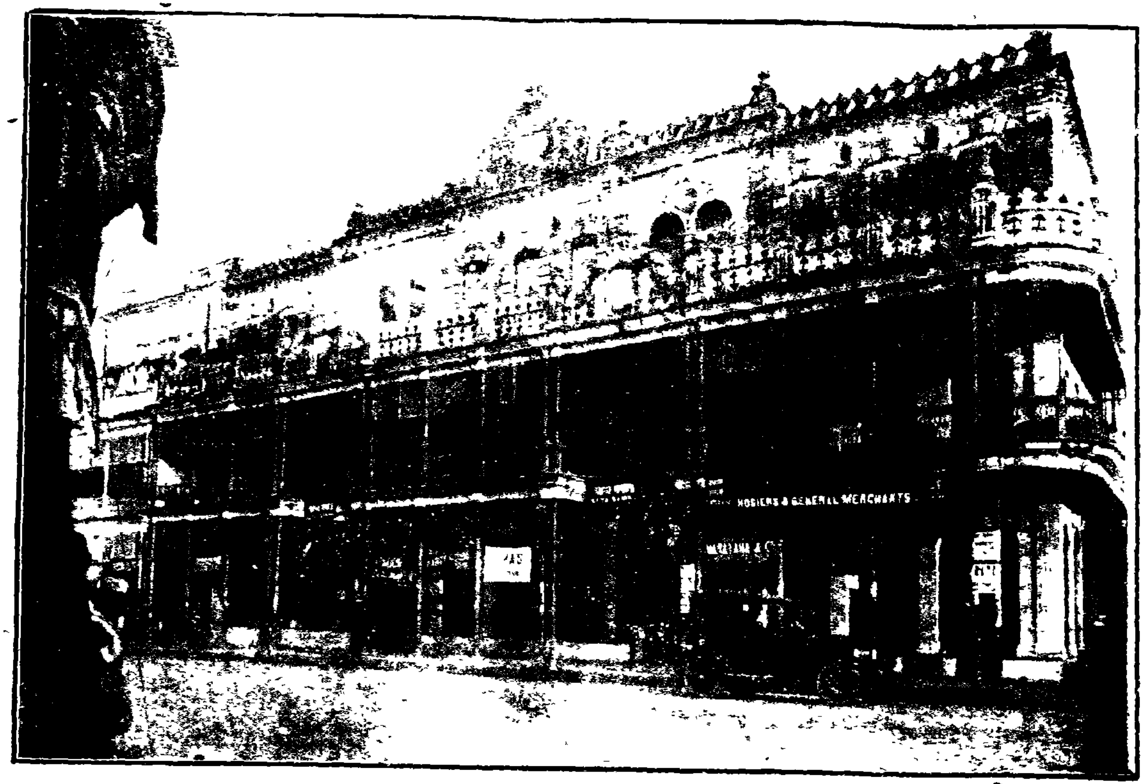
یہ سائنس کے ذریعہ فائدہ کرنیوالی عجیب و غریب دوا کی ٹکیہ ہے

فوری طور پر چھینکیں آنے لگنا اور ناک سے پانی بہنا زکام کی اولین اور ناخوشگوار علامت ہے۔ انفلوئنزا اور زکام کے جراثیم جب سانس کے ذریعہ منہ اور گلے میں پہونچتے ہیں تو سانس لینے والی نلیوں کی نرم و نازک اندرونی جھلیوں پر اپنا مضر اثر کرتے ہیں جس سے آماس اور مختلف تکلیفیں ہو جاتی ہیں۔

زکام کو روکنے اور اسکے ناقص اثرات سے بچنے کی بہترین تدبیر یہ ہے کہ پیپس کی ایک یا دو عجیب و غریب ٹکیاں کبھی کبھی منہ میں ڈال لیجئے۔ پیپس کا طبی دھواں جب سانس کے ذریعہ آپکے منہ میں جائیگا تو تمام مضر صحت جراثیم نیست و نابود ہو جائیں گے۔ بلغم اور جکڑن رفع ہو جائیگی۔ گلے اور سانس لینے والی نلیوں کا آماس دور ہو جائیگا۔

کھانسی زکام۔ سردی۔ انفلوئنزا۔ گلے کی خراش۔ برانکائیٹز دمہ وغیرہ کیلئے پیپس نہایت سہل الحصول اور صریح التاثیر علاج ہے۔ پیپس بچوں اور بوڑھوں کے سینہ کو مضبوط بنا دیتا ہے آج ایک شیشی خرید لیجئے۔ قیمت ایک روپیہ سب انگریزی دوا فروشوں سے مل سکتا ہے۔

پیپس Peps



آریہ سماج مندر ماسٹن روڈ کلمبو



وہ جاندار جسکی ہڈیاں ٹرنل ووگ (جرمنی)
کے قریب سنہ ۱۹۰۲ء میں ملی تھیں
اس کا زمانہ ساٹھ لاکھ سال تخمینہ کیا گیا ہے -



جاوا سے جس جاندار کی ہڈیاں ملی تھیں یہ آدھا
انسان اور آدھا بن مانس سمجھا جاتا ہے
اس کا زمانہ پانچ چھ لاکھ برس قرار دیا گیا ہے

زمانہ

جلد ۵۲ فروری ۱۹۲۹ء نمبر ۲

قدامتِ انسان

سائنس کی تحقیقات کی روشنی مین

(از مسٹر جے - آر - رائے)

انسان کب پیدا ہوا تھا؟ یہ ایک نہایت ضروری اور جامع سوال ہے جو مذاہب و روایات اور علوم و فنون کا نہایت بسیط اور دلچسپ موضوع بنا ہوا ہے - اِس سوال کے صرف دو جواب ہو سکتے ہین - اوّل تصورِ مذہب - عبرانی - مسیحی اور اسلامی خیالات مین کوئی اصول اور بنیادی اختلاف نہین ہے - اسکی رُو سے یہ مانا جاتا ہے کہ ابتدا مین آدم اور حوا - نر - ناری - پیدا ہوئے تھے - بائبل کے ابتدائی باب مین اسکا ذکر پایا جاتا ہے - برخلاف اِسکے ہندو خیال مختلف ہے - پُرانون کی روایت کے مطابق ابتدا مین مُنو (آدم) عالمِ وجود مین آیا تھا - دوسری روایت کی رُو سے شیوجی اور پاربتی ابتدا مین معرضِ وجود مین آئے تھے - مگر سوامی دیانند جی نے ویدک خیال پر زور دے کر یہ بیان کیا ہے کہ شروع مین چند انسان پیدا کیے گئے تھے - اگر ہم مہذب قومون کی روایات پر نگاہ ڈالی جائے تو ان سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شروع مین ایک آدمی پیدا ہوا تھا - دوم تصور سائنس جسے پڑھے لکھے لوگ مذہب سے متبائن سمجھتے ہین - اِس مضمون کے ذیل مین اس امر سے بحث کی جائے گی - کہ جدید تحقیقات کی روشنی مین

انسان کی قدامت کا زمانہ کتنے ہزار سال کا مُسلّم اور معتبر ثابت ہوتا ہے اِس مین کلام نہین ہے کہ مسئلہ بہت پیچیدہ ہے۔ اور اس پر ایک مختصر مضمون مین کما حقہ خامہ فرسائی کرنا قریب قریب ناممکن ہے، فقط اختصار پر اکتفا کی جاتی ہے۔

ڈارون کا مشہور نظریہ

گذشتہ نصف صدی مین مہذب دنیا مین جو انقلاب رُونما ہوا ہے اُسکے سب سے بڑے محرک مختلف شعبہ ہاے سائنس کے اکتشافات ہین سب سے بڑا چارلس ڈارون کا نظریہ انتخاب طبیعی (NATURALSELECTION) اور ابتداء الانواع (ORIGIN OF SPECIES) ہے جس کا مروجہ مترادف ارتقا (EVOLUTION) ہے۔ ارضیات۔ فلکیات۔ اثریات (آرکیالوجی) انتھراپالوجی (علم الانسان) کے ماہرون کی جداگانہ تحقیقات سے صدہا سال کے مقبول عام خیالات تہ و بالا ہوگئے ہین۔ بیالوجی (علم الحیات) کی چادر اتنی وسیع ہے کہ کئی عُلوم اِسکے سایہ مین پرورش پاتے ہین۔ عام بحثون مین اسکا اطلاق ایسا جامع ہے۔ کہ انسان کی قدامت اور ابتدا کے متعلق جملہ مسائل اِسی کے زیر نگین تصور کیے جاتے ہین یعنی ارتقا کے عالمگیر نظریہ سے قدامتِ انسان نے عجیب و غریب وسعت اختیار کرلی ہے۔ تصورِ ارتقا کی رُو سے مصریون اور بابلیون۔ خالدیون اور چینیون کی قدیم روایات گویا کل کے واقعات ہین۔ البتہ ہندو جنتری مین اتنی گنجائش ہے کہ اُس سے اِس انوکھے خیال کے واسطے حسبِ ضرورت زمانہ کافی مسالہ بہم پہونچ سکتا ہے۔

ابوالبشر کا بنیادی سلسلہ

اِس مین شک نہین کہ انسان کی قدامت کے ساتھ کئی اور بُنیادی مسائل بھی مُنسلک ہین جیسے کرۂ ارض۔ اور انواعِ نباتی اور حیوانی کی ابتدا اور قدامت۔ اور اجرام فلکی کا ارتقا لیکن عدم گنجائش کے باعث یہان پر اُنھین دانستہ نظرانداز کیا جاتا ہے۔

اِس بحث مین سب سے پہلا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کا مورثِ اعلیٰ کون تھا۔ انسان یا حیوان؟ مسئلۂ ارتقا کے تسلیم کرنے کے بعد ہم اِس جامع سوال سے دوچار ہوئے بغیر نہین رہ سکتے۔ شروع ہی مین یہ واضح کردینا ضروری ہے کہ ڈارون کے تصور "آغاز الانواع" اور موجودہ مسئلۂ ارتقا مین معتدبہ فرق ہے۔ گو عام تعلیم یافتہ اصحاب انسان کی ابتدا بندر سے سمجھتے اور اسے ڈارون کی اختراع گردانتے ہین۔ اِس زبردست محقق نے انسان کی ابتدا پر اپنی مشہور کتاب (DESCENT OF MAN) مین خوب شرح و بسط سے بحث کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "انسان کا مُورثِ اعلیٰ ایک چوپایہ تھا جسکا بدن گرمی و سردی کی شدت سے پوستین سے محفوظ تھا۔ اسکی دُم اور کان نوک دار تھے۔ وہ غالباً درختون پر رہتا اور کودتا پھاندتا پھرتا تھا۔ جب اس نے پہلے پہل اپنی پوستین اُتاری تھی۔ چاہے کوئی زمانہ اور کوئی سرزمین

ہو۔ مگر وہان کی آب و ہوا گرم تھی۔ اور وہان پر پھل پھول کی بہتات تھی جنھین کھا کر وہ بسر اوقات کرتا تھا (جلد دوم صفحہ ۳۶۲)

چارلس ڈارون کے خیال کے مطابق زمانۂ ای اوسین (EOCENE) مین انسان کے ابتدائی بزرگ نے اپنی پوستین اتاری تھی۔ سر چارلس لائل جیالوجی (ارضیات) کے مشہور ماہر یون لکھتے ہین کہ

"جب تو زائیدہ زمین پر پہلے پہل چوپئے جانور نمودار ہوئے تو بڑے میلے کچیلے اور بالکل بے زبان تھے۔ درختون کے پھلون اور بسیرے کے ٹھکانون پر آپس مین گھونسون سے لڑتے اور نا خنون سے ایک دوسرے کو نوچتے تھے۔ پھر لکڑیون سے کام لینے لگے۔ بعد ازان ہاتھون سے دھینگا مشتی کرنے لگے۔ مرور ایام زمانہ اور جبلتیات کے بدولت وجود مین آگئے تھے کچھ عرصے کے بعد انھون نے چیزون کے نام وضع کیے پھر اظہار خیال کے واسطے الفاظ بنائے۔ ایک بعد کے زمانے مین جنگ و جدال سے متنفر ہو کر شہر بسائے اور ان کے گرد شہر پناہین کھڑی کرلین۔ اور نظام تمدن مرتب کرلیا۔" (ملاحظہ ہو، قدامت انسان صفحہ ۹، ۳۰۰)

ہمارے موجودہ مقصد کے لیے یہ دونون اقتباسات کافی ہین جو سائنس کے گذشتہ پشت کے ماہرون کی مستند کتابون سے ماخوذ ہین۔

بیالوجی کے تازہ ترین تصورات | ڈارون اور سر چارلس لائل کو اس دنیا سے گذرے ہوئے کافی مدت ہوگئی ہے ان کی معرکۃ الآرا تصانیف جس مین انسان کے حسب و نسب اور قدامت پر بحث کی گئی ہے اب کتبخانون کی الماریون مین کیڑون کی خوراک بن رہی ہین اس لیے موجودہ زمانے کے ماہران سائنس کے خیالات کا اجمالی ذکر خالی از لطف نہوگا۔ موجودہ تصور ارتقائے انسان کا لب لباب یہ ہے کہ انسان بن مانسون سے پیدا نہین ہوا ہے۔ اور نہ لیموز (LEMUS) اسکے اجداد قرار دیے جاسکتے ہین۔ اسکا مورث اعلیٰ کون ہے؟ اس سوال پر عقل چکراتی ہے۔ جرمنی کے ممتاز ماہر روڈالف آنو نے ایک مشہور جرمن رسالے مین دسمبر ۱۹۰۸ء اور فروری ۱۹۰۹ء کے درمیان ایک سلسلۂ مضامین لکھا تھا جسمین اُس نے جرمنی۔ ہالینڈ۔ فرانس۔ آسٹریا اور یورپ کے دیگر ماہرون کی رائین پیش کرکے یہ بات ثابت کی تھی۔ کہ ڈارون کا نظریہ اب ماہران بیالوجی کے نزدیک مقبول نہین رہا۔ اور نیا تصور اصولاً اسکے خلاف ہے۔ پروفیسر میورٹ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ امر توبخوبی ثابت ہے کہ انسان اور بن مانس اور ان سے اُتر کر دوسرے درجے کے بن مانس ایک سلسلے مین منسلک اور شمار نہین ہوسکتے جسکی انتہا انسان پر ختم ہوجاتی ہے۔ (ملاحظہ ہو "ہدایات قدرت" صفحہ ۳۶۱)

ہالینڈ کے مشہور ماہرین شرہڈر۔ فان ڈرکوک اور فرولک کا مشترکہ فیصلہ یہ ہے۔ کہ جانورون کے

مختلف ابتدائی اجداد کے درمیان جو مماثلت اور مشابہت پائی جاتی ہے اس سے انکی ابتدا کا کوئی ایک سلسلہ ثابت نہین ہوتا۔ بلکہ مختلف اور جداگانہ سلسلے کا جال پھیلا ہوا ظاہر ہوتا ہے"۔ بالفاظ دیگر انسان بن مانس اور دیگر بندرون اور جانورون کی ابتدا ایک مورث اعلےٰ سے نہین ہے۔ پروفیسر جی تیک وسکی اور انتھراپالوجی کے زبردست ماہر ڈوبی نژو نے انسان اور بن مانس کا جد اعلےٰ پیتھی سی (PITHECS) قرار دیا ہے۔ مگر پروفیسر کوپ انسان کا مورث اعلیٰ بن مانس کو نہین مانتے ہین۔ اٹریکیٹ کی یونیورسٹی (جرمنی) کے ماہر ز والوجی پروفیسر اے۔ اے۔ ڈبلیو ہبریکیٹ بھی اسی خیال کے حامی ہین۔ دو تین سال ہوئے کہ برلن کے نامور ماہر انتھراپالوجی۔ پروفیسر وسٹن ہیفر (WESTON HOEFER) نے سالسبرگ کی انتھراپالوجیکل کانگرس مین ایک مضمون پڑھتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ڈارون کا یہ خیال غلط ہے کہ انسان کا مورث اعلیٰ بن مانس ایسا جانور تھا۔ برخلاف اسکے یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ بن مانس کا بزرگ اولین ایسا جاندار تھا جو انسان سے بہت مشابہت رکھتا تھا"۔ پروفیسر موصوف نے انسان کی ٹھوڑی اور پاؤن کی بڑی تحقیقات کی ہے یہ دونون اعضا بن مانسون سے بالکل مختلف ہوتے ہین۔ دو تین سال ہوئے ایڈی لیڈ کی یونیورسٹی (آسٹریلیا) کے ماہر تشریحات (ANATOMY) پروفیسر وڈجونز نے ملبورن مین لکچر دیتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے۔ کہ "مجھے اپنی تحقیقات سے یہ ثابت ہوا ہے۔ کہ ماہران انتھراپالوجی جو بن مانس کو انسان کا بزرگ اولین قرار دیتے ہین غلطی پر ہین۔ بلکہ اصل یہ ہے کہ بن مانس کا جد امجد انسان تھا"۔

لیکن برطانیہ کے مشہور ماہر پروفیسر ایلیٹ اسمتھ اور سر آرتھر اسمتھ وڈورڈ مذکور القدر کے خیال کے مخالف ہین۔ وہ اس خیال کے حامی ہین۔ کہ انسان اور بن مانس کا مورث اعلیٰ مشترک تھا۔ وہ یہ بھی مانتے ہین کہ بورنیو کے جنگلون مین ٹرسٹیس نام کا جو چھوٹا بندر پایا جاتا ہے وہ آدمی اور بندر دونون کے ابتدائی بزرگ سے بالکل مشابہ ہے۔ پروفیسر سر آرتھر کیتھ نے جو انتھراپالوجی کے ماہر ہین۔ ۱۹۱۵ء مین قدامت انسان پر اپنی مشہور کتاب شائع کی تھی۔ جسکا نیا ایڈیشن ۱۹۲۵ء مین طبع ہوا ہے۔ اس مین آپ نے ایک نسب نامہ دکھایا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ زمانۂ ایوسین مین وہ نامعلوم جاندار پایا جاتا تھا جسکی نسل سے انسان اور بن مانس یا انسان نما بندر رہین۔

اس مختصر بحث سے واضح ہوگیا ہوگا۔ کہ چارلس ڈارون کے نظریہ سے موجودہ خیال بہت مختلف ہے۔

ابوالبشر کے بے نظیر خواہں	انھین جدید خیالات پر بحث کرتے ہوئے ایک ماہر نے جو اپنا نام ظاہر نہین کرتا۔ دو تین سال ہوئے۔ کلکتہ کے نامی اخبار "اسٹیٹسمین" مین ایک سلسلہ مضامین انسان کی ابتدا پر جواں قلم

کیا تھا۔ اسمین جو دلائل اور معلومات پیش کیے گئے۔ اِن کا لب لباب یہ ہے کہ انسان کی ابتدا جو عرصے تک گوریلے سے منسوب ہوتی رہی۔ اب ارباب سائنس اِس خیال سے دست بردار ہوگئے ہین اور انکا خیال یہ ہے کہ عہد ایوسین کے ابتدائی زمانے مین ایک نا معلوم جانور تھا۔ اور یہی انسانون اور جانورون کا جدِ امجد ہے یہ نہ بندر تھا اور نہ بن مانس بلکہ اِن دونون سے مقدم تھا۔ اگرچہ انسان نہ تھا تو غالباً ایسا جاندار ہوگا جس مین بندر بن مانس اور انسان کے خواص تھے اور ایسی نوع سے تھا جس کا کوئی نام اور نشان اب نہین ملتا۔

حال کی تحقیقات انتھراپالوجی سے یہ نتیجہ بآسانی مترتب ہو سکتا ہے کہ بن مانس اور انسان کا مشترکہ بزرگ اولی از قسم بن مانس (APE) نہ تھا۔ بلکہ از نوعِ انسان تھا۔ وہ دیگر دودھ دینے والے جانورون مین تین باتون مین بے نظیر فوقیت اور برتری رکھتا تھا۔ ذہانت۔ قوت اور ہر قسم کے ماحول مین زندہ رہنے کی صلاحیت وہ ابتدا ہی سے عقلی طاقت سے آراستہ و پیراستہ تھا جسکی بدولت اُس نے باقی مخلوقات پر اپنا اقتدار قائم کیا تھا۔ وہ ایک بے مثال ہستی تھی جسکی نسل اب روئے زمین پر آباد ہے۔ اسکی اولاد کی مردم شماری دو سو کروڑ کے قریب بنی آدم) تمام دودھ دینے والے جانورون کی اولاد سے سینکڑون گنا زیادہ ہے دائرہ قطب شمالی سائبیریا کے لق و دق سرد میدانون اور افریقہ کے تپتے ہوئے ریگستانون مین لاکھون آدمی بستے ہین دنیا کا کوئی گوشہ انسان کے وجود سے خالی نہین ہے جس سے ظاہر ہے کہ مورث اولی کی جبلّی خاصیتین اسکی اولاد مین بھی منتقل ہوتی چلی آتی ہین۔ جنکی وجہ سے وہ ہر قسم کے حالات مین عمرے کی زندگی بسر کرتے ہین۔ پروفیسر وُڈ جونز لکھتے ہین۔ کہ انسان کی زبان اور ناک کی ہڈیان گردے اور ورمی فارم اپن ڈکس زیادہ ابتدائی ہین۔ اور رگون پٹھون کی ترتیب بھی بندرون سے مختلف ہے۔ بلکہ ادنے درجے کے دودھ دینے والے جانورون سے مشابہت رکھتی ہے۔ اِس خیال سے ڈاکٹر ٹامس چیری اتفاق کرتے ہوئے لکھتے ہین۔ کہ جس طریقے سے انسان کے دانت بنے ہین اُن سے ثابت ہے۔ کہ وہ بن مانس کی اولاد نہین ہو سکتا۔ علاوہ ازین جسمِ انسانی کی نمو اور عمل تغیر جس سے ہمارے جسم کی توانائی قائم رہتی ہے۔ بندرون سے بالکل جُدا ہے۔ پروفیسر وُڈ جونز کے خیال کی تائید کرتے ہوئے ڈاکٹر ڈبلیو۔ ایچ ڈک ورکلا لکھتے ہین کہ جنین کے تغیرات کی داستان سے یہ ثابت نہین ہوتا کہ انسان بن مانسون سے پیدا ہوا ہے۔ سب سے نرالی اور تعجب انگیز نمو دماغ کی ہے جو انسان کے جنین مین بہت جلد واقع ہوتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان

ابتدا سے اعلیٰ اور سوچنے والا دماغ رکھتا ہوا چلا آتا ہے۔

نظریۂ ارتقاء حاملیر

انسان کی ابتدا کے تذکرے کے بعد مناسب ہے۔ کہ مسئلۂ ارتقا کا بھی تھوڑا سا ذکر کیا جائے اگر انسان جیسا اب ہے۔ لاکھوں برس پہلے ایسا نہ تھا۔ بلکہ بن مانسوں سے مشابہ تھا جیسا کہ مسئلۂ ارتقا کے حامی بیان کرتے ہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کا مورثِ اعلیٰ کون تھا؟ اور وہ کس نسل حیوانی سے پیدا ہوا تھا؟

فلکیات کا یہ نظریہ ہے کہ تمام اجرام سماوی کا ہیولےٰ سحاب ہے۔ یعنی ابتدا میں خلا میں سحاب یا سفید دھوان تھا۔ اُسمیں حرکت پیدا ہوئی۔ اور وہ گھومنے لگا۔ قوتِ اتصال سے دُخانی ذرّوں میں انجماد پیدا ہو گیا۔ رفتہ رفتہ اُس سے بڑے بڑے کُرہ بنے جنکا دَور کرد ڑوں میلوں میں تھا۔ اُنکی گردش محوری نہایت تیز تھی۔ اِس طرح تمام سیارے اور ستارے بنے۔ آفتاب مع نظامِ شمسی کے ابتدا میں اسی قسم کے دُخانی مادّے کا ایک نہایت عظیم کُرہ تھا۔ جیسے جیسے وہ ٹھوس ہوتا گیا وزن کے سبب سے اُسکے کئی ٹکڑے ہو گئے اور وہ اپنے اپنے جداگانہ محور پر گردش کرنے لگے۔ اس سے ارکینِ نظامِ شمسی وجود میں آئے۔ ہمارا کرۂ ارض بھی اسی طرح بنا ہے آسمان میں اب بھی درخشاں سحاب پایا جاتا ہے۔ جس کے مختلف ڈھیر موجود ہیں۔ کوئی گول کوئی لہردار اور کوئی چکردار ہے اس وقت بھی اجرامِ فلکی اپنے ابتدائی مرحلۂ زیست میں ہیں۔ کئی باہمگر تصادم سے ریزہ ریزہ ہو کر نابود ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ ہمارا کرۂ ارض نظامِ شمسی کا ایک ادنےٰ حصّہ ہے۔ جب کسی نامعلوم عملِ قدرت سے یہ آفتاب سے الگ ہو کر اپنے جداگانہ محور پر گردش کرنے لگا۔ تو آگ کا گولہ تھا۔ رفتہ رفتہ اُسمیں خُنکی اور انجماد کا عمل شروع ہوا۔ پھر جب عرصۂ دراز کے بعد ٹھوس اور سرد ہوا۔ تو پانی جو پہلے کرۂ ہوا میں تجاراتِ گرم یا بھاپ کے بادلوں میں تھا سمندروں میں نمودار ہوا۔ کئی لاکھ برس گزرنے کے بعد پانی میں پروٹوپلازم پیدا ہوا۔ جو جاندار مادّے کی ابتدائی صورت ہے۔ اِسی سے ہر قسم کے جاندار پیدا ہوئے ہیں۔ پروٹوپلازم کاربن اور ہیڈروجن۔ نائٹروجن اور آکسیجن سے مُرکّب ہے۔ اور اِسکے اندر جان ہوتی ہے۔ گو قدرت کے اندر بیجان مادّہ کی صورت میں پایا جاتا ہے۔ جس سے فقط یہ مُراد ہوتی ہے کہ متحرّک اور غیر متحرّک مادّے میں امتیاز کیا جائے۔ جب یہ خلیہ (CELL) کی حالت میں ہوتا ہے تو اِسکے اندر جان ہوتی ہے لیکن یہ بھی نہایت چھوٹے اجزا سے مُرکّب ہوتا ہے جسے اصطلاح میں سیاٹوڈز (CYTODES) کہتے ہیں۔ گویا جاندار مادّہ کی ابتدائی صورت سیاٹوڈز ہے اور دوسرا خلیہ یا ذرّہ ہے۔ پانی ہی کے اندر یہ سیاٹوڈز پیدا ہوا تھا۔ یہ سوال لاینحل ہے کہ بیجان سے جاندار مادّہ عملِ ارتقا سے کس طرح پیدا ہو گیا؟

ابتدائی مادہ نرم لعاب جیسا تھا - اس سے پانی کے اندر کی کائی بنی - پھر اس سے چھلکے دار مچھلیان بنین - پھر کیکڑے اور کیڑے پیدا ہوئے - اِنکے بعد مچھلیان نمودار ہوئین - اِن جانداروں کی ہڈیان مٹی کے ڈھیرون اور چٹانون کے اندر پائی جاتی ہین جو سمندر کے کنارون پر ریت اور مٹی کے اجتماع سے بنی ہین - زندگی پانی سے نکل کر خشکی پر نمودار ہوئی - جنگلات پیدا ہوئے - پھر وہ نابود ہوگئے - پتھر کا کوئلہ اُنھین دبے ہوئے جنگلون سے بنا ہے - ان جنگلون کے اندر حشرات تھے جن مین سے بعض بہت بڑے بڑے تھے - پھر رینگنے والے جاندار پیدا ہوئے - اِن مین سے بعض سو سو فٹ لمبے تھے - بعض گھاس پات اور بعض ماس کھاتے تھے - رینگنے والون مین سے پرندے پیدا ہوئے - اِن مین سب سے پہلے چمگادڑ جیسے تھے - مگر اِن کے بازو اور پر نہ تھے - اِنکے دانت لمبے لمبے تھے - پھر اصل پرندے نمودار ہوئے بعد مین آب وہوا مین انقلاب اہم واقع ہوا جسکی سردی سے رینگنے والے جانور مرگئے - ان مین سانپ گرگٹ اور گھڑیال وغیرہ تھے - پھر دودھ دینے والے جانور پیدا ہوئے جو ابتدا مین چوہے سے بڑے نہ تھے مگر بعد ازان کئی قسم کے جاندار معرضِ وجود مین آئے - ویل مچھلیان پانی مین جاکر تیرنے لگین - اور بندر درختون پر کودنے پھاندنے لگے - دودھ دینے والون مین بعض بڑے بڑے اور مہیب جانور تھے - اِسی قبیل کے جاندارون مین انسان کا مورث اعلیٰ بھی تھا -

معدوم جاندار طبقاتِ ارضیہ مین | اب سے لاکھون برس پہلے کے جاندار معدوم ہوچکے ہین - اُنکی ہڈیان شکمِ زمین اور چٹانون سے برآمد ہوئی ہین جنکی بنا پر ارتقا کا سلسلہ قائم کیا گیا ہے - ابتدائی سمندرون مین پانی کی ریت اور مٹی بھرنے سے زمین پیدا ہوتی رہی ہے - اور ٹھوس زمین کے مختلف تہون اور پہاڑون سے اندازہ کیا گیا ہے - اِن طبقاتِ ارضیہ کی مجموعی موٹائی ایک لاکھ تیس ہزار فٹ ہے - اور زیادہ سے زیادہ موٹائی تین لاکھ تینتیس ہزار فٹ تخمینہ کی گئی ہے - مختلف طبقات کی ترکیب مین کتنا عرصہ لگا تھا - اِسکا اندازہ کیا گیا ہے - اِس وقت بھی دریاؤن کے بہاؤ سے جو زمین بن رہی ہے اسکی بنا پر زمانۂ قدیم بعید مین طبقات کے ترکیب پذیر ہونے کا تخمینہ کیا گیا ہے - ماہرانِ ارضیات نے یہ حساب لگایا ہے کہ تین لاکھ پینتیس ہزار فٹ طبقاتِ ارضیہ نو کروڑ ساٹھ لاکھ برس مین بنے ہونگے - ماہرانِ طبیعیات کے سرتاج لارڈ کیلون نے طبعی اسباب کی بنا پر اُن کی ساخت دس کروڑ برسون مین شمار کی تھی - مگر حال ہی مین پروفیسر جالی نے ریڈیم کے خواص کو مدِنظر رکھکر یہ زمانہ بیالیس کروڑ سال قرار دیا ہے -

قصہ کوتاہ ماہرانِ سائنس کے خیال کے مطابق ابتدائی مادہ یا ہیولیٰ مین عمل ارتقا سے پہلے

مادّیات - پھر نباتات - پھر حیوانات اور اخیر مین انسان پیدا ہوئے - بیجان سے جاندار کیسے بنے - اور پھر حیوان سے انسان کیسے پیدا ہوئے؟ اِن سوالات کو سائنس حل کرنے سے قاصر ہے ماہرانِ سائنس مین اساسی اختلاف ہے کہ جس مین اُلجھنا ہمارے موجودہ مقصد سے خارج ہے -

عملِ ارتقا کے واسطے وسیع زمانے کا مطالبہ

عمل ارتقا کے سرگرم حامی انواع نباتی اور حیوانی اور انسانی کے استحالے کے واسطے وسیع اور ان گنت قرنون کا مطالبہ کرتے ہین اور ان مین ماہرانِ ارضیات کا تقاضا سب سے بڑا اور شدید ہے - جرمنی کے مشہور ماہر ارنسٹ ہیگل نے ۱۸۹۸ء مین زوآلوجی کے ماہرون کی کانگریس مین ایک مضمون پڑھتے ہوئے یہ بیان کیا تھا کہ "انواع کے مختلف مراحل کے ارتقا کے لیے ایک ارب سال کا عرصہ امر ضروری ہے" اِس پر ایک ماہر نے یہ حجت پیش کی کہ طبعیات کی رو سے آپ کو ڈھائی کرور برس سے زیادہ عرصہ نہین مِل سکتا - ہیگل نے اپنی مشہور تصنیف مین ہر قسم کی انواع کے جملہ مراحل ارتقا کے واسطے چار کرور اسّی لاکھ برس کا زمانہ تخمینہ کیا ہے - اور جاندار ہستیون کے واسطے تین کرور چالیس لاکھ سال اندازہ لگایا ہے - گویا زمانہ مال وقف ہے کہ جس سے ماہر عندالضرورت بے چون وچرا کام لے سکتے ہین - یہان پر ضمناً یہ بتا دینا بھی مناسب ہے کہ کرۂ ارض کی عمر زیادہ سے زیادہ ایک ارب اور کم از کم بیس کرور سال تخمینہ کی گئی ہے مختلف ماہرون کے جداگانہ تخمینہ جات ہین -

انسان نما جاندار کے نشانات

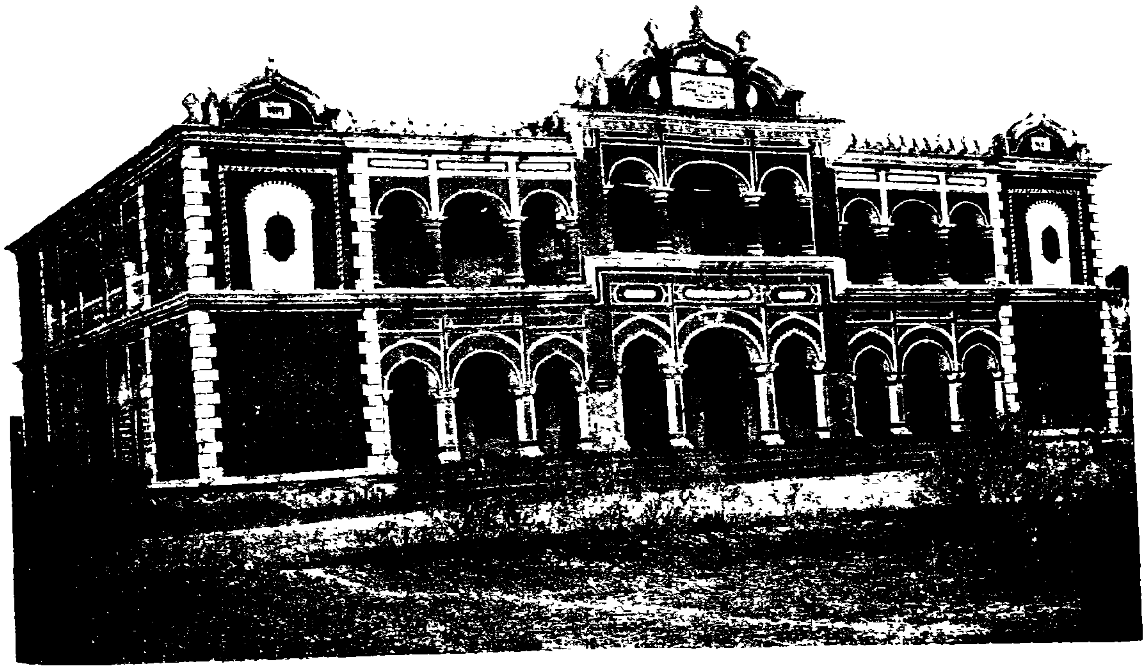
اب اِس سوال پر بحث کرنا ضروری ہے کہ انسان کب سے ہے؟ - شروع مین یہ بتا دینا ضروری ہے - کہ جسے ہم "انسان" کہتے ہین - اِسمین اور اُسکے ابتدائی اجداد مین زمین و آسمان کا فرق ہے - قوّتِ اِدراکیہ - احساس اخلاقی و رُوحانی - شعور - اور نطق اِس انسان کے بڑے بڑے خواص ہین - جنکا ثانی بن مانسون بندرون اور دیگر جاندارون مین نہین پایا جاتا حیوان اپنی بہیمیت مین مست ہے - مگر انسان اپنی حالت پر قانع نہین رہتا - اِسکے اندر جبلّی بے چینی اور ترقی کرنے کا مادّہ پایا جاتا ہے جس سے تمام جاندار بیگانہ ہین -

دنیا کے مختلف ملکون سے جو ہڈیان اور اوزار چقماق وغیرہ برآمد ہوئے ہین انھین ماہران انتھراپالوجی ایسے جانور سے منسوب کرتے ہین - جو انسان کے مانند تھا - اور حامیانِ ارتقا سے موجودہ انسان اور اعلےٰ درجے کے بن مانس کے درمیان سلسلہ قرار دیتے ہین -

جزیرۂ جاوا مین ۱۸۹۲ء مین ایک ولندیزی محقق کے ہاتھ ایک جاندار کی کھوپڑی کا اوپر کا حصہ دو سوئے اور ایک ران کی ہڈی آئی تھی جسے بن مانس اور انسان کے درمیانی سلسلے کا جاندار قرار دیا گیا تھا -



وہ جاندار جسکی ہڈیاں ہیڈلبرگ (جرمنی) سے دستیاب
ہوئی تھیں اس کا زمانہ دس چار لاکھ اندازہ کیا جاتا ہے —



دیوبند دار المحدثین کی دہرہ نوں

ران کی ہڈی سے یہ نتیجہ نکالا گیا تھا کہ وہ سیدھا چلنے والا تھا۔ مگر اسکے دماغ کی سمائی معمولی آدمی کے دماغ کی نسبت ⅔ کم تھی۔ ۱۹۰۷ء مین ماڈر۔ ہیڈل برگ (جرمنی) سے جبڑے کی ہڈی ملی تھی جس سے ماہرون نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ وہ کسی بڑے قد آور جاندار کی تھی جس کا سر بہت بڑا اور ہڈی سخت تھی اور وہ اپنی نسل کے اور جاندارون کی طرح کچھ بولنے چالنے کے قابل بھی تھا۔ اِسے یورپ کے آدمیون کے باوا آدم کا نمونہ تسلیم کیا گیا ہے۔ پلٹ ڈاؤن (برطانیہ) سے ۱۹۱۲ء مین کھوپڑی کا بڑا حصہ اور نچلا جبڑا اور پھر ایک داڑھ ملی تھی جسے ماہر انسان نما جاندار کی بتاتے ہین۔ اسکے دماغ کی سمائی حال کے تمدن سے سراسر بیگانہ وحشیون کے برابر قرار دی گئی ہے۔ مگر وہ آدمی کی طرح بولنے کی طاقت سے بے بہرہ تھا۔ اِسے انسان اور بن مانس کے درمیانی سلسلہ کی "کھوئی ہوئی کڑی" تسلیم کیا گیا ہے۔ ٹونگہ۔ ملک اوڈیشیا سے پانچ سات سال ہوئے۔ ایک اور جاندار کی ہڈیان برآمد ہوئی تھین وہ بھی انسان نما جاندار کی سمجھی جاتی ہین۔ تھوڑا ہی عرصہ ہوا کہ شملہ مین "اتھرسن انسٹیٹیوٹ" کے مہتمم ڈاکٹر ہرڈ لنکر نے لیکچر دیتے ہوئے یہ بیان کیا تھا کہ دُنیا کے مختلف عجائب خانون مین ایک سو پُرانے پنجر پائے جاتے ہین۔ پروفیسر کیتھ کا بیان ہے کہ تیس پنجر اور اُنکے اجزا برآمد ہو چکے ہین۔ جو متحجرات (FOSSILS) مین شمار ہوتے ہین۔

جاوا سے جو ہڈیان میسر آئی تھین اُنکی مدت پانچ لاکھ برس اندازہ کی گئی ہے۔ ہیڈل برگ کی ہڈیان اس سے بھی پرانی قرار دی گئی ہین۔ اور وہ جاندار پلیس ٹوسین یا زمانہ سیلاب ہائے برف سے پہلے کا سمجھا جاتا ہے۔ پلٹ ڈاؤن کے انسان نما جاندار کی عمر سات اور دس لاکھ کے درمیان اندازہ کی گئی ہے۔ ہیڈل برگ کے متحجرات جاوا اور پلٹ ڈاؤن کی ہڈیون کے درمیانی زمانے کے قرار دیے ہین۔ گویا یہ چھ سات لاکھ برس کے ہین۔ آسٹریلیا اور پاپائی نیشیا کے مردم خور لنکا اور نیوگنی کے ابتدائی باشندون کی قسم کے انسان یورپ مین اب سے دو چار لاکھ برس پہلے رہا کرتے تھے۔ نینڈرٹل (جرمنی) سے بھی ایک قسم کی ہڈیان نکلی تھین۔ جو یورپ کے ابتدائی انسان کی قرار دی گئی ہین۔ جسکے نشانات وسطی اور مغربی یورپ مین آسٹریا سے لے کر فرانس۔ جبرالٹر اور جزیرہ جرزی تک پائے جاتے ہین۔ انکی بابت مارٹ لکھتا ہے کہ نینڈرٹل کے نمونہ کے آدمیون کے سر بلا شبہ بن مانسون ایسے تھے۔ لیکن ان مین اتنا احساس تھا کہ وہ حیات بعد ممات پر اعتقاد رکھین۔ یہ آدمی پتھر کے اوزار بنانے مین ہوشیار تھے۔ ان کے مخالف اور معاصر شیر اور ریچھ تھے۔ جو ان کے رہنے کے غارون مین جا گھستے تھے اس وجہ سے دونون مین جانکاہ معرکہ ہوا کرتا تھا۔

انسان نما جانداروں کی قدامت

اس انسان نما جاندار کی قدامت کا تخمینہ جسکے نشانات ایشیا- یورپ اور افریقہ سے دستیاب ہوئے ہین- مختلف ماہرون نے مختلف کیا ہے - سر آرتھر کیتھ کا یہ بیان ہے کہ جیسے لوگ اب یورپ مین پائے جاتے ہین ویسے آدمی پانچ لاکھ برس پہلے بھی رہا کرتے تھے - پروفیسر آرتھر ٹامسن - ماہر بیالوجی کا یہ بیان ہے کہ دس لاکھ برس پیشتر موجودہ مہذب آدمیون جیسے انسان اس دنیا مین - رہا کرتے تھے - بعض ماہر انسان کی عمر بیس لاکھ سال اندازہ کرتے ہین-

مسئلہ کی صورت حال

اب یہ سوال ہمارے سامنے آتا ہے کہ جدید تحقیقات کی روشنی مین انسان کی قدامت پر کیا روشنی پڑتی ہے ؟ اس اہم سوال کا مختصر جواب یہ ہے- کہ انسان کی قدامت اتنی وسیع نہین ہے جتنی بعض ماہرین تصور کرتے ہین- اس امر کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ جب کوئی بات مشہور ہو جائے- تو اسکا ذہن سے نکلنا مشکل ہو جاتا ہے جسکی مشہور مثال یہ ہے - کہ بشپ آشر نے پیدائش انسان کا اندازہ چار ہزار برس قبل از سنہ عیسوی قائم کیا تھا- اس خیال نے جمہور غرب کے ذہن پر ایسا تصرف حاصل کر لیا ہے کہ باوجود وسیع سائنسی ترقیون کے اسی کا رواج قائم چلا جاتا ہے-

امریکہ کے ایک مشہور ماہر- پروفیسر جی ایف - رائٹ نے لانسنگ سے برآمد شدہ متحجرات پر رائے زنی کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ پچیس سال پہلے از روئے حقائق ارضیات جو وسیع قدامت انسان سے منسوب کی جاتی تھی- اب اس سے صاف روگردانی کی جاتی ہے- اس اثناء مین جو انقلاب خیالات مین واقع ہوا ہے اس سے ماہران انتھراپالوجی اور عالمان دینیات کما حقہ آشنا نہین ہین- پچاس سال پہلے جو قدامت انسان تسلیم کی جاتی تھی- اب اسکا نصف حصہ بھی مسلم نہین ہے- جو اہل قلم انسان کی عمر بہت وسیع قرار دیتے ہین- انکی معلومات دقیانوسی ۱۹۰۵ء زمرہ مین- سر آرتھر کیتھ نے اپنی مشہور تصنیف "قدامت انسان" مین ۱۹۱۵ء مین جو مدت انسان کے ارتقا کے لیے مقرر کی تھی- ۱۹۲۵ء کے جدید اڈیشن مین اس سے آدھی ضروری سمجھی- جس سے ظاہر ہے کہ جدید تحقیقات سے اس وسیع زمانے مین کتنی ترمیم ہو گئی ہے- ماہران طبیعیات اور نیز ارضیات عمل ارتقا کے لیے اب اتنی مدت ضروری خیال نہین کرتے- جتنی تیس چالیس سال پہلے لازمی سمجھی گئی تھی-

جیالوجی مین ایک دور عہد سیلاب ہائے برف (GACIAL PEYIOD.) کے اصطلاحی نام سے مشہور ہے- اس سے مراد یہ ہے کہ خاص مدت گذرنے کے بعد منطقہ بارد شمالیہ سے برف کے

خوفناک سیلاب آتے تھے - جو موجودات کو تباہ و برباد کر دیتے تھے - اب سوال یہ ہمارے سامنے آتا ہے کہ کیا انسان عہد سیلاب برف سے پہلے موجود تھا یا اُسکے وسطی حصے مین یا خاتمہ پر نمودار ہوا؟ -

کئی برس ہوئے کہ انتھراپالوجیکل انسٹیٹیوٹ لندن مین اس سوال پر غور کرنے کے واسطے مشہور ماہرون کا ایک خاص جلسہ منعقد ہوا تھا جس مین سر جوزف پریسٹ وچ پروفیسر بائڈ ڈاکنس - پروفیسر ہوز وغیرہ شریک ہوئے تھے - اتفاق راے سے یہ امر تسلیم کیا گیا کہ پلیس ٹوسین عہد کے دودھ دینے والے جانورون کی ہڈیون سے یہ ثابت نہین ہوتا کہ انسان کا کسی قسم کا تعلق عہد سیلابہائے برف سے ہے - یہ تو یورپ کی کیفیت ہے - امریکہ سے جو تحجرات برآمد ہوئے ہین - انکی بنا پر پروفیسر جی - ایف - رائٹ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہان پر انسان عہد یخ کے خاتمے کے بعد نمودار ہوا تھا - مگر بعض ماہرون کا یہ نظریہ ہے - کہ انسان کی ہستی اور اسکی صنعت کاری کے نشانات عہد پلایوسین (PLIOCENE) مین پائے گئے ہین " - لندن کوارٹرلی ریویو' مین چند سال ہوئے ایک ماہر نے گمنام مضمون لکھکر یون خیال آرائی کی تھی کہ " آیا انسان عہد ثالث (TERTIARY PERIOD) مین تھا؟ اس پر بحث کرنے کی چندان ضرورت نہین ہے - کیونکہ برطانیہ - فرانس اور امریکہ کی چوٹی کے ماہرون کی یہ راے ہے کہ اس زمانے مین انسان کی ہستی کا کوئی پتہ نہین چلتا - پروفیسر بائڈ ڈاکنس نے اپنی ایک نہایت مستند تصنیف مین یہ رائے ظاہر کی ہے - کہ عہد ہائے آی اوسین - مایوسین - اور پلائسٹوسین مین حیوانات کے درمیان انسان کا وجود نظر نہین آتا - بلکہ پلیس ٹوسین کے درمیانی حصے مین اسکی ہستی کے نشان دکھائی دیتے ہین - باوجود اسکے سیموئل لینگ یہ دعوی کرتا ہے - کہ انسان یا اُسکے مورث کی ہستی کا زبردست ثبوت اس زمانے مین ملتا ہے - جو نشانات دستیاب ہوئے ہین اُنکی بنا پر یہ نظریہ وثوق کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے - کہ انسان عہد سیلاب ہاے برف کے خاتمے پر نمودار ہوا تھا -

عہد سیلاب ہاے برف کا زمانہ

اب یہان پر دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے - کہ عہد یخ کب شروع ہوا - اور کب اسکا خاتمہ ہوا! امریکہ کے طبعی حالات کی چھان بین ماہرون نے بہت ہوشیاری سے کی ہے جسکی بنا پر پروفیسر رائٹ نے یہ تخمینہ لگایا ہے کہ عہد یخ کے قیام کی مدت پچیس ہزار سال ثابت ہوتی ہے - مگر اسکی بابت ماہرون مین سخت اختلاف رائے پایا جاتا ہے - بعض یہ کہتے ہین - کہ عہد یخ کے خاتمے پر کرہ ارض برف کے تودون سے مستور تھا - جسکی وجہ سے زندگی عرصے تک نمودار نہ ہوسکی - امریکہ کے آبشار نیاگرا کو ماہر مقیاس الزمان قرار دیتے ہین - انکی جانچ پڑتال بڑی صحت سے کی گئی ہے - امریکہ کے ماہران ارضیات نے بہت صحت سے سب باتون کا اندازہ کرکے یہ راے ظاہر کی ہے کہ یہ آبشار سات ہزار سال

سے چل رہے ہین - منیا پولس (اضلاعِ متحدہ) کے سینٹ انتھونی نام کے آبشارون کے مشاہدات عرصے تک ہوتے رہے - جس سے وہی نتیجہ مترتب ہوتا ہے - جو آبشار نیاگرا سے برآمد ہو چکا ہے - اس سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ یہ آبشار عہدِ یخ کے بعد شروع ہوئے تھے - جس رفتار سے پانی زمین اور چٹان کاٹ کر دونون طرف پھیلتا جاتا ہے - اس سے ان کے آغاز کا زمانہ آٹھ ہزار سال ثابت ہوتا ہے۔ اوہایو کے دریا کی گذرگاہ مین پروفیسر ہکس نے - انڈورمین پروفیسر رائٹ نے اور جھیل مشیگن کے کنارون پر شکاگو کے ماہر ڈاکٹر اے اینڈریوز نے عرصے تک مشاہدات کرکے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ وہان آخری سیلابِ یخ دس ہزار سال پہلے آیا تھا - آبشارون کی کاٹ چھانٹ - جھیلون کے کنارون پر ریت کے اجتماع - دریاؤن کے کنارون پر مٹی کی تہین جمنے سے یہ تخمینہ کیا گیا ہے - کہ عہدِ یخ آٹھ دس ہزار سال پہلے ختم ہوا تھا -

ماہرانِ طبیعیات کا قول ناطق

علاوہ برین ماہرانِ طبیعیات اور فلکیات انتھراپالوجی والون کو ارتقا کے عمل کی تکمیل کے لیے اتنا زمانہ دینے کو تیار نہین ہین - جتنا وہ باپ دادا کا ورثہ سمجھ کر طلب کرنے کے درپے رہتے ہین - کیمبرج کے نامی ماہر ڈاکٹر جارج ڈارون نے یہ خیال پیش کیا ہے کہ اُس وقت کرۂ ارض کی حالت ایسی نہ تھی جسکے رُو سے جاندارون کی زیست ممکن ہوتی موصوف ماہرانِ جیالوجی کو زیادہ سے زیادہ دس کروڑ سال دینے کو تیار ہین - پروفیسر ٹیٹ اور نیوکم نے دوسرے طریقے سے استدلال کرکے کروڑ ڈیڑھ کروڑ سال زیادہ وقت دینے سے صاف انکار کیا ہے - لارڈ کیلون نے سُورج کی عُمر دو کرور سال تخمینہ کی تھی - اس وجہ سے طبقاتِ ارضیہ کی ترکیب کے لیے ساٹھ لاکھ سال سے زیادہ مدت درکار نہین ہوتی - جسکے دَوران مین اِن جاندارون کا ارتقا مکمل ہوا تھا بلکہ ہڈیان اُن کے درمیان پیوست پائی گئی تھین - مگر ماہرانِ ارضیات اور انتھراپالوجی اپنے مطالبے ترمیم کرنے کے لیے تیار نہین ہین -

مشہور اہلِ قلم ایچ - جی - ویلز نے جو تاریخ مُرتّب کی ہے اُسکے ابتدائی باب کا آغاز پچاس ہزار سال کے انسانی تمدن اور اُسکے نشانات کے تذکرے سے ہوتا ہے - پروفیسر جان ہائی لینڈ نے اپنی تاریخِ تمدن مین بھی اسی نتیجہ کی طرف اشارہ کیا ہے - اِس بحث کا ماحصل یہ ہے کہ قدامتِ انسان بہت مختصر ہے - لاکھون برسون کا کیا ذکر ہے! اَب تو اکثر ماہر چند ہزار برس کا زمانہ موجودہ انسان اور اسکی صنعت کاریون کے لیے مقرر کرتے ہین - ماہرون نے متحجرات کی قدامت کے لیے جو عہد مقرر کیے ہین انکی میعاد کی بابت اتفاقِ رائے ہے - ان کے نام پہلے زنگ یعنی ابتدائی

میوزوٹک یعنی وسطی زمانہ۔ اور کینوزوئک یعنی بالائی زمانہ ہے۔ انسان کی ہستی کے نشان اس آخری دور میں ملتے ہیں۔ اگر لارڈ کیلون کا تخمینہ در بارۂ عمر آفتاب درست ہو۔ تو بالائی دور کی مدت دھائی لاکھ برس ظاہر ہوتی ہے۔ اگر ای۔ اوسین۔ مائیوسین اور پلائیوسین کے قرنوں کی مدت منہا کردی جائے تو بمشکل ایک لاکھ سال کا زمانہ مرتب ہوتا ہے۔ اگر پلیسٹوسین او عہد سیلاب ہائے برف کی مدت بھی محذوف کردی جائے۔ تو پھر وہی مدت نکلتی ہے۔ جو ماہران برطانیہ اور امریکہ نے عہد تاریخ کے ناپنے کے واسطے مقرر کی ہے۔ بالفاظ دیگر قدامت انسان (جس میں وہ انسان نا جائز شامل ہیں۔ جنکی ہڈیاں جاوا۔ ہیڈل برگ۔ پلٹ ڈاؤن وغیرہ سے برآمد ہوئی ہیں) دس بیس لاکھ سال کے بجائے پندرہ بیس ہزار برس سے زیادہ نہیں ثابت ہوتی۔ جسکی تائید ارکیالوجی کے انکشافات سے بھی ہوتی ہے۔

رسیدِ کتب

اسلامی لغت۔ (جلد اوّل) از سید حامد حسین رضوی۔ قیمت ۱۲؍

واقعاتِ عالم۔ از حضرت بادشاہ مرحوم رئیس دانمباڑی۔ قیمت ۴؍

تذکارِ سلف۔ از مسٹر ضیاء الدین احمد ایم۔ اے۔

گڑیا کا گھر۔ از مسٹر عبدالشکور ایم۔ اے۔

تواریخ انگلستان (اردو) مترجم مسٹر سالگ رام ورما۔ بی۔ ایس۔ سی۔ قیمت ۱۲؍

سلطنت ہندوستان اور لنکا۔ (اردو) از مسٹر سی۔ مارسن ایم۔ اے۔

آنند مٹھ۔ (ہندی) از مسٹر بنکم چٹرجی۔ قیمت ۱۲؍

اردو شاعری کی نیتی شاعری (ہندی) از چودھری شیونا تھ سنگھ۔ قیمت ۶؍

چوگانِ ہستی۔ (حصۂ اوّل و دوم) از منشی پریم چند۔

بقائے دوام۔ از مسٹر ایم۔ اسلم۔ قیمت ۸؍

تاریخ اخلاقِ یورپ۔ از مسٹر عبدالماجد بی۔ اے۔ قیمت ۷؍

وقائع عالمگیری۔ از چودھری نبی احمد سندیلوی۔ قیمت ۶؍

پتھر سے ہیرا۔ از ڈاکٹر سعید احمد بریلوی۔

حضرت امیر خسرو دہلوی

(۲)

از پروفیسر محمد حبیب بی اے (آکسن) پروفیسر مسلم یونیورسٹی

(مترجمہ جناب محمد داؤد خاں خوشگی خورجوی)

جدید شہنشاہ جلال الدین خلجی، امیر خسرو کا پرانا قدر شناس تھا اور کئی سال پہلے ہی ان کو امیر لاچین، کا موروثی فوجی منصب عطا کرچکا تھا جسکے سبب سے خسرو کو امیر کا خطاب ملا اور بارہ سو ٹنکے سالانہ وظیفہ بھی مقرر ہو گیا، جلال الدین کے تخت نشیں ہوتے ہی امیر خسرو عروج کی آخری سیڑھی پر پہنچ گئے چنانچہ بادشاہ نے انکو مصحف داری اور امارت کے عہدہ سے سرفراز فرمایا۔ اسکے ساتھ جامہ اور کمر بند جو امرا دربار کا مخصوص لباس تھا انکو عطا کیا۔ اگرچہ جلال الدین کی عمر ستر سال کی ہوگئی تھی لیکن وہ بامذاق اور عالم لوگوں کی صحبت کا دلدادہ تھا۔ اسکے طبع زاد اشعار اگرچہ بلند پایہ نہ ہوتے تھے لیکن انہیں بہ نسبت ایجاد کے انتقاد کا مادہ زیادہ رہتا تھا۔ اسکے دربار میں ملک کے بہترین مطرب مغنی اور ناچنے والی لڑکیاں موجود تھیں اور اسکی مجالس عیش و طرب ایسی ہوتی تھیں کہ انکی مثال صرف خواب ہی میں دیکھنا ممکن تھا۔ اسکی مجلس میں جب شراب کا دور چلتا، مطرب سرود نوازی سے حاضرین کو خوش کرتے اور ارباب نشاط رقص کرتیں تو خسرو کے اشعار بھی مردہ دلوں کو حیات تازہ اور باذاق لوگوں کو مسرت بے اندازہ بخشتے تھے۔ قصائد اور غزلیات کے علاوہ امیر نے جلال الدین خلجی کی تمام فتوحات نظم کیں اور "مفتاح الفتوح" نام رکھکر بادشاہ کو پیش کی بدقسمتی سے خسرو کے پہلے آقاؤں میں سے دو یعنی ملک چھجو اور حاتم خاں نے خلجی سلطان کے خلاف بغاوت کی اور سوء اتفاق کہ امیر نے اپنا سابق طریقہ بدل دیا اور جلال الدین کو باغیوں کی شکست پر مبارکباد دی لیکن انکی تقدیر میں جلد ہی اس سے بھی زیادہ تلخ تجربہ اٹھانا لکھا تھا۔

۱۶ رمضان ۶۹۵ھ مطابق ۱۴ رجولائی ۱۲۸۹ء کو شہنشاہ کے بھتیجے اور داماد ملک علاء الدین نے اپنے چچا کو گنگا کے کنارے کڑا (الہ آباد) کے قریب قتل کر دیا۔ تاریخ کے ہولناک گناہوں میں یہ قتل ایک نہایت بیرحمانہ اور کمینہ واقعہ ہے۔ جلال الدین نے اس بھتیجے کو اپنے فرزند حقیقی کی طرح پرورش کیا تھا، اسکو اسپر یہانتک اعتماد تھا کہ بغیر کسی فوج وغیرہ کے وہ اسکے خیمہ میں اس سے ملنے چلا گیا۔ جب فتحار الدین محمد جلال الدین

کی طرف دوڑا اور اسکا سر تن سے جدا کیا تو شہنشاہ کی زبان سے یہ آخری الفاظ نکلے تھے "اے نمک حرام علاء الدین یہ تو نے کیا چال چلی؟" مرتے دم تک سلطان کی زبان پر کلمہ طیبہ جاری رہا۔ علاء الدین نے اپنے اس ظالمانہ قتل کی وجوہات بتانا نامناسب سمجھا۔ اس نے زر و جواہر لٹا کر لوگوں کو اپنے موافق کر لیا اور اصلاحات سیاسی و معاشی سے ملک میں امن و امان قائم کیا۔ علاء الدین کے تخت نشین ہوتے ہی حکومت کا طرز عمل بہت خوفناک ہوگیا۔ سب پرانی باتیں منسوخ نابود ہوگئیں اور ہر ایک چیز کو سلطان کی تیز فہم نے ایک نئے سانچہ میں ڈھال دیا۔ اور دیگر مصاحبین کی طرح امیر خسرو نے بھی اپنے آپ کو نئے بادشاہ کے سامنے پیش کر دیا ممکن ہے کہ وہ سلطان کے اس سنگدلی کے ساتھ قتل کیے جانے پر علاء الدین کے خلاف ہوں لیکن بظاہر انکی زبان پر مخالفت کا کوئی لفظ نہیں آیا۔ انکی ملک الشعرائی پر کسیکو اعتراض نہ تھا۔ جلال الدین کے دوسرے درباریوں کے ساتھ ساتھ خسرو کو بھی ایک بلند ترین شاعر کا درجہ دیا گیا۔ موجودہ شہنشاہ کوئی عالم یا مہذب آدمی نہ تھا۔ برنی نے اسپر خسرو کی بیقدری کا الزام لگایا ہے۔ اسکی رائے میں اگر محمود یا سنجر کے زمانہ میں امیر خسرو جیسا شاعر موجود ہوتا تو اسکو جاگیر وصوبہ داری عطا ہوئی ہوتی۔ بڑے بڑے منصب دیئے جاتے لیکن علاء الدین نے اس باکمال شاعر کے شان و شکوہ کا بالکل خیال نہ کیا۔ اس نے صرف ایک ہزار ٹنکے کا وظیفہ جو اسے مل چکا تھا جاری رکھنا ہی کافی سمجھا۔ علاء الدین خلجی بڑا تجربہ کار اور عقلمند آدمی تھا وہ صوبہ داری کا ذمہ دار عہدہ شاعروں کو دینا پسند نہ کرتا تھا۔ وہ لوگوں کے معاشی حالات کو نئے پیرایہ میں ترتیب دینے میں جوش و خروش کے ساتھ مشغول تھا اس لیے اسکو شاعروں کا گروہ جو اسکی نظر میں بیکار تھا کچھ زیادہ عزیز نہ تھا۔ اسی لیے وہ انکے ساتھ زیادہ سخاوت سے پیش نہ آیا۔ تاہم وہ خسرو پر کافی مہربان تھا اور انکی محنتوں اور کوششوں کا ہمیشہ کچھ نہ کچھ صلہ دیتا رہا۔ اس زمانہ میں خسرو کی شاعری کو زیادہ عروج حاصل ہوا کیونکہ ان دنوں کے قصیدے زیادہ پرجوش اور قابل قدر ہیں۔ شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ علاء الدین بحیثیت بادشاہ کے واقعی خسرو کی تعریف کے قابل بھی تھا اس کے گذشتہ مربی ملک چھجو بغراخاں جلال الدین اور سلطان محمد سب معمولی آدمی تھے اور ان سب کا جاہ و مرتبہ نہی حیثیت سے حاصل ہوا تھا لیکن علاء الدین واقعی ایک لائق و بہادر شخص تھا، چنانچہ امیر خسرو بھی اسکی قابلیت و جامعیت سے متاثر ہو کر نہایت بلند و موثر الفاظ میں اسکی تعریف کرتے تھے جو قصیدے ہمارے قرون وسطی کے بہترین شاعر نے اس زمانہ کے بہترین شہنشاہ کی تعریف میں لکھے ہیں انمیں ایک خاص قسم کی شان رفعت اور بلندی ہے۔

غرض علاء الدین کی بست سالہ حکومت کا زمانہ امیر خسرو کیواسطے نہایت اچھا ثابت ہوا۔ ایک طرف بادشاہ ملکی اصلاح میں منہمک تھا اور دوسری طرف امیر خسرو کی شاعری حیرت انگیز رفتار کے ساتھ ترقی کر رہی تھی۔ صرف

تین سال کے عرصہ میں ۶۹۸ تا ۷۰۱ھ مطابق ۱۲۹۸ تا ۱۳۰۱ء) اُنھوں نے اپنی پانچ مثنویاں مطلع الانوار، شیریں خسرو، لیلا مجنوں، آئین سکندری اور ہشت بہشت جو مجموعی طور پر "پنج گنج" کہلاتی ہیں اختتام کو پہنچائیں۔ یہ مثنویاں شیخ نظام الدین اولیا کے نام پر معنون کی گئی ہیں اور پھر علاء الدین کے حضور میں بطور ہدیہ پیش کی گئیں۔ جب وہ اپنی تیسری مثنوی لیلا مجنوں لکھ رہے تھے تو انکو اپنی والدہ اور چھوٹے بھائی کی جدائی کا صدمہ جانکاہ اُٹھانا پڑا۔ امیر خسرو کہتے ہیں کہ اس سال میری فضا سے دو ستارے غائب ہوگئے اور اسکو اسطرح ادا کرتے ہیں۔

امسال دو نور ز اخترم رفت ہم مادر و ہم برادرم رفت
لے مادر من کجائی آخر روی از چہ نمی نمائی آخر
خندان ز دل زمیں برون آی برگریۂ زار من بہ بخشائی

آگے چلکر بچپن کے حالات کا ذکر ہے اور کہتے ہیں کہ "میں بچپن میں بڑا شوخ اور گستاخ تھا لیکن تم مجھ سے محبت سے پیش آتی تھیں اور اب جبکہ میں اپنے گذشتہ کاموں پر نادم و شرمندہ ہوں تم سے کس طرح معافی مانگوں۔ جب تک آدمی کسی چیز سے بہرہ مند رہتا ہے اسوقت تک وہ اسکی اہمیت کو نہیں پہچانتا لیکن جب اس کو کھو بیٹھتا ہے تو ہاتھ ملنے لگتا ہے، گو پھر وہ چیز حاصل نہیں ہوتی۔ تمہاری نصیحت سے مجھ کو ہر قسم کی تقویت تھی تمہارے ساتھ ساتھ تمہارا لڑکا اور میرا بھائی قطلغ بھی چلا گیا۔ وہ جنگی قواعد کی سب منزلیں طے کر چکا تھا۔ والد ماجد کی طرح میدان جنگ میں بڑی بہادری سے حملہ کرتا تھا۔ میری طرح کبھی میدان جنگ میں ایک تلوار شکستہ لیے ہوئے پیچھے نہیں رہا۔" آگے چلکر ماں سے کہتے ہیں کہ "لیکن یہ تو بتاؤ کہ قبر میں بغیر یار و ہمدرد کے اکیلے کیسے گذرتی ہے۔" پھر بیقراری کے ساتھ درخواست کرتے ہیں کہ "مجھ کو اپنا چہرہ تو دکھا دو۔ اسکو مجھ سے کیوں چھپاتی ہو۔ اپنے اس خواب طولانی سے جاگ اُٹھو اور اگر میری اس چشم ظاہر بیں سے دور ہو تو کم از کم خواب میں ہی آجاؤ۔"

اس صدمہ کے باوجود بھی خسرو نے اپنی مثنویوں کو انجام تک پہنچا دیا۔ "ہشت بہشت" کے آخر میں وہ کہتے ہیں کہ "خدا کا شکر ہے کہ اس نے خزانۂ غیب سے میرے ہاتھوں میں اسقدر جواہرات بھر دیے کہ میں نے ان سے اپنے "پنج گنج" کو تین سال کے عرصہ میں آراستہ کر دیا چونکہ اب یہ عمارت پوری ہو گئی اس لیے اب مجھکو اپنی زندگی کے فانی ہونیکی بھی پروا نہ رہی۔" ممکن تھا کہ کسی کم حوصلہ اور کم ہمت شاعر کو پانچ مثنویاں خاطر جمع کرنے کیواسطے کافی ہو جاتیں لیکن خسرو کا زور طبع کم نہ ہوا۔ اس خوف سے کہ انکے نکتہ چیں انکو محض ایک شاعر سمجھ کر انکی اہمیت کم کر دینگے اب وہ نثر کی طرف متوجہ ہوئے اور مختلف کتابیں تصنیف کیں۔ سب سے پہلی "خزائن الفتوح" علاء الدین کی جنگی تاریخ کے متعلق ایک چھوٹی سی کتاب ہے۔ دوسری اعجاز خسروی

پانچ جلدوں میں ہے۔ اسمیں صنائع لفظی پر بحث کی گئی ہے۔ علاء الدین کے آخری وقت میں خسرو کی بہترین تاریخی مثنوی "دول رانی خضر خانی" تیار ہوئی جسکو مرور زمانہ نے غم کا لباس پہنا دیا۔

کوئی تذکرہ نویس شیخ نظام الدین اولیا کے اثر کو جو امیر خسرو پر پڑا تھا نظر انداز نہیں کر سکتا۔ حالانکہ دونوں کے مزاج اور طرز زندگی ایک دوسرے کے برعکس تھے لیکن دونوں ایک دوسرے سے نہایت صداقت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ دونوں کا ابتدائی طرز زندگی ایک دوسرے سے جدا رہا۔ شیخ نظام الدین کے جد بزرگ خواجہ سید علی بخارا کو چھوڑ کر بدایوں میں آکر رہے تھے۔ اور یہیں پر شیخ نظام الدینؒ ۶۳۶ھ مطابق ۱۲۳۸ء میں پیدا ہوئے۔ جب وہ بچہ ہی تھے تو سید احمد بیمار ہوئے اور انکی والدہ بی بی زلیخا کو خواب میں ایسا معلوم ہوا کہ ایک آواز ان سے کہتی ہے کہ اپنے لڑکے اور خاوند میں سے ایک کسی کو پسند کرو۔ بحیثیت ایک ہندوستانی ماں کے جسکو اپنے لڑکے سے دیوانہ وار محبت ہوتی ہے انھوں نے اپنے فرزند کی ہی حفاظت کرنا مناسب سمجھا۔ تقدیر کا لکھا پورا ہونا تھا اس لیے جلد ہی سید احمد عالم بقا کو رحلت کر گئے۔ بی بی زلیخا ایک نہایت پاکدامن عورت تھیں انکے پاکیزہ عقائد سے انکے لڑکے نظام الدینؒ نہایت متاثر ہوئے۔ فرط محبت سے بی بی زلیخا اپنے فرزند کی پرستش بھی کرنے لگی تھیں۔ انھوں نے ناداری و افسردہ حالی کے باوجود بھی اپنے لڑکے کے واسطے اعلیٰ درجہ کی تعلیم کا انتظام کیا۔ دونوں ماں اور بیٹے کا پڑوسیوں کی سخاوت کے سوا کوئی ذریعہ معاش نہ تھا انکی لونڈی بھی وہاں سے بھاگ گئی، لیکن ان دشواریوں کے باوجود شیخ نے اپنے ذوق تحصیل علم و محنت کی بدولت مقامی حیثیت سے جو اعلیٰ تعلیم حاصل کی جا سکتی تھی کی اور سولہ سال عمر میں اپنی والدہ اور خواہر کے ساتھ تکمیل تعلیم کے لیئے دہلی چلے گئے۔ اس زمانہ میں دہلی بڑے بڑے علما و فضلا کا مرکز بنا ہوا تھا اور تعلیم مفت دیجاتی تھی اور شیخ جیسے ذہین طالبعلم کو تو بڑے بڑے استادوں سے افادہ کرنیکا شرف حاصل ہو سکتا تھا۔ انکے خاص استاد مولانا کمال الدین زاہد تھے جو اپنی آزادئ طبع کے واسطے مشہور ہیں، کہا جاتا ہے کہ مولانا زاہد کے زہد و عبادت کا مال سنکر سلطان غیاث الدین بلبن نے انکو اپنے دربار میں بلایا اور امام اکبر کا منصب پیش کیا۔ مولانا نے جواب دیا کہ ہمارے پاس صرف ایک دعا ہی رہ گئی ہے کیا سلطان اسکو بھی ہم سے چھیننا چاہتا ہے۔ اس جواب سے بادشاہ خاموش ہو گیا۔ اور معافی مانگنے کے بعد انکو واپس جانے کی اجازت دیدی۔ ایسے بڑے عالم سے شیخ نظام الدین نے تکمیل علم کی سند بیس سال کی عمر میں حاصل کی اور شاید دنیوی جاہ سے استغنا اور بے پروائی بھی جو انکا خمیر زندگی تھا انھیں سے حاصل کی تھی۔

حالانکہ انھوں نے ہر قسم کا علم حاصل کیا لیکن انکا اصل میلان طبع تصوف ہی کی طرف تھا۔ انھوں نے اپنے ہمنشینوں کو سمجھا دیا تھا کہ وہ انکے ادبی مباحث میں زیادہ عرصہ تک حصہ نہیں لے سکتے۔ جب وہ بارہ سال

کے تھے تو انھوں نے ایک قوال کو شیخ فرید گنج شکرؒ کی تعریف کرتے ہوئے سنا تھا اور اسیوقت سے انکی عزت ذ انکے دل میں گھر کر گیا تھا اس لیے جیسے ہی وہ تعلیم سے فارغ ہوئے سب سے پہلے ان سے ملنے گئے مگر وہاں جاکر خوف کے مارے بول نہ سکے۔ یہ حالت دیکھکر شیخ فریدؒ نے انکو اطمینان دلایا کہ ہر شخص کی یہی حالت ہوتی ہے چنانچہ شیخ نظام الدینؒ انکے مریدوں میں داخل ہوگئے۔ اسوقت انکے پاس ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ ایک مہربان عورت نے انکے میلے کپڑے جو پہننے کے قابل نہ رہے تھے دھودیے۔ دہلی واپس آتے وقت شیخ فریدؒ نے انھیں ایک اشرفی دی۔ شیخ صاحب مع صرف کے گھر میں اسوقت صرف وہی اشرفی تھی اور اسی شام کو شیخ نظام الدینؒ کو معلوم ہوا کہ انکے مرشد کو مع خاندان کے فاقہ سے رہنا ہوگا شیخ نے اس تحفہ کو پھر اپنے پیر کو پیش کیا۔ اُنھوں نے اسکو احسانمندی کے ساتھ قبول کرلیا۔ شیخ فریدؒ نے پھر اپنے نوآمدہ مرید سے فرمایا کہ میں نے خدا سے تمھاری دنیوی بہتری کے واسطے دعا کی ہے لیکن جب انکے چہرہ پر پریشانی کے آثار دیکھے تو کہا کہ اسکے بارے میں کوئی فکر نہ کرو تمھارا میلان دنیا کی طرف نہ ہوگا۔ واقعی انکی مبصر اور باریک بین آنکھوں نے اپنے مرید کی عظمت و بزرگی کا اُسیوقت اندازہ کرلیا تھا۔

دنیا کے ہر ایک مذہب میں چند ایسے مشہور لوگ گذرے ہیں جنھوں نے اپنی ساری عمر دنیا سے علحدہ رہکر گذاردی اور متواتر دنیاوی کشمکش کا مقابلہ کیا اور ایک بڑی حد تک اسمیں کامیاب ہوئے لیکن شیخ نظام الدینؒ ایسے آدمی نہ تھے۔ کسی تذکرے میں بھی انکی بیحد اور تعجب انگیز عبادت و ریاضت کا ذکر نہیں ہے۔ انکو شیخ فریدؒ کا کثرت سے روزہ رکھنا اور طرح طرح کی سختیاں برداشت کرکے قریب مرگ ہوجانا قطعی پسند نہ تھا۔ انمیں مجاہدات نفسی کا شایبہ بھی نہ تھا کیونکہ وہ اسکی کوئی ضرورت ہی محسوس نہ کرتے تھے۔ وہ ریاضت نہ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اس سے ایک قسم کی دنیا سے نفرت ہوجاتی ہے اور طبیعت پر برا اثر ہوتا ہے۔ خوشدلی انکی خاص عادت تھی۔ نہ کبھی اُنھوں نے شادی کی اور نہ اپنے واسطے کوئی مکان خریدا۔ رات بھر کی عبادت کے بعد انکی آنکھیں ایک مخمور کے مانند سرخ ہوجاتی تھیں، اور انکے چہرہ سے خوشی کے آثار نمایاں ہوتے تھے لیکن اس اندرونی خوشی کی کوئی ظاہری وجہ نہ تھی۔

شیخ فریدالدینؒ نے ایک موقعہ پر ان سے فرمایا کہ میں نے ہندوستان کی روحانی سلطنت تمکو دیدی ہے جاؤ اور اس پر قبضہ کرلو۔ لیکن جب شیخ نظام الدینؒ دہلی لوٹے اسوقت تک اُنھوں نے اسکے بارے میں کوئی تصفیہ نہ کیا تھا کہ آیا انکو ملکی دارالسلطنت یا کسی صوبہ کے دارالسلطنت میں قیام پذیر ہونا چاہیئے۔ صرف یہی ایک ایسا امر معلوم ہوتا ہے جسپر شیخ موصوف کو بہت کچھ غور کرنا پڑا لیکن اُنھوں نے بہت جلد اس معاملہ کو طے کرلیا اور آخر کار دہلی کو ہی اپنا دارالقیام قرار دیا۔ بیاسی برس سال متواتر مفلسی میں گذرے اوّل وہ

امیر خسرو کے نانا عماد الملک کے یہاں رہے لیکن دو سال بعد عماد الملک کے لڑکے دہلی واپس آگئے اور اُنھوں نے بہت جلد شیخ موصوف کو اپنے مکان سے علٰحدہ کر دیا۔ یہاں سے وہ ایک غیر آباد مسجد میں چلے گئے لیکن خدائی قدرت دیکھئے کہ اسی رات کو عماد الملک کا مکان جلکر خاک ہوگیا۔ اسوقت سے وہ تمام ہندوستان میں گشت کرتے رہے حتی کہ آخر کار اُنھوں نے غیاث پور میں قیام کیا اور آخری دم تک وہیں رہے۔ نہ تو انکا کوئی ذریعہ معاش تھا اور نہ اُنھوں نے کبھی کسی سے التجا کرنیکی بیعزتی گوارا کی۔ اپنی آخری عمر میں شیخ موصوف کہا کرتے تھے کہ غیاث الدین بلبن کے زمانہ میں ایک جیتل کے من بھر تربوز آتے تھے لیکن پھر بھی اکثر سارا موسم گذر جاتا تھا اور میں اسکا ایک ٹکڑا بھی نہ کھاتا تھا۔ وہ فرماتے تھے۔ کہ ایک مرتبہ مجھ کو تمام رات اور تمام دن اور دوسری آدھی رات بھی فاقہ میں گذری حالانکہ ایک جیتل کی دو سیر روٹی آتی تھی لیکن مفلسی کے سبب سے اُسکو خرید نہ سکتا تھا اور میرے ساتھ میری والدہ اور بہنوں کو بھی مصیبت برداشت کرنی پڑتی تھی۔ انکا بیان ہے کہ ایک مرتبہ تین روز سے فاقہ ہو رہا تھا کہ ایک آدمی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور کھچڑی کا ایک پیالہ دیا۔ واقعی اسوقت اس کھچڑی میں جو مزہ تھا آجتک اور کسی چیز میں نہیں ملا۔ جب ہمارے گھر میں کچھ کھانیکے واسطے نہ ہوتا تھا تو میری والدہ فرمایا کرتی تھیں کہ آج ہم خدائے پاک کے مہمان ہیں۔ ایکمرتبہ میں نے خواب میں دیکھا کہ شیخ نجیب الدین برادر شیخ فریدؒ ہمارے مکان پر آئے اور میں نے اپنی والدہ سے انکے واسطے کچھ کھانا تیار کرنے کو کہا لیکن اُنھوں نے جواب دیا کہ گھر میں کچھ بھی نہیں ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں نے دیکھا کہ حضور سرور عالمؐ مع اپنے صحابیوں کے آتے ہیں میں نے انکے قدموں کو بوسہ دیا اور اپنے غریب خانہ پر چلنے کی درخواست کی۔ اُنھوں نے فرمایا کس لیے۔ میں نے کہا جو کچھ مقدور ہے اسکو آپکے اور صحابیوں کے سامنے پیش کرونگا۔ حضورؐ نے جواب دیا کہ ابھی تو تمھاری والدہ نے تم سے کہا ہے کہ گھر میں کچھ بھی کھانے کو نہیں ہے۔ اس پر میں بہت شرمندہ ہوا۔

انکی معزز والدہ نے ان سب مصائب کا نہایت دلیری سے مقابلہ کیا۔ انکو ایسا اطمینان قلب حاصل تھا کہ کوئی دنیوی مصیبت یا تکلیف اسمیں خلل انداز نہ ہوسکتی تھی، لیکن پیہم فاقہ کشی انکے واسطے مضر صحت ثابت ہوئی۔ انکی والدہ نے اپنی مہلک بیماری کی آخری حالت میں جبکہ شیخ موصوف نے ہلال کے ظہور پر انکے پیر کو بوسہ دیا تو فرمایا کہ "اے نظام اب اگلے مہینہ تم کسکے پیروں کو بوسہ دوگے" شیخ صاحب نے پوچھا کہ "اماں تم مجھ کو کسکی حفاظت میں چھوڑدوگی" صبح کو اندھیرے ہی انکی والدہ نے انکو اپنے پاس بلاکر انکا ہاتھ پکڑکر فرمایا کہ "اے خدا میں اپنے لڑکے کو تیری سپرد کرتی ہوں" اور یہی کہتے کہتے عالم جاودانی کو سدھار گئیں۔

اس عرصہ میں شیخ موصوف کی شہرت دور دور پھیل گئی تھی اور جو شخص بھی ان سے ملتا وہ اس عجیب خوشی کی وجہ سے جو کہ انکے چہرہ سے ہر وقت نمایاں رہتی تھی، انکا بندہ ہوجاتا تھا۔ ۶۶۶ھ میں شیخ فریدؒ نے

انکو اپنا مرید خاص بنایا اور اپنے مرنے سے کچھ مدت پہلے اپنا فرغل، عصا اور بوریائے نماز شیخ نظام الدینؒ کے یہاں بیجانے کا حکم دیا۔ اسپر انکے اہل خاندان کو نہایت تعجب اور رنج ہوا۔ سلطان جلال الدین نے انکے خرچ کے واسطے ایک پورا گاؤں پیش کیا، لیکن مریدوں کے اعتراض کے باوجود بھی اُنھوں نے انکار کردیا، پھر سلطان نے ملاقات کی درخواست کی لیکن اسکی بھی اجازت نہ دی۔ آخر کار جب سلطان نے بلا اطلاع انکے یہاں جانیکا ارادہ کیا تو امیر خسرو کی زبانی معلوم ہوجانے پر اُنھوں نے اس ملاقات سے بچنے کے واسطے اجودھن کا سفر اختیار کیا۔ شیخ نے سیاسی معاملات سے علٰحدہ رہنے کا مصمم ارادہ کرلیا تھا اور اب اسکو کسی طرح سے بھی نہ بدل سکتے تھے لیکن پھر بھی ایک ایسے معلم کے واسطے جس نے اپنا دروازہ ہر خاص وعام کے واسطے کھول رکھا ہو، سیاسی لوگوں کو اپنی مریدی سے علٰحدہ رکھنا ناممکن تھا۔ علاء الدین کے زمانہ حکومت کے شروع ہی میں شرفا اور اُمرا انکی خانقاہ غیاث پور میں آنے لگے تھے۔ انکی آمد سے شیخ صاحب گھبرا لئے لیکن پھر بھی منع نہ کر سکتے تھے۔ آہستہ آہستہ انکی تعداد ترقی پذیر ہوتی گئی۔ علاء الدین کے آخری زمانہ میں انکی شہرت بہت زیادہ ہوگئی تھی۔ خضر خاں ولیعہد شیخ صاحب کا پکا معتقد ہوگیا اور شاہی خاندان کا ہر ایک فرد بشر حتیٰ کہ ملازم بھی انکے دائرہ مریدی میں داخل ہوگئے۔ ایک صرف سلطان ہی بچے ہوئے تھے۔ برنی فرماتے ہیں کہ علاؤالدین کیسا سخت دل، لاپروا اور دلیر تھا کہ ہزاروں میل سے برنا و پیر۔ عالم و جاہل عقلمند و بیوقوف سب شیخ کی خدمت میں چلے آتے تھے لیکن علاء الدین کو کبھی یہ خیال نہ آیا کہ یا تو خود ان سے ملنے جانا چاہیئے یا انکو اپنے دربار میں مدعو کرے۔ واقعی بات یہ ہے کہ بادشاہ اور شیخ صاحب دونوں اپنے اپنے کام میں کامل تھے اور ایک کو دوسرے سے باہمی عزت کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ جتنا کہ شیخ سیاسی لوگوں سے گھبراتے تھے اتنا ہی علاء الدین درویشوں سے علٰحدہ رہنا پسند کرتا تھا اس نے اپنے گناہ آلودہ زانوؤں کو صرف ایک خدا کی ذات واحد کے سامنے جھکانے کا ارادہ کرلیا تھا۔

اب شیخ صاحب نے اپنا در فیض ہر شخص کے واسطے وا کردیا تھا۔ کیا اُمرا و عوام۔ امیر و غریب۔ ملک و فقیر، طلبا، علما و جہلا، شہری و دیہاتی، اور سپاہی پیشہ وغیرہ سب انکے دائرۂ مریدی میں داخل ہوگئے۔ نظام الدینؒ کا کام سب لوگوں کو نیکی اور بھلائی کی تعلیم دینا تھا اور اس کام کو شیخ نے اپنی تمام عمر نہایت کوشش کے ساتھ انجام دیا۔ ہر درجہ کے لوگ انکی خانقاہ میں آتے تھے اور وہ ہر شخص سے اسکے معیار اور معلومات کے موافق گفتگو کرتے تھے۔ جو شخص بھی شیخ صاحب سے ملتا تھا انکے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے بغیر نہ رہتا تھا۔ درحقیقت انکی برابر کسی ہندی نژاد صوفی کو اسقدر رسوخ و شہرت حاصل نہ ہوئی۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ قیامت

کے نزدیک دنیا کے مسلمانوں اور عام لوگوں کے دلوں کو خوش کرنے کی سب کاموں سے زیادہ قدر ہوگی۔ شیخ صاحب ہر شخص سے جو انکے پاس جاتا تھا نہایت خندہ پیشانی سے ملاقات اور گفتگو کرتے لیکن انکا دل و دماغ خدائے پاک ہی کی طرف لگا رہتا تھا۔

بہت سے تذکرے انکی کرامات کے ذکر سے بھرے پڑے ہیں لیکن انکی کرامت معمولی قسم کی نہ تھی یعنی وہ کبھی ہوا میں اُڑے اور نہ کبھی زمین پر پاؤں ہلائے بغیر چلے۔ اُنھوں نے ایک صاف دل اور پاک روح پائی تھی اور انھیں میں انکی کرامات کا راز مضمر تھا۔ وہ ایک ہی نظر میں آدمی کے دلی جذبات معلوم کر لیتے تھے اور پھر اس سے تسلی آمیز گفتگو کرتے تھے۔ یہاں پر چند واقعات بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

(۱) خواجہ مبارک کو جب کبھی وہ شاہی دربار میں جاتے خلعت ملتا تھا لیکن ایک مرتبہ سلطان نے انھیں صرف ایک سفید کُرتا ہی نذر کیا۔ سلطان کی اس حرکت پر وہ رنجیدہ ہوئے۔ شیخ نظام الدینؒ سے مشورہ کیا۔ شیخ موصوف نے محبت آمیز نگاہ سے انکی طرف دیکھا اور فرمایا کہ شاہی تحفہ چاہے وہ اشرفی ہو یا ایک کوڑی قیمتی اور قدر کی چیز ہے۔ خواجہ صاحب کو شیخ صاحب کے ان الفاظ سے اطمینان ہوگیا۔ (۲) ایک مرتبہ ایک نوجوان طالب مع چند دوستوں کے شیخ صاحب کے پاس حاضر ہوا اور شیرینی کے ساتھ جو اسکے احباب لائے تھے اسنے ایک پڑیا میں تھوڑا سا ریت بھی باندھ کر انکے سامنے رکھدیا۔ جب خدام ان چیزوں کو اٹھانے آئے تو شیخ صاحب نے ان سے ریت کی پڑیا کو وہیں چھوڑ دینے کو فرمایا اور کہا کہ یہ سرمہ خاص طور سے میری آنکھوں کے واسطے آیا ہے۔ اس پر وہ نوجوان خوف کے مارے کانپنے لگا اور اپنی گستاخی تسلیم کی لیکن شیخ صاحب نے اسکو خلعت عطا کی اور تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ جس چیز کی تم کو ضرورت ہو کہو مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا کرونگا (۳) اپنی مفلسی کے زمانہ میں شیخ موصوف ایک مرتبہ دو دن کی فاقہ کشی کے بعد کچھ روٹی کے ٹکڑے کھانے بیٹھے اتفاق وقت سے ایک فقیر وہاں سے گذرا، اس نے خیال کیا کہ شیخ صاحب اپنا کھانا ختم کر چکے اس نے دسترخوان پر سے ٹکڑے اُٹھا لیے۔ اس پر شیخ مسکرائے اور فرمایا کہ شاید خدا کو ہماری محنت اور فاقہ کشی پسند آئی کہ وہ پھر ہمکو آزماتا ہے (۴) ایک شخص نے جب شیخ اور انکے خاندان کو بھوکوں مرتے دیکھا تو اس نے انکو علم کیمیا سکھانا چاہا لیکن شیخ نے انکار کردیا اُنھوں نے فرمایا کہ پڑیا اور رنگ بنانا تو نصاریٰ کا کام ہے اور دولت جمع کرنا یہودیوں کا، ہم مسلمان ہیں، ہم اس دنیا کا آرام نہیں چاہتے ہیں، ہماری زندگی تو خدا کیواسطے ہے اور اسی کے واسطے جیتے ہیں۔

شیخ کی زندگی واقعی ان اصولوں کا مجموعہ تھی جو روحانیت کے لحاظ سے انسانی زندگی کے واسطے اہم ترین کہے جا سکتے ہیں۔ نجات یا انسانی زندگی کی بہترین خوشی دنیاوی خواہشات کو ترک کر دینے سے حاصل نہیں

ہوتی بلکہ دنیوی ولولوں کو پاکیزگی کے ساتھ ترقی دینے اور ہمدردی کے ساتھ اپنے گردوپیش کی چیزوں سے مطابقت قائم کرنے سے ملتی ہے۔ اس ذات واحد کا اسقدر خیال ہونا چاہیئے کہ خود اپنی ہستی کا بھی امتیاز نہ رہے۔ اس قسم کی نجات اس دنیا سے باہر حاصل نہیں ہوسکتی بلکہ اسکا حصول یہیں رہکر ممکن ہے۔ شیخ فریدؒ کی دعا انکو مریدوں کے واسطے ہمیشہ مفید ثابت ہوئی۔ انکا میلان طبع کبھی دنیا کی طرف نہ ہوا۔ آخری عمر میں جب شیخ صاحب کے پاس ہر طرف سے تحفے تحائف آنے لگے تو وہ انھیں محتاجوں کو تقسیم کردیتے تھے۔ ہر جمعہ کو نماز سے قبل انکا مودی خانہ اور باورچیخانہ وغیرہ بالکل خالی کردیا جاتا تھا۔ جو لوگ ان سے ملاقات کو آتے انکی پرلطف دعوت کیجاتی لیکن شیخ صاحب خود قریب قریب ہمیشہ روزہ ہی رکھتے تھے اور جب کبھی کھاتے تو معمولی کھانا کھاتے تھے۔ انکے مرید اسقدر فاقہ کشی کی شکایت کرتے تو فرماتے تھے کہ جب سقدر غریب و محتاج لوگ مسجدوں اور بازاروں میں بھوکوں مر رہے ہیں تو میرے حلق میں ایک نوالہ بھی آسانی سے جانا کیسے ممکن ہے۔ آپ سوتے بھی بہت کم تھے۔ کچھ دیر دوپہر کو بطور قیلولہ آرام فرماتے تھے اور چند ساعت آدھی رات سے پہلے لیکن آدھی رات کے بعد جب سب لوگ سو جاتے تھے تو شیخ اپنا حجرہ بند کرکے رات بھر استغفار، گریہ وزاری، عبادت مطالعہ اور تسبیح خوانی میں گذار دیتے تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "رات کی خاموشی میں، میں اور چراغ ہم صحبت ہوتے ہیں۔ کبھی میں چراغ کو اپنی آہوں سے گل کردیتا ہوں اور کبھی اپنی روح کے شراروں سے اسے پھر جلا دیتا ہوں"

امیر خسرو آٹھ برس کی عمر ہی میں شیخ کے مرید ہوگئے تھے، شیخ نے ابتدائی شاعری میں انکی بہت حوصلہ افزائی کی تھی لیکن خسرو اکثر دہلی سے باہر رہے۔ "قران السعدین" میں جو کیقباد کے دور حکومت کے آخری سال میں لکھی گئی نظام الدینؒ کا ذکر بالکل نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ اور خسرو کی دوستی سلطان جلال الدین کے زمانہ میں شروع ہوئی اور باہمی ارتباط روزانہ ترقی کرنے لگا۔ حالانکہ انکا طرز زندگی ایک دوسرے سے بہت مختلف تھا، لیکن پھر بھی آپس میں بڑی ہمدردی تھی۔ خسرو حالانکہ درباری فضا میں زندگی بسر کرتے تھے لیکن اصل میں وہ تصوف کے دلدادہ تھے۔ شیخ خود بھی نہایت عالی پایہ کی رباعیات کہتے تھے، خسرو کی روحانی ترقی دیکھکر ان سے دلی محبت رکھتے تھے، جب خسرو کا جوش جوانی ختم ہوا تو وہ عبادت و ریاضت میں مشغول ہوگئے اور شیخ نے انکے درباری شغل کے باوجود اپنی خانقاہ میں خوشی سے رہنے کی اجازت دیدی۔ خسرو ایک تازہ نسیم کی مانند جو کسی خیالی دنیا کی طرف سے چل رہی ہو انکی خانقاہ میں آتے تھے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد شیخ موصوف ایک طرف کروٹ لیکر لیٹتے تو امیر خسرو سے کہتے، کہو کیا خبریں ہیں۔ اس فرمانے پر امیر خسرو جنکے پاس دہلی کی خبروں کا ہر وقت خزانہ موجود رہتا تھا

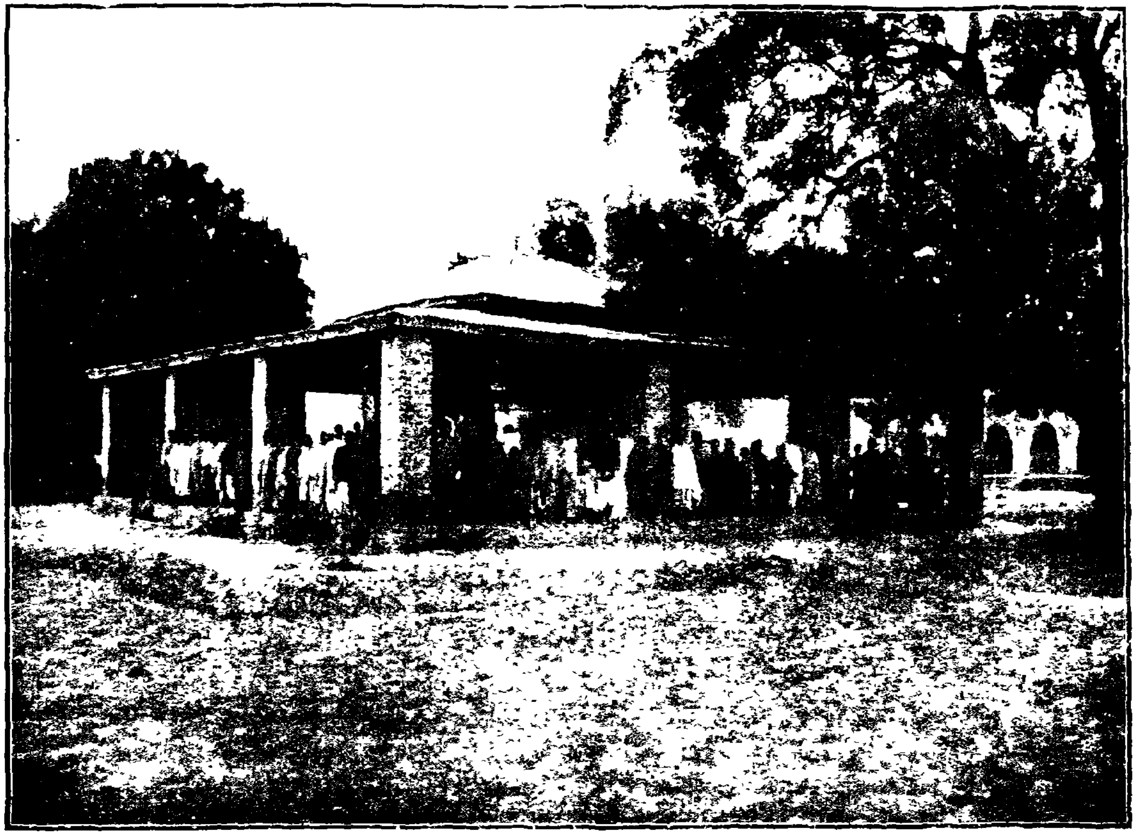
فوراً انکو عام خبریں سُنانا شروع کردیتے تھے۔ شیخ ان خبروں کو نہایت توجہ کے ساتھ سُنتے۔ اسی دوران میں امیر خسرو انکی بلندیٔ خیالات کو دیکھکر متعجب ہوتے۔ خسرو کی زندگی کا مقصد شاعری کے ذریعہ دائمی شہرت حاصل کرنا تھا لیکن شیخ نے جنکے خیالات اس دنیوی ہوس سے بلند تھے انکو بتایا کہ روحانی ترقی دنیوی ترقی سے بالاتر ہے۔ اگرچہ اس تعلیم سے امیر خسرو کا پُرانا خیال نہ بدلا لیکن اس نئی تعلیم کا بھی اپنا نمایاں اثر ہوا۔ انکی بہت سی غزلیں اسکی شاہد ہیں۔ حالانکہ خسرو اپنے مربی سلطان کی عنایات کو نہ بھول سکتے تھے لیکن شیخ کے پند و نصائح کا اثر اتنا گہرا ثابت ہوا کہ آخر زمانہ میں انکے کلام میں کہیں نہ کہیں شیخ نظام الدینؒ کا نام ضرور آجاتا تھا اور کبھی کبھی انکا ذکر بادشاہ سے بھی مقدم ہو جاتا ہے۔

شیخ پوری کوشش کے باوجود بھی سیاسیات سے علحدہ نہ رہ سکے۔ سلطان علاء الدین کا سب سے بڑا لڑکا خضر خاں شیخ کا مرید تھا اسلیے عام خیال تھا کہ خضر خاں کا بادشاہ ہونا شیخ کو پسند خاطر ہوگا لیکن علاء الدین کے مرنے کے بعد جو جو سازشیں ہوئیں شیخ نے انکی کوئی پروا نہ کی۔ چالیس روز کے وقفہ کے بعد قطب الدین مبارک شاہ بادشاہ ہوا۔ پہلے پہلے تو قطب الدین شیخ موصوف سے کشادہ دلی کے ساتھ پیش آیا اور انسے کوئی تعرض نہ کیا لیکن جب سلطان دکن کے حملہ سے واپس آرہا تھا تو ملک اسد الدین اسکے چچازاد بھائی کی ایک سازش کا حال معلوم ہوا۔ سلطان نے مفسدہ پردازوں کو سخت سزائیں دیں۔ سلطان کے برادران خضر خاں۔ شادی خاں اور شہاب الدین بھی جنکو کافور نے آنکھیں نکلوا کر گوالیار میں قید کر رکھا تھا قتل کردیے گئے۔ مبارک نے شیخ پر بھی اتہام لگانا چاہا۔ برنی کہتا ہے کہ اس نے شیخ کی بُرائی کرنی شروع کردی اور ہر طرح سے اپنی ناخوشی ظاہر کرنے لگا۔ سب اُمرا وغیرہ کو حکم ملا کہ غیاثپور میں شیخ کی خانقاہ پر نہ جایا کریں سلطان نشہ کی حالت میں اکثر یہ بھی کہتا تھا کہ جو شخص شیخ کا سر کاٹ کر لائیگا اسکو ایک ہزار ٹنکے انعام میں ملیں گے۔ ایک روز شیخ ضیاء الدین رومی کے مکان پر سلطان اور شیخ نظام الدینؒ کا سامنا ہوا لیکن سلطان نے انکی بالکل عزت نہ کی حتیٰ کہ سلام بھی قبول نہ کیا۔ شیخ کی طرف سے عوام کے خیالات خراب کرنیکے واسطے ملتان سے شیخ رکن الدینؒ بلائے گئے لیکن چونکہ وہ شیخ کے پُرانے دوست تھے اس لیے شیخ زادہ جام کو جو شیخ موصوف کے پُرانے دشمن تھے کھڑا کیا گیا۔ جب لڑنا منظور ہو تو کوئی نہ کوئی وجہ بھی مل جاتی ہے، سلطان نے ایک مسجد جسکا نام "مسجد میری" رکھا، بنوائی اور سب سے پہلی جمعہ کی نماز میں اکابرین کو دعوت دی لیکن شیخ نے انکار کردیا اور فرمایا کہ میرے پڑوس کی مسجد کا مجھپر زیادہ حق ہے۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ وہاں کا دستور تھا کہ ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو ہر شخص بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوتا تھا۔ شیخ اسوقت بھی نہ گئے اور اپنے بجائے اپنے نوکر اقبال کو بھیجدیا۔ اس پر سلطان کے غصہ کی کوئی حد نہ رہی اور اگلے مہینہ کی پہلی تاریخ کو شیخ کو ذاتی

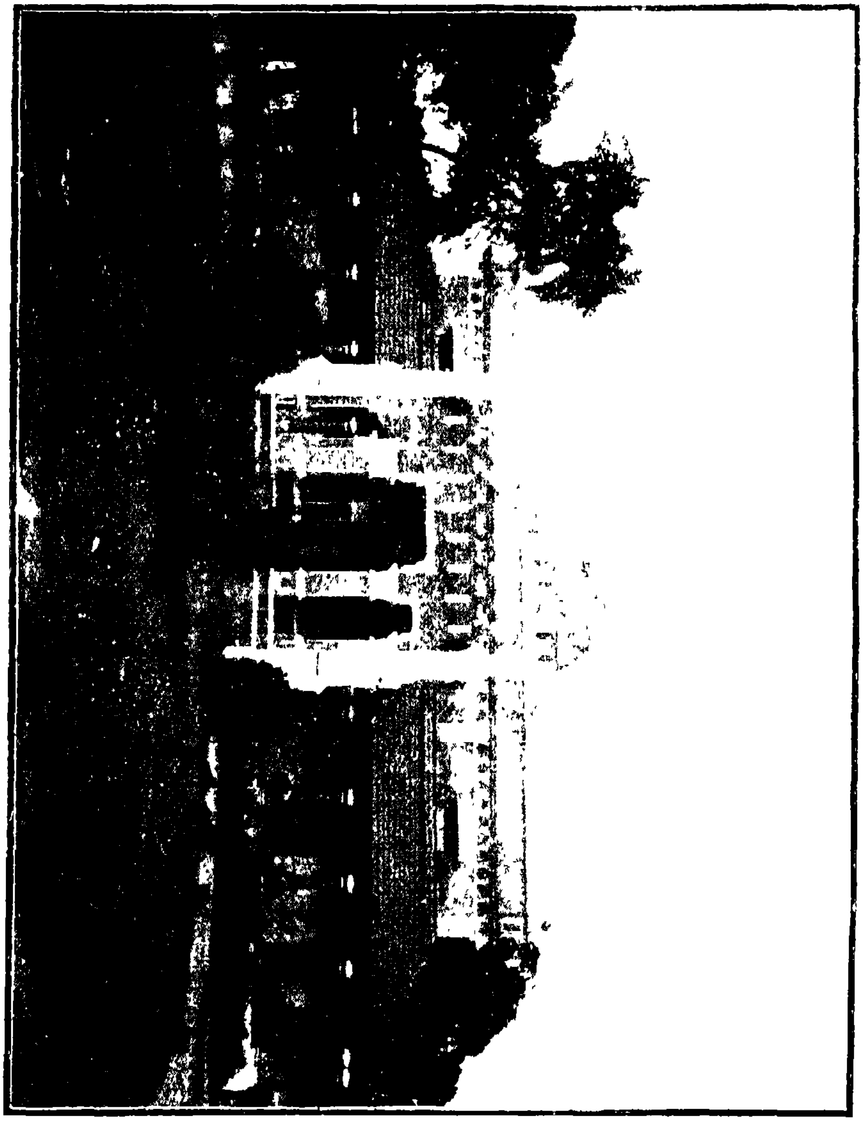
طور سے بلانے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن قدرت خدا کہ وہ وقت ہی نہ آنے پایا۔ ہلال کے ظہور کی رات کو مبارک شاہ قتل کر دیا گیا اور اسطرح شیخ نظام الدینؒ کی مشکلات ختم ہوگئیں۔ امیر خورد کہتے ہیں کہ مبارک شاہ شیخ کی بددعا ہی سے قتل ہوا لیکن ایک مؤرخ کی حیثیت سے اس مسئلہ کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔

حالانکہ سلطان اور خسرو کے پیر میں آپس میں جھگڑا رہا تاہم خسرو دونوں سے خلوص کے ساتھ ملتے رہے سلطان مبارک شاہ خسرو کے ساتھ اپنے والد سے بھی زیادہ سخاوت کے ساتھ پیش آتا تھا۔ خسرو نے بھی شکر گزاری میں "نہ سپہر" لکھی، اس میں اُنھوں نے سلطان کے زمانۂ حکومت کے تمام حالات کو نظم کیا ہے مبارک کی موت کے کچھ دن بعد غیاث الدین تغلق باغیوں کو شکست دیکر تخت سلطنت پر بیٹھا۔ سلطان غیاث الدین اپنے وقت کا بہترین بادشاہ ثابت ہوا۔ وہ عرصہ تک فوجی اور عدالتی ملازمت کر چکا تھا۔ اسکی زندگی پاکیزہ تھی۔ ضیاء الدین کہتے ہیں کہ ایک ہی ہفتہ میں اس نے فساد و بدامنی کو جڑ سے اُکھاڑ دیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ گویا سلطان علاء الدین پھر زندہ ہو گیا ہے، خسرو کے اس عالی مرتبہ سلطان سے بھی بہت اچھے مراسم رہے چنانچہ "تغلق نامہ" انکی آخری تاریخی مثنوی اسکی ثنا و تعریف میں لکھی گئی ہے۔ جب غیاث الدین نے بنگال پر حملہ کیا تو خسرو بھی اسکے ساتھ تھے لیکن وہاں سے واپس آنے سے پہلے ہی شیخ نظام الدینؒ کا دہلی میں انتقال ہو گیا۔ دہلی آنے پر خسرو کو اپنے دوست اور مرشد کی وفات کا سخت رنج ہوا۔ شیخ اکثر خسرو سے یہ کہا کرتے تھے کہ میری زندگی کی دعا کرو کیونکہ میرے بعد تم بھی زیادہ زندہ نہ رہوگے، یہ پیشین گوئی بالکل صحیح ثابت ہوئی اور چھ ماہ بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ خسرو بھی اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے اور اپنے پیر کی قبر کے نزدیک ہی دفن ہوئے۔ موت سے پہلے شیخ نظام الدینؒ نے کہدیا تھا کہ میری قبر پر کوئی مقبرہ نہ بنوایا جائے۔ لیکن سلطان نے ایک عالیشان مقبرہ بنوا دیا۔ چھ سو سال گذر گئے، پرانی سلطنتیں برباد ہو گئیں اور نئی قائم ہو گئیں، دہلی خود پے در پے برباد ہوئی اور پھر آباد ہوئی لیکن ان سب تغیرات کے باوجود شیخ کا مقبرہ ہنوز صحیح و سالم کھڑا ہے۔ آج کل بھی ہندو مسلمان دونوں اسکی زیارت کے واسطے آتے جاتے ہیں،





[illegible]



ممالکِ متحدہ آگرہ و اودھ مین آریہ سماج کی سرگرمیان

(از جناب منشی جوالا پرشاد صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل بی سکریٹری ڈی۔ اے۔ وی کالج کانپور)

آریہ پرتی ندھی سبھا پنجاب کے بعد ہمارے صوبہ مین بھی آریہ سماج کا کام نہایت سرگرمی سے ہو رہا ہے اس صوبے مین اِس وقت تقریباً ڈھائی سَو سماجین ہین جنمین سے دو سَو دس سماجون کا الحاق آریہ پرتی ندھی سبھا یو پی سے ہے۔ جو آریہ سماج کی ایک صوبہ داری جماعت ہے۔ خوش قسمتی سے پنجاب کی طرح صوبۂ متحدہ مین بھی دو پارٹیان نہین ہین اور یو پی کی پرتی ندھی سبھا مین وہ اصحاب بھی شامل ہین جو کالج و اسکول کے ارا کین ہین۔ ڈی۔ اے۔ وی کالج سوسائٹی کے سکرٹری آجکل سبھا کے وائیس پریسیڈنٹ ہین اور انکی کالج سوسائٹی کے میمبر سبھا کی انتظامیہ کمیٹی مین بھی شامل ہین

آریہ پرتی ندھی سبھا کی طرف سے آریہ سماج کے اُصولون کی اشاعت کی غرض سے بتیس ۳۲ تنخواہ دار اُپدیشک اور بھجن منڈلیان صوبے مین کام کر رہی ہین۔ اِن کے علاوہ بہت سے آنریری اُپدیشک ہین جو سماجون کے جلسون مین جاتے رہتے ہین اور جن سے پرچار کے کام مین بڑی مدد ملتی ہے۔ اِس قسم کے اُپدیشکون مین بابو گھاسی رام جی ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ بابو پورن چندجی بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی پروفیسر دھرمیندر ناتھ جی ایم۔ اے شاستری۔ پرنسپل دیوان چند جی ایم۔ اے پروفیسر گوبند رام جی ایم۔ اے۔ پروفیسر کالکا پرشاد جی۔ ایم۔ اے۔ پروفیسر لم بہاری لال جی۔ بی۔ اے۔ شاستری۔ پروفیسر منشی رام جی۔ ایم۔ اے۔ پروفیسر کرشن کمار جی۔ ایم۔ اے۔ بابو موتی لال جی۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ ڈاکٹر جوالا پرشاد جی۔ پنڈت ستیہ دیو جی ایم۔ اے۔ لالہ ٹھاکر داس جی۔ بابو گنگا پرشاد جی۔ ایم۔ اے۔ ہیڈ ماسٹر خاص طور پر قابلِ ذکر ہین۔

پرتی ندھی سبھا کے علاوہ بعض آریہ سماجون نے بھی اپنے طور پر اُپدیشک اور بھجن منڈلیان رکھکر پرچار کا انتظام کر رکھا ہے۔ اِس قسم کا انتظام آگرہ۔ کانپور۔ لکھنؤ۔ بریلی وغیرہ کی سماجون مین ہے۔ بجنور۔ سہارن پور۔ بدایون وغیرہ مقامات پر کئی سماجون نے مل کر اُپ پرتی ندھی سبھائین قائم کرکے آریہ سماج کے اُصولون کی اشاعت کا اچھا انتظام کیا ہے ان اُپ پرتی ندھی سبھاؤن نے اپنے اپنے حلقے مین پرچار کی غرض سے بہت سے اُپدیشک اور بھجن منڈلیان مقرر کر رکھی ہین یہ سبھائین

پرتی ندھی سبھا کی زیر نگرانی کام کرتی ہین-

پرچار کا ایک ذریعہ کتابین اور ٹریکٹ بھی ہوا کرتے ہین چنانچہ پرتی ندھی سبھا کا ایک شعبہ ٹریکٹ ڈیپارٹمنٹ ہے جسکے ذریعے سے بعض بہت اچھے اچھے ٹریکٹ اور کتابین وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہتی ہین- لایق مصنفون مین جنہون نے کہ آریہ سماج کے لٹریچر مین قابل قدر اضافہ کیا ہے خاص طور پر پنڈت تلسی رام جی سوامی مرحوم- پنڈت گنگا پرشاد جی ایم- اے بابو گھاسی رام جی- ایم- اے- پنڈت کھیم کرن داس جی ترویدی کے نام قابل ذکر ہین- بابو گنگا پرشاد جی ایم- اے ہیڈ ماسٹر ڈی اے وی اسکول الہ آباد نے بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹریکٹ لاکھون کی تعداد مین شائع کرکے پرچار کے کام مین بڑی مدد دی ہے- پنڈت تلسی رام جی نے سام وید کا بھاشیہ- اور پنڈت کھیم کرن داس جی نے اتھروید کا بھاشیہ کرکے سماج کی بڑی خدمت کی ہے- پنڈت گنگا پرشاد جی کی کتاب سرچشمۂ مذاہب بڑی قابلیت سے لکھی گئی ہے- اور بابو گھاسی رام جی نے رگ وید کا آد بھاشیہ بھومکا کا انگریزی ترجمہ کرکے ایک بڑی کمی کو پورا کیا ہے- اور بھی کئی اصحاب نے چھوٹے بڑے ٹریکٹ لکھکر اس سلسلے مین اچھا کام کیا ہے- بھجن منڈلیان عوام مین آریہ سماج کے پرچار کا بہت اچھا ذریعہ ہین لیکن یہ افسوس سے لکھنا پڑتا ہے کہ آریہ سماجی بھجنیک جو بھجن عموماً گاتے ہین وہ باعتبار شاعری نہایت نیچے درجے کے ہوتے ہین اور ان مین سے اکثرون کو تو اپنے ہی بنائے ہوئے گانے کی عادت ہو گئی ہے- آریہ سماجک حلقے مین پنڈت ناتھورام جی شنکر ایک بڑے اعلےٰ پایہ کے شاعر ہین- ہندی دان اصحاب عام طور پر انکی شاعری کے قائل ہین- آپ نے بہت سے بھجن بھی تصنیف کیے ہین- مگر ہمارے بھجنیک مہاشیون کو وہ بھجن پسند نہین آتے- سور داس- نانک- کبیر اور دوسرے مشہور شاعرون کے بھی بہت سے ایسے بھجن اور پد ہین جو آریہ سماجک جلسون مین گائے جا سکتے ہین لیکن بھجنیک مہاشیون کو اس طرف مائل کرنا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے آریہ سماجیون کو اس معاملے مین خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے-

سبھا کی طرف سے ایک ہفتہ وار ہندی کا اخبار آریہ مترنامی نکلتا ہے جو اس صوبہ مین کانپور کے مشہور اخبار پرتاب کو چھوڑ کر ہندی کے ہفتہ وار اخبارون مین ایک کثیرالاشاعت اخبار ہے اسکے اڈیٹر پنڈت ہری شنکر جی ہین جنکی کوشش سے نہایت کامیابی سے نکل رہا ہے اور ہندی دان طبقہ مین- آریہ سماج کی اشاعت کا ایک بہت اچھا ذریعہ ہے اسکے ذریعے سے سماجک حالات اور خبرین بھی بہت جلد معلوم ہو جاتی ہین- سبھا کے ذریعے سے شدھی- اچھوت ادّھار- جاتیون کا سدھار وغیرہ

کا کام بھی سرگرمی کے ساتھ ہو رہا ہے۔

حال ہی مین سبھا کے سرگرم سکرٹری پنڈت رام بہاری تواری ایم-ایل-سی کی کوشش سے جرائم پیشہ اقوام کی اصلاح کا کام بھی سبھا نے اپنے ہاتھ مین لیا ہے اور اس غرض سے ایک سٹلمنٹ شہر لکھنؤ کے قریب "کریل" ذات کے لوگون کے سدھار کی غرض سے اپریل ۱۹۲۹ء مین قائم کیا جائیگا۔

سبھا کا ایک شعبہ ذات پانت توڑک منڈل بھی ہے جسکے ممبر اس بات کا عہد کرتے ہین کہ وہ خود ذات پانت کی قید سے آزاد رہینگے- اور شادی بیاہ مین ذات پانت کی کچھ پروا نہین کرینگے۔

پرتی ندھی سبھا کے زیر تحت جو سماجین اس صوبے مین کام کر رہی ہین ان مین سے آگرہ- کانپور- بریلی- لکھنؤ- بنارس- بجنور- میرٹھ- مظفرنگر- الہ آباد مین اس وقت اچھا کام ہو رہا ہے، ان سماجون نے خود بھی اپنے اپنے ضلع اور ارد گرد کے مقامون مین پرچار کا انتظام کر رکھا ہے-

اچھوت ادھار کا کام بریلی- اور بنارس اور ضلع بجنور مین بڑے زور سے ہو رہا ہے ان مقامات پر بہت سے اچھوت ادھار پاٹھ شالے بھی قائم ہین- کانپور مین سماج کی طرف سے نہ صرف شدھی اور اچھوت ادھار کے لیے کوشش ہو رہی ہے بلکہ غریب اور مفلس مریضون کے علاج کے لیے ایک خیراتی شفا خانہ بھی قائم ہے- لکھنؤ مین بھی اس قسم کا خیراتی شفا خانہ ہے- آریہ سماج کانپور کے متعلق ایک بہت اچھا ریڈنگ روم ہے- لکھنؤ- بریلی اور آگرہ مین آریہ سماج کے بہت اچھے یتیم خانے اور بدھوا آشرم ہین- شہر اور قصبہ کی شاید ہی کوئی ایسی سماج ہو کہ جسکا خاص مندر نہو- کانپور آریہ سماج کے مندر پر سوا لاکھ روپے کی لاگت آئی ہے- لکھنؤ- دیرہ دون- میرٹھ- بریلی- مظفرنگر کے مندر بھی بڑے عالیشان اور خوبصورت بنے ہین اور انکی لاگت بھی پچاس پچاس ہزار روپے کے لگ بھگ ہے-

گروکل بندرابن | آریہ پرتی ندھی سبھا کی طرف سے بندرابن مین ایک گروکل قائم کیا گیا ہے جسمین سنسکرت کی اعلے تعلیم کے ساتھ انگریزی، حساب، جغرافیہ، تواریخ، سائینس وغیرہ کی تعلیم بھی دیجاتی ہے- اسکی عمارت پر اب تک ڈیڑھ لاکھ کے قریب صرف ہو چکا ہے اور اس وقت اس مین تقریباً پونے دو سو طلباء تعلیم پاتے ہین- اسکے موجودہ مکھ ادھشٹاتا بابو سری رام جی بڑے سرگرم اور آریہ سماج کے پرانے سیوکون مین سے ہین- آپکو شبانہ روز گروکل کی ترقی کی فکر لگی رہتی ہے اور جب سے آپ نے چارج لیا ہے گروکل کی حالت روبہ ترقی ہے- گروکل کے آچاریہ پنڈت برہسپتی ایک بڑے یوگیہ سناتک ہین، آپ سنسکرت کے اعلے درجے کے ودوان ہونے کے علاوہ انگریزی کی بھی اچھی قابلیت رکھتے ہین گروکل کا سالانہ خرچ تقریباً پچاس ہزار روپیہ ہے- گروکل کی بنیاد ڈالنے والون مین سے پنڈت بھگوان دین جی کا

نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، اُنھون نے ایک بہت اچھی نوکری چھوڑ کر آنریری طور پر گروکل کا مکھ ادھشٹاتا بننا منظور کر کے حقیقت مین اس انسٹی ٹیوشن کی بنیاد قائم کی اور مرتے دم تک اُسکی سیوا کرتے رہے۔ پنڈت بھگوان دین جی مرحوم نے بھی بحیثیت پریسیڈنٹ آریہ پرتی ندھی سبھا نہایت شاندار خدمات انجام دین جنکو اِس صوبے کے آریہ سماجی کبھی بھلا نہین سکتے۔ پنڈت تلسی رام جی سوامی نے بھی بحیثیت پریسیڈنٹ آریہ پرتی ندھی سبھا نمایان خدمات انجام دین۔ لیکن گروکل کی موجودہ ترقی زیادہ تر منشی نراین پرشاد جی سابق ادھشٹاتا گروکل کی حسنِ خدمات کا نتیجہ ہے جو آجکل شری نراین سوامی کے نام سے موسوم ہین اور جو اِس وقت آریہ سارودیشک سبھا کے پردھان ہین اور جنکی ذات پر ہم سب بجا طور پر فخر کر سکتے ہین

گروکل بندرابن کی پچیس سالہ جوبلی ۱۹۳۱ء مین منائی جائیگی جسکے لیے ابھی سے خوب تیاریان شروع کر دی گئی ہین۔ ہمین اُمید ہے کہ ہمارے صوبے کے آریہ سماجی سلور جوبلی کے موقع تک ایک لاکھ روپیہ گروکل کے لیے جمع کرنے مین کامیاب ہونگے۔

گروکل بندرابن کے علاوہ ہمارے صوبے مین مہا ودیالہ جوالاپور۔ گروکل سکندرآباد۔ گروکل بدایون وغیرہ اور بھی کئی تعلیمی انسٹی ٹیوشنس ہین جہان بلا فیس سنسکرت کی اعلےٰ تعلیم دیجاتی ہے اور سنسکرت اور ہندی کے بہت سے پاٹھ شالہ اور کنیا پاٹھ شالہ ہین جو اشاعتِ تعلیم مین بہت امداد دے رہے ہین۔

ڈی-اے-وی کالج سوسائٹی یو-پی

ان تعلیمی انسٹی ٹیوشنون کے علاوہ اِس صوبے مین ڈی-اے-وی کالج سوسائٹی ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کے زیرِ تحت دیرہ دون مین ایک انٹرمیڈیٹ کالج ہے اور کانپور مین ایک فرسٹ گریڈ کالج اور ہائی اسکول قائم ہے۔ سوسائٹی کی طرف سے پہلے میرٹھ مین ایک اسکول قائم کیا گیا تھا جو سنہ ۱۹۰۰ء مین دیرہ دون مین منتقل کر دیا گیا اور اب ترقی کرتے کرتے انٹرمیڈیٹ کالج بن گیا ہے

اِس انسٹی ٹیوشن کی قائمی اور ترقی مین نیگی پورن سنگھ جی مرحوم رئیس دیرہ دون کا بڑا حصہ ہے جنھون نے تقریباً دو لاکھ کی جائداد اِس انسٹی ٹیوشن کے لیے وقف کر دی ہے۔ اتنا گران بہا عطیہ کسی ایک شخص نے ہمارے صوبے مین آریہ سماج کی انسٹی ٹیوشنون کے لیے اب تک نہین دیا ہے۔ دیرہ دون کالج مین آٹھ سو سے زائد لڑکے تعلیم پاتے ہین۔ اسکی عمارت نہایت شاندار ہے اور اِس پر تقریباً دو لاکھ روپے سے زائد خرچ ہوا ہے۔ یہ کالج ایک بہت پُرفضا مقام پر واقع ہے۔ اور صوبے کے ہر حصے سے لڑکے یہان پڑھنے آتے ہین۔ کالج کے متعلق ایک عالی شان بورڈنگ ہوس بھی ہے جس مین ڈیڑھ سو سے زائد لڑکے رہتے ہین۔ کالج کے پرنسپل لالہ لکشمن پرشاد جی ایم-اے ایک تجربہ کار اور قابل شخص ہین، آپ کالج کی ترقی کے لیے

ہمیشہ کوشش کرتے رہتے ہین- اس کالج پر تقریباً پچاس ہزار روپیہ سالانہ صرف ہوتا ہے -

ڈی-اے وی کالج کانپور کو قائم ہوئے صرف دس برس کا عرصہ گذرا ہے مگر اس تھوڑے عرصے مین اس انسٹی ٹیوشن نے جو ترقی کی ہے وہ حیرت انگیز ہے، اس کالج مین بی-اے اور بی ایس سی بی کام اور ایل-ایل-بی تک تعلیم کا انتظام ہے دو مضامین مین اور اگلے سشن سے ایم-اے کے درجے بھی کھل جائینگے- پانچ سو کے قریب طلبا اسمین تعلیم پاتے ہین جنمین سے پونے تین سو کے قریب بورڈرس ہین- کالج کی عمارت تیار ہوگئی ہے صرف ایک جانب کا برآمدہ اور دیوکے گنبد و مینا بننا باقی ہین- کالج و بورڈنگ کی عمارتون پر چار لاکھ روپے کے قریب صرف ہو چکا ہے -کالج کے نتائج بھی شاندار رہتے ہین-

۱۹۲۸ء کے یونیورسٹی کے امتحان مین اس کالج کی طرف سے اسی لڑکے بی-اے (آرٹس) کے امتحان مین شریک ہوئے تھے جن مین سے ساٹھ کامیاب ہوئے گویا پچھتر فی صدی نتیجہ رہا- اور جو چھ وظیفے تمام صوبے کے کامیاب طلباء کے لیے تھے اُن مین تین وظیفے اس کالج کے طالب علمون نے حاصل کیے- اور بقیہ تین الہ آباد یونیورسٹی اور یوپی کے دیگر ۱۴ کالجون مین تقسیم ہوگئے- پچھلے سال کا نتیجہ بھی بہت تسلی بخش تھا-کالج دن بدن ترقی کر رہا ہے جسکے لیے کالج کے قابل پرنسپل لالہ دیوان چند جی ایم-اے ہم سب کے شکریہ کے مستحق ہین جنکو شبانہ روز کالج کی ترقی کی فکر رہتی ہے-کالج مین دھارمک سکشا (مذہبی تعلیم) اور ورزش کا بھی معقول انتظام ہے، دھارمک سکشا کی طرف رجحان پیدا کرنے کے لیے رائے جوالا پرشاد صاحب ریٹائرڈ انجنیر نے دس روپیہ ماہوار کا ایک وظیفہ قائم کردیا ہے جو دھارمک سکشا کے امتحان مین سب سے زیادہ نمبر پانیوالے طالب علم کو ہرسال دیا جاتا ہے-کالج کا سالانہ خرچ پچھتر ہزار روپیہ ہے

اس سوسائٹی کے زیر تحت کانپور مین ایک ڈی-اے-وی ہائی اسکول بھی ہے جو طلبا کی تعداد طلباء و نتائج کانپور کے دیگر اسکولون مین ایک ممتاز درجہ رکھتا ہے- اس اسکول کو ترقی دینے مین بابو بشن سروپ جی ہیڈ ماسٹر و بابو برجیندر سروپ جی وکیل سکرٹری اسکول خاص توجہ اور کوشش کرتے رہتے ہین-

اسکول کی عمارت مین پچھلے دو سال مین خاصی توسیع ہوئی ہے- اور اسکے متعلق ایک بورڈنگ بھی ہے جسمین ستر لڑکے رہتے ہین- اسکول مین ساڑھے پانچسو سے زائد طلباء تعلیم حاصل کرتے ہین

ہمارے صوبے مین کالج کی سوسائٹی کی بنیاد منشی لچھمن سروپ صاحب مرحوم وکیل میرٹھ کے مبارک ہاتھون سے پڑی تھی جو مرتے دم تک اسکے پریسیڈنٹ رہے- پرتی ندھی سبھا کے قواعد و ضوابط بھی

آپ ہی نے مرتب کیے تھے۔ اور سبھا کے پہلے پریسیڈنٹ بھی آپ ہی تھے۔ آپ اپنی متانت وسنجیدگی اور قابلیت کے لیے سماجک حلقے مین بہت مشہور تھے۔ دیرہ دون اسکول کی ترقی مین دیرہ دون کے مشہور وکیل بابو جوتش سروپ جی مرحوم نے بہت نمایان حصہ لیا تھا۔ کانپور ڈی اے وی کالج کے قائم کرنے مین جو مالی امداد بابو بنسی دھر مرحوم رئیس کانپور کی ذات سے ملی حقیقت مین اُسی نے کالج کے ارکین کی ہمت بندھائی ورنہ شاید اِس انسٹی ٹیوشن کا قائم ہونا مشکل ہو جاتا۔ اور اِس لیے کانپور ڈی۔ اے۔ وی کالج پر ہمیشہ اُنکے احسان کا بار رہیگا۔ ڈی اے وی کالج کی حقیقی ترقی اُس وقت سے شروع ہوئی جب سے کہ بابو آنند سروپ رائے بہادر اُسکے سکریٹری منتخب ہوئے۔ اور سوسائٹی مذکور کو جو کامیابی اِس وقت حاصل ہے وہ ایک بڑی حد تک اُنھین کی محنت اور کوششونکا نتیجہ ہے۔

ڈی اے وی اسکول بنارس۔ لکھنؤ۔ علی گڈھ۔ آگرہ۔ مظفرنگر وغیرہ مقامات پر بھی سماج کے ہائی اسکول ہین۔ لکھنؤ اور بنارس کے ہائی اسکول بہ نسبت دیگر مقامات کے نہایت اچھی حالت مین ہین۔ ان کی عمارتین بھی بڑی شاندار ہین۔

لکھنؤ اسکول کے رُوحِ روان پنڈت رمیس بہاری تیواری ایم۔ ایل۔ سی ہین جو کہ سماج کے بڑے سرگرم میمبر ہین۔ بنارس اسکول کی ترقی کے لیے سب سے زیادہ کوشش بابو گوری شنکر پرشاد جی وکیل بنارس نے کی ہے، آپ نے ہائی اسکول کے علاوہ ایک سنسکرت ڈیپارٹمنٹ بھی ویدودیالے کے نام سے قائم کیا ہے جو نہایت کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ دیگر مقامات کے ہائی اسکول بھی اچھا کام کر رہے ہین۔ اِن اسکولون کے علاوہ کہین کہین مڈل اسکول بھی ہین جنکی تفصیل کی یہان ضرورت معلوم نہین ہوتی۔

تعلیم کے کام کو ایک مرکز پر لانے کے لیے اور اُسکو زیادہ اشاعت اور وسعت دینے کے لیے ڈیڑھ سال سے ایک آریہ ودّیا سبھا قائم کی گئی ہے جس مین گروکل۔ کالج۔ اسکول۔ کنیا پاٹھ شالا انڈسٹریل اسکول وغیرہ ہر قسم کے انسٹی ٹیوشن شامل ہین۔ اس سبھا کے پریسیڈنٹ پنڈت گنگا پرشاد جی ایم اے چیف جج ریاست ٹہری۔ اور سکرٹری پروفیسر برہما نند جی ایم اے ہین۔ سبھا نے اپنا کام شروع کر دیا ہے اور امید ہے کہ سبھا کی سرگرمیون سے اشاعتِ تعلیم مین بڑی مدد ملے گی۔ ہمارا خیال ہے کرشچن سوسائٹی کو چھوڑ کر شاید آریہ سماج سے زیادہ کسی اور سوسائٹی نے اِس صوبے مین اشاعتِ تعلیم کا کام اتنے وسیع پیمانے پر نہین کیا ہے۔

آریہ سماج کے سوشل کامون سے تمام ہندوؤن کی ہمدردی دن بدن بڑھتی جاتی ہے۔ شُدھی کا

جو کچھ کام ہوا ہے اُس مین بڑا حصّہ آریہ سماج کا ہے - صغر سنی کی شادی کے رواج کو کم کرنا - ذات پات کے بندھنون کو ڈھیلا کرنا - بدھواؤن کا بواہ کرنا - بدھواؤن کی رکشا - یتیمون کی پرورش اور سنگھٹن کا کام آریہ سماج کا اودیش رہا ہے - اور یہ بڑی خوشی کا موقع ہے کہ اِس وقت سارے صوبے کے ہندوؤن کی ہمدردی آریہ سماج کے ساتھ ہے - اور آریہ سماج بھی جب ہندوؤن پر کوئی تکلیف یا مصیبت آتی ہے تو میدان مین سب سے پہلے پہنچ کر عملی طور پر کام کرتی ہے - لوگ محسوس کرتے ہین کہ آریہ سماج ایک زندہ سوسائٹی ہے ، اِس لیے مخالف اُسکے کچلنے کے درپے ہین مگر مجکو یقین ہے کہ ابھی تک مخالفین نے آریہ سماج کو نہین سمجھا ہے - آریہ سماج کی مخالفت اُسکی تقویت کا باعث ہوگی - ساری ہندو جاتی آریہ سماج کے ساتھ ہے اور آریہ سماج کو کوئی کچل نہین سکتا جب تک کہ ۲۲ کرور ہندو موجود ہین -

آریہ سماج خوش قسمت ہے اور مبارکباد کی مستحق ہے کہ اُس نے ہندو جاتی کی رکشا کے لیے اپنے چند ویرون کے قربان کر دینے سے دریغ نہین کیا - اور کون نہین جانتا کہ شہیدون کا خون ہی چرچ کی بُنیاد کو مضبوط کرتا ہے -

رسیدِ کتب

صراط حمید - از مولوی محمد الیاس برنی ایم - اے - قیمت - ۱۲ ؎

مطلع الانوار - از حضرت امیر خسرو دہلوی - قیمت - ۸ ؎

سوراجیہ (ناٹک) از مسٹر برج باسی لال بی - اے - ایڈوکیٹ - قیمت - ۱۲ ؎

دیال باغ - (انگریزی پمفلیٹ متعلقہ دیال باغ آگرہ)

مضامین شرر - (تیرہ حصّے) از مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی مرحوم -

ورنگل

(از سید احمداللہ قادری - ایم - آر - اے - ایس (لندن) حیدرآبادی)

ورنگل ایک نہایت ہی قدیم اور تاریخی شہر ہے - جسکی بنیاد کاکیتیا خاندان کے مشہور راجہ پرولاہ (۱۱۵۰ء تا ۱۱۶۳ء) نے رکھی تھی - مگر اس سے صدیوں قبل یہ شہر راجگانِ اندھرا کی عملداری میں آچکا تھا جب یہ خاندان تباہ و برباد ہوگیا تو اس پر ورنگل کے کاکیتیا راجہ قابض و متصرف ہوگئے -

ورنگل قلمرو نظام کا جنوبی شرقی علاقہ ہے - یہ خطوط عرض البلد شمالی (۱۶°۴۸' - اور ۱۸°۳۶') اور مابین خطوط طول البلد شرقی (۷۸°۵۰' - و - ۸۰°۴۳') کے تقاطع پر واقع ہے اسکے حدود جنوب و مشرق میں ضلع چاندا، کرشنا اور گوداوری تک پھیلے ہوئے ہیں - ضلع نلگنڈہ اور اطراف بلدہ کے علاقے اسکے جنوبی و غربی حصے پر ہین - میدک اور کریم نگر اسکی شمالی حد ہین - اسکا ارتفاع سطح زمین سے تقریباً دو ہزار فیٹ ہے[۵۱] -

ورنگل قدیم زمانے میں "اورکل" کہلاتا تھا[۵۲] جسکو بعد مین مسلمان مورخین نے مسخ کرکے ورنگل بنادیا - لیکن رگھوناتھ بھاسکر کی تصنیف "ارواچم کوش" کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نام کا ترجمہ اسین ایکا سیلا نگر کیا گیا ہے - جسکے معنی ایک بہت بھاری چٹان کے ہین اور اس بیان سے گمان ہوتا ہے کہ اس سے ورنگل کی وہی چٹان مراد ہوگی جس پر قلعۂ ورنگل کی بنیاد ہے[۵۳] - اگر ہم اس بیان کو صرف ایک مصنف کی تحقیق کے اعتبار سے قابل وثوق سمجھین تو یہ ممکن نہین ہے، اسلیے ہم اس بیان کی تائید مین یورپ کے مشہور مستشرق اور جغرافیہ نویس ڈاکٹر لاسین کے بیان کو لکھتے ہین - انھون نے اپنے جغرافیہ مین اسکا قدیم نام ارانیا کنڈہ لکھا ہے - مگر یہ ایک سخت غلطی ہے کیونکہ کچھ عرصہ پہلے بنگال رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے مین اسکے متعلق ایک مضمون شائع ہوا تھا جس مین اس نام کے صحیح قرار دینے کی نسبت ایک بسیط بحث کی گئی تھی اور آخر مین اسکا قدیم نام ارسنا کنڈہ بجائے انمکنڈہ یا ہنمکنڈہ قرار پایا تھا[۵۴] -

---

[۵۱] جنرل دکن آرکیولوجیکل سوسائٹی صفحہ ۳۰ - [۵۲] گزیٹیر نظام سٹیٹ صفحہ ۲۴۰ - [۵۳] ڈسکرپٹیو ہسٹاریکل اسکیچز (از سید حسین نواب عماد الملک بہادر) صفحہ ۴۷ - [۵۴] جنرل دکن آرکیولوجیکل سوسائٹی صفحہ ۴۴ - [۵۵] انڈین انٹی کویری جلد ۱۰ صفحہ ۳۱۲ -

اِس موقع پر اکثر مؤرخین نے بالکل سکوت اختیار کیا ہے - اور بعضون نے اِس سے نہایت دلچسپ اور نئے نئے نظرئے استخراج کیے ہین - اور بیشتر اس بات پر متفق ہین کہ اس سے دہی اورنگلی[1] مراد ہے جو ادیوارا جاؤن کی سلطنت[51] تھی -

یہ نظرئے چونکہ نہایت دلچسپ اور تاریخی ہین اور واقعہ سے انکی قریب قریب تطبیق بھی ہوجاتی ہے - اِس لیے ہم انکے ماننے کو زیادہ تیار ہین - اور دوسری وجہ انکے قبول کرنے کی یہ ہے کہ جب دکن مین ساتا واھانا خاندان کی حکومت زوال پذیر ہوئی تو اُس وقت اسکی کئی شاخین ہوگئین - اور یہ سب اپنے بڑے خاندان کے تباہ ہونے سے بہت پہلے عالم وجود مین آچکی تھین[52] -

اِس موقعہ پر جنرل کنگ ہیم نے بھی ایک بیان سپرد قلم کیا ہے - یعنی ورنگل یا اورنگل کا قدیم نام بطلیموس (ٹالمی) کے جغرافیہ مین کورنکولہ کے نام سے مستعمل ہے اور اسکو بیان کرتے وقت انھون نے اپنے ہان اسکی قطعی تصدیق کرلی ہے - جسکو ہم ایک زبردست محقق ہونے کے اعتبار سے قابل وثوق سمجھتے ہین اور دوسرے اسکی تائید اور محققین کی مختلف تحریرات سے ہوجاتی ہے[53] -

ورنگل کے متعلق جس قدر معلومات ہم نے فراہم کیے ہین اُن مین ڈاکٹر رگھوناتھ بھاسکر اور جنرل کنگ ہیم کے بیانات زیادہ وزنی ہین اور ان سے ورنگل کے ابتدائی زمانے پر جو روشنی پڑتی ہے - وہ ایک حد تک بہت غنیمت ہے - آخر الذکر بیان قدامت کے اعتبار سے اپنے اندر بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہر حضرت عیسیٰؑ سے صدیون قبل حرف تحقیق مین آچکا تھا - در اصل یہی ایک ایسا بیان ہے جس سے ہم اسکی غیر معمولی قدامت اور شاندار عظمت کا اندازہ کرسکتے ہین - اور اسکے متعلق اس سے قدیم تحقیق آج تک ہماری نظر سے نہین گذری -

(۲)

جنوبی ہند مین جب راجگان اندھرا کی حکومت کو زوال شروع ہوا تو اس پر ورنگل کے کاکیٹیا خاندان کے راجہ قابض ہوگئے - در اصل ورنگل مین یہی ایک ایسا خاندان ہے جسکو دکن کی تاریخ مین معمول سے زیادہ شہرت حاصل ہے - اور واقعہ یہ ہے کہ سلطنت ورنگل کے عظیم الشان تاجدارون سے یہی ایک خاندان ہے - اور اسی نے مسلمانون کے خروج تک سارے دکن پر حکومت کی تھی - انکے زمانۂ حکومت

---

۵۱ ہسٹاریکل اسکیچز صفحہ ۳۷ -

۵۲ ان کا تعلق تلو اندھرا خاندان کے راجاؤن سے بھی تھا

(انڈین انٹی کویری صفحہ و سیکیچز صفحہ ۴۸)

۵۳ رسالہ دکن آرکیولوجیکل سوسائٹی صفحہ ۳۷ -

۵۴ رسالہ دکن ارکیولوجیکل سوسائٹی صفحہ ۳۷ -

کے مقابلے مین جیساکہ تاریخ کے سنہرے ورقون پر ثبت ہے۔ ناممکن ہے کہ ورنگل کے کسی ہندو خاندان کو ایسی لافانی حیثیت حاصل ہو۔

اِس خاندان کی ابتداء اور نشو ونما کے متعلق مورخین مختلف البیان ہین بعض کا خیال ہے کہ اس خاندان نے بارھوین صدی عیسوی کے وسطی ایام مین اپنا ابتدائی قدم[51] رکھا۔ اور بعض اسکی غیر معمولی قدامت کے معترف ہین۔ ان کے خیال مین اسکی ابتدا ساتوین صدی سے بہت پہلے شروع ہو جاتی ہے[52]۔ اور ہمین بھی اسی نظریے سے اتفاق ہے کیونکہ ساتوین صدی عیسوی کے مشہور چینی سیاح ہیون شانگ نے ہندوستان کا سفر کیا تھا[53]۔ اسنے جنوب کی سلطنتون کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ دانا کاکیٹیا خاندان کا بھی تذکرہ کیا ہے[54]۔ اِسکے علاوہ ہم اِس بیان کے ثبوت مین بارھوین صدی ہجری کے مشہور مورخ بدایونی کے قول کو بھی پیش کرتے ہین ان کے ہان اسکی ابتدا ساتوین صدی عیسوی سے بہت قبل کی قرار پاتی ہے۔ کیونکہ انھون نے اِس خاندان کا زمانۂ حکومت سات سَو سال بیان کیا ہے۔

یہ مختصر واقعات جس تحقیق اور تفتیش سے ہم نے جمع کیے ہین یہ سب نہایت اہمیت رکھنے والے ہین۔ خاص کر اِس خاندان کے متعلق جس قدر معلوماتی ذخیرہ تلنگی اور ٹامل زبانون مین موجود ہے ناممکن ہے کہ کسی اور زبان مین ایسا اچھا مواد فراہم ہو۔ البتہ تیرھوین صدی ہجری کے وسطی یا آخری دَور مین جس قدر کتابین تلنگی یا دکن کی مروجہ زبانون سے اُردو یا فارسی زبان مین منتقل ہوئی ہین۔ اُن مین ایک حد تک اِس خاندان کے حالات زیادہ وضاحت سے پائے جاتے ہین مثلاً ۱۲۶۹ھ مین منشی قادر خان بیدری نے سلاطین قطب شاہیہ کی ایک تاریخ لکھی ہے جس مین زیادہ تر راجگان ورنگل کے حالات قلمبند کیے ہین۔ دراصل اِس کا تاریخ ورنگل کا حصہ تلنگی زبان کی ایک کتاب پرتاب چرترا سے ماخوذ ہے۔ اِس کتاب سے راجگان ورنگل کے حالات پر نہایت اچھی روشنی پڑتی ہے۔ اور جو معلومات اِس سے فراہم ہوتے ہین وہ ایک حد تک غنیمت اور صحیح ہین۔ چنانچہ اِس خاندان کی ابتدا کے متعلق ایک جگہ کا اقتباس ذیل مین نقل کیا جاتا ہے۔

"نندگری (نانڈیڑ) مین ایک راجہ نند نامی حکومت کرتا تھا جسکے مرنے کے بعد اُسکی سلطنت دَو بیٹون مین تقسیم ہوگئی"
"ایک بیٹا ہنمنت گیری[55] کی ریاست پر قابض ہوا۔ دوسرے نے قندھار[56] کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ موخرالذکر راجہ نے"
"خوب ترقی حاصل کی۔ اوّل الذکر راجہ کا خاندان معدُوم ہوگیا۔ جب اِس راجہ کے جاہ وجلال کی خبر انک"

---

۵۱ گزیٹیر ممالک محروسہ سرکار عالی صفحہ ۱۵۱ و میڈوز ٹیلر ہسٹری صفحہ ۵۰۴۔ ۵۲ انڈین انٹی کویری صفحہ ۱۲۰ اراد ہسٹاریکل دسکرپٹو اسکیچز صفحہ ۲۰۷۔ ۵۳ سفرنامۂ ہیون شانگ صفحہ ۲۰۷ واقعات بیجاپور صفحہ ۵۹۲۔ ۵۴ لینڈ مارک اف دکن صفحہ ۶۰۔ ۵۵ ہنمکنڈے یا انمکنڈے کا قدیم نام ہے جو ضلع ورنگل کا ایک تعلقہ ہے۔ ۵۶ یہ تعلقہ ضلع نانڈیڑ کے مغرب میں واقع ہے (گزیٹیر حیدرآباد صفحہ ۲۲۰)

"کے راجہ کو پہونچی تو اُسنے اِس پر فوجکشی کرنے کا ارادہ کیا اور آخرکار چڑھائی کردی۔ اِس جنگ میں قندھار
کے راجہ کو نہایت بُری طرح پسپا ہونا پڑا اور اثنائے جنگ میں کٹک کے راجہ نے اُسکو مار ڈالا۔ جسکے بعد
اُسکی بیوی (جو اُس وقت حاملہ تھی) وہان سے بھاگ کر ہنمکنڈے میں ایک برہمن کے گھر چلی آئی۔
یہان اسکے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ جسکا نام اُس نے مادھو ورما رکھا۔ یہی راجہ کاکیتا خاندان
کا بانی کہلاتا ہے"[۵۱]

اِس مختصر اور مجمل بیان سے اِس خاندان کی نشو و نما پر نہایت واضح روشنی پڑتی ہے اور اِس خاندان کے ابتدائی مدارج کے سمجھنے مین آسانی ہوتی ہے۔ البتہ اِس حصے مین جو نقص واقع ہُوا ہے وہ یہ ہے کہ اِس سے راجہ کا زمانہ اور عہد حکومت معین نہین ہو سکتا اور مؤرخین کے بیان کے لحاظ سے اِس واقعہ کو ساتوین صدی عیسوی کا ابتدائی زمانہ قرار دینا پڑتا ہے[۵۲]۔

اسی کتاب کے مصنف نے ایک جگہ پرتاپ چرترا کے حوالے سے اِس خاندان کے سلسلۂ نسب کی نسبت لکھا ہے کہ "یہ خاندان جو راجگان ورنگل کے نام سے مشہور ہے۔ اِسکا نسبی سلسلہ چولا خاندان سے ملتا ہے۔ اور اِس خاندان کے بانی مادھو ورما نے چولا خاندان کے ایک راجہ کی لڑکی سے شادی بھی کی تھی"[۵۳]

ڈاکٹر برنل نے اِس خاندان کے نام سے تعلق جو کاکیٹیا کہلاتا ہے[۵۴] تحقیق کی ہے کہ یہ خاندان جس نام سے موسوم و منسوب ہے وہ بقول مسٹر کمارا سوامی کے درگا دیوی کے القاب سے حاصل کیا گیا ہے[۵۵]۔

(۳)

ابتداء مین راجگان ورنگل کی حیثیت ایک باجگزار راجہ کی تھی۔ لیکن جب ونیالی کی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا تو اسپر دکن کے راشٹر کوٹا خاندان کے راجہ مسلط ہوگئے۔ اور یہ موقع چونکہ راجگان ورنگل

---

۵۱ سرال دیوی (پرتاپ چرترا تلنگی صفحہ ۱۰) ۵۲ تاریخ قطب شاہی قلمی صفحہ ۲۲۔ پرتاپ چرترا تلنگی صفحہ ۱۰۔ ۵۳ اس جہ کے زمانۂ حکومت کو ہسٹاریکل ڈسکرپٹو اسکیچز (نواب عماد الملک بہادر) اور اسی کی اتباع مین گزیٹیر انڈیٹ (مرتبہ محمد یحییٰ خان) نے ۱۱۵۰ء کے قریب کا بتایا ہے۔ ہم اِس بیان کو قابلِ وثوق نہین سمجھتے۔ کیونکہ اِسکا انکے پاس کوئی ماخذ نہین ہے (قادری)

۵۴ (پرتاپ چرترا کی تلنگی عبارت کا اصلی ترجمہ یہ ہے) مہاراج مادھو ورما نے چول دیش کے ایک ذی اقتدار راجہ راجہ جسکی عزت راجہ اور مہاراجہ کرتے ہین اُسکی ایک لڑکی سے شادی کی تھی۔ اور اِس خوشی مین ہنمکنڈے کے برہمنون کو مالا مال کردیا تھا (پرتاپ چرترا صفحہ ۲۲) ۵۵ راجگان ورنگل کا زیادہ تر کاکیٹیا کے نام سے مشہور ہین۔ لیکن انکا دوسرا قبول عام نام نرپتیس تھا جسکے معنی آدمیون کے سردار کے ہین۔ اور یہ نام جیتی خاندان کے راجاؤن کا مقابل ہے کیونکہ اسکے معنی ہاتھیون کے سردار کے ہین۔ اور یہ لقب راجگان آندھرا اپنے نام کے ساتھ ہمیشہ استعمال کیا کرتے تھے (جنرل دکن ارکیالوجیکل سوسائٹی صفحہ ۳۰)

۵۶ انڈین انٹی کویری جلد ۱ صفحہ ۱۰

سکے لیے بھی نہایت بہتر تھا۔اس لیے انھون نے بھی اپنی خود مختاری کا اعلان کردیا۔جسکے بعد ان کی سلطنت مین غیر معمولی وسعت ہونے لگی اور تھوڑے ہی عرصے مین یہ سارے دکن کے مالک بن بیٹھے[۵۱]۔

اِس خاندان کا پہلا راجہ بقول میجر ہیگ متھری بھوانا ملا (سنہ ۱۰۰۰ء) تھا جسکے پوتے نے ہنمکنڈے کی مشہور ہزار ستونی دیول تعمیر کی تھی[۵۲]۔ اِس راجہ کا ذکر تاریخون مین بہت کم ملتا ہے اور اکثر مورخین نے اِسکو اِس خاندان کے سلسلۂ نسب ہی سے بالکل خارج کردیا ہے[۵۳]۔

اِس راجہ کے مرنے کے بعد اسکا بیٹا پرولے راجہ (۱۰۵۰ء ۔ ۱۰۸۰ء) تخت نشین ہوا جس نے چالوکیا خاندان کے مشہور راجہ تیلا پادوا کو ایک معرکے مین شکست دی تھی[۵۴]۔اِسکے عہد مین اطراف کے راجہ جو ایک زمانے سے خود سر اور باغی بنے ہوئے تھے سب اسکی سطوتِ شہریاری سے اطاعت گزار ہوگئے۔ خاصکر ایسے عروج کے زمانے مین اسکے خلاف راجہ گووندنے علم بغاوت بلند کیا۔جسکے بعد اس نے اُس راجہ کو قید کرلیا۔اور اس بغاوت کی پاداش مین اسکے سارے ملک کو ایک دوسرے راجہ کے جسکا تعلق اَویوا خاندان سے تھا) سپرد کردیا[۵۵]۔

اِن فتوحات کے علاوہ اِسکے زمانے مین منتراکوٹا کی سلطنت فتح ہوئی یہ سلطنت کہان واقع تھی، اسکے حدود کیا تھے؟ یہ سب واقعات پردۂ خفا مین مستور ہین[۵۶]۔

اِس راجہ کے عہد حکومت مین سلطنت ورنگل نے غیر معمولی وسعت اور ترقی حاصل کی۔اور اسکے زمانے مین بڑے بڑے شہر فتح ہوئے۔اس راجہ کو بعض محققین نے سلسلۂ کاکیتیا کا پہلا راجہ تسلیم کیا ہے۔ اِسی نے سلطنتِ ورنگل کی بنیاد رکھی تھی[۵۷]۔

اسکے بعد رودرادیوا اوّل[۵۸] (۱۱۱۰ء ۔ ۱۱۵۸ء) جو اسی سلسلے مین تھا سریر آرائے سلطنت ہوا جسنے ہنمکنڈے کا مشہور ہزار ستونی دیول تعمیر کیا تھا۔اسکے مفصل حالات کتبۂ ہنمکنڈہ مین تحریر ہین۔کہا جاتا ہے کہ اسنے راجہ ملوگی کو جو یادو خاندان کا سولھوان راجہ تھا اسکے شہر کے شہر سبینہ دیشہ کو فتح کیا[۵۹]۔ اور پولاداسا کے راجہ کو بھی ایک عظیم الشان معرکے مین شکست دی۔بھیما جو چولا اور چالوکیا سلطنتون پر حکمرانی کرتا تھا اسکی سلطنت کے ایک حصّے کو اپنی قلمرو مین شامل کرلیا۔

---

[۵۱] رسالہ آرکیولوجیکل سوسائٹی آف دکن صفحہ ۳۷۔ [۵۲] امپیریل گزیٹیر آف انڈیا جلد ۲۴ صفحہ ۳۵۰۔ [۵۳] لینڈ مارک آف دکن صفحہ ۵۰۔
[۵۴] اس راجہ کو مغربی چالوکیا خاندان کا تیلائے سوم (۱۱۵۰ء ۔ ۱۱۶۲ء) بھی کہتے ہین چوچالوکیا خاندان کے آخری تاجدار سے پہلے گزرا ہے (انڈین انٹی کویری صفحہ ۱۲ جلد ۱۰۔ لینڈ مارک آف دکن صفحہ ۵۰۔ ہسٹری آف بیجانگر صفحہ ۸۳) [۵۵] لینڈ مارک آف دکن صفحہ ۵۰
[۵۶] لینڈ مارک آف دکن صفحہ ۵۰ (ضمیمۂ مضمون) [۵۷] جنرل دکن آرکیولوجیکل سوسائٹی صفحہ ۳۰۔ لینڈ مارک آف دکن صفحہ ۵۰۔ [۵۸] کو پرتاب رودرا اوّل بھی کہتے ہین (لینڈ مارک آف دکن صفحہ ۱) [۵۹] ماسکی ریاست حیدرآباد کا درمیانی حصّہ (لینڈ مارک آف دکن صفحہ ۵۶)

اسکے زمانے مین بڑے بڑے مناد۔ اور اونچی اونچی دیولین تعمیر ہوئین۔ خاص کر اسنے ورنگل کی حدود مین جس قدر توسیع کی وہ ہمیشہ اسکے نام کے ساتھ یادگار رہیگی۔

اسنے جب انتقال کیا تو اس وقت بقول منشی قادرخان اسکے کوئی اولاد نہ تھی۔ البتہ اس کا ایک چھوٹا بھائی مہادیو (۱۱۹۹ء تا ۱۲۱۳ء) زندہ تھا جس نے سلطنت کی عنان حکومت اپنے ہاتھ مین لی۔ اور اسکو اس رواداری اور نیک طینتی سے انجام دیا کہ اسکی نظیر راجگان ورنگل مین ملنی دشوار ہے۔

اس راجہ کو میجر ہیگ نے رودرا دیوا اول کا بیٹا لکھا ہے اگرچہ اس بیان کو قابل اعتبار سمجھین تو پرتاپ چرترا جو ایک قدیم اور مستند کتاب ہے اسکے بیان مین لغزش واقع ہوتی ہے۔ اس لیے ہم اس پر کوئی قطعی راے قائم نہین کرتے۔

مہادیو کے بعد بلحاظ سلسلہ گنپتی دیو (۱۲۱۳ء تا ۱۲۵۰ء) تخت نشین ہوا۔ اس راجہ سے ابتدا مین دیوگرہ کے یادو خاندان سے تعلقات بہت کشیدہ تھے اور ہمیشہ خانہ جنگیان ہوا کرتی تھین لیکن اس نے اپنی ہوشیاری اور اعلیٰ دماغی سے کام لے کر ان سے ہمیشہ کے لیے صفائی کر لی اور اس تصفیہ کو باہم برقرار رکھنے کے لیے اس خاندان کی ایک لڑکی سے شادی کی۔

اس راجہ کو ایک زبردست فاتح اور کامیاب جنگجو کی حیثیت سے وہی رتبہ حاصل ہے جو اس خاندان کے تیسرے فرمانروا رودرا دیوا اول کو تھا۔ اسنے صرف شہرون کو اجاڑنا اور فتح کرنا اپنے شعار مین داخل نہین کیا تھا۔ بلکہ جس نے تعمیرات۔ موسیقی۔ اور علم ادب کی ایک زبردست راجہ ہونے کی حیثیت سے شایان شان سرپرستی کی تھی، اس کو بقول مصنف "پرتاپ چرترا" علم ادب سے خاص ذوق تھا۔ اسکے دربار مین ہمیشہ بڑے بڑے پنڈت جمع رہتے تھے۔ اسی نے قلعہ ورنگل کی عالی شان فصیل بنوائی تھی۔ اسکے عہد حکومت مین نہایت عظیم الشان مناد بنے تھے۔ قلعۂ ورنگل کا وسطی مندر جو اب ناتمام اور بالکل شکستہ حالت مین ہے۔ اسی کی خوش ذوقی کی ایک زندہ مثال ہے۔ اگرچہ یہ دیول اختتام کو نہین پہونچا لیکن اسی حالت مین اسکا شمار دکن کی ان معدودے چند عمارات مین ہوتا ہے جو انگلیون پر گنی جاتی ہین۔

اسکے زمانے مین ورنگل کی حدود مین خوب توسیع ہوئی تھی جنوبی گجرات اور بنگال کے علاقے سب اسی کے

---

۵۰ تاریخ قادری قلمی صفحہ ۹۱۔

۵۱ لینڈمارک آف دکن (ہیگ) صفحہ ۵۹ جنرل دکن آرکیولوجیکل سوسائٹی صفحہ ۲۔

۵۲ لینڈمارک آف دکن صفحہ ۵۹۔

۵۳ پرتاپ چرترا تلنگی صفحہ ۲۱۔

۵۴ لینڈمارک آف دکن صفحہ ۶۰ و ڈسٹرکٹ ہسٹاریکل سکیچز صفحہ ۳، گزیٹیر نظام سٹیٹ صفحہ ۱۵ و ضمیمہ مضمون ہذا)

۵۵ پرتاپ چرترا صفحہ ۲۲۔

۵۶ لینڈمارک آف دکن صفحہ ۵۷۔

خراج گذار تھے - اسکی حکومت ضلع نلور سے متجاوز تھی اور مشرقی دکن کے سارے راجہ اسی کے ماتحت تھے۔ اور ان سب پر اسکی عظمت و شوکت کا سکہ یکساں رواں تھا -

اس نے بقول سیجہ بیگ ۱۲۵۷ء مین انتقال کیا[51] - لیکن بعض مورخین نے اس کی تاریخ انتقال ۱۲۶۱ء بیان کی ہے - اس لحاظ سے ہم اس کے انتقال کی کوئی صحیح تاریخ تعین نہین کرسکتے -

اس راجہ کے کوئی نرینہ اولاد نہ تھی - اسکے مرنے کے بعد اسکی بیوی رودر ما دیوی (۱۲۵۷ء یا ۱۲۶۱ء) سے ۱۲۹۵ء تک تخت نشین ہوئی[52] جسکا ذکر مارکو پولو نے بھی کیا ہے - وہ اسکے انتظام سلطنت کی نسبت لکھتا ہے کہ

"اس رانی نے اپنے مرحوم شوہر گنپتی کے بعد سلطنت ورنگل کا جو انتظام کیا تھا وہ تاریخ مین اپنی آپ" "در نظیر ہے - اور اس نے جس وفاداری اور صلح پسندی سے رعایا مین قبولیت عام حاصل کی تھی - " " آج تک اس خاندان کے کسی راجہ کو ایسی ہر دلعزیزی حاصل نہین ہوئی[53]"

ڈاکٹر بیگ نے اسکا دور حکومت اڑتیس (۳۸) سال بیان کیا ہے[54] - اگر ہم اسکی تخت نشینی کا سال ۱۲۶۱ء قرار دین تو اسکی حکومت کا زمانہ چھتیس سال قرار پاتا ہے -

۱۲۹۵ء مین اسنے بقول سیجہ بیگ سلطنت سے سبکدوشی حاصل کی - اسکے بعد پرتاپ رودر دوم[55] جو رشتہ مین اسکا نواسہ ہوتا تھا تخت نشین ہوا اسکے عہد مین ورنگل کی حدود مغربی گھاٹ تک پھیلی ہوئی تھین جو بالا را ور گوداوری ندی کا درمیانی حصہ ہے[56] -

اسکے حکمراں ہونے کے بعد ورنگل کی سلطنت یک لخت کمزور ہوگئی اور سب سے پہلے اسپر ۱۳۰۳ء مین مسلمان حملہ آور ہوئے - لیکن بعض وجوہات کے باعث انکو اسپر کامیاب فتح حاصل نہین ہوئی کیونکہ راجگان ورنگل کے قبضے مین اسوقت بہت سے مقبوضات تھے - اس واقعہ کے تقریباً سات سال بعد (۱۳۱۰ء مین ملک کافور نے) پھر مسلمانون نے اسپر چڑھائی کی - اور راجہ نے اطاعت قبول کرنے پر ورنگل بطور خراج مسترد کردیا - لیکن بعد کو انھون نے اپنی نام نمود کے لیے سلطنت مین خود مختاری شروع کی جسکے بعد ۱۳۲۱ء مین محمد تغلق اسپر پھر حملہ آور ہوا[58] - اور اسکو فتح

---

[51] گزیٹیر نظام اسٹیٹ صفحہ ۳۵۱ - [52] لینڈ مارک آف دکن صفحہ ۵۷ - [53] جنرل دکن ارکیولوجیکل سوسایٹی صفحہ ۹۳ و لینڈ مارک آف دکن صفحہ ۵۹ ڈسکرپٹیو ہسٹاریکل اسکیچز (نواب عماد الملک بہادر) صفحہ ۳۰۷ - واقعات بیجاپور صفحہ ۵۹۴ جلد ۲

[54] ارکولوجی جلد ۲ صفحہ ۲۹۵ - [55] لینڈ مارک آف دکن صفحہ ۵۹ -

[56] اس راجہ کو مسلمان مورخین نے لادر دیو (۱۲۹۵ء تا ۱۳۲۳ء) کے نام سے یاد کیا ہے (واقعات بیجاپور صفحہ ۵۹۴)

[57] جنرل دکن آرکیولوجیکل سوسائٹی صفحہ ۹۳ - [58] گزیٹیر نظام اسٹیٹ صفحہ ۴۵۱ -

کرکے سلطنت دہلی مین شامل کیا۔ اور راجہ کو قید کرکے دہلی بھیج دیا۔ لیکن غیاث الدین تغلق کی خداترسی سے اسکو بہت جلد رہائی مل گئی اور ورنگل بھی بطور خراج واپس کیا گیا۔ اسکے بعد اس نے اپنی ساری عمر شاہان دہلی کے ایک وفادار نمایندے کی حیثیت سے بسر کی جسکی وجہ سے اسکی سلطنت مین وہ اگلی سی شان وشوکت باقی نہ رہی جو ابتدا مین تھی[۱]

اسکے انتقال کے بعد ویرابھدر یا کرشنا (۱۳۲۵ء تا [illegible]) تخت نشین ہوا جو اسی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے تھوڑے ہی عرصے مین سلطنت سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور تارک الدنیا ہوگیا۔ اور اسکے بعد اس خاندان کا خاتمہ نظر آتا ہے[۲] مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پھر تلنگانہ کے ہندؤن نے (۱۳۴۳ء یا ۱۳۴۴ء کے درمیان) محمد تغلق کے آخری عہد مین بغاوت کی تھی اور اس خاندان کے ایک راجہ کنیا نائک نامی نے مسلمانون سے آزاد ہوکر اپنی خودمختاری کا اعلان بھی کیا تھا۔ لیکن بعد مین محمد تغلق نے اس شورش کو دفع کرکے اسپر پھر اپنا مستحکم قبضہ کرلیا۔ لیکن جب تغلق خاندان کی سلطنت مین کمزوری واقع ہوئی تو اس موقعہ پر علاءالدین حسن بہمنی نے راجگان ورنگل کو مجبور کیا کہ وہ خراج بجائے شاہان دہلی کے اسے ادا کیا کرین[۳]۔

آخر ۱۴۲۲ء مین ورنگل پر بیدر کے بہمنی بادشاہون کا قبضہ ہوگیا اور یہ سلطنت سلاطین قطب شاہیہ کی عملداری مین آئی اور اب اسپر حیدرآباد کا آصفیہ خاندان حکمران ہے[۴]

(کاکیتیا خاندان کا سلسلۂ نسب)

مادھو ورما (بانی) ساتوین صدی عیسوی

(۱)	متھری بھوانا ملا	(سنہ [illegible] تا ۱۰۵۰ء)
(۲)	پرولا راجہ	(۱۱۱۰ء تا ۱۱۶۳ء) (۱) بیٹا
(۳)	رودرا دیوا اول	(۱۱۶۳ء تا [illegible]) (۲) "
(۴)	مہادیو	([illegible] تا ۱۲۳۱ء) (۳) بھائی یا بیٹا (تحقیق طلب)
(۵)	گنپتی دیو	(۱۲۲۳ء تا ۱۲۵۰ء یا ۱۲۶۱ء) (۴) بیٹا

۱ لینڈ مارک آف دکن صفحہ ۵۰ و جنرل دکن ارکیولوجیکل سوسائٹی صفحہ ۹۳ ہسٹاریکل ڈسکرپٹیو اسکیچز صفحہ ۳۰، تاریخ نادری قلمی صفحہ ۶۲

۲ لینڈ مارک آف دکن صفحہ ۵۷

۳ گزیٹیر نظام اسٹیٹ صفحہ ۲۵۱

۴ گزیٹیر نظام اسٹیٹ صفحہ ۲۵۲۔

(۶) رودرا دیوی (۱۲۵۹ء یا ۱۲۶۱ء تا ۱۲۹۴ء) (۵) بیوی

(۷) پرتاپ رودرا اول (۱۲۹۴ء تا ۱۳۲۵ء) (۶) نواسہ

(۸) کرشنا (۱۳۲۵ء تا [illegible]) (۷) بیٹا

ضمیمہ

اس خاندان کے سلسلۂ نسب اور رودرا دیوا اول کے زرین کارناموں کے متعلق ایک کتبہ سنسکرت زبان میں ہنمکنڈے کے مشہور ہزار ستونی دیول پر (۱۱۶۲ یا ۱۱۶۳ء کا) کندہ ہے اس سے اس خاندان پر جو روشنی پڑتی ہے وہ بالکل نئی ہے۔ یہ کتبہ انگریزی زبان کے مختلف رسائل میں متعدد بار (معہ ترجمہ) چھپ چکا ہے۔ جسکی بابت ہر ایک مورخ نے اپنی اپنی بساط کے موافق تحقیق کی ہے لیکن قریب قریب سب محققین کو اس میں ناکامی رہی۔ ہمارے خیال میں سب سے پہلے اسپر بنگال رایل ایشیاٹک سوسائٹی[1] نے لکھا اور اس کتبہ کی صحیح تاریخ کندگی ۱۰۸۴ (ساکا) قرار دی۔ اسکے بعد بمبئی رایل ایشیاٹک سوسائٹی[2] نے اسی عنوان پر ڈاکٹر باڈوجی کا ایک مضمون شائع کیا۔ جس میں انھوں نے اسکی ترشوائی ۱۰۸۵ (ساکا) قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ مگر جب ان مستشرقین کی تحقیق مسٹر راش کی نظر سے گذری تو انھوں نے اسکو ناقابل تحقیق اور لغو قرار دیا اور اسپر خود از سر نو نظر[3] قائم کیے اور یہ لکھا کہ اس کتبہ کی ترشوائی نویں صدی عیسوی کی ہے۔ اور اس میں تیلاپ اول اور بھیاپ دوم جو مغربی چالوکیا خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اسمیں انکی قسمت کے نوشتوں کا حال مندرج[4] ہے۔

ان مضامین کے لکھے جانے کے چند سال بعد مسٹر فلیٹ نے قدیم سنسکرت کتبوں پر ایک مضمون لکھا جو انڈین انٹی کویری کی دسوین جلد میں شائع ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے ان تمام محققین کی تحقیق سے اختلاف کرتے ہوئے اسکی صحیح تاریخ کندگی ۱۱۶۲ء و ۱۱۶۳ء بیان کی ہے۔ اور یہ آخری نظریہ نہایت صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ مابعد کے مورخین بھی اسی کا اتباع کرتے[5] ہیں۔ یہی مضمون میجر ہیگ اور مسٹر یزدانی کے ان مقالوں کی بنیاد ہے جو ورنگل پر شائع ہوئے ہیں۔ اور ہم اسی مضمون سے جس میں اس کتبہ کا ترجمہ بھی ہے اسکا خلاصہ ذیل میں درج کرتے ہیں۔

---

[1] بنگال رائل ایشیاٹک سوسائٹی جنرل جلد ۴ صفحہ ۹۰۱ - [2] بمبئی رائل ایشیاٹک سوسائٹی جنرل جلد ۱ صفحہ ۴۶ [3] انڈین انٹی کویری جلد ۱ صفحہ ۱۲۱ تا ۲۱۱ [4] انڈین انٹی کویری صفحہ ۱۲۰ تا ۲۱۲ جلد ۱۰ -

"خدا ہمارے ملک کو فتح و کامرانی، سرسبزی اور شادابی عطا کرے رودرا دیوا مہاسندلیس ور جیسے ذی اقتدار"
"راجہ کا زمانہ حکومت، شوکت و دبدبہ اور فتحمندیوں سے لبریز تھا۔ اور وہ اُمکنڈ جیسے بہترین شہر پر نہایت"
"جلو و جلال کے ساتھ حکمران تھا۔ مہاسیس وارا کا بڑا پرستار تھا اسکے سارے افعال مالک کی خاطر تھے"
"اور وہ شرم و مروت کا مجسم پتلا تھا۔ اور طرز جہانبانی کو اُسکی شیرین بیانی نے چار چاند لگا دیے تھے۔"
"**دودرا** یعنی ۱۲ ماہ ششنو مشنہ سالی ملک مین سیوراسری وشنو یوا او سری دیوا کے نامون پر اُسنے"
"اپنے نام کا سکہ بیٹھایا۔"

"مین ہری کی تعریف مین رطب اللسان ہون جب اس نے ارضِ زمین کو اوپر کی طرف اُٹھایا تو سات"
"سمندر کی موجین اٹھ اٹھ کر اُسپر یورش کرنے لگین جو بشکل تمام اُس کے عظیم الشان پانون کے"
"انگوٹھون کے ناخن تک پہونچ سکین۔ اور تینون عالم پانی کے ایک قطرے کی طرح اُسکی جھونپڑی مین"
"سما گئے۔ یہ جھونپڑی اُسکے دانت کا صرف ایک گوشہ تھی۔ اے سری ہریا میرے حال پر لطف و کرم"
"کی نظر کر تو اُن شہد کی مکھیون کا نشیمن ہے جو یاسمین کے عطر بیز پھولون کی کشش سے کھنچی ہوئی تیرے پاس"
"چلی آتی ہین۔ خدا کرے سرسوتی علم کی دیوی میرے دل مین آبسے۔ جس کو مین اپنی مان کے برابر سمجھتا"
"ہون۔ وہ دودھ کی دھارون سے ہمین بلند مدارج پر پہنچاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ چشمہ علم سرسوتی"
"چاند کے نور سے گوندھی ہوئی ہے یا ہلکے ہلکے صندلی رنگ کا ایک نازک مجسمہ ہے۔ مین یعنی اچیتندرادرا"
"سری رامیس ورداکشتیا کا بیٹا ہون جو بھرت راجہ کے خانوادے کی عزت بڑھانے والا تھا۔ اور سوتا"
"کے رسوم کو نہایت توقیر کے ساتھ ادا کیا کرتا تھا۔ وہ دنیا کا ایک بہترین آدمی تھا۔"

"ستری بھوانا ملا کا کیتیا کل کا ایک فتحمند راجہ تھا۔ جس سے زوی جبہدت دشمنون کی بیویون کا سہاگ"
"جاتا رہتا تھا۔ اُسکے نام سے بڑے سے بڑے سرکشون کے دل ہل جایا کرتے تھے۔ مستحق لوگ اس کے"
"فیض کرم سے مستفید ہوتے تھے۔ اور خوش گلو حسین نازک اندام نازنین اُسکی دل و جان سے گرویدہ"
"ہو جایا کرتی تھین"

"اُسکے بیٹے پرودے نے بڑی ناموری حاصل کی اور ایک لمحہ مین اُسنے تیلا پا ردا جیسے فتحمند اور"
"سپاہی منش راجہ کو جو چلو کیا خاندان کی ناک تھا۔ ایک معرکے مین قید کر لیا۔ اِس نے راجہ گووند"
"پر چڑھائی کی اور اُسے بھی دم بھر مین اسیر کر لیا۔ اور پھر اُسکو اپنی شاہانہ فیاضی سے رہا کر دیا اور"
"اُسکی سلطنت راجہ آدیوا کو دے دی۔ بے شرم (راجگذار) گووند اُسکے ہاتھون شکست کھا کر اپنے شہر"

ملہ یہ عبارت بطور جملہ معترضہ کے آئی ہے۔

"کی طرف فرار ہو گیا۔ جسکے بعد پرونا نے اسکو پھر جنگ کے لیے مقابلے کو طلب کیا۔ جگدیوا جیسے"
"ذی اقتدار راجہ کی شخصیت کو اسنے معرضِ زوال مین ڈال دیا اور اسکی تمام قوتین سلب کرلین۔ اسکے"
"بعد میتا رانی اسکی بیوی بنی۔ جسکے دلفریب حسن کی تعریف نہین ہوسکتی۔ اسکے بطن سے دنیا کا"
"یعنی سری رودرا دیوا پیدا ہوا جسکا تعلق سری کرشنا سے وابستہ ہے۔"

"اسنے اُن کی آن مین ڈوماکا سارا زور توڑ ڈالا۔ جو بڑا قد آور صاحب قوت اور شہسوار تھا۔"
"اسکے بعد راجہ رودرا نے کئی بہتر سے بہتر شہر اپنی راجدھانی مین شامل کیے۔"
"مین عمر بھر سری رودرا کی تعریف کرتا رہونگا جو میدا س کی شرارتون کو کچل سکتا ہے۔ اور جو بلند"
"اور اولوالعزم ارادون اور مشورون کا علمبردار ہے جس کی تاب اُسکے دشمن نہین لا سکتے۔ اُسنے"
"ظفرمند میلی گیدوا جیسے نامور شخص کی شان و آبرو کو خاک مین ملایا۔ سری پلوا تا جیسے زبردست راجہ"
"کی ساری دولت سمیٹ لی۔ گوکرنا اگرچہ ایک کم اصل انسان تھا لیکن وہ تمام دنیا کا ہیرو بن بیٹھا"
"تھا۔ اور اسکو بھیما جیسی خوفناک ہستی نے موت کے گھاٹ اتارا۔ اور پھر وہ چمکتا راجہ چدودیا عالم دینگی"
"مین دنیا سے سدھارا۔ اگرچہ وہ تیلپا سری رودرا دیوا کے رعب و دہشت سے چل بسا۔ بھیما جیسے بخت"
"نے اُسکی جگہ لی۔ یہ اپنی حکومت کے نشے مین چور تھا اور سری رودرا جیسے بہادر کے مقابل مین خم ٹھونکنے"
"کی جرأت کر بیٹھا۔ رودرا نے بھیما کی شیخیان سُنین تو اُسکا خون معرکہ آرائی اور فتحمندی کے جوش سے"
"اُبلنے لگا۔ چنانچہ ایک لشکرِ جرار کے ساتھ روانہ ہوا۔"

"اسکی ان شاندار تیاریون کو دیکھ کر بڑے بڑے مخالف کانپنے لگے۔ سب سے پہلے شہر دہمن نگری"
"کو اپنے قہر و غضب کا نشانہ بنایا۔ بھیما نے راجہ کی اس شان جلال کو دیکھا تو ہوش جاتے رہے۔ اور سب"
"چھوڑ چھاڑ کر بڑی بے حیائی کے ساتھ اپنے بھائی بہن بیوی کو لیکر جنگل کی راہ لی۔ راجہ نے بھی اسکا تعاقب"
"کیا۔ اور چدودیا کے شہر کو آگ لگا دی۔ اور پیچ پیچ جنگلون کا صفایا کر ڈالا جو اسکی راہ مین حائل ہوئے۔"
"پھر اسنے ایک عظیم الشان اور عجیب و غریب تالاب شہر کے بیچون بیچ بنایا۔"

"بھیما اور دوسرے راجہ جو کاکتی اور وندھیا کے درمیان رہتے تھے جو سلطنت کے غرور مین اپنی اپنی جگہ خدا"
"بنے بیٹھے تھے۔ لیکن جب انکے مزاج درست ہوئے اور ہوش ٹھکانے لگے تو رودرا کے دامن مین پناہ گزین ہوئے۔"
"اسکا دار الحکومت انماکنڈہ شہر گندرا پا کی طرح راحت و آرام سے معمور تھا اور اسکا ہر ایک گوشہ مہندری کی"
"طرح جشنو اور روشنو کی دیولون سے آراستہ و پیراستہ ہے۔"

"یہان پر نازک اندام اور پری پیکر جادو بھری نینون والی عورتون کا میلا لگا رہتا ہے جو دلفریب انداز کے"

" ساتھ مسکراتی ہوئی اپنی ابھری ابھری چھاتیوں کو سنبھال سنبھال کر چلتی ہیں۔ برہمنوں کے مکانوں میں نوجوان ..
" طالبعلموں کے ساتھ سینے طوطے بھی ہیں جو ان کے ہم آہنگ ہو کر 'وید' کی رٹ لگاتے ہیں ...

" سری رودرا کے گھوڑے آسمان پر دھاوے نہیں کرتے کیونکہ یہ وہ تھا جب جہاں دیوتاؤں کے قدم پڑے تھے۔ وہ اپنی ٹاپوں سے زمین کو پامال کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ انکے نزدیک ایک تقدس کا ٹکڑا رکھتی ہے "
" لیکن گھوڑوں کی یہ فوج غنیم اور دشمن کے حق میں ایک بلائے ناگہانی ہے۔ انکے گھوڑے مشہور ذعرون ،،
" خصائل سے متصف ہیں۔ بڑے بجیلے اور خوبصورت برق رفتار اور انکا کے بار بردار ہیں انکی عمر بھی خاصی "
" بڑی ہوتی ہے۔ رفتار کی پانچوں قسموں میں خوب طاق ہیں ..."

" اسکی قلمرو مشرق میں دریائے سوڑ تک پھیلی ہوئی ہے۔ اور اسکی قوت اقتدار کا سلسلہ تمام جنوبی ہند
" میں یعنی سری سیلا تک رواں ہے۔ اسکی حدود کے ایک جانب گنگا ہے اور دوسری جانب تمام مغربی ملک ،،
" اور جانب شمال ساترنا کے پہاڑ جو اپنی ناہموار بلندیوں کی بدولت بہت مشہور ہیں ۔"

" راجہ اراجیوا ... کی سب عزت و تکریم کرتے ہیں سری مہیسا ، راوی اور سوری جیسے دیوتاؤں ،،
" کی پرستش کے لیے ایک عظیم الشان قصبہ ... مستقل طور پر وقف کر دیا "

جذبات تسکین

(از حضرت تسکین سوروتوی)

اب بجز کنج قفس کچھ بھی مجھے یاد نہیں ۔۔۔ وہ اسیری ہے کہ جسکی کوئی میعاد نہیں
رنج بیداد باندازۂ بیداد نہیں ۔۔۔ مَیں جو فریاد کروں بھی تو وہ فریاد نہیں
قصۂ عمر دو روزہ مری روداد نہیں ۔۔۔ مَیں ہوں اس خواب کی تعبیر کہ جو یاد نہیں
ضبط بیداد بھی کچھ مانع بیداد نہیں ۔۔۔ اب یہ حیلہ ہے کہ لب پر ترے فریاد نہیں
عشق والوں کی ہر اک چیز ہے افسانۂ عشق ۔۔۔ آج فرہاد سے کم تیشۂ شمشاد نہیں
وہ نگاہ غلط انداز تھی اکسیر حیات ۔۔۔ اب سمجھتا ہوں کہ ہستی مری برباد نہیں
مجھ سے وہ پوچھتے ہیں قصۂ بربادیٔ دل ۔۔۔ وہ اگر یاد بھی ہو مجھکو تو اب یاد نہیں
غیرتِ عشق نہیں اس کو گوارا کرتی ۔۔۔ یہ نہ سمجھو کہ مجھے حسرت فریاد نہیں

گو زمانہ مجھے غمدوست کہے اے تسکین
شاد ہوں اس پہ کہ دشمن مرا ناشاد نہیں

درگاوتی

(از نور الٰہی محمد عمر صاحبان)

کہنے کو تو "ہمایون از بام افتاد" کے ساتھ ہی اکبر اورنگ جہانبانی پر متمکن ہو گیا۔ مگر جنھون نے جنت آشیانی کے ہمائے اقبال کو چٹکیون مین اُڑتے دیکھا تھا۔ اُنھین ہیمون کے پیکر مین شیر شاہ کی روح دوڑتی نظر آتی تھی۔ اور اکثر وفاداری کا دم بھرنے والے سر اُٹھا اُٹھا کر ہوا کا رُخ دیکھ رہے تھے اِس لیے جب تک بیرم خان کی تلوار ہیمو کے خون مین نہ نہائی۔ انتزاع سلطنت کا دھڑکا لگا رہا لیکن سچ پوچھیے تو ہیمو کا خون فقط بیرم خان کی حکومت کی سُرخی ثابت ہوا۔ اور وہ سلطنت کے سیاہ و سفید کا مالک بن گیا۔ اکبر ایک کھلونا تھا۔ جو خان بابا کے اشارۂ ابرو پر سر ہلا دیا کرتا تھا۔ مگر تابکے۔ آخر وہ دن آگیا جب خانخانان کو ماہم انگہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کرکے "آب آمد و تیمم برخاست" کے معنی سمجھنے پڑے۔ شیر شاہ کے بدنام کنندۂ نکونامے چند۔ نام لیوا نہ صرف اپنے اجداد کی شجاعت و فراست سے محروم تھے بلکہ لے دیکے عدلی و سکندر کے پاس مُلک بھی اِتنا ہی رہ گیا تھا۔ جسے مرحوم عروس سلطنت کے رُخ کا خال کہہ سکتے ہین۔ وابستگانِ دامنِ دولت اِس نان و نمک پر الحمدللہ کہنے کے لیے ہاتھ اُبھارے تھے لیکن اکبر کی بلند نظری اِس تنگنائے اقبال سے تڑپ کر نکل جاتی تھی۔ سب دیکھ رہے تھے۔ کہ گجرات، مالوہ، خاندیس، بنگال، سندھ اور دکن۔ اپنی اپنی ڈفلی پر اپنا اپنا راگ الاپ رہے ہین۔ لیکن اِنکی تن آسانی "خیر دیکھا جائیگا" کہکر "مردے از غیب برون آید" کے خواب مین محو ہو جاتی تھی۔ جب اکبر نے اپنی سلطنت کے دیباچہ کو بتیس دانتون مین زبان کی طرح پایا۔ اور اس کٹھراج کی بقا مین اُسے اپنی سلطنت کی فنا نظر آئی۔ تو اُس نے اِن علاقون کو ممالکِ محروسہ مین شامل کرنیکا فیصلہ کر لیا بڑے بڑے سردار بڑی بڑی مہمّون پر مامور ہو گئے مگر دکن کی مہم کی سرکردگی خالی رہ گئی۔ ان دنون بزم مین خواجہ عبدالمجید کے علم و فضل۔ کاردانی اور معاملہ فہمی کی دھوم تھی۔ لیکن کسی کو سان گمان نہ تھا۔ کہ یہ چھپا رستم رزم مین بھی دو ہاتھ دکھانے کا دم رکھتا ہے یسلسلہ جنبانی ہوئی اور اکبر نے خواجہ کو آصف خان بنا کر تسخیرِ دکن کے لیے روانہ کیا۔ یہی آصف خان ہے جسکی تیغ آبدار نے اکبر کی جہان کشائی کو چار چاند لگا دیے۔ دکن کی وہ اسلامی ریاستین جو دولت بہمنیہ کے کھنڈرات پر کھڑی ہوئین گو پہلے سے جاہ و جلال

شان و تمکنت کی مالک نہ تھیں۔ پھر بھی اِن مین اتنا دم خم اور بل بوتا باقی تھا کہ چند سے اِس سیل مغلیہ کے سامنے اپنے سینے کو دیوار بنا ئین۔ ان سے اُلجھنا ایک قصہ تھا جو شاید اکبر کے جانشین کے ہاتھون بھی ختم نہ ہوتا۔ اِدھر نیا سپہ سالار گھڑیان گن رہا تھا کہ کب فتح نامہ آگرہ روانہ ہو اور لوگ دیکھ لین کہ اقلیمِ سخن کا شاہسوار عرصۂ جنگ مین بھی بند نہین۔ اِس لیے اُسنے مصلحت اِسمین دیکھی کہ اپنی فتوحات کی بسم اللہ چوراگڈھ سے کرے۔

چوراگڈھ کی ریاست تازہ تازہ منظم ہوئی تھی۔ راجہ مر چکا تھا۔ ایک خورد سال بچہ اپنی مان کی ولایت مین گدی پر تھا۔ ایوانِ نصرت تک پہونچنے کے لیے اِس سے قریب راستہ ممکن نہ تھا۔ گونڈوانہ مین یہ چوٹی کی ریاست تھی۔ اور شاہانِ اسکے سایے مین پنپ رہے تھے۔ ستر ہزار گاؤن کے بسنے والے چنت زندگی مین قدیم ہندوستانی تہذیب۔ تمدن۔ معاشرت اور ادب کو سینے سے لگائے بیٹھے تھے۔ جنگ پیر اور مستحکم قلعون کے طفیل بیجاپور اور دیگر اسلامی ریاستون سے علیک سلیک کر لیتے تھے۔ مگر آصف خان کا مقابلہ بمصداق "سنگ آمد و سخت آمد" اہل گونڈوانہ کی شجاعت کا پہلا امتحان اور مرہٹی عروج کا سنگ بنیاد تھا۔

—(۲)—

ساون کا مہینہ اور صبح کے آغاز کا وقت ہے سورج اپنے بسرام سے جھانک رہا ہے۔ اسکا طویل سفر اسکے سامنے ہے۔ پُر خار جنگل۔ تپتے ہوئے صحرا۔ اتھاہ سمندر۔ عطر بیز وادیان لہلہاتے چمن۔ پُر رونق شہر۔ سب سینما کی فلم کی طرح اسکے سامنے سے گذرتے ہین۔ لیکن اسکا بچپن مسکرا رہا ہے اور ان سب کو محض کھلونا سمجھتا ہے۔ منظر پر ایک ہلکی سی چادر پڑی ہے اور ہر چیز کندن کی طرح دمک رہی ہے۔ گڈھ کٹنگہ کی فصیل سے باہر پنگھٹ پر اِس وقت غضب کا جماؤ ہے۔ شہر کا سارا حسن اسجگہ سمٹ آیا ہے۔ زمانے کے تغیرات نے ہمارے لغت کو بھی مسخ کر دیا ہے۔ آج ہم پنگھٹ کو اِس سے زیادہ نہین سمجھ سکتے۔ کہ وہ آب رسانی کا منبع ہے۔ گئے چند گاگرین بھرین۔ چلے آئے بس۔ مگر اگلے زمانے مین پنگھٹ ایک کلب کا کام دیتا تھا۔ جہان خوش گپیون ہی مین بہت سے جھگڑے طے ہو جاتے تھے۔ جہان حسن و عشق کے راز و نیاز گلے ملا کرتے تھے۔ اور جہان پہنچنے کے لیے رات کے گھنٹے مچلتے مچلتے بیہوش ہو جاتے تھے۔ یہان دن مین دو دفعہ یعنی صبح و شام کومل بیٹھنا درگا وتی اور دکھارا تھ کا معمول تھا۔ آندھی۔ بارش۔ سردی۔ گرمی۔ کوئی انکی مزاحم نہ ہوتی تھی۔ وہی باتین ہر روز دُہراتے تھے جو ہمیشہ اِس جگہ پہنچکر ہر روز ادھوری رہ جاتی تھین جہان قول کے فعل مین تبدیل

ہونے کا وقت آتا تھا۔ لیکن آج حسن و عشق نے ایک فیصلہ کن نتیجے پر پہنچنے کی ٹھان لی ہے مجمع عام سے الگ جنبیلی کے ایک جھنڈ کے محاذی وہ خاموش بیٹھے ہیں۔ آغاز کلام کا پہلو تلاش ہو رہا ہے۔ دونوں کا شباب عین جوانی پر ہے۔ اور اسلیے تدبیر کی جو منزل بڑھاپا دونوں میں طے کر سکتا ہے۔ یہ منٹوں میں ختم کرنا چاہتے ہیں۔ درگا وتی حسن ملیح کا ایک مکمل نمونہ ہے۔ جس پر غربت نے نقاب ڈال رکھا ہے سر کے بالوں سے لیکر پاؤں کے ناخن تک ہر عضو نور کے سانچے میں ڈھلا ہے۔ اگر آپ ہر حصے کا الگ الگ جائزہ لیں۔ اور آپ میں ایک سخت گیر ممتحن کی روح حلول کر جائے۔ پھر بھی وہ آپکے معیار سے بہت بلند ثابت ہو۔ رہی سیرت تو اسمیں شوخی و حیا نے ایک ایک دوسرے میں سموکر ایک ایسا گنگا جمنی حصار باندھ رکھا ہے۔ کہ کوئی حسن پرست آنکھ حد ادب سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ اسکے مقابلے میں دکھارا رتھ ایک بلند بالا تنومند اور وجیہ جوان ہے۔ اسکی آنکھیں بتا رہی ہیں کہ شجاعت اسکی رگ رگ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اسکے تیور کہہ رہے ہیں۔ کہ وہ غیرت کا ایک متحرک پتلا ہے۔ اور آن پر جان دینا اسکے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اور اسکا لباس گواہی دے رہا ہے۔ کہ وہ لچھمی ماتا کا چہیتا بیٹا ہے۔

آخر خدا خدا کرکے یہ طلسم سکوت ٹوٹا۔ اور درگاوتی نے کہا۔ شادی کا تو ذکر ہی جانے دو۔ پتاجی کے پاس نہ دھن ہوگا نہ وہ میری شادی پر رضامند ہونگے۔ رہی یہ بات کہ تم سے دور رہیں تو یہ سمجھ لو کہ ہم پشتوں سے غریب ہیں۔ مگر کوئی نہیں کہہ سکتا۔ کہ ہم میں کوئی دختر فروش پیدا ہوا۔ اسلیئے کسی کی کہی پتھر کی لکیر سمجھو کہ نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچیگی۔

دکھارا رتھ۔ درگاوتی! تم نہیں جانتیں۔ کیا کہہ رہی ہو۔ اگر سنجوگ کی کوئی صورت نہیں تمھیں مجھ سے محبت نہیں۔ تو یہ کٹار اس غمگین زندگی کا واحد علاج ہے۔

درگاوتی۔ تم نے محبت کا نام تو سن رکھا ہے۔ مگر اسکے مفہوم سے ناآشنا ہو۔ محبت کا لطف تو سنجوگ ہی میں ہے۔ جب یہ عہد ختم ہو جاتا ہے تو وہ آگ بجھ جاتی ہے۔ جسکے سلگنے کا نام محبت ہے۔ تمھیں محبت نہیں۔ دکھارا رتھ! محض دلہا بننے کا خبط ہے۔ رہا سنجوگ۔ تو اپنے دل سے پوچھو۔ آفتاب سے گواہی لو۔ کہ کون دن خالی گیا کہ میں دو دو دفعہ تم سے نہیں ملی۔

دکھارا رتھ۔ مگر وہ دن بھی آنے والا ہے جب تمھارا اور میرا ملنا کسی اور شخص کی رضا پر منحصر ہوگا۔ اس قید و بند کی ملاقات کو تو سنجوگ نہیں کہتے درگاوتی!

درگاوتی۔ ایسا کوئی دن میری زندگی میں نہیں آسکتا۔ ایسا کوئی شخص پیدا نہیں۔ سکتا۔ جو پھر

پابندیاں عائد کرے۔ دکھارا رتھ! سنو کی ایک بات سن رکھو کہ اگر درگا وتی کے لیے تمہارے ساتھ شادی کرنا ممکن نہیں تو وہ اپنی رضا سے اپنے پتا کے حکم سے کسی اور کی بیوی نہیں بن سکتی۔ بہن محبت تو تمہاری ایک بہن تھی۔

دکھارا رتھ۔ جو مر گئی۔ اور میری زندگی اجیرن کر گئی۔

درگا وتی۔ تو مجھے وہی سمجھو اور اسکی محبت میرے دامن میں ڈال دو۔

دکھارا رتھ گفتگو کے اس پہلو سے خبردار نہ تھا۔ اور یہ وہ پہلو تھا۔ کہ اسکی خودداری کے پاس سوا قبول کے کوئی جواب نہ تھا۔ اسلیے وہ یہ کہنے پر مجبور تھا "بہن درگا وتی! مجھے یہ بھی منظور ہے۔ دوبتے کو تنکا بھی لنگر ہے۔ میری محبت خود غرضی نہیں۔ زمانہ دیکھے گا۔ کہ دھرم کا بھائی اپنی منھ بولی بہن سے کس طرح سلوک کرتا ہے۔ ہاں ہاتھ بڑھاؤ۔ راکھی باندھ دو"

درگا وتی نے چوٹی سے دھاگا نکالا۔ اور دکھارا رتھ کی کلائی میں باندھ دیا۔

اب سورج ایک نیزے کے قریب بلند ہو گیا اور فاتحانہ انداز سے دنیا کو دیکھنے لگا۔ اور دھوپ نے بڑھ کر چاروں طرف دراز دست شروع کیا۔ اتنے میں شہر کے مشہور جوتشی مان پنڈت ادھر آنکلے۔ درگا وتی نے پرنام کیا۔ آشیرباد لی۔ اور ہنسی ہنسی میں جوتشی جی کو اپنا ہاتھ دکھایا۔ جوتشی جی کبھی ہاتھ دیکھتے تھے۔ اور کبھی درگا وتی کے چہرے پر نگاہ ڈالتے تھے۔ اس عمل کی تکرار کرتے کرتے جب تھک گئے تو زمین پر بیٹھ گئے مگر کیا مجال جو نگاہ ہاتھ سے اچٹ جائے۔ آخر رکتے رکتے بولے۔

"پتری۔ کیا کہوں کیا نہ کہوں۔ آنکھ جو کچھ دیکھ رہی ہے وہ لب پر نہیں آتا تم بھی سن کر مان پنڈت کو دیوانہ سمجھو گی۔ مذاق اڑاؤ گی۔ خیر میں کہے دیتا ہوں۔ کوئی مانے یا نہ مانے۔ مجھے گنگا کنگال کی پتری کے سر پر سونے کا چھتر لہراتا نظر آتا ہے۔ مہارانی درگا وتی تیری جے ہو ہاں گنگا کی پتری اور سونے کا چھتر اگر برہمن کا بچن پورا ہوا تو اسے بھولنا نہیں" یہ باتیں سنکر درگا وتی کو ہنسی تو آئی۔ مگر ضبط کر گئی۔ اور سنجیدہ شکل بنا کر کہا "وہ دن آئیگا تو مہاراج! مہارانی درگا وتی کو آپ سے بہتر منتری اور کون ملیگا"

مان پنڈت۔ پتری پرکشا کر کے دیکھ لینا۔ راج نیتی کے وہ گر یاد ہیں کہ شاید ہی کسی کو معلوم ہوں مجھے نرا برہمن نہ سمجھنا۔ تو شند تھوڑی سی ودیا بتائے دیتا ہوں۔ درگا وتی نے بات کا کاٹ کر کہا۔ جب تیرہ خود کو توالی سکھا دیگا اسکی فکر بیکار ہے پہلے میرے بھائی کا ہاتھ دیکھ لیجیے۔ مان پنڈت نے ہاتھ دیکھکر کہا۔ سیناپتی بنتے نظر آتے ہو۔ آگے پرماتما جانے۔

درگا وتی اس ساری گفتگو کو محض دل لگی سمجھتی تھی اسنے مذاق کو اور بڑھانا چاہا اور ہاتھ دکھا کر کہا۔

اور یہ تو بتائیے کہ آخر یہ وقت کب آئیگا؟ پنڈت نے کہا۔ برس۔ مہینا۔ اٹھوارہ دن۔ سب خانے خالی ہین مین تو یہ جانون گھڑی دو گھڑی مین مرلیا جائیگی۔ اب تو درگاوتی ہنسی کو ضبط نہ کرسکی اور ہنستے ہنستے ہوئے کہا کہ اسی کو چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کہتے ہین۔ یہ مزے مزے کی باتین ہو ہی رہی تھیں کہ ایک سوار نقاب پوش اسلحہ جنگ مین ہر سجے اونچی بنا ہوا پاس کی جھاڑیون سے نکلا۔ درگاوتی کی کمر مین ہاتھ دیا اور اسے اٹھا کر اپنے آگے بٹھا لیا۔ اور گھوڑا اڑائے سن سے نکل گیا۔ یہ واقعہ کچھ ایسی عجلت سے وقوع مین آیا کہ سب کے ہاتھ پانون پھول گئے۔ جب ذرا اوسان بجا ہوئے تو دلھارام نے تعاقب کا ارادہ کیا مگر ان پنڈت نے ہاتھ تھام کر کہا "مور کھ ہوئے ہو۔ ہوا کے پیچھے دوڑتے ہو۔ مہارانی درگاوتی سسرال جاتی ہے۔ جب اسکے من مین آئیگی اپنے منتری اور سیناپتی کو بلا لیگی۔ جاؤ گھر مین بیٹھ کر رام نام جپو۔

(۳)

چوراگڈھ کے راجہ دلپت اور درگاوتی کا گندھرپ بیاہ ایک پامال داستان ہو گیا ہے۔ قسمت راجہ کو مرے ہوئے تین سال گذر چکے ہین۔ سات آٹھ سال کا راجکمار بیرنارائن اپنی مان کی آغوش مین پرورش پا رہا ہے راجہ دلھارام سیناپتی اور راجہ مان منتری ہین ملک آباد اور رعایا آسودہ ہے۔ دکھ اور تپایے کے نام تک سے لوگ واقف نہین مہارانی درگاوتی کی شجاعت سخاوت اور حسن تدبیر کا ایک زمانہ معترف ہے۔ باز بہادر سے کئی لڑائیاں لڑی۔ اور غالب رہی۔ تیر اور بندوق چلانے مین اپنا جواب آپ ہے۔ شیر سے سنگھ لڑتی ہے۔ بیس ہزار سوار ایک ہزار ہاتھی بیشمار پیادے اور بھرپور خزانہ اسکے پاس تھا۔ جب آصفخان نے دس ہزار سپاہیون کے ساتھ دموہ مین آکر ڈیرے ڈالے۔

آصف خان کا ایلچی پہنچا تو ساری فوج ادھر ادھر علاقون مین پھیلی ہوئی تھی۔ مہارانی فوراً لڑنے مرنے پر تیار ہو گئی۔ راجہ دھارنے لاکھ سمجھایا کہ غنیم کو باتون مین لگائیے اور فوج کو جمع کر کے میدان مین اترئیے۔ مگر مہارانی نے کہا کہ کن سے دبون ان تین کوڑی کے پیادون سے؟ اکبر آتا تو مین شاید اطاعت ہی کر لیتی۔ یہ شاگرد پیشہ میری قدر کیا جانے؟ ان بزدلون سے بات کرون جنھین ایک نربل عورت اور ایک بالک پر حملہ کرتے شرم نہین آتی۔ منتری جی ایلچی کو رخصت کرو۔ اور سیناپتی جی فوج کو کوچ کا حکم سناؤ۔ یہ کہکر ہندوستان کی مایۂ فخر مہارانی نے ہتیار سجے ہاتھی پر سوار ہوئی۔ خواصی مین سیناپتی کو بٹھایا۔ منتری کے ہاتھ مین مورچھل دیا۔ اور وہ راجکمار

بیرنارائن کو علَم کے سایے مین لے کر نکلا- مہارانی کی فوج مین اَب دو ہزار جوان اور ملے- اور اُنھون نے چار منزل پر شاہی فوج کو جالیا- لیکن راجہ مان کے مشورے سے مہارانی نے گھنے جنگلون کا رُخ کیا اور ترلی جیسے دشوار مقام کو اپنا مستقر بنایا- اِسکے مشرق مین فلک بوس پہاڑ تھا- مغرب مین ندی گور- جنوب مین دریاے نربدا- اور سامنے ایک ناقابل گذر گریوہ تھا- اِس قدرتی قلعے مین بیٹھکر مہارانی نے دمدمے تیار کیے- اور فوج جسکی تعداد اَب پانچہزار تک پہنچ گئی تھی- سر ہتھیلی پر رکھکر جنگ کیلیے تیار ہونے لگی- آصف خان بھی پر لگا کر اُڑا- اور گریوے پر شاہی عَلَم نصب کر کے دم لیا- یہ دیکھکر مہارانی نے پوجا کی- تلسی کا ٹیکہ ماتھے پر لگایا- راجکمار کو پیار کیا- اور مان بیبر لڑائی کے لیے نکلے- آخر بڑے گھمسان کا رن پڑا- چوراگڈھ کے بہت سے سپاہی کھیت رہے- اور شاہی فوج کے بیشمار مقتولون کے علاوہ تین سو مغل اسیر ہوئے- آفتاب ہنستا ہُوا غروب ہو رہا تھا- جب آصف خان کی فوج نے گھونگٹ کھایا اور اُسکی شکست کا اعلان ہوا- گریوہ خالی ہوگیا- اور مغل شاہی علم وہان اُٹھا لیگئے- چوراگڈھی فتح کے نشے مین کچھ ایسے مست ہوئے کہ کسی نے مہارانی کے اِس مشورے پر کان نہ رکھا- کہ دشمن کو دم نہ لینے دُو اور ابھی اُنکا فیصلہ کردو- ورنہ رات کو کُمک آجائیگی اور صبح کو گریوے پر دشمن مورچہ لگادیگا- سب نے کمرین کھول دین- اور شیخیان بگھارنے لگے- دن چڑھا تو اُداس اور زرد رو سُورج نے بادل نخواستہ گوشۂ مشرق سے سر نکال کر دیکھا کہ گریوے پر مُغلون کا قبضہ ہے- اور محب علی مراد خان اور بابا فغانی جیسے تجربہ کار جرنیل کُمک لیکر پہنچ گئے ہین- مہارانی حسبِ دستور میدان مین آئی- ہاتھیون کے پانون زنجیرون سے بندھوا دیے- اور ایسے مردانہ وار حملے کیے کہ بڑے بڑے دلاورون کے مُنھ پھیر دیے- تیر اور تلوار کے ایسے ایسے کرشمے دکھائے کہ دونون صفون سے نعرۂ تحسین بلند ہوا- تیسرے پہر تک لڑائی کانٹے کی تُول رہی- آخر بیرنارائن جو تین دفعہ شاہی فوج کو پیچھے ڈھکیل چکا تھا- زخمی ہوا- مہارانی نے حکم دیا کہ اِسے فوراً چوراگڈھ پہنچایا جائے- اِس حکم کی تعمیل مین بہت سی فوج میدان سے نکل گئی- اور صف بندی مین رخنہ پڑگیا- گو کٹ کٹا کر اَب صرف تین سو جوان باقی رہ گئے تھے- مگر مہارانی پُورے استقلال سے جنگ کر رہی تھی اور کوئی نہین کہہ سکتا تھا کہ کس کی فتح ہوگی- اتفاقاً ایک تیر مہارانی کی کنپٹی پر پڑا اُس نے تیر کو کھینچ لیا مگر پیکان اندر رہ گیا- دوسرا تیر گردن مین ترازو ہُوا تو اُسے غش آگیا- ہوش آیا تو اُسنے راجہ دکھدار تھ سے کہا- کہ اَب ہاتھ مین بَل نہین رہا- حقِ نمک ادا کرو اور اِس کٹار کو میرے سینے مین اُتار دے- دکھدار تھ نے کہا کہ بہن درگاوتی! مجبور ہون- راکھی بند ہاتھ اِس کام کو کرنے کے لیے نہین اُٹھ سکتا- ہان مجھے بین ندہ

میدان سے باہر لیجا سکتا ہون - یہ سُن کر مہارانی نے جھٹ کٹار اپنے پہلو مین مار لی - اور آن کی آن مین ٹھنڈی ہو گئی - مگر سورج یہ دیکھکر بھچک کر رہ گیا - کہ ہودے مین ایک نہین بلکہ دو لاشین پڑی ہین اور اس نے جھٹ دامنِ شفق مین مُنھ ڈھانپ لیا -

اس فتح کے کلنک کا ٹیکا ماتھے پر لگا کر آصف خان چوڑا گڈھ کی طرف بڑھا - قلعے والون نے بھوج کا تھ بھکاری کے اہتمام مین جیوہر کی رسم ادا کی - اور راج کمار بیر سین اور راجپوتان تیغ بکف مُردہ پائے گئے - جیوہر کی چتا سے مہارانی کی چھوٹی بہن کملاوتی زندہ نکل آئی - جسے آصف خان نے اکبر کے پاس بھیج دیا -

اکبر نے اس فتح کا کس طرح اقبال کیا - یہ ابو الفضل سے پوچھیے -

میخانۂ ریاض

(خیام العصر لسان الملک حضرت ریاض خیرآبادی)

نالہ نالہ رہے فریاد نہ فریاد رہے
کوئی کہہ جائے کہ ناشاد مرا شاد رہے

ہو کے آزاد تہِ دامنِ صیّاد رہے
گھر مین صیّاد کے جبتک ہے آزاد رہے

نگہ لطف اس انداز سے صیّاد رہے
لب تک آ کر مری فریاد نہ فریاد رہے

کبھی خالی نہ ہو یہ گھر یونہی آباد رہے
کم سے کم تیری طرح دل مین تمھی یاد رہے

نقش چھوڑے ہوئے تیرے نہین دیکھے جاتے
عمرِ رفتہ مرے دل مین نہ تری یاد رہے

صدقے اے تیر فگن آئے نہ آئے دل مین
تیری چٹکی مین یونہی ناوکِ بیداد رہے

مَین وہ بلبل ہون کہ رہون دامِ محبت مین اسیر
چار ہی روز مین صیّاد نہ صیّاد رہے

کہین گلشن سے سوا ہے ہمین الفت اس کی
ہم نہ ہون تو بھی الٰہی قفس آباد رہے

کیجیے کیا اسے رفتارِ زمانہ ہے یہی
پا بہ گِل سرو رہے اور پھر آزاد رہے

کوئی کہتا یہ گزرتا ہے اُدھر سے ہر روز
ہم رہین یا نہ رہین میکدہ آباد رہے

کس قدر رہین اثر اندازِ بتانِ کافر
اس زمانے مین بہت ہے جو خدا یاد رہے

چوڑیان کیسی - حنا کیا - یہ زمانہ وہ نہین
گورے ہاتھون مین ترے خنجرِ فولاد رہے

ڈر سے محشر مین دمِ پرسشِ اعمال ریاض
اُسکی رحمت کے سوا کچھ نہ مجھے یاد رہے

تنقیدِ کُتب

خاکِ پروانہ

(از منشی پریم چند صاحب بی۔اے چھوٹی تقطیع حجم ۲۰۶ صفحات۔ کتابت و طباعت عمدہ قیمت فی جلد عہ ملنے کا پتہ۔ منیجر زمانہ پریس کانپور)

اب سے چند سال پہلے تک اُردو زبان مین اُسی قسم کے طویل افسانون کے لکھنے کا عام رواج تھا جو سالہا سال سے ایک ہی طرز پر لکھے جاتے رہے تھے۔ اُردو زبان مین غالباً سب سے پہلے منشی پریم چند نے زمانے کے مذاق کے مطابق جدید انداز کے مختصر افسانے لکھنا شروع کیے اور چند سال کے اندر ہی اس قدر شہرت حاصل کرلی کہ آج دنیاء ادب کے گوشہ گوشہ مین اُن کا نام خاص عزت و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے اور اِن کے دلنشین اندازِ تحریر کا ہر شخص معترف نظر آتا ہے۔ یون تو آجکل بہت سے اصحاب افسانے لکھتے ہین لیکن افسانہ اور پھر وہ بھی مختصر افسانہ لکھنے کے لیے جس قابلیت اور جن خصوصیات کی ضرورت ہے اگر ان کو مدِ نظر رکھکر دیکھا جائے تو صرف چند اہلِ قلم ہی ایسے نظر آئین گے جو کامیاب افسانے لکھتے ہین۔ اِن ہی مین سے ایک منشی پریم چند صاحب بھی ہین جنکو افسانہ نگاری مین خاص ملکہ ہے۔ اگرچہ گزشتہ چند سال سے آپ کا گلکارِ قلم اُردو کے بجاے ہندی ادب کے یوان کی زیب و زینت مین مصروف ہے لیکن "پریم پچیسی" اور "پریم بتیسی" کے بعد "خاکِ پروانہ" کا عالمِ وجود مین آنا اِس امر کا ثبوت ہے کہ آپ اُردو زبان کی خدمت کرنے سے بھی غافل نہین ہین۔

"خاکِ پروانہ" منشی صاحب موصوف کے چودہ[14] منتخب مختصر افسانون کا ایک دلکش مجموعہ ہے۔ سیرت نگاری مین جو افسانے کی جان ہوتی ہے پریم چند صاحب کو جو ملکہ ہے اُسکی نظیر ذرا مشکل سے ملیگی۔ "خاکِ پروانہ" کا ہر افسانہ سیرت نگاری کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ باتون ہی باتون مین کام کی باتون کا اِسطرح بیان کرنا کہ پڑھنے والے کو دورانِ مطالعہ مین اسکا احساس نہو کہ مصنف نے صرف ایک بات کو سمجھانے کے لیے افسانہ لکھا ہے پریم چند صاحب کی خصوصیاتِ تحریر سے ہے۔ وہ قصے کے پیرائے مین ایسے ایسے نکات بیان کرجاتے ہین کہ اگر وہ سیدھے سادے طور پر لکھے جائین تو کوئی اُن کو پڑھنا پسند نہ کرے مگر ادبی شیرینی مین پند و نصائح کی تلخی محسوس نہین ہوتی اور پڑھنے والا بالکل غیر ارادی طور پر اُس سے سبق لیتا ہے۔ اسپر سنجیدہ ظریفانہ طرزِ بیان سونے پر سہاگا ہے۔ اور یہ وہ خصوصیت ہے جسکی بناء پر پریم چند صاحب مستحقِ صد ستایش ہین چنانچہ "خاکِ پروانہ" مین "بڑے بابو"

"دعوت" "عجیب ہولی" وغیرہ افسانے اسی قسم کے ہین - زبان کی شیرینی اور انداز تحریر کی دلکشی کے لیے صرف مصنّف کا نام کافی ہے -

---

مرقع لیلیٰ مجنون (منظوم ڈرامہ)

از ڈاکٹر مرزا محمد ہادی صاحب رسوا بی - اے پی ایچ - ڈی - چھوٹی تقطیع - کتابت و طباعت عمدہ - قیمت ۸ (ملنے کا پتہ) مسٹر رام نراین لال - بک سیلر - الہ آباد)

لیلیٰ مجنون کا قصہ بہت پرانا ہے اور نثر و نظم مین متعدد اہلِ قلم نے اپنی اپنی معلومات و مذاقِ طبیعت کے مطابق اُسپر خامہ فرسائی کی ہے مگر رسوا صاحب کی جدت پسند طبیعت نے اس بادۂ کہن کو نئے پیمانے مین کچھ اس طرح بھر دیا ہے کہ اسکا نشہ پہلے سے دوچند ہوگیا ہے - اسکا ماخذ قیس کا دیوان (مرتبۂ والبی) ہے مگر شاعر نے ہندوستان کی طرزِ معاشرت کو مدِ نظر رکھکر اسکو نظم کیا ہے - ہر سین دلکش اور واقعے کی ہوبہو تصویر ہے - اس ڈرامہ کی نمایان خصوصیت یہ ہے کہ شاعر نے تمام مروّجہ بحورمین دادِ سخن سنجی دی ہے - اور حاشیہ پر بحر کا نام اور وزن لکھدیا ہے جسکی وجہ سے ناواقفانِ فنِ عروض کے لیے اس کا مطالعہ یقیناً مفید اور انکی معلومات مین کافی اضافہ کا موجب ہوگا - واقعات کے مناسب حال بحر کا انتخاب اور کیرکٹرس کی فطرت کے موافق اظہارِ واقعہ وغیرہ ایسی باتین ہین جن سے شاعر کی وسعتِ نظر اور مشّاقی کا ثبوت ملتا ہے -

دیباچے مین لکھنؤ اور دہلی کی زبان کے متعلق مرزا صاحب نے جو راے ظاہر کی ہے اُسکا ضروری اقتباس نقل کرنا یقیناً ناظرین کے لیے دلچسپی کا موجب ہوگا - اور بہت ممکن ہے کہ لکھنؤ اور دہلی کی زبان کے متعلق آئے دن جو جھگڑے ہوتے رہتے ہین اُنکا فیصلہ ہو سکیگا - وھو ہذا

"ہم لکھنؤ والون کو جس زبان پر اس قدر ناز ہے اگر سچ پوچھو تو وہ فی الحقیقت دہلی ہی کی زبان ہے اس لیے لکھنؤ مین جن لوگون کی زبان قابلِ اعتبار ہے انکے آبا و اجداد اولاً دہلی سے فیض آباد آئے اور پھر وہان سے لکھنؤ مین آکر آباد ہوئے - ان نوابادِ لکھنؤ والون نے مثل اور جائداد کے زبان بھی اپنی اولاد کو ورثہ مین دی - ان لوگون کی اولاد کے لیے یہ فخر کیا کم ہے کہ انھون نے اپنے آبا و اجداد کے وطن کی زبان کا تا حدِ امکان تحفظ کیا -

سرزمینِ لکھنؤ کے اصلی باشندون کی وہ زبان تھی جو آج تک لکھنؤ کے اطراف و جوانب مین بولی جاتی ہے - جسکو لکھنؤ والے گنواری یا پوربی زبان کہتے ہین - لکھنؤ مین دو قسم کے باشندے سکونت پذیر ہین - ایک وہ جنکو دہلی سے تعلق ہے - دوسرے وہ جنکو نہین ہے - پہلی قسم کے باشندے اپنے خاندان کے سوا اور شریفون مین بھی شادی بیاہ کرنے سے مضائقہ نہین کرتے - دوسرے صرف اپنی برادری مین نسبت ناتہ

کرتے ہین - اس لیے دہلی والون کو ان لوگون سے ربط کرنا پڑا جو ان سے پہلے یا بعد ہی دہلی سے آکر لکھنؤ مین مقیم ہوئے، اور اس طرح ان کی اصلی زبان کا تحفظ ہوا - ان لوگون کی مرد و عورت دونوں کی زبان حقیقت مین دہلی کی زبان ہے اور دوسری قسم کے باشندون کی زبان اُردو پوربی آمیز ہے جسکو قصباتی زبان کہتے ہین - ہان اتنا فرق ضرور ہے کہ جو لوگ مدت سے لکھنؤ مین سکونت پذیر ہین - اُنکے مردون کی زبان مین پوربی کی آمیزش بہت کم ہے مگر پھر بھی اپنی اصلی زبان کے ایک دو لفظ بول جاتے ہین - پس اس قسم کے باشندون کی زبان مادری پتانی ہے اور اوّل قسم (دہلی والون) کے باشندون کی زبان مادری پدری اُردو ہے۔"

بلقیس [۱] ایک مختصر ناول ہے جس مین مصنف (سیّد محمد رشید الملک صاحب) نے قصہ کے پیرایہ مین یہ دکھایا ہے کہ ایک تعلیم یافتہ لڑکی نے کس طرح حقوق نسوان کی حفاظت کا سامان کیا اور اُسکا بدلا شوہر برسون کے بعد ایک بازاری عورت کے پنجے سے رہائی پاکر اُسکا رفیق حیات بن گیا۔

قصہ جس مقصد کو پیش نظر رکھکر لکھا گیا ہے وہ جس قدر ضروری ہے اسی قدر اہم اور دشوار بھی ہے، اس قسم کے افسانے ذرا مشکل سے کامیاب ہوتے ہین، چنانچہ ہم دیکھتے ہین کہ "بلقیس" مین بکثرت خامیان موجود ہین - افسانے کے پلاٹ مین کوئی خاص بات نہین، انداز بیان مین بھی جس قدر دلچسپی ہونا چاہیے اُس قدر نہین - آٹھوین باب مین دکھایا گیا ہے کہ بلقیس (قصہ کی ہیروین) نے لیڈیز کانفرنس کے انعقاد کا انتظام کیا، تقریرین ہوئین، رزولیوشنس پاس کیے گئے، مگر اس تمام دردسری کا نتیجہ کیا نکلا اور اس تحریک کا انجام کیا ہوا اسکا ذکر کہین نہین کیا، خاتمہ کو دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ زبردستی کھینچ تان کر قصہ کو ختم کر دیا گیا ہے۔

علاوہ برین افسانے کے کریکٹرز کی باہمی گفتگو مین اکثر لغزشین پائی جاتی ہین - مثلاً صفحہ (۱۱) پر بلقیس کے والدین کی گفتگو جسمین فاضلہ (بلقیس کی مان) اپنے شوہر حافظ بخاری کو "مردوا" اور "مرِدوئے" کہکر مخاطب کرتی ہے - ہم نہین سمجھ سکتے کہ کسی شریف خاندان کی عورت کی زبان سے ایسے الفاظ ادا ہو سکتے ہین - یا صفحہ ۴۳ - ۴۴ پر حافظ بخاری کا خط جس مین دکھایا گیا ہے کہ اُس نے بلقیس (اپنی اکلوتی بیٹی) کی شادی ایک آوارہ مزاج لڑکے سے قصداً کی تھی محض اس لیے کہ بلقیس اُسکے یہان زیادہ دن نہ ٹھیر سکے اور اپنے میکے مین واپس آ جائے - تاکہ حافظ صاحب کو جو تعلیم و اصلاح نسوان کے حامی تھے اپنے مشن کو پورا کرنے مین امداد مل سکے - کیا کوئی شریف باپ اپنی بیٹی کے ساتھ ایسا سلوک کر سکتا ہے؟ - تاہم چونکہ افسانے کا مقصد اصلاح ہے - اس لیے پڑھنے کے قابل ہے۔

---

[۱] لکھائی چھپائی اچھی ہے، تقطیع $\frac{20 \times 26}{16}$، حجم ۹۴ صفحات قیمت ۴ر ملنے کا پتہ، منیجر ملیح آباد کر شل - فتحپور - (ن س ع)

شکوہ از اقبال

(از پنڈت آنند نراین صاحب ملا - ایم - اے - ایل ایل بی)

تو کعبے کا دلدادہ تھا - تو بتخانے مین کیون آیا؟ — مے سے تجھکو پرہیز اگر تھا - میخانے مین کیون آیا؟
گر تیری چشم باطن مین نورِ حسن صحرائی تھا! — کیون گلشن مین آکر پھر تو محوِ نغمہ پیرائی تھا؟
ہندی ہونے پر ناز جسے کل تک تھا - حجازی بن بیٹھا — اپنی محفل کا رند پرانا - آج نمازی بن بیٹھا!
اے بلبل! چھوڑ کے شاخِ گل کیون خار و خس مین بیٹھا ہے؟ — کیا ذوقِ اسیری نے تجھکو - جو جا کے قفس مین بیٹھا ہے؟

محمل مین چھپا ہے قیسِ حزین، دیوانہ کوئی صحرا مین نہین
پیغامِ جنون جو لایا تھا - اقبال وہ اب دنیا مین نہین

اے مطرب تیرے ترانون مین - اگلی سی اب وہ بات نہین — وہ تازگیٔ تخئیل نہین - بیباختگیٔ جذبات نہین
تو بھول گیا اپنے نغمے - کچھ فرق مرے کانون مین نہین — تاثیر جو دل پر کرتی تھی - وہ لَے ہی تری تانون مین نہین
شوریدہ سریٔ الفت کی گئی، اب عقل کی ریزہ کاری ہے — فرہاد کی بیتابی کے عوض، پرویز کی حیلہ سازی ہے
مین جسکا جویا ہون گنجینہ مین تیرے گوہر وہ نہین — سامانِ فریبِ عقل تو ہے - جو دل مین چبھے نشتر وہ نہین

اس گلشن سے تجھکو نسبت، اب جز نگہِ گلچین نہ رہی
اب تیری زبان حق گو نہ رہی، اب تیری نظر حق بین نہ رہی

تیرے جامِ دل کی صہبا اب کوثر مین تبدیل ہوئی — مذہب کے ہاتھون خون تری پاکیزگیٔ تخئیل ہوئی
افسوس کہ تیری فکرِ فلک پیما کا یہ انجام ہوا — تو تو فردوس کا طائر تھا، کیون آکے اسیرِ دام ہوا؟
تو وہ قطرہ تھا جو اشکِ اربابِ نظر بن سکتا تھا — تو جا کے صدف مین کیون بیٹھا؟ جب یونہی گوہر بن سکتا تھا!
تیری چشم کو تہ بین مین اب ایمان کے سوا جلوا ہی نہین — جو نورِ دلِ انسان مین ہے، غافل تو نے دیکھا ہی نہین

اب دنیا والون کو ہندو کی، نے مسلم کی حاجت ہے
مذہب آیندہ نسلون کا نوعِ انسان کی خدمت ہے

جسکو ایمان کہتا ہے تو، پردہ ہے تری نادانی کا — اللہ ترا کیا ہے؟ اک نام فقط جہلِ انسانی کا
اپنی رسوائی کا باعث، تعلیم یہ "مین" اور "تو" کی ہے — انسان کی ترقی کی دشمن - تفریق یہ رنگ و بو کی

میرا بس ہو تو ہر مسجد سے، روئے زمین کو پاک کرون ہر مندر کو مسمار کرون - ہر ایک کلیسا خاک کرون
مذہب کے مینا کے قابل - اے رند تری صہبا ہی نہین پوشاک جو تو نے پہنی ہے - قامت پہ ترے زیبا ہی نہین

آ محفل کو اپنا کر لے - دیرینہ طرز سخن سے پھر
ہر لب پہ دعا آتی ہے یہی - خورشید گہن سے چھوٹے پھر

جذبات فرخ

(از جناب فرخ بنارسی)

کوندرہی ہین تجلیان آج نگاہِ یار مین آگ نہ لگ اٹھے کہین خرمنِ روزگار مین
ذرہ ذرہ رنگِ دوست ہے محفلِ روزگار مین اب نہین امتیاز کچھ بیخود و ہوشیار مین
اپنے ہی دل کی مختلف کیفیتون کا رنگ ہے شامِ شبِ فراق مین صبحِ وصالِ یار مین
وعدے پہ نہ آسکا کوئی تو اس کا کیا گلہ وقت مزے سے کٹ گیا لذتِ انتظار مین
اب ہے نہ وہ نوائے عیش اب نہ وہ نغمۂ نشاط سازِ خموشِ عشق ہون محفلِ روزگار مین
مٹ گئی ساری دلکشی محفلِ کائنات کی تیری ادا سما گئی دیدۂ اعتبار مین
میری نظر کا ہے یہ عکس جسکی ہین یہ تجلیان میرا ہی رنگ شوق ہے حسنِ فریب کار مین
نزع مین یادِ دوست ہے روح ہے بیخودِ نشاط لذتِ صد سرور ہے کیفیتِ احتضار مین

قصۂ برقِ حسن کیون طور پہ ختم ہو گیا
اور فسانہ کیا نہ تھا چشمِ فریب کار مین

تضمین

(بر غزل جناب جگر بریلوی)

موت اب باعث ہراس نہیں زندگی موجب سپاس نہیں
تا قیاس انتہا سے یاس نہیں تم نہیں پاس، کوئی پاس نہیں
اب مجھے زندگی کی آس نہیں!

دیکھیے موت رنگ کیا لائے وقت تسکین کرے کہ تڑپائے
ڈر ہے۔ وقت اخیر جب آئے کشمکش میں نہ روح پڑ جائے
یوں تو مرنے کا کچھ ہراس نہیں

گو زبان پر ہے ہر چہ بادا باد مطمئن کب ہے خاطر ناشاد
کار دنیا ہوا نہ فکر معاد عمر سی عمر ہوگئی برباد
دل ناداں عبث اداس نہیں

ماتمی سی فضائے دنیا ہے یا کوئی ہولناک صحرا ہے
ہر نفس دشمن تمنا ہے سانس لینے میں درد ہوتا ہے
اب ہوا زندگی کی راس نہیں

دامن زیست چاک ہونے دے قصہ ہوتا ہے پاک، ہونے دے
خاک کو تابناک ہونے دے راہ میں اپنی خاک ہونے دے
اور کچھ میری التماس نہیں

آگ تھا آگ یہ دل مضطر نظر آتا ہے اب جو خاکستر
پوچھ محروم زار سے جا کر کیا بتاؤں مآل شوق، جگر!
آہ! قائم مرے حواس نہیں

تلوک چند محروم

کلامِ شاد

(از خان بہادر مولانا شاد عظیم آبادی مرحوم)

اُٹھائے ناز کب تک خاطرِ اندوہگین تیرا
بہت تنگ آگیا اے آرزو اب مین نہین تیرا

نچوڑون جب تجھے دریا بہے خون جاری ہو کوسون تک
خدا اس بزم مین رکھ لے وقار اے آستین تیرا

اِسے کہتے ہین خوبی ہم تو اس خوبی کے قائل ہین
ہوا جب ذکر یکتائی کا نام آیا وہین تیرا

بہت سرگوشیان کرنے لگے رستے مین اب ہر دو
بہت چرچا ہے بازارون مین اے خلوت نشین تیرا

نہ بستر ہے نہ تکیہ ہے فقط دو گز زمین دیکر
مجھے شرمندہ کہا آسمان نے اے زمین تیرا

گلہ کرتا ہون مین اُن کا کہ اپنی نارسائی کا
خدا جانے کہان پہونچا خیال اے ہمنشین تیرا

تری آغوش مین ہم سا شہیدِ ناز سوتا ہے
نصیب اللہ اکبر کیا بتائین اے زمین تیرا

اب اس معراج سے بڑھکر خدا کا نام ہے ساقی
وظیفون مین کیا کرتے ہین تکرار یا رب دین تیرا

تپ اگلی سی ہے اب بھی وہی یا چین بھی پایا
دلِ وحشی بتا کیا حال ہے زیرِ زمین تیرا

اثر یون تو محبت کا ترے اے **شاد** ظاہر ہے
پر اتنا جانتے ہین ذکر ہوتا ہے کہین تیرا

چست کمر کا کیا سبب تنگ قبا کی وجہ کیا
ہم تو کیے ہین دل نثار ہم سے ادا کی وجہ کیا

رُوح و جسد کا سابقہ کتنے دنون سے ہے بھلا
دونون کی خو دو بو الگ مہر و وفا کی وجہ کیا

حسن پر وہ لین رہے نصیب گر نہ سنین تو لیا گلہ
یہ ہے اگر ہمین سے گفتگو ترکِ دعا کی وجہ کیا

صدمہ و درد و رنج و غم طولِ فراق کا الم
ہین یہ حوادثات چند ان کی بقا کی وجہ کیا

دارِ دل ہین جب وہی جب ہے انھین کا انتظار
مجھ سے وہ کیون خفا ہوئے میری سزا کی وجہ کیا

روئے ہو **شاد** تم ضرور جب تو ہے لب پر آہِ سرد
مینہ نہ برس گیا تو پھر ٹھنڈی ہوا کی وجہ کیا

مُطربِ محبت سے

(از جناب روش صدیقی صاحب)

فرشتے عرش کی منزل میں منتظر ہیں ترے ستارے چرخ کی محفل میں منتظر ہیں ترے
ترانے دامنِ ساحل میں منتظر ہیں ترے نظارے رات کی محفل میں منتظر ہیں ترے
ہے انتظار خدائی کو تیرے گیتوں کا
اُٹھا رباب اُٹھا

کسی کو عشرتِ جاوید کی بشارت دے کسی کے قلب کو لا انتہا مسرت دے
بَرا ضطرابِ جگر کو پیامِ راحت دے فرازِ عرش سے اُتری ہوئی محبت دے
ترانہ خلد سے لایا ہوا ترانہ گا
اُٹھا رباب اُٹھا

ستارے بن کے بکھر جائیں عشق کے نغمے فضائے دہر میں بھر جائیں عشق کے نغمے
سرور بن کے گذر جائیں عشق کے نغمے جگر سے دل میں اُتر جائیں عشق کے نغمے
بہا دے عشق کے پربت سے عشق کا دریا
اُٹھا رباب اُٹھا

ہیں تفرقوں میں عقیدت گذارِ دیر و حرم فساد گاہ بنا ہے جوارِ دیر و حرم
مٹا رہے ہیں عنصر عش اعتبارِ دیر و حرم اُٹھا دے رخ سے تو پردہ نگارِ دیر و حرم
بنا دے نغمے کو پیغامبر محبت کا
اُٹھا رباب اُٹھا

جبینِ عشق کے سجدوں کو جستجو ہے تری حریمِ حُسن کے جلووں کو جستجو ہے تری
سوادِ طور کے شعلوں کو جستجو ہے تری نیازِ شوق کے بوسوں کو جستجو ہے تری
خموشیاں ہی نہ کردیں کہیں تجھے رسوا
اُٹھا رباب اُٹھا

اثر سے نغمہ گہِ آبشار خالی ہے — تجلّیوں سے ہر اک لالہ زار خالی ہے
نشے سے جامِ مئے گل فشار خالی ہے — نوائے کیف سے بزمِ بہار خالی ہے
تڑپ رہی ہے ترے انتظار میں دُنیا
اُٹھا رباب اُٹھا

شرارِ عشق سے جل جائیں ناز کے پردے — حقیقتوں سے اُٹھا دے مجاز کے پردے
تڑپ رہے ہیں تری بزمِ ناز کے پردے — کہ ہل رہے ہیں ہم سوز و ساز کے پردے
نکل، کہ تیرے نکلنے کا وقت آ پہونچا
اُٹھا رباب اُٹھا

فلسفۂ عیش

(از جناب سید عبد الودود صاحب وَرد بریلوی)

چند روزہ عیش ہے اور چند روزہ یہ حیات — تیز رفتاری سے جاری ہے یہ عمرِ بے ثبات
اِک ڈرامے کے دکھانے کے لیے اسٹیج پہ — ہم شعورِ زیست سے کچھ ہو گئے ہیں بہرہ وَر
عارضی احساس کو سمجھے کوئی کیوں مستقل ؟ — رُوح کیوں آلام اور آمال میں ہو پایگل ؟
رُوح کا انجام جب مجہول و نامعلوم ہے — اِس معمّے کا نہیں کھلتا کہ کیا مفہوم ہے
پھر تو یہ بے سود ہے تقویٰ عبث ہے احتیاط — مختصر یہ زیست کا وقفہ ہو وقفِ انبساط

ہو اگر توفیق انسان کو تو دُنیا چھوڑ دے — رشتۂ الفت کو نا اہلوں سے قطعاً توڑ دے
گوشۂ عزلت میں بیٹھے عیش اور آرام سے — دل لگائے بس فقط اِک ساقیِ گلفام سے
جسکو حاصل ہو گئی توفیقِ ترکِ مدعا — ساری دُنیا میں وہی ہے اِک حقیقت آشنا

رباعیاتِ یگانہ

منزل کی تجھے کیسے خبر منزل کی نہ پوچھ
بیچ ہی میں بہتا پھرا ساحل کی نہ پوچھ
سمجھا جسے بس گھاٹ لیے جاتا ہے
بیچ میں جو دیکھا ہیں کہیں دل کی نہ پوچھ

ولہ

دھارا سے جو نکلا کارواں ڈوب گیا
پھیلے زمین و آسمان سے جا ملا
سمجھا جسے بس منزل مقصود کی دھن
کھینچے لیے جاتی ہے کہاں جانے بلا

ولہ

دل زندہ ہے درد مشغلہ ہے جب تک
آباد ہے گھر ہجوم غم ہے جب تک
بچھتے ہیں پر کیا آپ اپنا الٹ کی لے
دم لینے نہ دیں گے دم میں دم ہے جب تک

مرزا یاس یگانہ لکھنوی

پھولون کی کہانی

(منشی شکھدیو پرشاد بسمل الہ آبادی)

گلزار مین آیا موسمِ گل، اللہ رے جوانی پھولون کی
اب پھول کے بلبل کہتی ہے، پھولون سے کہانی پھولون کی

صیاد کے گھر مین کہتا ہے یون کوئی کہانی پھولون کی
جا پہنچی، پرکھی، دیکھی بھالی، مین نے بھی جوانی پھولون کی

رہ جائے گی کہنے سننے کو، گلشن مین کہانی پھولون کی
دو روزہ ہے عالم پھولون کا، فانی ہے جوانی پھولون کی

جب موسمِ گل کا ذکر آیا، تو اشک بہائے گلچین نے
تصویر کی صورت پھرنے لگی آنکھون مین جوانی پھولون کی

اے بادِ خزان! یہ ظلم و ستم، پتے بھی الگ، شاخین بھی جدا،
گلشن مین نہ رہنے پائے گی کیا کوئی نشانی پھولون کی؟

گلچین بھی مخالف، صرصر بھی، کچھ بس نہین چلتا بلبل کا
مٹی مین ملائی جاتی ہے پُرجوش جوانی پھولون کی

وہ محفلِ گل باقی نہ رہی، وہ اہلِ چمن باقی نہ رہے،
اب کون سنائے گا ہم کو، دلچسپ کہانی پھولون کی

گلچین کا بھروسہ خاک کرون، امید خزان سے کیا رکھون،
وہ دشمن جانی پھولون کا، یہ دشمنِ جانی پھولون کی

گلشن مین نہ کیونکر دل بہلے، وہ سنتے ہین، مین سنتا ہون
پھولون سے فسانہ بلبل کا، بلبل سے کہانی پھولون کی

مضمون کے گل کیونکر نہ کھلین، بسمل پھر صفحۂ کاغذ پر
متلون سے لکھی ہے تم نے، خوشرنگ کہانی پھولون کی

علمی خبرین اور نوٹ

ہندوستانی اکاڈمی صوبۂ متحدہ الہ آباد کے قیام سے جو امیدین وابستہ تھین وہ رفتہ رفتہ پوری ہو رہی ہین اور امید ہے کہ مستقبل قریب ہی مین صوبہ کی یہ واحد علمی انجمن علم ادب کی قابلِ قدر خدمت انجام دیسکے گی۔ مشاہیر اہلِ قلم سے مفید و دلچسپ موضوعات پر مستقل کتابین لکھانے کا جو فیصلہ کیا گیا ہے اُسپر زمانہ کے کسی گزشتہ نمبر مین تفصیل کے ساتھ لکھا جا چکا ہے۔ اس وقت ہم اپنے ناظرین کو خصوصاً یہ خوشخبری سناتے ہین کہ گزشتہ سال کی طرح امسال بھی اُردو اور ہندی کی مفید کتابون پر قابلِ قدر انعامات دیے جائینگے۔ جنکی تفصیل حسب ذیل ہے۔

ایک انعام نیچرل سائنس کے کسی موضوع پر لکھی ہوئی کتاب پر دیا جائیگا **دوسرا** علم اخلاق کی کتاب پر۔ **تیسرا**۔ عام ادبی موضوع پر لکھے ہوئے کتاب پر۔ یہ تینون انعامات نثر کی ایسی کتابون پر دیے جائینگے جو یکم جنوری ۱۹۲۶ء کے بعد شائع ہوئی ہون **چوتھا** انعام نظم کی ایسی کتاب پر دیا جائیگا جو یکم جنوری ۱۹۲۷ء کے بعد طبع ہوئی ہو۔ یہ انعامات پانچ پانچ سو روپے کے ہونگے۔ اہلِ قلم کے لیے یہ بہت اچھا موقع ہے کہ وہ اپنی تصانیف پیش کرکے اکیڈمی سے اپنی محنتون کی داد لین۔

ستمبر ۱۹۲۵ء اور دسمبر ۱۹۲۵ء کو ختم ہونے والی دونون سہ ماہیون مین صوبۂ متحدہ مین اُردو زبان کی (علی الترتیب) صرف ایک سو پندرہ (۱۱۵) اور ایک سو آٹھ (۱۰۸) کتابین شائع ہوئی ہین ان مین نئی اور دوبارہ شائع ہونیوالی کتابین دونون شامل ہین۔ ہمین یہ دیکھکر بہت افسوس ہوا کہ ان مین صرف دو ہی چار کتابین کارآمد ہین باقی زیادہ تر غزلون کے چھوٹے چھوٹے مجموعے اور ابتدائی درسی کتابین ہین۔ ستر کتابین نظم کی ہین اور ایک سو تریسٹھ (۱۶۳) نثر کی۔ نثری کتابون کی تفصیل بلحاظ موضوع حسب ذیل ہے۔

سوانح عمری	۲	طب	۶
ڈرامہ	۵	مذہبی	۹
قصہ	۱۵	سیاسی	۳
تاریخ وجغرافیہ	۱۳	فلسفہ	۱
زبان (تعلیمی)	۵۸	متفرق	۳۸
قانون	۴		

ڈاکٹر سر اقبال نے "الٰہیات اسلامیہ و فلسفہ جدیدہ" پر مدراس میں چھ خطبے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر علالت کی وجہ سے دسمبر ۱۹۲۸ء کے آخر ہفتے میں آپ نے مندرجۂ ذیل صرف تین عنوانات ہی پر خطبے دیے۔

(۱) علم اور وحی والہام (۲) وحی والہام کی تصدیقات کا فلسفیانہ معیار

(۳) ذات خدا کا اسلامی تصور اور دعا کا مفہوم۔

باقی تین عنوانات یعنی (۱) مسئلۂ جبر و قدر و حیات بعد الموت (۲) علم النفس کی رو سے اسلامی تہذیب و تمدن کا حقیقی مفہوم اور (۳) ایک جماعت کی حیثیت سے اسلام کی تشکیل۔ آیندہ سال کے لیے ملتوی کر دیے گئے ہیں۔

منشی تلوک چند صاحب محروم بی۔ اے نے لالہ لاجپت رائے صاحب کی وفات پر "آتشکدۂ خون" کے عنوان سے ایک مختصر ترکیب بند لکھا ہے۔ اسمیں لالہ جی کی بے وقت وفات پر اظہار ملال کرنے کے ساتھ اہل ہند کو اپنا فرض پہچاننے کی بھی ترغیب دی گئی ہے۔ محروم صاحب ایک کہنہ مشق شاعر ہیں انکے کلام کی پختگی اس نظم سے ظاہر ہے۔

ہمارے دوست سید جالب صاحب دہلوی سابق ایڈیٹر اخبار ہمدم لکھنؤ نے حال ہی میں لکھنؤ سے ایک روزانہ اخبار "ہمت" کے نام سے جاری کیا ہے۔ ہم خوش ہیں کہ سید صاحب میں ابھی جوانوں کا سا جوش اور ہمت موجود ہے۔ سید صاحب ایک تجربہ کار اور کہنہ مشق اخبار نویس ہیں۔ ہمکو مسرت ہے کہ ابھی تک اہل ملک کی رہنمائی و توسیع معلومات کے متعلق ہمدم کے ذریعے سے آپ جو خدمات کر رہے تھے اب آپ اس نئے روزانہ کے ذریعے انجام دینگے۔ ہم انکی اس اولو العزمی کی تہ دل سے داد دیتے ہیں اور معزز "ہمت" کا کشادہ دلی سے خیر مقدم کرتے ہیں ناظرین زمانہ سے ہم اس روزنامہ کی سرپرستی کی پرزور سفارش کرتے ہیں۔

انٹرنیشنل لیبر آفس ایک تحقیقات کی رپورٹ شائع کر رہا ہے جو ایسوسی ایشن آف جرنلسٹ ملحقہ لیگ آف نیشن کی خواہش پر اہل قلم کے کارناموں کی کیفیت اور انکی زندگی کی حالت معلوم کرنے کے لیے کی گئی تھی۔ اس رپورٹ میں موجودہ زمانے کی زندگی میں پریس کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے جسکا ثبوت اخبار و رسائل کی روزافزوں تعداد ہے۔ بعض ممالک کے اخبار و رسائل کی تعداد ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

جرمنی (۱۹۲۶ء) ۳۸۱۲ روزانہ ۸۳۰۹ ہفتہ وار

بیلجیم (") ۱۱۰۰

کنیڈا (") ۱۵۰۰

اسپین اور ڈنمارک (۱۹۲۶ء) ۳۰۰۰ سے زیادہ مع ۲۰، ہفتہ وار اور ماہوار۔

امریکہ (") ۲۴۰۰ روزانہ۔ ۱۴۰۰۰ ہفتہ وار۔ روزانہ اخبارات کی مجموعی تعداد اشاعت (۱۹۱۱ء) مین دو کروڑ اٹھاسی لاکھ تھی مگر ۱۹۲۶ء مین تین کروڑ ستاون لاکھ تیس ہزار سے زیادہ ہوگئی۔

برطانیہ عظمیٰ۔ ۲۴۰۰ جن مین ایک اخبار کی اشاعت ایک کروڑ سے زیادہ ہے۔

(اٹلی) (۱۹۲۴ء) تقریباً ایک ہزار۔

(جاپان) (") تین سو سے زیادہ۔

(پولینڈ) (") پانچ ہزار۔

(سوئٹزرلینڈ) (") دو ہزار۔

فرانس مین بھی اخبارون کی تعداد مین ایسا ہی اضافہ ہوا ہے۔ صرف پیرس سے تقریباً ایک سو اخبار شائع ہوتے ہین جن مین بعض کی اشاعت پچاس لاکھ سے زیادہ ہے۔

اس ماہ کی تصاویر سب اس نمبر کے دو مضامین سے تعلق رکھتی ہین۔ ہمارے مخدوم و محترم منشی جوالا پرشاد صاحب بی اے۔ ایل ایل بی۔ سکرٹری آریہ سماج کانپور نے صوبۂ متحدہ آگرہ و اودھ مین آریہ سماج کی علمی کارگزاریون کے متعلق جو دلچسپ مضمون لکھا ہے اُسکے متعلق ہم چار تصاویر اس پرچے مین ہدیۂ ناظرین کر رہے ہین۔ ہمکو افسوس ہے کہ ہمارے محدود ذرائع ہم کو زیادہ تصاویر دینے کی اجازت نہین دیتے ورنہ آریہ سماج کی کارگزاریان بیس پچیس تصاویر سے کم مین پورے طور پر ظاہر نہین ہو سکتی ہین۔ اس سال ہم اس قسم کے کئی اور با تصویر مضمون شائع کرنے کا بندوبست کر رہے ہین۔ جن سے ناظرین کو ملک کی بعض جدید ترین تحریکون کی کارگزاریان آئینہ ہو جائینگی۔

ہمارے مکرم مسٹر جے۔ آر۔ راے نے انسان کے قدیم حالات پر ایک نہایت محققانہ مضمون لکھا ہے جسکے متعلق ہم تین تصویرین درج رسالہ کر رہے ہین۔ بلجیم کے مشہور سنگ تراش لوئی مسکرے نے جیالوجی اور انتھراپالوجی کے ماہر پروفیسر رتات کے حسب ہدایت انسان نما جانذارون کی مورتین بنائی ہین۔ یہ تصویرین انھین مورتون کی ہین اور ان سے اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ جانذار کس شکل و صورت کے تھے۔ پروفیسر رتات کا یہ خیال ہے۔ کہ جاوا کا انسان جانذار تو سیدھا چل سکتا تھا۔ مگر سوچنے کی طاقت سے محروم تھا۔ پھلون پر گزارہ کرتا۔ اور پتھر کے بھونڈے ہتھیار بنا سکتا تھا۔ ہیڈل برگ کا جانذار گوشت خور تھا۔ نینڈرٹل کا جانذار بہت زبردست تھا۔ اپنے آس پاس کے انسان نما جانذارون کو زیر کرکے اُن پر حکمران تھا۔

For Wasting Diseases

جسم کی طاقت زائل کرنیوالی بیماریاں



دق وغیرہ ان سب قسم کی بیماریوں کے معالجے میں جنمیں وزن میں کمی ہو جاتی ہے انجیرس ایملشن نہایت کثرت و کامیابی کیساتھ استعمال ہوتا ہے ۔ یہ کھانے میں خوش ذائقہ ہے بھوک بڑھاتا ہے ۔ ہاضمہ کو مدد دیتا ہے اور وزن اور طاقت میں ترقی کرتا ہے ۔

اپنی مقوی خاصیت کے علاوہ انجیرس ایملشن نہایت تسکین بخش اور مفید صحت ہوتا ہے جسکی وجہ سے معدہ پھیپھڑوں کی شکایتوں یا کھانسی زکام وغیرہ امراض میں سکا استعمال بہت مفید ہوتا ہے ۔ سل دق کنٹھ مالا اینمیا (خون کی کمی) معدہ اور آنت کی طاقت زائل کرنے والے امراض اور دیگر سخت بیماریوں کے بعد انجیرس ایملشن کے استعمال کی بہت زور کیساتھ سفارش کیگئی ہے تمام ہندوستان میں اسکو نہایت شاندار شہرت حاصل ہوئی ہے اور سب خاص خاص بازاروں میں دوکانداروں کے یہاں فروخت ہوتا ہے ۔

انجیرس ایملشن میں کسی قسم کی چربی یا چربی کا روغن نہیں ہوتا ہے اور اسکی تیاری میں کسی آدمی کا ہاتھ لگنے نہیں پاتا ہے ۔ اسلئے اسکو سب قوموں اور مذہبوں کے لوگ بلا کسی پس وپیش کے استعمال کر سکتے ہیں :—

ANGIER'S EMULSION

Of all Chemists and Stores.

شاما

ایک نہایت دلچسپ اخلاقی و اصلاحی ناول مصنفہ پنڈت کرشن پرشاد کول ممبر سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی

(مطبوعہ انڈین پریس الہ آباد)

اس ناول میں مشہور مصنف نے پوری اخلاقی جرأت سے ان تمام رسوم و قوانین سے بحث کی ہے جو ہندو سوسائٹی میں ازدواجی تعلقات کو مکدر کر دیتے ہیں لائق مصنف نے یہ دکھایا ہے کہ موجودہ زمانہ کی تعلیم یافتہ ہندو مستورات کو خانہ داری کے مصائب برداشت کرنا پڑتے ہیں اور کس طرح یہ بیچاریاں تحمل کر اپنی جان عزیز برابر رائیگاں کر دیتی ہیں لائق مصنف نے نہایت کامیابی سے ان قبیح رسوم و قوانین کی مضرتوں پر بحث کی ہے زبان نہایت صاف فصیح اور شگفتہ ہے نفسیاتی حیثیت سے فطرت انسانی کو نہایت حکیمانہ طور سے بے نقاب کیا گیا ہے۔ شاما کے خطوط سے یہ صاف صاف پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تعلیم یافتہ ہندو خواتین میں کیسی فطری تبدیلی واقع ہو رہی ہے اور ان کو کس اصلاحات کی ضرورت ہے کتاب شروع کر کے بغیر ختم کئے ہوئے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا کتاب نہایت خوشنما باتصویر چھپی ہوئی ہے قیمت عہ

معزز رسائل و اخبارات کی راؤں کا خلاصہ

اُردو اورنگ آباد - انسانی جذبات کی تصویر نہایت صفائی سے کھینچی ہے۔ زبان بہت صاف فصیح اور شگفتہ ہے اور جس غرض سے انہوں نے یہ قصہ لکھا ہے اسمیں وہ خاطر خواہ کامیاب ہوئے ہیں۔

رسالہ معارف اعظم گڈھ شاما ایک قلم کی نئی گلکاری ہے یہ ایک دلچسپ افسانہ ہے جسمیں مصنف نے ہندو جماعت کی ازدواجی معاملات میں اصلاح کی ضرورت ثابت کی ہے۔

بہار کشمیر یہ کتاب لکھ کر مصنف نے سوسائٹی کی بیش بہا خدمت کی ہے

اودھ پنچ طرز بیان نہایت دلکش ہے کشمیر کے مناظر اور تاہل کی زندگی کے باریک نکات اس خوبی سے بیان کئے ہیں کہ اکثر مسلمان مصنف بڑی بڑی ڈینگیں ہانکنے اور واہ واہ کا شور سننے کے بعد بھی طرز ادا کے مطلب پر قادر نہیں۔

ہمدم لکھنؤ یہیں کی زبان۔ خیالات اور طرز بیان کی پاکیزگی کیساتھ اس امر کا بھی اعتراف ہے کہ پلاٹ بہترین اور موثر ہے۔ شاما کے دو آخری خطوط تو کتاب کا ماحصل ہیں

لیڈر شاما ایک اعلیٰ اصلاحی ناول ہے۔ ہم مصنف کو مبارکباد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ اگر ہندو سوسائٹی کو تباہی سے بچانا مقصود ہے تو لائق مصنف اسی قسم کی مزید تصنیفات سے سوسائٹی کی خدمت کرتے رہینگے۔

انڈین ڈیلی ٹیلیگراف ہم اپنے ناظرین سے شاما کے مطالعہ کی سفارش محض اسلئے نہیں کرتے ہیں کہ وہ ایک اہم و خاص مسئلہ پر نہایت خوش اسلوبی سے لکھی گئی ہے۔ بلکہ اسلئے بھی کہ اسمیں متعدد اعلیٰ اور تکمیل خیر مسائل پر بھی نہایت دلچسپ بحث کیگئی ہے۔

ٹریبیون یہ ناول شاما کے مصائب تلخی کا افسانہ ہے جسمیں ہمارے طرز معاشرت و قوانین ازدواج اور ان رسمیات پر جو ان قوانین کے اجرا پر مصر ہیں۔ نہایت زبردست اور ناقابل تردید نکتہ چینی کیگئی ہے۔

مسٹر ٹامس سڈ کولی نے اس ناول کے ذریعہ سے اپنا دل کھولکر رکھدیا ہے۔ بلاشبہ یہ ایک مصیبت زدہ دل کی پر درد داستان ہے۔

مضامین چکبست یعنی پنڈت برج نرائن چکبست کا مجموعہ مضامین نثر جسمیں پنڈت دیا شنکر نسیم۔ پنڈت تربھون ناتھ ہجر۔ رتن ناتھ سرشار۔ داغ۔ انشی سجاد حسین اور دیگر نامہ نگاران اودھ پنچ پر ادبی و تنقیدی تبصرہ کیا گیا ہے اور بھائی نوردجی۔ پنڈت بشن نرائن در وغیرہ مشاہیر کے سوانح حیات۔ نیز مختلف تاریخی ادبی و اصلاحی مضامین درج ہیں قیمت سادہ ۱۲ سنہری جلد ۲

صبح وطن

(مصنفہ پنڈت برج نرائن چکبست)

یہ رگ رگ میں بجلی دوڑا دینے والی نظموں کا مجموعہ ہے جنہوں نے فصاحت و سنجیدگی نیز ظریفانہ و قومی سحر طرازیوں سے اردو شاعری میں ایک نئی روح پھونکدی ہے۔ قیمت اُردو یا ہندی اڈیشن عہ

نوٹ نہایت نفیس کیساتھ رسالہ زمانہ کا خاص نمبر دیا گیا ہے

ملنے کا پتہ:- انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد

واہ! واہ!! واہ!!!

۶۱ انعام

صرف نام کیلئے

دولت کا خون

ہمارے درجن داد کی دوا پر ۶۱ قیمتی چیزیں انعام

نیشنل بل ٹرولسے رسٹ واچ اور پاکٹ واچ بھی انعام ہی میں شامل ہیں

انعام کی چیزوں کو دیکھتے ہی دل پھڑک اٹھیگا



انعام کی چیزیں

۳۸ چابی - ۳۹ مضبوط تالا - ۴۰ سندر چھٹی ۴۱ - دودہ یا چاے چھاننے کا آلہ ۴۲ کان سے میل نکالنے کا اوزار ۴۳ خوبصورت گھونگھرو -
۴۴ خوبصورت ایرنگ ۴۵ گولی - ۴۶ خوشبودار تیل کی شیشی ۴۷ سندر تماشے کی گیند ۴۸ خوبصورت ناک کا پھول ۴۹ آٹومیٹک سندر
۵۰ مسنرہ - ۵۱ عجیب جھبی ۵۲ چابی کا رنگ ۵۳ دانت سے میل نکالنے کا اوزار ۵۴ فاونٹین پن قلم کا کلپ ۵۵ چھاتی پر لگانیکا سیفٹی پن ۵۶ نب
۵۷ - بیلدار خوبصورت چھلا - ۵۸ پیپر کلپ ۵۹ حجامت بنانے کا سیفٹی استرہ - ۶۰ سندر فیتہ - ۶۱ بڑھیا ٹرولسے رسٹ واچ (نوٹ)
جن کا آرڈر تیس ۳۰ انعامی چیزوں کا آچکا ہے - انکو بھی انعام میں دکشہ ہی چیز دیجائیں گی:-

پتہ :- دی فرینڈس آف انڈیا ۲۸/۱ اپر چیت پور روڈ - کلکتہ

سودیشی یا سستی؟

لال املی کی لوئیوں میں دو نوں وصف ہیں، جو اصحاب یہ لوئیاں خریدتے ہیں، وہ نہ صرف اپنے ہم وطن کاریگروں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ بلکہ خود بھی ایسی لوئیاں خرید لیتے ہیں جو نہایت اعلیٰ درجہ کی اور اس کے ساتھ نہایت کم قیمت ہیں۔

یہ لوئیاں جو ہندوستان میں گزشتہ تیس ۳۰ سال کے عرصے تیار ہو رہی ہیں یقینی طور پر سو فی صدی خالص اون سے بنائی جاتی ہیں اور اپنے دلنواز رنگوں کی بدولت قدردان آنکھوں کو مقناطیس کی طرح اپنی جانب کھینچ لیتی ہیں۔

ٹریڈ مارک

لوئیوں کی قیمتیں

			طول گز	طول گرہ	عرض گز	عرض گرہ	قیمت روپیہ	قیمت آنہ
نمبر ۳	لوئیاں	(سفید اور رنگین)	۳	-	۱	۸	۷	۹
نمبر ۲۶	لوئیاں	(" ")	۲	۱۵	۱	۶	۶	۴
نمبر ۱۶	لوئیاں	(" ")	۲	۸	۱	۴	۵	-
نمبر ۱۴	لوئیاں	(" ")	۲	۱۲	۱	۵	۵	۴
نمبر ۲۱۶	لوئیاں	(" ")	۲	۱۵	۱	۶	۶	-
نمبر ۲۹	لوئیاں	(چارخانہ دار)	۲	۱۵	۱	۶	۶	-
نمبر ۳۰	لوئیاں	(سفید اور رنگین)	۳	-	۱	۶	۱۲	۸

نوٹ:۔ ان لوئیوں کا طول و عرض جو اوپر بیان کیا گیا ہے اسمیں جھالر کا طول شامل نہیں ہے

LALIMLI
PURE WOOL

اپنے شہر کی لال املی ایجنسی میں جاکر نمونے دیکھئے اور پسند فرمائیے
اگر وہاں ایجنسی نہ ہو تو ہمیں لکھئے ہم نمونے مفت بھیج دیں گے۔

زمانہ بک ایجنسی کی قابل دید کتابیں

[illegible] رسالہ

جس میں [illegible] اور [illegible]
[illegible] نظم و نثر [illegible]
[illegible] مضامین [illegible]
قیمت [illegible]

نصائح چانکیہ

یعنی

نامور ہند چانکیہ کے مشہور و معروف
نیتی کا ترجمہ
از جناب پنڈت منمنت راؤ صاحب
مددگار خزانہ سرکار عامرہ
گورنمنٹ نظام۔
قیمت ۸/

پریم بتیسی

اردو کے مشہور فسانہ نگار منشی پریم چند جی کے بہترین قصوں کا مجموعہ زبان کی لطافت اور بیان کی شگفتگی قابل دید ہے۔
قیمت حصہ اول ۱۲/
حصہ دوم ۱۲/

اردو مضمون نویسی

مضمون لکھنے کے متعلق بابو ناٹک پرشاد بی اے پروفیسر کی نہایت عمدہ کتاب ہے اس سے بہت جلد اردو مضمون لکھنے کی مہارت پیدا ہو جاتی ہے اور مضمون کی ماہیت ہر موضوع کی نہایت آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے قابل دید کتاب ہے ان تمام خوبیوں کے باوجود اسکی قیمت
۸/

خیالات عزیز

یعنی مجموعہ مضامین مولوی عزیز مرزا صاحب ضابطہ رجسٹری ہو گئی ہے کوئی صاحب بلا اجازت پبلشر اسکے چھاپنے کا ارادہ نہ فرمائیں ورنہ نقصان ہوگا۔ حجم ۲۰۰ صفحات ٹائیٹل نہایت خوشنما رنگین شروع میں بھی رنگین ہے
قیمت صرف عا/ ، دعہ/

ترجمہ رامائن

(منظوم)

بال کانڈ کا ترجمہ اصل دوہے اور چوپائیاں ہندی میں ترجمہ اردو نظم میں
مترجمہ
منشی سورج پرشاد صاحب تصور
قیمت صرف ۱۲/

بزم المصنفین

اردو انشا پردازی کی مکمل تاریخ از جناب مولوی [illegible] صاحب [illegible] شعراء کی [illegible] تذکروں کا جامع [illegible]
قیمت [illegible] عا/

گل کدہ

لسان الملک جناب عزیز لکھنوی کا مجموعۂ کلام جس کا ہر صفحہ ایک چمن راز اور ہر شعر ایک خوشنما رنگ پھول ہے
قیمت صرف
ایک روپیہ عہ/

[illegible]ستان

[illegible]
قیمت [illegible]

۵

دکن کی علمی فتوحات

روح تنقید فن تنقید، اصولی بحث و مبادیات تنقید از مولوی سید غلام محی الدین صاحب زور ایم۔ اے۔ قیمت عہ

تنقیدی مقالات اصول تنقید کا عمل اور اسکے نمونے " " " مجلد " ۱۲/

اردو کے اسالیب بیان اردو نثر نویسی کی تاریخ اور اسکے طرز تحریر پر تبصرہ " " " " عہ

سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب محمود غزنوی کے علمی کارناموں کا مرقع " " قیمت عہ

دنیائے افسانہ افسانہ نویسی کی تاریخ اور اسکے اصول و مبادیات " " " ۱۲/

ارباب نثر اردو انیسویں صدی کے اردو نثر نگاروں کا تذکرہ اور اردو نثر کی ارتقائی تاریخ از مولوی سید محمد ایم۔ اے۔ عہ

مبادی فلسفہ فلسفہ کے اصول و ضوابط کا بہترین صحیفہ از مولوی میر حسن الدین بی۔ اے۔ ال ال بی۔ قیمت ۱۲/

شاہ رفیع الدین قندھاری ایک صوفی اور روشن دل بزرگ کے حالات از مولوی عبد الغفور عابدی قیمت ۵

خزینہ اخلاق لڑکے اور لڑکیوں کے لیے آداب و اخلاق کا گنجینہ از مولوی سید عبد اللہ نیر نظامی ۶

آثار الکرام عہد سلاطین ہمنیہ کے تحقیقی علمی کارنامے از مولوی سید شمس اللہ قادری ام ار اے ایس

شیایان اردو اردو نظم و نثر کے

بہترین شہ پارے از مولوی احمد عارف قیمت عہ

اعظم اللغات وکلا، عمال اور حکام کا قانونی اور دفتری محاورات از مولوی محمد اعظم صاحب وکیل۔ مجلد ۳

طلسم تقدیر المناک تاریخی افسانہ از مولوی سید غلام محی الدین زور ایم اے۔ قیمت ۸/

اسوۂ حسنہ دنیا کے انسان کامل کی تعلیم اور اسکی زندگی کا بہترین ذکر از مولوی عبد الصمد صمد وسی بی۔ اے۔ قیمت صرف ۸/

جواہر کلیات نظیر اردو کے اولین نیچرل شاعر کے جواہر پارے از مولانا زین حیدرآبادی قیمت صرف عہ

سیرت خیر البشر آنحضرت صلعم کے اخلاق حمیدہ۔ بچوں کے لیے نہایت مفید ہے ۱/

نیک بی بی نیک بی بی اپنے شوہر کو کس طرح ٹھیک کرسکتی ہے بتلایا گیا ہے قیمت ۲

دکن

بہترین علمی و ادبی مصور رسالہ

"مجلہ مکتبہ"

مجلہ مکتبہ حیدرآباد دکن کی علمی سرگرمیوں کا بلیغ ترجمان اور دکن کا سب سے زیادہ کثیر الاشاعت ماہانہ رسالہ ہے مولوی عبد القادر صاحب سروری ایم اے ایل ایل بی کی ادارت میں خود ماہ اپریل سنہ ۱۹۳۰ء سے نہایت مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔ اسکی چند خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

(۱) علوم جدیدہ پر بلند پایہ مضامین (۲) ادب کے مختلف عنوانات پر تنقیدی مضامین

(۳) اردوئے قدیم اور دکنی لٹریچر پر تحقیقاتی مقالے۔

(۴) عربی، انگریزی، فرانسیسی، روسی، ہندی کے ترجمے اور طبعزاد شاہکار افسانے

(۵) بادۂ دکن کے قدیم مشاہیر شعرا کے کلام کا پاکیزہ انتخاب

(۶) شعرائے جدید کی دلکش نظمیں

(۷) مشاہیر شعرائے قدیم، دکنی شعرا و ادبا کی کمیاب تصاویر

(۸) اردو کی تازہ ترین مطبوعات کی اطلاعات و تنقید ہیں۔

قیمت سالانہ (للعہ) ششماہی ۱۲ فی پرچہ (۶)

پتہ:۔ منتظم "مجلہ مکتبہ" مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

چھوٹا شیطان منظوم رسالہ ہے اسمیں علم کی خوبی اور جہالت کی برائی کو قصے کے پیرایہ میں ظاہر کیا گیا ہے یہ بچوں کیلئے بہت مفید ہے از مولانا زین قیمت صرف ۱/

دکنی لغت اسمیں دکنی الفاظ کے معانی کیساتھ اسکے مترادف اردو الفاظ بھی دیئے گئے ہیں تاکہ اسکی بدولت اہل ہند دکن کو مطالب و معانی کے سمجھنے میں آسانی ہو از مولوی شعار احمد ہاشمی قیمت ۸/

دکن میں اردو قدیم اردو کی تاریخ اور عہد بعہد کے اردو شعرا کا تذکرہ از مولوی نصیر الدین ہاشمی منشی فاضل قیمت عہ

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

صنوبر کے جنگل کی دوا

گلے۔ سینہ۔ اور پھیپھڑون کی عجیب و غریب دوا پیپس

عام طور پر سربرآوردہ طبیبوں کا اس رائے پر اتفاق ہے کہ صنوبر کے جنگل کی فرحت بخش ہوا گلے۔ سینہ اور پھیپھڑ دن کی تمام کمزوریوں کو دور کرنے کی تعجب خیز طاقت رکھتی ہے۔ چونکہ سانس کے ذریعہ سے انتقال ہونے والی نئی پیپس کی ٹکیوں میں اسی صنوبر کے جنگل کی ہوا کی تمام ضروری خاصیتیں عمدہ اور اعلےٰ درجہ کی صاف کی ہوئی شکل میں ہوتی ہیں اسلئے وہ کھانسی ٹھنڈ اور رقات الریہ کو آرام دینے میں بے مثل مشہور ہیں۔

پیپس دق کی تکلیف دہ کھانسی سے آرام دیتی ہیں اور اس طرح اس طاقت کی حفاظت کرتی ہیں جو افسوسناک طریقے پہ ضائع ہوتی ہے اور پرانے مریضوں کو آرام کی نیند سلاتی ہے جب انکو روچلہ کنارہ کے لفافہ سے علیحدہ کر کے منہ میں گھولا جاتا ہے تو اجزے نکلتے ہیں یہ اجزے اس ہوا سے ملکر جو ہم سانس کے ذریعہ اندر کھینچتے ہیں پھیپھڑونکے پوشیدہ سوراخوں تک پہنچتے ہیں پیپس کی ٹکیاں حیرت انگیز آرام دہ اور طاقتور اثر کرتی ہیں وہ بلغم کو آسانی سے خارج کرتی ہیں گلے کو جراثیم سے صاف کرتی ہیں اور سینہ کے درد کرنے والی جھلی اور نلیوں کو صحت بخشتی ہیں۔

پیپس جو اکثر "ایک صنوبر کا جنگل ایک بوتل میں" کہلاتی ہیں کھانسی ٹھنڈ سردی۔ گلے کا خراش حلق کی سوزش ذات الریہ دمہ اور زکام وغیرہ کے لیے حقیقی حفاظت اور علاج ہیں۔

قیمت ایک روپیہ تمام دوا فروشوں سے مل سکتی ہیں

ایجنٹ۔ میسرز اسمتھ سٹینس اسٹریٹ اینڈ کو لیٹڈ۔ استانی کلکتہ۔

پیپس

کانپور

پریم چند کی نئی کتاب

پریم چند کی کہانیوں کے ترجمے گجراتی۔ مرہٹی۔ تامل تلیگو وغیرہ زبانوں میں تو پہلے ہی ہو چکے تھے۔ اب انگریزی اور جاپانی ممتاز ترین رسالوں میں انکے ترجمے شایع ہو رہے ہیں جاپانی ادب میں آپکی کہانیوں کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا ہے۔ ہندستانی اکیڈمی نے امسال نثر کی بہترین تصنیف کا انعام آپکی مشہور عالم تصنیف "رنگ بھوم" کو عطا کیا ہے۔

خاک پروانہ

آپکی تازہ ترین ۱۴ منتخب کہانیوں کا مجموعہ ہے

شائقین منگوا کر پڑھیں اور ان کہانیوں میں وہ کشش وہ تاثیر وہ جدت ہے کہ آپ حیرت میں آجائینگے قیمت صرف ایک روپیہ عہ

فارورڈ ۔ کلکتہ کا مشہور انگریزی اخبار اپنی تازہ اشاعت ۸ جولائی ۱۹۳۲ء میں ایک بسیط تنقیدی مضمون کے دوران میں لکھتا ہے کہ "منشی پریم چند کے افسانے فطرت انسانی کے گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہوتے ہیں وہ زندگی اور اُسکے عام نشیب و فراز واضح طور پر بیان کرنے پر قادر ہیں۔

پریم چند کے یہاں حقیقت و صداقت بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے۔ انکے افسانوں کے کیرکٹر سچے اور حقیقی ہوتے ہیں پریم چند صاحب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ زندگی کے روشن پہلو پر ہمیشہ نظر ڈالتے ہیں اور تاریک رخ کو ہمیشہ نظر انداز کرتے ہیں۔"

ملنے کا پتہ

منیجر زمانہ بک ایجنسی نیا چوک کانپور

[illegible]



[illegible]

[illegible] کے ایک گاؤں کے مدرسہ کا نظارہ [دیکھو ۲]



[illegible] بہت خوش ہو کر [illegible] — [illegible] کرتے ہیں [illegible] ہوتی ہے

زمانہ

جلد ۵۲ — مارچ سنہ ۱۹۲۹ء — نمبر ۳

پانی پت کا خونین میدان

(از سید جالب صاحب دہلوی سابق ایڈیٹر ہمدم، لکھنؤ)

(۱)

تاریخی خونین علاقہ | ممالک متحدہ اور پنجاب کے تقریباً وسط مین جو علاقہ انبالہ کی تحصیل نرہند سے لیکر دریائے جمنا کے کنارے کنارے دارالحکومت دہلی کی بیرونی سرحد" باونی کی سرائے تک پھیلا ہوا ہے وہ ہندوستان مین قدیم زمانے سے اپنی خون آشامی کے لیے مشہور ہے۔ اور انسانی خون کی ندیاں ہمیشہ اسمین بہتی رہی ہین تاریخ ہند کی وہ اہم اور عظیم جنگین جو نئے خاندانون۔ نسلون اور قومون کو حکومتِ ملک مین برسرِ اقتدار لانے کے باعث ہوئین۔ زیادہ تر اسی میدان مین لڑی گئین اور انگریزی عملداری کے فتنۂ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان مین استحکام پذیر ہونے تک کوئی صدی ایسی نہین گذری کہ اس علاقہ کی سرزمین دلاورانِ روزگار کے خون سے سیراب نہین ہوئی اور انکی ہڈیون نے اس مین چونہ کے اجزا کا اضافہ نہین کیا۔

مہابھارت | چنانچہ ہندوستانِ قدیم کی سب سے زیادہ ہولناک اور خونخوار جنگ جو اسم بامسمّےٰ "مہابھارت" (جنگِ عظیم) کے لقب سے ملقّب ہے۔ شمالی و وسطی ہند کے سب سے زیادہ طاقتور حکمران خاندان

کی ذو شاخون "کوروون" اور "پانڈوون" کے درمیان اس علاقہ مین کورکشیتر کے وسیع میدان پر واقع ہوئی۔ جسکے تالاب نے اسی معرکۂ عظیم کی بدولت اہم تاریخی اہمیت اور اپنے اردگرد کے مندرون کے ساتھ ہندوؤن کے ماثر متبرکہ کی حیثیت حاصل کرلی ہے اور سورج گرہن کے موقعہ پر تمام حصص ملک کے لاکھون جاتریون کا وہان اجتماع ہوتا ہے مہابھارت کے بعد بھی ہندو حکمرانون کی کثر باہمی لڑائیان اسی میدان مین ہوئین۔ اور مشہور یونانی فاتح اسکندر اعظم کی فوج اگر دریاے ستلج تک آکر اسکے عبور کرنے سے انکار نہ کردیتی۔ تو غالبًا شمالی اور وسطی ہند کے راجاؤن کی متحدہ قوت اسی میدان مین اُسکے مقابل صف آرا ہوتی

یونانیون سے لڑائی | اسکندر اعظم کے جانشینون مین سلیوکس یا جس دیگر سپہ سالار نے ہندوستان پر حملہ کیا اُسکو بظاہر اسی علاقہ مین ایسی قوت کا سامنا ہُوا۔ اور اس جنگ کے نتیجے کا اس امر سے اندازہ لگایا سکتا ہے کہ سپہ سالار موصوف نے اُس وقت کے سب سے زیادہ طاقتور ہندوستانی حکمران "چندرگپت" کے ساتھ رشتۂ ازدواج پیدا کرکے جو ہر زمانے مین باہمی اتحاد کے استحکام کی ایک بڑی ضمانت سمجھا گیا ہے۔ وہین سے واپس چلا جانا مناسب سمجھا۔ یونانی و ہندوستانی مورخین کے بیانات اس رشتہ کی نوعیت معین کرنے مین کسی قدر مختلف ہین۔ اور یونانی چندرگپت کی لڑکی کے اپنے سپہ سالار سے منسوب ہونے اور ہندوستانی چندرگپت کے یونانی سپہ سالار کی بھانجی کو اپنی سلک زوجیت مین لانے کے دعویدار ہین۔ ہمارے خیال مین عجب نہین کہ دونون طرف کے مورخون کے بیانات درست ہون اور یونانی سپہ سالار اور مہاراجہ چندرگپت نے باہم اس قسم کے رشتے قائم کیے ہون۔ اس واقعہ سے کم ازکم یہ ثابت ہوتا ہے کہ شیر شاہ سوری نے جو ہندو راجاؤن سے اس قسم کے ازدواجی رشتے قائم کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ اور اُسکے بعد اکبر اعظم اور اُسکے جانشینون نے اُسکو مزید تقویت بخشی۔ اور زمانۂ حال کے ایک مشہور مورخ کے استعارے کے بموجب اونٹنی کے دُودھ مین اس قدر گنگا جل ملایا۔ کہ آخر مین اونٹنی کا دُودھ صرف براے نام شہنشاہ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے جانشینون کے جسم مین باقی رہ گیا تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہین تھی۔ بلکہ قدیم ہندوستان کے ایک سابق طریقے کی تجدید کیگئی تھی

مسلمانون کا داخلہ ہندوستان مین | یہ امر قابل ذکر ہے کہ مذہب عیسوی کی طرح اسلام بھی سب سے پہلے تاجرون کے ذریعے سے جنوبی ہند مین داخل ہوا۔ اور غازی محمد قاسم علیہ الرحمۃ نے جو ابتدائی پیش قدمی سندھ کی طرف سے ہندوستان پر کی۔ وہ جنوبی ہند مین اشاعت اسلام کا ایک نتیجہ تھی۔ کیونکہ وہان کے راجہ کا جو مسلمان ایلچی معہ تحائف کے دربار خلافت مین جارہا تھا۔ اُسکو سندھ کے بحری قزاقون نے

ساحل مکران کے قریب لوٹ لیا تھا۔ اور مسلمانون کی طرف سے جب اس واقعہ پر سندھ کے ہندو حکمران کو توجہ دلائی گئی۔ تو بجائے استمالت کے یہان سے رعونت آمیز جواب دیا گیا۔ اور مسلمانون کو بحری راستے کا امن بحال کرنے اور قیدیون کو چھڑانے کے لیے سندھ کے ساحلی علاقے پر فوجکشی کرنی پڑی۔ سندھ کی اندرونی سیاسی پیچیدگیون کے باعث یہ معمولی سی فوجکشی اُمید سے بڑھکر نتیجہ خیز ثابت ہوئی اور غازی محمد قاسم علیہ الرحمۃ نے عالم شباب مین سندھ کے جنوبی علاقے مین امن وامان قائم کرنے کی ذمہ واری کو ایسے شاندار طریقے سے ادا کیا۔ اور انسانی مساوات کا عملی طور پر وہ نقشہ جمایا۔ کہ جنوبی علاقے کا حفظ امن و رفاہ عام شمالی علاقہ سندھ کے لیے جسکی حدود اُس وقت ملتان سے گذر کر ولایت لاہور کی حدود سے ملجاتی تھین۔ باعث رشک ہوا۔ اور وہان کے ارکان دولت نے خود جنوبی سندھ کے مسلمان حکمرانون کو اپنے علاقے پر قبضہ کرنے کی دعوت دی۔ اور اُنکے لیے ہر قسم کی سہولتین بہم پہنچائین۔ فاتحین سندھ کو جہان تک تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے۔ بھٹنڈہ سے آگے قدم بڑھانے کا موقعہ نہین ملا۔ اور سلطان محمود غزنوی کی افواج اگرچہ اپنی فاتحانہ پیشقدمی مین اس تاریخی علاقے کے بعض حصّون سے گذری ہین۔ مگر اس میدان مین کوئی قابل ذکر معرکہ ان کو پیش نہین آیا۔ اور محمود کے جانشین سلاطین غزنوی نے صرف دریائے ستلج کے اُس پار کے علاقہ تک اپنی توجہات کو محدود رکھا۔ جس مین وہ اس قدر امن وامان قائم کرنے مین کامیاب ہوگئے تھے۔ کہ غوریون کی روز افزون قوت نے جب اُنکے موروثی مرکز حکومت (غزنی) مین اُنکو چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ تو خسرو شاہ نے پنجاب مین آکر لاہور کو اپنا مستقر حکومت بنایا۔ اور خاندان غزنوی کا آخری حکمران "خسرو ملک" لاہور کے باہر غوری افواج کے ہاتھون شکست کھانے کے بعد بحالت اسیری اُس مقام پر لیجایا گیا۔ جہان سے اُسکے مورث اعظم نے اپنی سلطنت کی حدود وسط ایشیا مین دریائے سیحون سے ترہدا کے کنارے تک وسیع کی تھین!

شہاب الدین غوری کی لڑائیان

غوریون کے وقت سے مسلمانون کا اقتدار حکومت مستقل طور پر اُس حصّۂ ملک مین قائم ہوا۔ جو قدیم اصطلاح مین اصل "ہندوستان" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور اس کا اہم ترین حصّہ۔ جو زرخیزی و نظافت آب و ہوا مین ہندوستان کے سارے میدانی علاقون پر فوق رکھتا ہے۔ وہ ہے۔ جو گنگا و جمنا سے سیراب ہوتا ہے۔ جن دونون دریاؤن کو اُنکے فوائد عظیم کے باعث جو کرورون انسانون کو زراعت و دیگر صورتون مین ان سے پہنچتے ہین۔ ہندوؤن نے مذہبی تقدیس کا مرتبہ دیدیا ہے۔ اس علاقہ کے جو سارے ہندوستان کی جان سمجھا جاتا ہے مرکزی مقامات پر اپنا تسلط

قائم کرنے کے لئے سلطان شہاب الدین غوری کو اُسی مشہور میدانِ کارزار کے قریب تراوڑی و تھانیسر مین مہاراجہ پرتھی راج اور شمالی ہند کے دیگر ہندو راجگان کی متحدہ فوجی قوت کے بالمقابل اپنی شجاعت و بسالت کا ثبوت دینا پڑا - اور مہاراجہ پرتھی راج سے جو اہم سیاسی غلطی اپنی حسن پرستی کی بدولت سرزد ہوئی تھی کہ اپنے خالہ زاد بھائی راجہ جے چند والئی قنوج کی لڑکی سنجوگتا کو وہ اسکے " سویمبر " جشن انتخاب شوہر کے روز اُسکے باپ کی راجدھانی (قنوج) سے لے اُڑا تھا - اُسکا شدید ترین خمیازہ اُسکو تھانیسر کے میدان کارزار پر بھگتنا پڑا - کہ جے چند نے نہ صرف اپنی فوجی امداد اپنے جابر داماد سے دریغ رکھی - بلکہ اپنی ریشہ دوانیوں سے پرتھی راج کے حلیفوں مین بھی بددلی پیدا کردی - اسکے علاوہ مہاراجہ پرتھی راج نے فوج کی نگہداشت کے بدلے جو زمانہ محلون اور باغون مین مہارانی سنجوگتا کے گلشن جمال کی گلچینی مین گذارا تھا - وہ بھی اسکے قوائے حربی و جسمانی پر اثر انداز ہوا اور ایک سال کی مسلسل عیش پرستی کے بعد میدان کارزار مین وہ مستعدی و سرگرمی اس سے ظاہر نہ ہوسکی - جس نے سارے شمالی ہند کے حکمرانون مین اُسکی دھاک بٹھا دی تھی - مہاراجہ پرتھی راج کے درباری شاعر چند بردے نے اپنے فیاض و حوصلہ مند مربی کا مرثیہ لکھنے مین مشرقی مبالغہ آمیزی و خیال آرائی کو جو دخل دیا ہے - اُس نے ہندو عوام کے طبقہ مین جو " مہابھارت " کی رزم و بزم کی شاعرانہ داستانون کو مستند تاریخ کا مرتبہ دیتے ہین - ایک غلط افسانے کو شہرت دے دی ہے - کہ مہاراجہ پرتھی راج نے شہاب الدین غوری کو ۱۰ مرتبہ میدانِ جنگ مین اسیر کرکے رہا کردیا تھا - مگر آخر الذکر نے مہاراجہ کو معرکۂ تھانیسر مین گرفتار کرنے کے بعد نہین چھوڑا - اور قفس یا حجرۂ آہنی مین بند کیا - اور عقوبت و ایذا رسانی سے اُسکی جان لینے کا درپے ہوا - حتّٰے کہ مہاراجہ کے درباری شاعر نے شہاب الدین کے دربار مین رسوخ اور خود سلطان موصوف کے مزاج مین درخور پیدا کرکے مہاراجہ پرتھی راج کو اپنے دشمن سے انتقام لینے کا ایک موقعہ اس طرح بہم پہنچایا کہ سلطانِ غوری مہاراجہ پرتھی راج کے کمال تیراندازی کو دیکھنے کا مشتاق ہوا اور اگرچہ اسکی آنکھون پر پٹی بندھی ہوئی تھی - مگر پرتھی راج نے اپنے بھاٹ سے شاعرانہ تلمیح مین اشارہ پاکر آواز پر ایسا درست نشانہ لگایا کہ اُسکا تیر سلطان شہاب الدین غوری کے حلقوم کو توڑ کر گُدّی سے پار نکل گیا - اور سلطان کی رُوح کو بھی اپنے ساتھ لیتا گیا - اِس واقعہ کے بعد سلطان کے سپاہیون نے مہاراجہ پرتھی راج کو قتل کردیا - مگر یہ تمام افسانہ بالکل فرضی ہے اور خود ہندو مؤرخون کے بیانات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مہاراجہ پرتھی راج تھانیسر کے میدان مین لڑتا ہوا بہادرون کی طرح مارا گیا اور اُسکی لاش کشتون کے درمیان سے اٹھائی گئی - شہاب الدین غوری کی موت اِس واقعہ کے ایک عرصے کے بعد دریائے جہلم اور اٹک کے درمیان اس طرح واقع ہوئی کہ گکھر لٹیرون کی ایک جماعت شب کو موقعہ پاکر اُسکے خیمے مین گھس گئی اور سلطان کو

بحالتِ خواب اسکے بستر پر قتل کر ڈالا۔

مسلمان بادشاہون کا ہندوستان مین تسلیم

مگر سلطان موصوف نے ہندوستان سے اپنے وطن واپس جاتے ہوئے اس ملک کی حکومت کا معقول انتظام کر دیا تھا اور اپنے معتمد علیہ غلام قطب الدین ایبک کو دہلی کے مرز مین کامل اختیارات حکمرانی کے ساتھ اپنا نائب قرار دے کر ملتان اور بنگال مین دو طاقتور دیگر نائبون کو جو قطب الدین کی مانند سلطان کے غلام تھے۔ اس ہدایت کے ساتھ چھوڑا تھا۔ کہ وہ قطب الدین کو اپنا افسر خیال کرین۔ سلطان شہاب الدین غوری کے مقتول ہونے پر چونکہ اسکا کوئی طاقتور جانشین باقی نہین رہا تھا۔ اس لیے قطب الدین ایبک نے ہندوستان مین اپنی قوت کو مجتمع و مضبوط کرنے کی ضرورت سمجھی اور سردارون کے مشورے سے تاجِ حکومت اپنے سر پر رکھا۔ اس طرح ہندوستان مین مسلمانون کی بادشاہت حریت اخوۃ و مساوات کے عملی مظاہرے سے شروع ہوئی۔ اور اس ملک کے باشندے جو ذات پات اور چھوت چھات کی پابندیون مین گرفتار تھے اور اب تک گرفتار ہین۔ انھون نے براہ العین اسکا مشاہدہ کیا کہ اسلام انسانون کو اُن کی قابلیتون کے موافق انتہائی ترقی کا موقعہ بہم پہنچاتا ہے اور ایک زرخرید غلام اپنی ہمت ولیاقت سے مرتبۂ شاہی حاصل کر سکتا ہے اور شاہی نسل کے لوگون سے اپنا اقتدار تسلیم کرا سکتا ہے۔

ہندوستان کی واحد سلطانہ

ایبک نے اپنے ایک ترکی النسل غلام شمس الدین التمش کو اپنا جانشین نامزد کیا جس نے توسیع سلطنت و استحکام قوت مین اعلیٰ درجے کے جوہر قابلیت دکھائے اور اسی کی بیٹی سلطانہ رضیہ واحد ملکہ تھی جو ہندوستان مین تختِ شاہی پر بیٹھی۔ مگر اسکے عورت ہونے کی وجہ سے امرائے دربار نے اُس گہرے اعتماد کو۔ جو سلطانہ رضیہ اپنے ایک حبشی غلام پر رکھتی تھی۔ خواہشات نفسانی و جذبات حیوانی پر محمول کیا اور سلطانہ رضیہ اسی مشہور میدانِ کارزار کے ایک حصے مین اپنے تاج کی حفاظت کرتی ہوئی گرفتار ہوئی۔ اور دوسری دفعہ کی کوشش مین بھی جو اُسنے محافظ قلعہ سے شادی کر کے دوبارہ تختِ شاہی حاصل کرنے کے لیئے کی تھی۔ ناکام رہکر معہ اپنے شوہر کے دیہاتیون کے ہاتھ سے ماری گئی۔ مگر اُسکا امتیاز و احترام آج سات صدیون کے بعد بھی قائم ہے اور صنف نازک جوق در جوق دہلی مین اُسکے مزار پر۔ جو "رجی چھجی کی درگاہ" کے نام سے موسوم ہے حاضر ہوتی اور لال چوڑیان اور شیرینی اُسپر چڑھاتی ہین!

سلطانہ رضیہ نے اپنے باپ کے اوصاف قابلیت سے جو حصہ پایا تھا وہ اُسکے بھائیون کو نصیب نہین ہوا تھا۔ چنانچہ وہ بارِ حکومت نہ سنبھال سکے۔ اور چھوٹے بھائی ناصر الدین محمود نے

تختِ شاہی کو عملاً مصلائے عبادت بناکر ایک عابدِ مرتاض کی طرح زندگی گذاری - اور انتظامِ سلطنت اپنے باپ کے ایک دانشمند و عالی ہمت غلام غیاث الدین بلبن المخاطب بہ الغ خان کو جو اُسکا بہنوئی بھی تھا تفویض کیا - جو اُسکی وفات کے اُسکا جانشین ہوا - اور تاتاریون کے حملون کو بڑی حوصلہ مندی و ہوشیاری کے ساتھ مسترد کرتا رہا - اگرچہ اِس مین اُسکو اپنے قابل و ہردلعزیز ولیعہد کی جان کا نقصان اُٹھانا پڑا - جسکے صدمے سے وہ خود جانبر نہ ہوسکا - اور خاندانِ غلامان کے اقتدار کی بنیاد بھی اسی واقعے کی وجہ سے متاثر ہوگئی - کیونکہ بلبن کے دوسرے بیٹے قراخان عرف بغراخان نے مرکزی حکومت کی خطرناک ذمہ داریون کو اپنے سر لینا مناسب نہ سمجھا - اور دانشمندی و عاقبت اندیشی کی راہ سے صرف بنگال کی حکومت پر قناعت کی جس پر وہ اپنے بیٹے کیقباد کے دہلی مین مقتول ہونے اور خاندانِ غلامان کی حکومت ختم ہوجانے کے بعد بھی باطمینانِ تمام قریب تہائی صدی تک قائم رہا - اور اُسکی اولاد بھی عرصے تک وہان صاحبِ اقتدار رہی -

خاندانِ تغلق کے عہد کی لڑائیان

سلطانہ رضیہ کے خون سے اپنی پیاس بجھانے کے بعد پانی پت کے تاریخی میدان کا بازار مین قریب ڈیڑھ صدی تک قدرے سکون رہا - مگر امیر تیمور کے حملے سے تھوڑے عرصے قبل محمود شاہ تغلق و نصرت خان ابن فیروز شاہ تغلق کی باہمی خانہ جنگی نے اِس علاقے کو بہادرون کے خون سے لالہ زار بنایا - اور امیر تیمور نے اپنے قریب نصف لاکھ قیدیون کا خون اِسی میدان کے ایک گوشے مین بہایا - خاندانِ سادات کا حکمران محمد شاہ جب بہلول لودی کے دیپال پور اور ملتان کے علاقون کو مسخر کرنے کے بعد اِس سے بدگمان ہوا اور بہلول لودی ایک لشکرِ عظیم کے ساتھ دار السلطنۃ دہلی کی طرف بڑھا - تو محمد شاہ سید اور بہلول لودی کی فوجون کی پہلی مڈبھیڑ اسی میدان کے ایک حصے مین ہوئی اور محمد شاہ کی فوج تابِ مقاومت نہ لاکر دہلی چلی آئی - بہلول لودی کئی ماہ تک دہلی کا محاصرہ کیے رہنے کے بعد اُس وقت تو بے نیلِ مرام واپس چلا گیا - لیکن محمد شاہ سید کی وفات کے بعد اُسکے بیٹے علاء الدین نے خود مرکزی حکومت بہلول کے سپرد کردی - اور خود بدایون پر قناعت کی جو باپ کے وقت سے اُسکی جاگیر مین تھا -

پانی پت کی پہلی جنگ

بہلول لودی اور اُسکے بیٹے سکندر لودی نے پون صدی سے زیادہ بڑے رُعب و دبدبے کے ساتھ حکومت کی - مگر وہ سلاطین شرقیہ و مالوہ کے جھگڑون مین پھنسے رہے اور میدانِ پانی پت کو اُسکی مرغوب خونین غذا نہین پہونچا سکے - مگر سکندر کے بیٹے ابراہیم لودی نے یہ کمی سخت دردناک طریقے پر اِس طرح پوری کی - کہ ایک لاکھ سوارون کی جمعیتہ اور ایک ہزار ہاتھیون کی قوت کے باوجود نواحِ پانی پت مین بابر کے ہاتھون جسکے ساتھ اُس وقت ۱۲ یا ۱۵ ہزار سوارون اور ۵ ہزار پیادون سے زیادہ نہین تھے -

شکست کھائی - اور اُسکی لاش میدانِ جنگ مین پٹھان سرداروں اور ہندو راجاؤن کی لاشون کے درمیان پڑی ہوئی ملی - یہ پانی پت کی تین مشہور جنگون مین سے پہلی جنگ تھی اور اسکا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان کی حکومت پٹھانون کے ہاتھون سے نکل کر مغلون کے ہاتھ مین چلی گئی اور اگرچہ شیرشاہ سُوری نے درمیان مین پندرہ سولہ برس کے لیے ہندوستان پر پٹھانون کا اقتدار بحال کیا - اور اپنی قابلیتِ حکمرانی کا ایک ایسا زبردست نقش بٹھایا کہ مغل شہنشاہ اکبرِ اعظم کو اکثر امور خصوصًا بندوبست مالیہ اراضی مین اُسکی تقلید کرنی پڑی ہی - اور آج انگریزی یونیورسٹم کے ایوانِ رفیع الشان کی بنیادون مین بھی شیرشاہ کا وہ پُرانا مصالحہ موجود ہے مگر پانی پت کی پہلی لڑائی سے پٹھانون کے اقتدار پر جو شدید ضرب لگی تھی - اُسکے صدمے سے پنپنے کے لیے زیادہ مدت درکار تھی اور شیرشاہ کی عُمر نے حصولِ سلطنت کے بعد پانچ سال سے زیادہ وفا نہین کی - اور اُسکے جانشینون مین اُسکی سی صلاحیت نہین تھی - چنانچہ سلیم شاہ نے اپنے بڑے بھائی عادل خان کو اسکے ترکِ سلطنت پر رضامند ہو جانے کے بعد بھی قدیم آبائی جاگیر بہار پر چین نہین لینے دیا - اور آخر دونون بھائیون مین جنگ کی نوبت پہنچی - اسی طرح سلیم شاہ کی وفات کے بعد اُسکے فرزند فیروز خان کو اُسکے حقیقی ماموں قمر زیخان نے قتل کر کے تختِ سلطنت پر قبضہ کیا - جسکے بعد خانہ جنگی کی آگ پٹھان سردارون کے درمیان سارے مُلک مین بھڑک اُٹھی اور پٹھانون کے بحال شدہ اقتدار کے ایوان کو جلا کر خاک کرنے لگی - مُلک مین وہ بد امنی پھیلی - کہ قمر زیخان کے شاہی لقب "عدلی" کو بگاڑ کر لوگ "اندھلی" کہنے لگے - عدلی خود اسی خانہ جنگی مین مارا گیا - اور اسی اثناء مین ہمایون نے براہ بھکر واپس آکر سندھ و ملتان اور لاہور پر قبضہ کر لیا - خاندانِ سُوری کے آخری حکمران سکندر نے نواحِ جالندھر مین ۲۰ ہزار سپاہ کی جمعیت سے ہمایون کی پیشقدمی رُوکنے کی کوشش کی - مگر شکست کھا کر کوہستانِ سوالک مین بھاگنے پر مجبور ہوا - اور ہمایون نے دارالسلطنت آگرہ تک راستہ صاف پایا - مگر چونکہ پٹھانون کا خدشہ ابھی لگا ہوا تھا - اور نوجوان ولیعہد جلال الدین معہ بہترین سپہ سالار بیرم خان کے پہاڑون مین شاہ سکندر کا تعاقب کر رہا تھا - اِس لیے ہمایون نے قدیم دارالسلطنت دہلی مین قیام کو ترجیح دی - اور شیرشاہ نے جو قلعہ ہندؤن کے قدیم قلعہ کی بُنیادون پر تعمیر کرانا شروع کیا تھا - اور ایک عالی شان مسجد و دیگر عمارات اسمین بنائی تھین - اسی کو مکمل کر کے اپنا مسکن بنایا - مگر یہان زیادہ عرصے تک اسکو رہنا نصیب نہین ہوا - اور پٹھانون سے مُلک واپس لینے کی جدوجہد کے آخری اہم معرکہ کو وہ اپنے جانشین کے لیے چھوڑ گیا -

پانی پت کی دوسری جنگ | یہ آخری اہم معرکہ اکبر کو اپنی تخت نشینی کے بعد ہی عدلی شاہ سُوری کے دیوان ہیمو کے ساتھ

جس نے بقال ہونے کے باوجود ملک داری و سپہ سالاری کی اعلےٰ قابلیتون کا ثبوت دیا - اسی پانی پت کے میدان مین لڑنا پڑا - جہان اسکے دادا نے تین برس پہلے شاہ ابراہیم ودہی خکست دیکر سلطنتِ مُغلیہ کی حکومت کا جھنڈا سرزمینِ ہند پر نصب کیا تھا - ہیمو بقال دہلی کو مغل حاکم تردی بیگ سے چھیننے مین کامیاب ہوگیا تھا - اور گذشتہ معرکون مین اس نے اپنی فوج کو بڑی حکمتِ عملی سے لڑایا تھا - مگر بعض روایات سے پایا جاتا ہے کہ خود کو دہلی کی تاریخی سرزمین کا حاکم پاکر ہیمو کو سلطنت کی ہوس دامنگیر ہوئی اور شاہ عادلی کے جانشین کی نیابت اپنے لیے ناکافی سمجھ کر اسنے خود مہاراجہ کا لقب اختیار کرنا چاہا - پنجاب کے ایک اخبار مین چندماہ قبل ہیمو کی ایک تصویر ایسی حالت مین شائع ہوئی تھی کہ وہ تخت پر چترِ شاہی کے نیچے متمکن ہے - اور خدام مورچھل لیے مگس پرانی مین مشغول ہین - یہ تصویر بظاہر فرضی ہے - مگر تاریخ کی بعض روایات کے بموجب ہیمو کی دلی خواہش و ارادے کا اس سے ضرور پتہ لگتا ہے - ظاہر ہے کہ ہیمو کے سرداران فوج کو - جو زیادہ تر پٹھان اور شاہانِ سوری کے متوسلین تھے - جب اسکے اس ارادے کا علم ہوا ہوگا - تو ان کے دلون مین کیسے خطرات پیدا ہوگئے ہونگے - بجنسہ اسی قسم کی ارادے کے اظہار کی غلطی جنگ سوم پانی پت سے قبل مرہٹون کے سپہ سالار بھاؤ سے بھی سرزد ہوئی اور اسکا خمیازہ بھی اُسکو ہیمو کی طرح بھگتنا پڑا - دوسرے ہیمو نے ہاتھیون کے چابکدست مغل تیراندازون کے سامنے کارآمد نہ ہونے کی بابت ابراہیم لودی کی پہلی لڑائی کے واقعات سے کوئی سبق نہین لیا اور وہ اکبر کے ایرانی و افغان سپاہیون پر رعب ڈالنے کے لیے ہاتھیون کی ایک تعداد کثیر اپنے ساتھ میدانِ جنگ مین لے گیا - جنکی وجہ سے اسکی فوج کی نقل و حرکت مین وقت پیدا ہوئی اور ہاتھی مغلون کے تیرون اور آتشبازی سے پریشان ہو کر اپنی ہی فوج کو پامال کرنے لگے - ہیمو نے ذاتی طور پر کافی شجاعت کا اظہار کیا - اور جب دشمن کا ایک تیر آن کر اُسکی آنکھ مین لگا تو اُسنے خود اپنے ہاتھ سے اُس تیر کو کھینچ کر باہر نکالا اور رومال کو تہ کر کے اپنی آنکھ پر پٹی باندھ لی اور فیلبان کو ہاتھی اُس جگہ لے چلنے کا حکم دیا - جہان گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی - مگر فیلبان کی کوشش کے باوجود ہاتھی نے دوسری راہ اختیار کی اور ہیمو اس طرح اکبری سپاہیون کے ہاتھون مین گرفتار ہوگیا - جسکے بعد اُسکی سپاہ نے ہمت ہار دی اور باوجودیکہ اُسکی تعداد اکبر کی فوج سے زیادہ تھی - مگر میدان سے اس کے پاؤن اُکھڑ گئے - ہیمو کی قوت کے منتشر ہوتے ہی پٹھانون کا زور ٹوٹ گیا اور اُن کو پہاڑون سے اُتر کر میدانی علاقون مین قسمت آزمائی کے لیے آنے کا حوصلہ نہین پڑا - بلکہ اکبر اعظم کے اقبال نے رفتہ رفتہ سب کو مطیع و منقاد بنا لیا - اور سلطنتِ مغلیہ کی مہمات انکے ہاتھون سے سر ہونے لگین - اس طرح پانی پت کی

دوسری لڑائی نے مغل شہنشاہی کی تنزل بنیادون کو از سرِ نو مضبوط کر دیا۔ اور ہندوستان مین نئی دورِ عظمت و جلالت کا آغاز ہوا۔ جو اس ملک بلکہ دنیا کی تاریخ مین ہمیشہ قابلِ یادگار رہے گا

اکبر اعظم۔ جہانگیر شاہجہان اور عالمگیر کے عہدِ حکومت مین۔ جو ڈیڑھ صدی سے زیادہ کے طویل زمانے پر پھیلا ہوا تھا۔ اور نہ صرف مغلون اور مسلمانون بلکہ ہندوستان کی تاریخ کا درخشان ترین دور تھا۔ پانی پت اور اُسکے گرد و نواح کے میدان کو اُسکی خونین غذا محض برائے نام ملی۔ اور شہنشاہ عالمگیر کے بیٹون اور پوتون کی باہمی لڑائیان بھی حصولِ تخت کے لیے لاہور و آگرہ کے گرد و نواح مین ہوئین۔

بندا بیراگی کے مظالم

مگر ان خانہ جنگیون کی بدولت پنجاب مین سکھون کو سر اُٹھانے کا موقع مل گیا۔ اور انکے دسوین گورو گوبند سنگھ جی کے دو نوجوان لڑکون کے میدانِ جنگ مین کام آنے کے بعد ہی باقیماندہ دونون خورد سال بچون پر سرہند مین جو دردناک واقعہ ایک برہمن کی دغا بازی اور دوسرے برہمن کی غمازی سے گذرا تھا۔ کہ مشہور عام روایت کے بموجب وہ زندہ دیوار مین چنوا دیے گئے تھے اور زیادہ مستند روایت کے موافق اُن بچون کے سر تلوار سے قلم کیے گئے تھے اُس نے سکھون مین ایک زبردست جوش غصہ و انتقام کا پیدا کر دیا۔ چنانچہ بندا بیراگی کی قیادت مین اُنھون نے لوٹ مار پر کمر باندھی۔ اور نواب وزیر خان حاکم سرہند کے لڑائی مین مارے جانے کے بعد سرہند مین داخل ہو کر اُسکی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور مسلمان مردون عورتون، اور بچون کو بڑی عقوبت کے ساتھ قتل کرنے کے علاوہ مساجد و مقابر کو منہدم کیا۔ اور قبرون مین سے مُردون کی لاشین اُکھاڑ کر جلائین۔ الغرض انتہائی شقاوت و بربریت بندا بیراگی اور اُسکی ماتحت سپاہ سے ظاہر ہوئی اور سرہند سے لے کر دیوبند اور پانی پت تک اپنا تسلط بٹھا کر اِس علاقے کے تمام دیہات و قصبات کو اُنھون نے تباہ و برباد کر دیا۔ آخر سلطان قلی خان برادرزادۂ رستم دل خان کو دربارِ شاہی سے اُنکی تادیب کے لیے مامور کیا گیا۔ جس نے پہلے پانی پت مین پہنچکر سکھون کی ایک طاقتور فوج کو۔ جو بماتحتی کبھری سنگھ وہان تعینات تھی۔ تھوڑے دنون کے مقابلے کے بعد شکست دی۔ کبھری سنگھ خود مقتول ہوا۔ اور اُسکی فوج کے بقیۃ السیف آدمی بھاگ کر سرہند مین بندا کے پاس پہنچے۔ سلطان قلی خان پانی پت پر اپنا عمل دخل کر کے اُنکے تعاقب مین سرہند پہنچا اور دوسری طرف سے نواب خانخانان کو بھی بادشاہ نے اِس مہم پر تعینات کیا۔ اِن دونون شاہی سردارون نے سرہند پر ایک خونخوار جنگ کے بعد بندا بیراگی کا شیرازۂ جمعیت پریشان کر دیا۔ مگر وہ گرفتار نہ ہو سکا اور بھاگ کر اپنی کوہستانی جائے پناہ قلعۂ لوہگڈھ مین چلا گیا۔ جسکو ایک طویل محاصرہ و رسد بندی

کے بعد شاہی فوج نے مسخر کیا اور بندا اکثر رفقاء کے مقتول ہونے کے بعد گرفتار کر کے دارالحکومت مین لایا اور کیفرِ کردار کو پہنچایا گیا۔

نادر شاہ کی فوج سے لڑائی

اسکے بعد تقریباً چوتھائی صدی تک اِس خون آشام علاقے کو اُسکی مرغوب غذا نہین پہنچی اور دربارِ شاہی مین طاقتور اُمراء اپنی "بادشاہ گری" کے کرتب دکھاتے تو شہنشاہ عالمگیر کے پردوتون اور پرپوتون کو بطور کٹھ پُتلیون کے اپنی انگلیون پر نچاتے رہے۔ محمد شاہ نے تورانی اُمراء کی حمایت و اعانت سے اِس ناگوار تماشے کو ختم کرنے مین کامیابی حاصل کی۔ مگر سلطنت کی مرکزی قوّت اِس طرح اور ضعیف ہوئی اور محمد شاہ کی عیش پرستیون اور ارکانِ دولت کی خودغرضیون اور اندرونی کاوشون نے جب نادر شاہ کو ہندوستان کے حملے کی ہمّت دلائی۔ تو ایرانی اور ہندستانی فوجون کی باہمی نام نہاد لڑائی اِسی تاریخی میدانِ کارزار کے ایک گوشے مین کرنال کے قریب ہوئی۔ مین نے اِسکو "نام نہاد لڑائی" بدین وجہ لکھا ہے کہ مُغل شہنشاہی فوج کا صرف ایک چھوٹا سا حصّہ میدانِ کرنال پر نادر شاہ کے تقریباً نصف لاکھ جفاکش اور دلیر و خونخوار سپاہیون سے نبرد آزما ہوا تھا۔ اور فی الحقیقۃ نواب خان دوران خان صمصام الدولہ اور اُن کے بھائی نواب قمقام الدولہ نے جو آخری شاہِ اودھ کے آخری بدنام وزیر نواب علی نقی خان کے بزرگ تھے، شجاعت کے ساتھ نمک حلالی جان نثاری کے جوہر دکھا کر اپنی جانین خدمتِ سلطنت مین قربان کر دی تھین۔ نواب سعادتخان برہان الملک بانیٔ حکومتِ اودھ بھی اِس میدان مین لڑے۔ مگر قزلباشون کے ہاتھون گرفتار ہو گئے باقی ماندہ امرا و سوار اپنے اپنے کیمپون مین مشغولِ عیش و طرب رہے اور نواب جعفر خان صوبہ دار بنگال جو ایک بڑی فوج کے ساتھ محمد شاہ کی طرف سے لڑنے آئے تھے۔ ان کو تو اِس معرکے کی اُس وقت خبر ہوئی۔ جب کہ ایرانی فوج صرف نادر شاہ کی خوش قسمتی اور محمد شاہ و اُمرائے ہند کی سُستی و سہل انگاری سے مظفر و منصور اپنے کیمپ مین داخل ہو چکی تھی۔ سلطنت مغلیہ کے زوالِ اقتدار اور خصوصاً حملۂ نادری کی داستان بڑی دردناک و عبرت انگیز ہے اور اگر کبھی اسپر تفصیل سے لکھنے کا موقعہ ملے گا۔ تو معلوم ہوگا کہ شہنشاہ عالمگیر کی نصف صدی کی مسلسل کوششون کو اُس کے نااہل جانشینون نے کس طرح خاک مین ملایا۔ اور جس شہنشاہ نے اپنے سرحدی علاقے کے گورنر کی اِس سفارش پر ناخوشی کا اظہار کیا تھا کہ ایرانی حاکم علاقۂ سرحدی کو آدھ کوس اِدھر چوکی خانہ قائم کرنے کی اجازت دیجائے۔ تاکہ وہ موسم کے شدائد سے محفوظ رہ سکے۔ اُسکے پردوتے نے عیش و عشرت مین پڑ کر کس قدر غفلت برتی کہ نادر شاہ معہ اپنے لشکرِ جرّار کے دارالسلطنت کے قریب آپہنچا۔ اور دربار مین بادشاہ یا

کسی امیر کے کان پر جون بھی نہ رینگی - بلکہ ایک مقتدر خاندان کی یادداشتون مین یہ روایت بھی نظر سے گذری کہ علاقۂ اٹک کے حاکم کی عرضداشت نادرشاہ کے ہندوستان کی طرف بڑھنے کی اطلاع کے متعلق اُس وقت محمد شاہ کے سامنے پیش ہوئی - جب کہ قلعۂ دہلی مین نادرشاہ کے ساتھ اُن کی صحبت گرم تھی فاعتبروا یا اولی الابصار!۔

خاندان مغلیہ کی آخری شاندار فتح

نادرگردی کا ہولناک واقعہ جس مین دارالسلطنت کے ہزارہا باشندون کی جانین اور مال نادری سپاہیون کے ہاتھون تلف ہونے کے علاوہ شہنشاہان مغلیہ کے دو صدیون کے فراہم کردہ خزائن و سامان تجمل بھی مع تخت طاؤس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا محمد شاہ اور انکے اُمراء کی آنکھین کھولنے کے لیے کافی ہونا چاہیے تھا - مگر افسوس ہے کہ انھون نے کوئی سبق عبرت نہین لیا - اور نواب چین قلیچ خان بہادر نظام الملک اوّل دربار کے اِس رنگ کو اپنے لیئے ناقابل برداشت پاکر جب اپنے صوبۂ دکن کو رخصت ہو گئے - تو اُمرائے بادشاہی اور بھی کھل کھیلے اور شمال و مغرب کی طرف سے حملہ آورون کی فاتحانہ پیشقدمی کے جس پرانے طریقے کی دو صدیون تک ملتوی رہنے کے بعد نادرشاہ نے تجدید کی تھی - اُسکی روک تھام کی کوئی فکر نہ کی گئی - جسکا نتیجہ یہ نکلا کہ احمد شاہ ابدالی کو جسنے نادرشاہ کے مقتول ہونے کے بعد اپنے ہمقوم افغانون کی رضامندی و اعانت سے افغانستان کی فرمان روائی کا لقب اپنے لیئے اختیار کر لیا تھا - ناصر خان نادری صوبہ دار کابل کی تادیب کے حیلے سے جو دربار دہلی مین احمد شاہ ابدالی کے کابل دپشاور پر دست تعدی دراز کرنے کی فریاد لے کر گیا تھا - تقریباً تیس ہزار افغان سوارون کی جمعیت کے ساتھ دریائے اٹک جہلم - چناب کو تیزی سے عبور کرنے کا موقعہ مل گیا - اور شاہ نواز خان بن ذکریا خان مرحوم نے - جو اپنے بڑے بھائی یحیےٰ خان کو قید کر کے صوبۂ لاہور پر بیٹھا تھا - اور چندان انتظامی قابلیت بھی نہ رکھتا تھا - جب اپنے مین شاہ ابدالی کے مقابلے کی تاب نہ پائی - تو لاہور کا شہر و قلعہ اُسکے سپرد کر دیا - احمد شاہ نے خزانۂ لاہور سے خاطر خواہ نقد و جنس لے کر اپنی قوت بڑھائی اور اپنے سابق آقا نادرشاہ کی روایت کو تازہ کرنے کے ارادے سے دارالسلطنت دہلی کی طرف کوچ کیا - مگر لاہور کے بلا جنگ وجدل ہاتھ سے نکل جانے کی خبر سُنکر محمد شاہ کے دربار مین بھی کچھ حرکت پیدا ہوئی اور ایک لشکر شاہی برائے نام ولیعہد شاہزادۂ احمد شاہ کے ماتحت لیکن فی الحقیقۃ وزیر الممالک اعتماد الدولہ قمر الدین کی زیر قیادت احمد شاہ ابدالی کی پیشقدمی روکنے کے لیے بھیجا گیا تھا جس مین نواب صفدر جنگ اور بعض راجپوت رئیس بھی مہاراجہ ایسری سنگھ کچھواہہ کی سرکردگی مین شامل تھے - یہ لشکر شاہی تیزی سے کوچ کر کے اِسی خون آشام علاقے کے شمالی مغربی سرے پر سرہند مین

پہنچا۔ جس کا نام بھی اِس امر پر دلالت کرتا ہے کہ وہان سے اصلی ہندوستان کی سرحد شروع ہوتی ہے یہان شاہی لشکر کا بھاری اسباب اور بھیر و بنگاہ وغیرہ چھوڑ دیا گیا۔ اور فوج کو شاہ ابدالی کی پیشقدمی رُوکنے کے لیئے آگے بڑھا کر دریائے ستلج کے مشہور گھاٹ ماچھی واڑہ پر تعینات کیا گیا۔ مگر شاہ مذکور نے مُغلون کے لشکر کی آمد سے خبردار ہوکر اِس طرف کا رُخ نہین کیا اور لُدھیانے کے گھاٹ سے دریائے ستلج کو عبور کرکے وہ بالا بالا سرہند پر پہنچ گیا۔ اور حسب معمول شہر کو لُوٹ لیا۔ اگر شاہ ابدالی کی کوئی اور قلیل جمعیت بھی دریائے ستلج کے اُس طرف ہوتی۔ تو مُغلیہ لشکر دونون طرف سے دشمنون مین گِھر جاتا۔ اور شاہ ابدالی کو دہلی کی شہنشاہی قوّت پر ایک شدید ضرب لگانے کا موقعہ مِل جاتا۔ مگر شاہ کی ساری فوج اُسکے ساتھ دریا کے پار آگئی تھی۔ اِس لیے شاہزادہ احمد شاہ نے ماچھی واڑے سے بآسانی اپنے لشکر کا رُخ سرہند کی طرف پھیرا۔ اور موضع مانپور مین۔ جو سرہند سے چند کوس کے فاصلے پر ہے۔ اپنا پڑاؤ ڈالا۔ احمد شاہ ابدالی نے جو سرہند کے باہر باغ شالامار مین مقیم تھا۔ وہان سے نکل کر ایک مضبوط جگہ مین قیام کیا۔ اور سولہ روز تک توپون اور تاخت کرنے والے رسالون کی باہمی جنگ ہوتی رہی۔ احمد شاہ ابدالی چونکہ بیگانے مُلک مین تھا۔ لہذا لڑائی کے طوالت پذیر ہونے کے ساتھ اُسکا سامانِ رسد اور گولہ بارود گھٹتا جاتا تھا اور مُغلیہ لشکر کو دونون طرف سے مدد ملنے کی اُمید تھی۔ اِس لیے سترھوین روز احمد شاہ اپنے مُورچون سے نکلا اور اِس نے لشکر مغلیہ پر حملہ کیا۔ ابتدائی حملے ہی مین اعتماد الدولہ میر قمر الدین وزیر جو در اصل اِس لشکر کی رُوحِ رواں تھے۔ ابدالیون کی توپ کے ایک گولے سے ایسے وقت پر مارے گئے کہ ولیعہد شاہزادہ احمد شاہ اپنے خیمے سے نکل کر میدانِ جنگ مین بھی پہنچنے نہین پایا تھا

تورانیون کی ایک جنگی رسم

میر قمر الدین کی ہلاکت سے شاہی فوج مین بددلی پھیلنے لگی۔ اور دوسری طرف شاہ ابدالی کی سپاہ کے کچھ آدمی مُغلیہ لشکر کے بھیر و بنگاہ مین گھس کر اُسکو لوٹنے لگے۔ اور متعدد ارابے سامان و اجناس سے بھرے ہوئے اپنی طرف کھینچ لے گئے۔ اِس واقعے سے مہاراجہ ایسری سنگھ کچھواہہ پر افغانون کی دہشت طاری ہوئی اور وہ اپنے دستۂ فوج کو شاہزادہ ولیعہد کے لشکر سے نکال کر اپنے مستقر "جے نگر" کی طرف چلا گیا۔ یہ تمام اُمور مغلیہ فوج کی شکست پر دلالت کرتے تھے اور ابدالی کے افغان سپاہی کمال بہادری سے لڑ رہے تھے کہ معین الدین عرف میر منو پسر اعتماد الدولہ میر قمر الدین وزیر نے اپنے مقتول باپ کے اُن جذبات وفاداری سے جو مغلیہ فوج اور خصوصاً تورانی دستون کے دلون مین وزیر مرحوم کی طرف سے موجود تھے ایک آخری اپیل کی۔ اور ترکون کے دستور کے موافق وزیر مرحوم کی نعش کو آگے رکھکر افغانون کے قلب سپاہ پر

ایک نہایت زبردست حملہ کیا- مرزا رفیع سودا اپنے ایک شعر مین ترکون کے اسی جنگی دستور کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہین کہ ؎

لے دل یہ کس سے بگڑی کہ آتی ہے فوجِ اشک لختِ جگر کی نعش کو آگے دھرے ہوئے

یہ طریقہ کامیاب ہوا- اور مُغلون اور تورانیون نے اپنے مربّی وزیر کی لاش کو بے حرمتی سے بچانے کے لیے اس زور و قوت کے ساتھ حملہ کیا کہ افغانون کو اپنی مسلّم جفاکشی و تہوّر کے باوجود تابِ مقاومت باقی نہ رہی- مُغلون کی یہ آخری فتح تھی جو اسی مشہور خون آشام علاقے کے ایک حصے مین اُس مقام (پانی پت) سے تھوڑے ہی فاصلے پر اُن کو حاصل ہوئی- جہان بابر نے تقریباً دو صدی قبل ابراہیم لودی پر فتحِ عظیم حاصل کر کے ہندوستان مین سلطنتِ مغلیہ کا جھنڈا گاڑا تھا- شاہ ابدالی کی فوج مین ایک یہ حادثہ بھی رُونما ہوا- کہ اُسی وقت کچھ ابر آکر مینہ برسنے لگا- سپاہی سامان نا صکر تولہ بارود کو بارش سے بچانے کے لیے دوڑے- اس گھبراہٹ مین کسی افغان سپاہی کی بندوق اتفاقیہ چل گئی یا کوئی اور سبب ہُوا کہ بانون کے ایک ارابے مین آگ لگ گئی اور ہزارون بانون کے ایک دم چھُٹنے سے شاہ ابدالی کی فوج کے سینکڑون آدمی ہلاک ہوگئے اور ان سے زیادہ مجروح ہُوئے- اس سے افغانی فوج مین ابتری پھیلی- اور شاہ ابدالی نے آفتاب غروب ہو جانے کو غنیمت سمجھا- اور طبلِ بازگشت بجوا کر اپنی فوج کو مُورچے سے باغ شالامار کی طرف واپس لے گیا- اور وہان اپنے سرداردن سے مشورہ کرنے کے بعد شب کی تاریکی ہی مین دریائے ستلج عبور کر کے واپس روانہ ہوگیا- لڑائی کا کوئی عملی نتیجہ شام تک نہین نکلا تھا- مگر احمد شاہ ابدالی کے اپنے مُورچے چھوڑنے پر مغلیہ فوج نے اس مقام پر قبضہ کر لیا اور شادیانے فتح کے بجنے لگے-

مردون کی جانفشانی | دہلی مین یہ روایت مُسن لوگون سے سُنی گئی ہے اور بعض خاندانی یادداشتون سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ مغلون کو یہ آخری شاندار فتح "احدیون" کی بدولت نصیب ہوئی- جنگی کھیتلی نقش اُنکو آسانی سے مرنے کا موقعہ نہین دیتی تھین- اِس لیے وہ افغانون کی آتش باری کے سامنے دلیرانہ بڑھتے ہوئے چلے گئے- اور اگرچہ اُن کی بڑی تعداد اسی میدان مین کھیت رہی- مگر اس معرکے مین حکومتِ مغلیہ کو فتح دلا کر قریباً ڈیڑھ صدی کے حق نمک سے ادا ہوگئے- اور قمرالدین وزیر نے میدانِ جنگ مین مقتول ہونے کے بعد بھی یہ کارِ نمایان کیا- کہ اُسکی لاش نے مغلیہ سپاہ کی ازسرِ نو ہمت بندھائی اور بڑی زبردست ہلّہ کا جوش اِن مین پیدا کر کے ہاری ہوئی لڑائی کو جیت لیا- کاشکے اسکے فرزند میر منو مین باپ کا سا حوصلہ ہوتا- یا لشکرِ شاہی مین دیگر سردار ایسی قابلیت کے موجود ہوتے- تو شاہ ابدالی کا تعاقب

کیا جاتا اور شاید اُسکی قوت کو ہمیشہ کے لیے توڑا جا سکتا مگر مصلحت ایزدی احمد شاہ ابدالی کی اعلے جنگی قابلیت سے پانی پت کے میدان مین وہان کے سب سے بڑے اور خونریز ترین معرکے مین کام لینا چاہتی تھی اور اسکے ہاتھ سے بظاہر مرہٹون کی قوت اور بباطن مُغلون کے شاہی اقتدار پر بھی ایک مُہلک ضرب لگانا چاہتی تھی - اِس لیے سرہند کی لڑائی فتح ہونے کے بعد شاہ ابدالی کے تعاقب مین سرگرمی ظاہر نہین کی گئی - اور اِس اثناء مین دہلی سے محمد شاہ کے وفات پانے کی خبر پہنچی - جس نے شاہزادہ ولیعہد احمد شاہ کو بیرونی دشمن کا تعاقب چھوڑ کر اپنی میراث پر قبضہ کرنے کے لیے بیچین کر دیا - اور وہ میر منّو کو صوبہ داری لاہور و ملتان کا خلعت و فرمان دیکر جو پیشگاہِ محمد شاہ سے بعد فتح سرہند اُس کے نام صادر ہو چکا تھا دارالسلطنت دہلی کو روانہ ہو گیا -

پنجاب پر افغانون کی دستبرد

میر منّو جو اَب شاہی خطاب نواب معین المُلک سے سربلند کیا گیا تھا - اس وقت کے دیگر امرائے مغلیہ کی طرح اپنے باپ دادا کے اوصاف ملک داری و سپہ سالاری سے محروم تھا - اگر وہ طاقتور و مستعد ہوتا - تو اٹک اور دوسرے دریاؤن پر گھاٹون کی نگہبانی و حفاظت کا کافی انتظام کرتا - اور پنجاب مین امن و امان قائم رکھتا - تو شاہ ابدالی کو سرہند کا سبق اِس قدر جلد فراموش نہ ہو جاتا - مگر میر منّو کی کمزوری نے احمد شاہ ابدالی کو دوسرے ہی سال پنجاب پر حملہ آور ہونے کی ہمت دلائی - اور نادر شاہ کے مشرقی علاقون کے حکمران کی حیثیت مین اِس نے چار محال سیالکوٹ گجرات - اورنگ آباد و پسرور کا خراج میر منّو سے طلب کیا - میر منّو نے زبان شمشیر سے جواب دینے کے بجائے اِس مطالبہ کو بڑی حد تک تسلیم کر لیا اور کچھ روپیہ نذر کر کے شاہ ابدالی کو ٹال دینا مناسب سمجھا - اِس طرح پنجاب کی سیاست مین یہ اختلال پیدا ہو گیا - کہ اُسکا مقامی حاکم ایک طرف مغلیہ دربارِ دہلی کی طرف سے باضابطہ صوبہ دار تھا اور دوسری جانب شاہ ابدالی کو بھی چار محالون کا خراج دینے کا ذمہ دار تھا

سکھون کی قوت بڑھنے لگی

اِس اثناء مین سکھون نے پھر سر اُٹھایا اور دوآبہ بست جالندھر اور دوآبہ باری مین شرارت و فساد پھیلانا شروع کیا - آدینہ بیگ خان جو ذکریا بیگ خان متوفی صوبہ دار لاہور کا عزیز اور اِن دونون علاقون کی فوجداری پر مامور تھا - اور میر منّو نے پنجاب کی گورنری کا چارج لینے کے بعد اُسکو اِس منصب پر بحال رکھا تھا - سکھون کے ساتھ مسامحت برتتا تھا - اور صرف آبادی مستقر سے اُن کو خارج کر دینا کافی سمجھتا تھا - سکھون کی اِن شرارتون نے دیہات کی آبادی کو سخت پریشان کیا - اور وہ دربار مغلیہ کے کمزور حکّام کی طرف سے مایوس ہو کر شاہ ابدالی سے مضبوط حکومت کی توقعات وابستہ کرنے لگے - اِس لیئے شاہ ابدالی کو تین سال بعد پھر لاہور پر حملہ کرنے کی ترغیب ہوئی

اور اگرچہ میر منو کی طرف سے مہاراجہ کوڑا مل نے کمال شجاعت کے ساتھ افغانون کا مقابلہ کیا۔ مگر آدینہ بیگ خان کی شرارت باطنی کے باعث راجہ موصوف کو بروقت کمک نہ پہنچی۔ اور وہ میدان کا رزار مین بندوق کی ایک گولی کھاکر اپنے غافل وعیش پرست آقایان دہلی پر اپنی جان نثار کر گیا۔ راجہ کوڑا مل کے مقتول ہونے پر نہ صرف اُسکی ہراول فوج ہمت ہار گئی بلکہ میر منو اور آدینہ بیگ خان کو بھی میدان جنگ مین ٹھہرنے کا حوصلہ باقی نہ رہا اور اُنھون نے قلعے مین پناہ لے کر شہر لاہور کو شاہ ابدالی کے سنگدل و حریص افغان سپاہیون کے رحم پر چھوڑ دیا۔ جنھون نے شہریون کے خون اور روپے سے خوب اپنے ہاتھ رنگے۔ اور میر منو بھی بعد مین قلعے سے تنہا شاہ ابدالی کی خدمت مین حاضر ہوگیا اور اظہار عجز و نیاز کے ساتھ کچھ نقد وجنس پیش کر کے شاہ افغانستان کی طرف سے صوبہ داری لاہور وملتان کی سند باضابطہ اپنے نام حاصل کر لی۔

تھانیسر پر سکھون کی یورش	شاہ ابدالی اسکے بعد کابل واپس چلا گیا۔ مگر آدینہ بیگ خان چونکہ حسب طلب میر منو شاہ ابدالی کے حملے کی روک تھام کے لئے مع اپنی سپاہ کے لاہور گیا تھا۔ اس لیے

سکھون نے اسکی عدم موجودگی سے فائدہ اُٹھایا۔ اور تھانیسر پر تاخت کر کے اس خون آشام علاقے کے ایک حصے کو پھر انسانی خون کی غذا پہنچائی۔ اور باشندگان قصبہ کے گھرون کو لوٹنے پر اکتفا نہ کر کے اُن کو مسمار بھی کر دیا۔ اور کورکھشیتر مین وہ تالاب تیار کرایا۔ یا پرانے چھوٹے تالاب کو بڑھایا۔ جس پر اس وقت بھی سورج گرہن کا میلہ لگتا ہے۔ دربار دہلی اپنے اندرونی جھگڑون مین مبتلا ہونے کے باعث سکھون کی ان شرارتون کا جو دار السلطنت سے اس قدر قریب ہو رہی تھین۔ کوئی سدباب نہ کر سکا۔ البتہ آدینہ بیگ خان نے شاہ ابدالی کے رخصت ہونے کے بعد اپنے مستقر مین واپس آکر سکھون کو قرار واقعی سرزنش کی اور مغلیہ تھانے دوبارہ وہان بٹھائے۔

ایک خاتون کا پنجاب مین انتظام	اس اثناء مین میر منو نے لاہور کے گرد و نواح مین مشہور روایت کے بموجب شکار مین گھوڑے سے گر کر اور ایک غیر مستند روایت کے موافق مرض ہیضہ مین مُبتلا

ہو کر انتقال کیا اور لاہور وملتان کی صوبہ داری پھر خالی ہوئی۔ میر منو کی بیوی نے کابل و دہلی دونون طرف سلسلہ جنبانی کی اور دونون جگہ سے فرمان صوبہ داری اپنے خورد سال فرزند میر مومن کے نام حاصل کر کے خود فرائض حکومت بڑی ہوشیاری سے ادا کرنے شروع کیئے۔ مگر میر منو کا خورد سال لڑکا تھوڑے دنون کے بعد فوت ہوگیا اور اگرچہ بیوۂ میر منو نے اپنے داماد خواجہ موسٰے احراری کے نام سند صوبہ داری شاہ ابدالی سے حاصل کر لی۔ مگر خود صوبۂ مذکور کے عمال کو ایک عورت کی ماتحتی قدرتی طور پر

ناگوار گذری اور اُنھون نے دربارِ دہلی مین ریشہ دوانیان کرنے کے ساتھ لاہور مین بھی ہاتھ پاؤن مارنے شروع کیے - ان مین نواب روشن الدولہ کا فرزند میر بھکاری خان المخاطب بہ رستم جنگ بھی شامل تھا - جو مدار المہامی کے مقتدر عہدے پر مامور تھا - بیوۂ میر منو نے رستم جنگ کی نیتی سے آگاہ ہو کر اُسکو ایک حیلے سے محل مین بُلایا اور اپنی کنیزون کے ہاتھون سے پٹوا کر اسکی شرارتون کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا مگر ایک عورت کے لیے خواہ وہ کیسی ہی طاقتور و ہوشیار ہو - محل مین رہکر مردون کی اُن شرارتون کا زیادہ عرصے تک مقابلہ کرنا دشوار تھا - چنانچہ خواجہ عبد اللہ خان پسر نواب عبد الصمد خان نے بیگم کو محل مین نظر بند کر دیا اور نیابتِ صوبہ کی سند شاہ ابدالی سے اپنے نام منگا لی - لیکن کچھ عرصے کے بعد خواجہ عبد اللہ خان کو اپنی فوج کے ہنگامۂ طلبی تنخواہ سے بھاگنا پڑا - اور بیوۂ میر منو کا اقتدار پھر بحال ہو گیا مگر اب نواب عماد الملک غازی الدین خان ثانی وزیر اعظم مغل شہنشاہ دہلی کی شرارت و خود غرضی نے صورتِ حال مین ایک تغیر عظیم پیدا کیا - یہ امیر فی الحقیقتہ مغل سلطنت کے لیے نحوست مجسم تھا - جس نے دو بادشاہون احمد شاہ و عالمگیر ثانی کو قتل کرایا - اور پانی پت کی عظیم خونخوار جنگ بھی دراصل اسی کی وجہ سے وقوع مین آئی - جیسا کہ آگے چل کر ظاہر ہو گا -

مغل شہنشاہی کی نحوستِ عظیم

عماد الملک نواب نظام الملک آصف جاہ اوّل کا پوتا - امیر الامراء نواب فیروز جنگ غازی الدین اوّل کا بیٹا اور نواب وزیر الممالک اعتماد الدولہ قمر الدین خان کا نواسا تھا - جنکی لاش کو آگے رکھکر سرہند مین مغلیہ فوج نے شاہ ابدالی کی سپاہ پر زبردست حملہ کیا تھا - اور افغانون کا مُنھ پھیر دیا تھا - اُسکا نام و رابپ جب نظام الملک اوّل کی خبر وفات سُنکر اپنی موروثی مسند پر قبضہ کرنے کے لیے دکن روانہ ہوا - تو اپنے فرزند کو جس کا اصلی نام میر شہاب الدین تھا - بادشاہ کے دامنِ شفقت اور نواب صفدر جنگ کی سرپرستی مین چھوڑ گیا - اسکے بعد جب نواب فیروز جنگ نے دکن مین پہنچتے ہی وفات پائی اور اُنکی لاش بغرضِ تدفین دہلی لائی جا کر اُس مقبرے مین سپرد زمین کی گئی - جو امیر الامرا نے اپنی زندگی مین بنوایا تھا اور اُس مین ایک مدرسہ بھی جاری کر دیا تھا - چنانچہ آج تک وہ عمارت "مدرسہ غازی الدین" کے نام سے مشہور ہے اور دار السلطنت دہلی کا واحد اسلامی (اینگلو عربک) کالج اسمین جاری ہے - تو بادشاہ اور صفدر جنگ دونون کو میر شہاب الدین کی یتیمی پر رحم آیا - اور اُنھون نے اُسکے مرحوم باپ کا منصب و خطاب امیر الامراء غازی الدین فیروز جنگ اُسکو عطا کر دیا - مگر حصولِ اقتدار کے بعد غازی الدین نے صفدر جنگ کے استیصال کی کوشش کی - اور اسی کی در اندازیون سے چھ مہینے تک بادشاہ اور وزیر صفدر جنگ کی باقاعدہ لڑائی شہر دہلی کے باہر

ہوتی رہی - عماد الملک نے روہیلہ سردار نجیب الدولہ کو اس موقع پر نادرشاہ کی خدمت ادا کرنے کے لیے بُلایا - جو سہارنپور سے امروہہ تک کے علاقے پر متصرف تھا - نجیب الدولہ نے آکر بادشاہ کی کافی خدمت گزاری کی اطاعت کی -

مرہٹون کو دارالسلطنت مین بلایا گیا

نجیب الدولہ کے علاوہ عماد الملک نے ملہار راؤ ہولکر کو مالوے سے اور جیاپا سیندھیا کو ناگور سے جہان وہ ابھے سنگھ والی جودھپور مارواڑ کو محصور کیے پڑا تھا طلب کیا - مگر ان کے پہنچنے سے قبل صفدر جنگ نے بادشاہ سے صلح کر لی - اور اپنے علاقہ اودھ کو روانہ ہو گیا - چونکہ سورجمل جاٹ والی بھرت پور نے صفدر جنگ کو امداد دی تھی - اس لیے ہولکر و جیاپا کے پہنچنے پر عماد الملک پہلے تو انکو سورج مل کے علاقے پر چڑھا لے گیا - اور جب اُسکا ایک مضبوط قلعہ مسخر نہ ہو سکا اور دربار احمد شاہ سے قلعہ گیر توپون کی مدد عماد الملک و ہولکر کی درخواست پر نہین ملی - بلکہ سورج مل کے عجز والحاح پر رحم کھا کر احمد شاہ نے عاقبت محمود خان کو شاہی توپین بھجوانے سے باز رکھنے کے لیے خود دار السلطنت سے سکندرہ تک قدم بڑھایا - تو ہولکر نے یکایک متھرا کے گھاٹ سے جمنا عبور کر کے شاہی کیمپ پر چھاپہ مارا - اور بہت سا اسباب لُوٹ لیا - احمد شاہ مع سربرآوردہ ارکان سلطنت کے بمشکل جان بچا کر بھاگے مگر ملکہ زمانیہ دختر شاہ فرخ سیر مرحوم اور دیگر خواتین تیموریہ ہولکر کی قید مین پھنس گئین - جس نے اگرچہ اُن کی عزت و حرمت قائم رکھنے اور خدمت بجالانے مین کوئی دقیقہ کوشش کا فروگزاشت نہین کیا - لیکن محترم شاہی خواتین کا اس طرح اسیر ہونا بھی مسلمانون اور ہندوؤن کو یکسان ناگوار گذرا - اور خواہ یہ فعل ہولکر نے عماد الملک کی بلا اطلاع کیا ہو - مگر اسکی بدنامی اُسپر عائد ہوئی - اسکے بعد عماد الملک نے ہولکر کی فوج کے ساتھ دہلی پہنچکر احمد شاہ پر دباؤ ڈالا - اور اپنے خالو انتظام الدولہ کو وزارت عظمےٰ کے منصب سے خارج کرا کے خود اس عہدے کو حاصل کیا - اور اُسی روز احمد شاہ کو قید کر کے عزیز الدین پسر جہاندار شاہ کو بہ لقب عالمگیر ثانی تخت شاہی پر بٹھا دیا - اور احمد شاہ اور ان کی والدہ قدسیہ بیگم کی - جنکا باغ دہلی مین کشمیری دروازے کے باہر فصیل شہر سے متصل اس وقت بھی حکام انگریزی کا تفرج گاہ اور طلباء کالج کے مردانہ کھیلون کا مقام ہے - آنکھون مین نیل کی سلائیان پھروا دین -

عماد الملک کی پنجاب پر چڑھائی

اِسکے بعد عالمگیر ثانی کو دہلی مین چھوڑ کر اور اُسکے ولیعہد شاہزادۂ عالی گوہر کو جو بعد مین بلقب شاہ عالم بادشاہ ہوئے - اپنے ساتھ لے کر عماد الملک بجناحِ استعجال لاہور کی طرف چلا اور آدینہ بیگ خان فوجدار لاہور سے چونکہ عماد الملک کی سازش ہو چکی تھی - اور اسنے میر منو کی بیوہ کو عماد الملک کے اصل ارادون سے بے خبر رکھا تھا - اس لیے لودھیانے سے عماد الملک نے ایک فوج سید جمیل الدین و عباد اللہ خان کشمیری کے ماتحت لاہور روانہ کی - جو رات ہی مین چالیس میل کا درمیانی فاصلہ

طے کرکے صبح کو لاہور مین پہنچ گئی۔ اور بیوہ میر منو کے پہرہ دارون کو قید کرنے مین کامیاب ہوگئی۔

عماد الملک کا اپنی ساس کو فریب دینا

عماد الملک کی نسبت چونکہ میر منو کی ایک بیٹی سے قرار پاچکی تھی۔ اس لیے اُسنے بیوۂ میر منو کو اس بھلاوے مین رکھا کہ وہ اپنی دُلھن کو رخصت کرانے آرہا ہے۔ بیگم نے وزیر اعظم سلطنت سے اپنی بیٹی کی شادی کو اپنے لیے قابل فخر سمجھا اور عماد الملک کا بطور داماد کے بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا۔ مگر عماد الملک نے دامادی کے یہ جوہر دکھائے کہ اپنی بیوہ ساس کو قید کرلیا اور وہان سے جو کچھ نقد و جنس ہاتھ لگ سکا وہ لے کر آدینہ بیگ خان کو تیس لاکھ سالانہ خراج کے وعدے پر لاہور کا صوبہ دار مقرر کرکے معہ بیوہ و دختر میر منو دہلی واپس روانہ ہوگیا۔ عماد الملک کی یہ حرکت جب شاہ ابدالی کے گوش زد ہوئی۔ تو اُس نے اِسکو صوبۂ لاہور کو افغانی سلطنت سے نکال لینے سے تعبیر کیا۔ اور قندھار سے بڑی تیزی کے ساتھ خود کو لاہور پہنچایا۔ آدینہ بیگ خان شاہ ابدالی کے حملے کی خبر سُنتے ہی بھاگا اور ہانسی حصار مین عماد الملک سے آکر ملا۔ مگر عماد الملک مین بھی افغان بادشاہ کے مقابلے کی قوت نہین تھی۔ اِس لیے اُس نے اپنی ساس سے اپنی سفارش کرائے اور خود خوشامد و عاجزی کرکے شاہ ابدالی کے غصے کو فرو کیا۔ اور سورج مل جاٹ۔ نواب احمد خان بنگش والی فرخ آباد اور شجاع الدولہ نواب اودھ پر دباؤ ڈال کر تینون سے دس بارہ لاکھ روپیہ علاوہ دیگر سامان کے شاہ ابدالی کو دلایا۔ اور شاہ افغانستان آگرہ کے نواح مین وبا پھیل جانے کے باعث ہندوستان سے اپنے ملک کو واپس روانہ ہوگیا۔ اور بوقتِ روانگی تالاب مقصود آباد پر شہنشاہ عالمگیر ثانی سے ملاقات کرکے امیر الامرائی کا منصب نجیب الدولہ کو دلا گیا۔ کیونکہ عماد الملک کی عالمگیر ثانی نے شکایات کی تھین اور شاہ ابدالی کو بھی اس سے کچھ زیادہ روپیہ نہین مل سکا تھا۔

پنجاب کا افغانستان سے الحاق

شاہ ابدالی نے لاہور و ملتان دونون صوبون کی حکومت پر اپنے بیٹے تیمور شاہ کو چھوڑا جسکی شادی اِسنے دختر محمد شاہ مرحوم شہنشاہ دہلی سے کرکے دونون بادشاہون مین قرابت باہمی کی صورت نکالی تھی۔ اور آدینہ بیگ خان کو تیمور شاہ کا نائب مقرر کیا۔ مگر عملی طور پر کامل اختیار اُس کو حاصل رہا۔ شاہ موصوف کی واپسی کے بعد عماد الملک نے اپنی شرارت کا جال دو طرف پھیلایا جسکا نتیجہ بالآخر پانی پت کی جنگ سوم کی صورت مین نکلا۔

عماد الملک کے ہاتھون خاندان ذات شہنشاہی کی اہانت

عماد الملک نے جو اس وقت شاہزادگان تیموری کے ساتھ فرخ آباد مین نواب احمد خان بنگش کے پاس مقیم تھا جب نجیب الدولہ کے منصب "امیر الامرائی" پر فائز ہونے کی خبر پائی۔ تو چونکہ وہ اُسکو اپنا موروثی و ذاتی منصب خیال کرتا تھا اور نجیب الدولہ کو اُسنے صفدر جنگ سے لڑائی

ہونے کے وقت احمد شاہ مرحوم کی خدمت ادا کرنے کے لیے دہلی مین بلایا - اور شہنشاہی دربار مین عہدہ دلایا تھا - اس لیے وہ نجیب الدولہ سے بیحد ناراض ہوا - اور شہنشاہ عالمگیر ثانی کی بھی جنکو خود اُس نے تخت پر بٹھایا تھا مخالفت پر کمربستہ ہوگیا - اب تک ذات شہنشاہی کی عقیدت سب لوگون کے دلون مین جاگزین تھی اور جہاندار شاہ و فرخ سیر کے ساتھ ساداتِ بارہہ نے جو زیادتی کی تھی - اُسکو طبقۂ امراء و عوام دونون مین سخت نفرت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا بلکہ یہی امیر سیدون کے زوالِ اقتدار کا باعث ہوا تھا - مگر عماد الملک نے شاہی خواتین کے ملہار راؤ ہلکر کے ہاتھون گرفتار ہونے کا سامان پیدا کرکے اور بعد ازان احمد شاہ کو گرفتار و قتل کرا کے رعب و داب شہنشاہی کو سخت صدمہ پہنچایا اور اب وہ اپنے دست گرفتہ نجیب الدولہ کو اپنا رقیب تصور کرکے اسکے استیصال کی فکر مین ہوا - اور شہنشاہ عالمگیر سے زبردستی اسکی منظوری حاصل کرنے کے لیے اس نے شہنشاہ و نجیب الدولہ کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کی فکر کی -

مغل شہنشاہی کی عقیدت مرہٹون کے دلون مین

عماد الملک نے نجیب الدولہ کی عداوت مین یہ طریقہ اختیار کیا کہ بالاجی باجی راؤ پیشوا کے بھائی رگھناتھ راؤ عرف دادا رگھوبا کو اپنی امداد کے لیے بلایا - رگھوبا اُس وقت مالوہ مین اُس استحقاق کی بناء پر لوٹ مار کر رہا تھا جو باجی راؤ پیشوا کو صوبہ داری مالوہ کا فرمان پیشگاہ شہنشاہ محمد شاہ جنت آرامگاہ سے سنہ ۱۷۳۶ء مین عطا ہونے کی بناء پر پیدا ہوا تھا - مرہٹے اگرچہ لوٹ مار کے شائق تھے مگر ذاتِ شہنشاہی کا اُنکے دلون مین خاص ادب و احترام تھا - اور وہ تختِ مغلیہ کی آڑ مین اپنا اقتدار قائم کرنا - اور ہندؤن کی مذہبی مراسم کی اس آزادی کو بحال کرنا چاہتے تھے جو اکبر اعظم اور اُسکے جانشینون نے اُن کو عطا کی تھی - مگر مغلیہ شہنشاہی اقتدار کے زوال پذیر ہونے پر بعض علاقون مین خودسر مقامی حکام نے اسپر بندشین عائد کردی تھین - صرف سداشیو راؤ بھاؤ نے اپنے سربرآوردہ مرہٹہ رفقاء و راجپوت رؤساء کی مرضی کے خلاف اپنے فرقہ کی مقررہ پالیسی سے انحراف کرنا چاہا تھا - جسکا تھوڑے عرصے بعد ہی پانی پت کے میدان مین اُسکو سخت خمیازہ بھگتنا پڑا - اور اسکے بعد پھر مرہٹہ پیشوا اور اُسکے سردارون نے اسی قدیم پالیسی کو قائم رکھا حتے کہ ایک بیرونی قوت نے مرکز سلطنتِ مغلیہ مین اپنا اقتدار جمایا اور کمالِ حکمتِ عملی سے ہندوستان کی اندرونی قوتون کو باہم لڑا کر سب کو بتدریج کچل دیا -

مرہٹون کا ہندو مسلمانون سے یکسان برتاؤ

سنہ ۱۷۳۶ء مین باجی راؤ پیشوا نے خود دار السلطنت دہلی کے گردونواح مین لوٹ مار کی تھی مگر اُسکا مقصد حصولِ زر کے سوا کچھ نہین تھا اور کالکا کے میلے مین ہندؤن کو بھی مسلمانون کی طرح لوٹا گیا تھا - اسکے بعد مرہٹون نے خود دار السلطنت کا اُس وقت تک رخ نہین کیا جب تک

عماد الملک جیسے موروثی دشمن شاہی عہدہ دار نے اپنی ذاتی اغراض کے لیے ملہار راؤ ہلکر اور جیا پا سیندھیا کو نہین بلایا اور شاہ ابدالی کی واپسی کے بعد نجیب الدولہ کی ضرر رسانی کے لیے دوبارہ ہلکر اور رگھوناتھ کو طلب نہین کیا۔ عماد الملک نے اپنی ذاتی سپاہ ان دونون سرداران مرہٹہ کی فوج کے ساتھ شامل کرکے دہلی کو محصور کر لیا۔

نجیب الدولہ اور ملہار راؤ ہلکر کی دوستی کا ہنگام

نجیب الدولہ نے تا بمقدور دار السلطنت و ناموس تیموری و ذات شہنشاہی کی حفاظت مین کوشش کی۔ اور ڈیڑھ مہینے تک توپون کی لڑائی محاصرین و محصورین کے درمیان جاری رہی۔ مگر جب مرہٹون نے عماد الملک کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے رسد کی آمد ہر طرف سے روک دی اور نجیب الدولہ کو باہر سے کوئی کمک نہ پہنچ سکی۔ تو مجبوراً اس نے ملہار راؤ ہلکر سے خفیہ طور پر مصالحت کی سلسلہ جنبانی کرکے ایک رقم اخراجات مہم کے نام سے اُسکو دی اور ناموس تیموریہ و ذات شہنشاہی کو مرہٹون کے ہاتھون کوئی گزند نہ پہونچنے کا حتمی وعدہ لے کر نجیب الدولہ اپنے علاقہ سہارنپور کو چلا گیا۔

ملہار راؤ ہلکر سے نجیب الدولہ کی جو دوستی اس وقت سے شروع ہوئی وہ ان دونون سردارون کی زندگی بھر قائم رہی اور ایک مرتبہ نجیب الدولہ اور دوسری مرتبہ ملہار راؤ ہلکر کی جانین محفوظ رکھنے کی باعث ہوئی

عماد الملک کا مرہٹون کو نجیب الدولہ کے علاقے پر بھیجنا

عماد الملک کا اگر بس چلتا۔ تو وہ نجیب الدولہ کو۔ جو منصب میر الامرائی پانے کی وجہ سے اسکا رقیب ہوگیا تھا۔ تباہ و برباد کر ڈالتا۔ مگر ہلکر سے اُسکی کچھ پیش نہ گئی۔ لہذا نجیب الدولہ اس وقت تو بچ کر مع اپنے سامان و رفقاء کے اپنے علاقے پر چلا گیا۔ مگر عماد الملک نے اسکی روانگی کے بعد دہلی مین کاروبار سلطنت پر متصرف ہونے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ نجیب الدولہ کو امیر الامرائی سے معزول کرکے یہ شہنشاہی منصب نواب احمد خان بنگش کو دلایا۔ اور کچھ عرصے بعد رگھوبا برادر پیشوا سے دباؤ ڈلوا کر دتاجی سیندھیا و ہلکر کو علاقہ نجیب الدولہ پر چڑھائی کے لیے بھیجدیا۔ اور نجیب الدولہ نے سکرتال مین جو مظفرنگر کے قریب واقع ہے۔ محصور ہو کر سات مہینے تک بڑی مشکل سے اپنی جان بچائی۔ اور اس اثناء مین مرہٹے برابر اُسکے علاقہ چاندپور و قصبات بارہہ وغیرہ کو تاراج کرتے رہے۔ نجیب الدولہ نے بہت عاجزی کی درخواستین بھیج کر شجاع الدولہ سے امداد طلب کی۔ اور اپنے بھائیون سرداران روہیلہ کو بھی بلایا۔ جو برسات کے زمانے مین بڑی دقت سے طویل منزلین طے کرکے امروہہ مین پہنچے۔ اور شجاع الدولہ بھی ایک طاقتور فوج کے ساتھ لکھنؤ سے روہیلکھنڈ کی طرف بڑھے اور شاہ آباد ضلع ہردوئی مین ٹھہر کر دریاے گنگا کی طغیانی گھٹنے کا انتظار کرنے لگے۔ جو اُس وقت بوجہ برسات کے زور پر تھی۔ مرہٹون کو جب شجاع الدولہ کے نجیب الدولہ کی مدد کے لیے روانہ ہونے کی خبر ملی تو دتاجی سیندھیا نے گوبند راؤ پنڈت کو جو مرہٹون کی طرف سے بوندیلکھنڈ مین حاکم اور "بوندیلے" اور "جھانسی والے"

کے القاب سے ملقب تھا۔ آٹھ دس ہزار سواران کے ساتھ نجیب الدولہ اور روہیلون کے دیہات کو لوٹنے کے لیے بھیجا جس نے مہینے سوا مہینے کے اندر چاندپور، نگینہ واطراف امروہہ کے تیرہ سو کے قریب گانون تباہ کر ڈالے۔ اور ان مواضع کے باشندے جو زیادہ تر ہندو تھے مرہٹون کی دستبرد سے بالکل مفلوک و محتاج ہو گئے نواب شجاع الدولہ کو مرہٹون کی قوت بڑھنے مین اپنے شمال مغربی علاقون کی تاراجی کا اندیشہ پیدا ہوا۔ اِس لیے وہ بحیثاج استعجال کوچ کر کے چاندپور پہنچے اور اپنی فوج مین سے ہندو گوسائیون کے دستون کو انوپ گیر وامراؤ گر کے ماتحت اور تو دس ہزار سوارون کو میر نجف علی خان و میر باقر ہمدانی کے ماتحت مرہٹون کی مدافعت کے لیے روانہ کیا۔ گوسائیون نے گوبند راؤ پنڈت کی فوج کو اپنی پیہم تاختون سے سخت نقصان پہنچایا اور گھبراہٹ کے عالم مین گنگا کو عبور کرنے پر مجبور کر دیا جس مین مرہٹون کے سینکڑون آدمی ضائع اور بہت سامان و اسباب تلف ہوا۔

نجیب الدولہ کی جان چھوٹی

شجاع الدولہ اور سرداران روہیلہ اب نجیب الدولہ کے پاس پہنچ گئے۔ اور دتاجی سیندھیا، محاصرۂ سکرتال کمزور پڑ گیا۔ اور ملہار راؤ ہلکر نے حق دوستی نجیب الدولہ کے ساتھ ادا کیا اور اپنے رسوخ واثر سے دتاجی سیندھیا کو نجیب الدولہ اور روہیلون سے صلح کرنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ دتاجی اپنی فوج کو لے کر دہلی کی طرف ہٹ گیا۔ عماد الملک کی تحریک واغوا سے چونکہ مرہٹون کا دوڑ روہیلون کے علاقے پر پڑا۔ اِس لیے نجیب الدولہ نے شاہ ابدالی سے فریاد کی اور روہیلون نے ایک ایسے شخص کو اپنی طرف سے وکیل بنا کر شاہ ابدالی کے پاس بھیجا۔ جو اسکے وزیر شاہ ولی خان سے قرابت قریبہ رکھتا تھا۔ سرداران روہیلہ کے علاوہ راجپوتانہ کے بعض راجاؤن کی طرف سے بھی جو مرہٹون کی مسلسل تاخت وتاراج سے تنگ آ چکے تھے۔ شاہ ابدالی کو تائید آمیز پیام پہنچے تھے۔ اور شہنشاہ عالمگیر ثانی نے بھی عماد الملک کی حرکات سے تنگ آ کر اُسکی خفیہ شکایتین شاہ موصوف کو لکھی تھین۔

عماد الملک کی ولیعہد کو گرفتار کرنے کی کوشش

اُن مین سے ایک شکایت نامہ عماد الملک کے ہاتھ مین پڑ گیا۔ جس پر وہ شہنشاہ کی جان کا دشمن ہو گیا۔ اور پہلے تو اُس نے شہنشاہ اور اُنکے ولیعہد شاہزادۂ عالی گوہر۔ دونون پر ہاتھ صاف کرنا چاہا۔ مگر جب شاہزادہ ولیعہد شہر دہلی مین واپس آنے کے بعد عماد الملک کی بدنیتی و اندرونی خصومت سے آگاہ ہو کر اپنی مردانہ وار جد وجہد اور اپنے بعض رفقاء کی جان نثاری کی بدولت اُن لوگون کو مار کر شہر کے باہر نکل گئے۔ جن کو عماد الملک نے اُن کی گرفتاری کے لیے بھیجا تھا۔ اور شہر سے باہر وِٹھل راؤ مرہٹہ سردار نے۔ جو اگرچہ عماد الملک کا بلایا ہوا تھا۔ اُسی عقیدت کی بناء پر۔ جو مرہٹون کو تیموری شاہی خاندان کے ساتھ تھی۔ اُن کو عارضی پناہ دی۔ اور بعد ازان بحفاظت نجیب الدولہ کے علاقے مین پہنچا دیا۔ جہان

سردار موصوف نے سات ماہ تک انکی مہمانداری اپنے حوصلے وہمت کے موافق کی اور بعد ازان انکو مشرقی علاقون مین قسمت آزمائی کے لیے جانے کی صلاح دی۔ تو عماد الملک نے بعد ازان دار السلطنت مین اپنی انتہائی شرارت و بد باطنی کا اظہار کیا۔ اور پہلے اپنے خالو انتظام الدولہ کو قتل کرادیا اور پھر شہنشاہ عالمگیر ثانی کو ایک درویش کی زیارت کے بہانے سے شہر کے باہر کوٹلہ فیروز شاہ مین لیجاکر قتل کرا دیا۔ اور شاہزادہ کام بخش پسر شہنشاہ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے ایک بیٹے کو بہ لقب محی السنہ تخت پر بٹھاکر خود بہ حیثیت صدر اعظم و امیر الامرا شہنشاہ کے نام سے احکام جاری کرنے لگا۔

عماد الملک نے مرہٹون کو پنجاب پر چڑھایا

عماد الملک نے مرہٹہ سردارون سے صرف دار السلطنت پر حملہ ہی نہین کرایا تھا بلکہ اس سے بڑھکر ایک شرارت و حماقت اس سے سرزد ہوئی تھی جس نے شاہ ابدالی کے چوتھی دفعہ پنجاب پر حملہ آور ہونے کو یقینی بنا دیا تھا۔ اب تک مرہٹون کی ترکتازی زیادہ تر وسط ہند و راجپوتانہ تک محدود تھی اور صرف ایک مرتبہ باجی راؤ پیشوا نواب برہان الملک کے ہاتھون اپنے مقتدر سردارون کی شکست کا داغ مٹانے اور بالفاظ خود اپنی موجودگی محسوس کرانے کے لیے دہلی کے باہر تک پہنچا تھا۔ اور محمد شاہ سے صوبہ داری مالوہ کی نیابت اور علاقجات دکن کی چوتھ کا فرمان لے کر واپس ہوگیا تھا۔ عماد الملک نے صفدر جنگ کے قضیہ مین جیاپا سیندھیا و ملہار راؤ ہولکر کو دار السلطنت مین بادشاہ کی امداد کے لیے بلایا اور وہ قضیہ انکے آنے سے قبل طے ہوگیا۔ تو انکو سورج مل جاٹ کے علاقے پر چڑھایا جسکے ضمن مین خواتین شہنشاہی کے ہولکر کے ہاتھون مین پڑجانے کا افسوسناک واقعہ رونما ہوا۔ اسکے بعد عماد الملک نے دتا سیندھیا کو شمال کی طرف نجیب الدولہ کے علاقے پر بھیجا۔ اور پیشوا کے بھائی رگھوبا اور ملہار راؤ ہولکر کو پنجاب پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دی۔ جہان تیمور شاہ خلف شاہ ابدالی لاہور و ملتان مین حکمران اور اسکا ایک ہمقوم افغان جہان خان معاملات منصرم اور آدینہ بیگ خان نائب صوبہ دار تھا

سکھون کا لاہور پر عارضی تسلط

شاہ ابدالی کی واپسی کے بعد سکھون نے پھر زور باندھا۔ اور چونکہ جہان خان نے انکے مقدس مقام (امرتسر) کے گوردوارے کو۔ جسکی بنیاد حضرت شاہ میا نمیر قدس اللہ سرہ العزیز نے گورو رامداس کے وقت مین رکھی تھی۔ اور جو اس وقت بہ لقب "دربار صاحب" سکھون کا سب سے بڑا مذہبی مرکز ہے۔ توڑ پھوڑ ڈالا تھا اور اسکے تالاب کو مٹی و کوڑے سے بھروا دیا تھا۔ اس لیے جوش مذہبی مین سکھون کی بڑی جمعیت اکٹھی ہوئی۔ اور انھون نے دار الصدر لاہور کے گرد و نواح کے دیہات کو لوٹنا شروع کیا۔ تیمور شاہ اور جہان خان لاہور سے نکل کر سکھون سے لڑے مگر انکو مغلوب نہ کرسکے اور خود لاہور کے چھوڑنے پر مجبور ہوگئے +

(باقی آیندہ)

لینن

(از پروفیسر سارام کوشک۔ آنرز ایم۔ اے)

ایک سطحی نگاہ رکھنے والے کو۔ بالشوزم کے بانی لینن کی شخصیت مجمع متضادین نظر آتی ہے بعض کے نزدیک وہ ایک معمولی بحری ڈاکو تھا جیساکہ لندن کے ایک ممتاز روزنامہ نے پانچ سال قبل اسکی وفات کے موقع پر اسکے حالاتِ زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے ظاہر کیا تھا حقیقت مین یہ سراسر بعید از انصاف اور یک طرفی رائے ہے لینن تاریخِ عالم مین پہلا شخص تھا جس نے اپنی مقناطیسی شخصیت اور تقریرون سے جن مین برقی رَو مضمر ہوتی تھی "عوام" کو "متمول" کے خلاف جہاد کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ مظلوم مفلوک اور مغلوب اقوام کے لیے وہ ایک ولی۔ پیغمبر اور عامل فلسفی تھا جسکا زاویۂ نگاہ وسیع اور تعصب سے معرّا تھا۔ جسکا مطمح نظر بنی نوعِ آدم کی باہمی مساوات اور خوشحالی پر مبنی تھا۔ اور جسکے فلک پیما تخیل نے ایک ایسی عالمگیر بغاوت کا سنگِ بنیاد رکھا تھا جس نے کثیر التعداد صاحبانِ افسر واورنگ کو "عوام" کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور کردیا اور یہی دَور جدید اسکے مجلسی۔ قومی، سیاسی اور اقتصادی انقلاب کا ذمہ دار ہے۔ آج ہر ملک مین جہان "شاہیت" کے بجائے "جمہوریت" کا دَور دورہ ہے لینن اور اُسکے عقائد کو تعظیم کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

لینن ۱۰۔اپریل ۱۸۷۰ء کو پیدا ہوا۔ اسکا اصلی نام ولیڈی میر الیچ اولیانو تھا۔ اسکا باپ جو ایک زمیندار تھا ترقی کرتے کرتے رُکنِ ریاست کے ممتاز اور برگزیدہ عہدے تک پہونچ گیا۔ اسکی مان میری الگزینڈرونا بھی صوبۂ کازان مین ایک چھوٹی سی جاگیر کی مالک تھی۔ ابتدا مین اسکا باپ ایک ورزش گاہ کا معلّم تھا پھر بتدریج مدارس کے ممتحن کا عہدہ حاصل کیا۔ اور اسی طرح رفتہ رفتہ ایک بڑے رتبے پر سرفراز ہوگیا۔ تین بھائی اور دو بہنون مین لینن کا باپ اسی کو زیادہ وقعت اور پیار کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ سب بہن بھائی درس وتدریس کے شوقین اور فنونِ لطیفہ کے دلدادہ تھے۔ اور اسی لیے اسکا باپ اپنے گھر کو "چھوٹے پیمانے پر ایک دار العلوم" کہا کرتا تھا۔

۲۰۔اپریل ۱۸۸۶ء کو لینن کے بڑے بھائی الگزینڈر کو پھانسی دی گئی کیونکہ وہ ایک خفیہ جماعت کا جس کا مقصد زارِ روس کی شہنشاہیت کو تباہ کرنا تھا، رکن ہونے کی وجہ سے ایک سازش کا بانی

سمجھا گیا تھا - اس غمناک واقعے سے لینن کے دل پر ایک ناقابل بیان صدمہ ہوا اور شاید یہ پہلا بیج تھا جو زار کے ظالمانہ برتاؤ نے لینن کے دل مین "شاہیت" کے خلاف بویا - جب لینن پیٹرسبرگ کے دار العلوم مین قانون اور اقتصادیات کا طالب علم تھا - اُس نے ایک مضمون موجودہ تمدن کے خلاف لکھا جس پر پلاکھنو جیسے عالم نے صاد کیا اور کہا کہ کسی دن یہ نوجوان خطرناک ثابت ہوگا" اور آخر یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی - روسی حکومت نے اسکو ۲۹ - جنوری ۱۸۹۶ء کو ایک خطرناک پادشاہی دشمن سمجھ کر قید کر لیا - اور مشرقی سائبیریا مین جلاوطن کر دیا -

پلاکھنو - مارتوو اکسیلرود - اور زوزولیچ کے مشورے سے لینن نے جو اب اُنھی کی طرح سائبیریا مین جلاوطن تھا - ایک روزنامہ "عسکرۃ" نامی جاری کیا جو ہر جلاوطن کے ہاتھ مین پہونچتا تھا اور آخر اپنے حسنِ تدبیر و ترتیب کی بدولت تمام جلاوطنون کا ہادی بن گیا - اور ۱۹۰۳ء مین اس نے "روسی حریت پسند جماعت" قائم کی - جس کا عام نام بالشوک مشہور ہے - اِسی زمانے مین اس نے ایک کتاب "مطالعۂ اقتصادیات" لکھ کر کافی روپیہ پیدا کر لیا - اور کچھ تو اس روپئے سے اور کچھ مرتبین لینن تحریک کی مالی امداد سے اس نے ایک اور اخبار "فارورڈ" نامی جاری کیا -

۱۹۰۵ء مین پہلی بغاوت ظہور مین آئی - اور لینن روس چلا آیا - "جنگ اعظم" کی ابتدا مین لینن آسٹریا مین تھا - جہان وہ مزدورون کو بغاوت کی تعلیم دیتا رہا - اسکو وہان کی حکومت نے قید بھی کیا - لیکن فرانسیسی ضمانت پر پھر آزاد کر دیا گیا - ۷ - نومبر ۱۹۱۷ء کو بالشوک پارٹی نے اعلان کر دیا کہ روس آزاد ہے - اور اس جمہوری حکومت کا رُکنِ اعظم لینن ہے -

لینن نے اپنے قول و فعل کی مطابقت سے جو مجلسی زندگی مین رُوح پھونکی وہ اظہر من الشمس ہے - وہ نہایت سادہ زندگی بسر کرتا تھا - بغاوت کے ایام مین جمہور کی روزانہ خوراک چائے، روٹی اور دلیا ہوتی تھی - اور لینن اور اسکی بیوی اور بہن بھی اتنی ہی اور ایسی ہی خوراک پر بسر کرتے تھے - بعض اوقات باغیون کے ساتھ بیس بیس گھنٹے تک بحالتِ فاقہ وہ کام کرتا رہتا تھا اور اپنے ہاتھ سے سینکڑون خطوط لکھتا تھا - وہ اپنے فرائض کی تکمیل مین ایسا محو ہو جاتا تھا کہ دنیا و مافیہا کی مطلق خبر نہ رہتی تھی - یہان تک کہ قوتِ لایموت سے بھی غافل ہو جاتا تھا - اکثر ایسا اتفاق ہوا کہ اُسکی بیوی نے جب اُسکو بہت مشغول دیکھا تو روٹی کا ایک ٹکڑا اُسکے منھ مین دے کر کھانے کی یاد دلائی اُوسکی چائے مین اکثر شکر نہین ہوتی تھی مگر وہ کہتا تھا "جب احرار شکر سے محروم ہین تو مجھے اسکو لینے کا کوئی حق نہین"، لینن کا قول تھا "ہماری طاقت" عوام مین ہے اور اُنکو سمجھنے مین ہماری فتح"



ایک لڑکے کا پہلا جرم
لندن کی استادی کے کمال فن کا نمونہ
جسے ۱۸۹۲ء میں انگلستان کی نمائش تصویر سے انعام ملا تھا



سر مالکم ہیلی گورنر صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ

اسکا اُصول اور منطق کہیں شکست نہیں ہوتی۔ وہ حریف کو اپنی ذہانت اور روشن دماغی سے اپنا ہمنوا بنا لیتا تھا۔ ذاتی ضبط اور خودداری کو اہم ترین مواقع پر بھی اس نے ہاتھ سے نہیں دیا۔ لینن کہتا تھا۔ ”میں نبی نہیں ہوں جو دنیا کے مستقبل پر رائے زنی کرسکوں۔ البتہ یہ یقینی ہے کہ سیاسی اصولوں کی تجدید کے زیر اثر انگلستان جیسی بادشاہتیں جو استحکام کے لیے صرف مالی ترقی کی خواہاں ہیں نابود ہوتی جا رہی ہیں۔ قدامت پسندی مٹ رہی ہے اور جنگِ جرمن سے جو عالمگیر اقتصادی انقلاب پیدا ہو رہا ہے ایک نئے جمہوری دور کی پیشین گوئی سنا رہا ہے۔ ارتقاے تمدن کی غایت مجلسی اور سیاسی مساوات ہے“۔

بے شبہ لینن کی ترقی کا راز اور اصولوں کی کامیابی کی جان عوام کا اسکی تقلید اور تعریف کرنا تھا۔ ایک دفعہ لینن اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا احکام جاری کر رہا تھا۔ کہ باغیوں کا ایک گروہ گھس آیا۔ تاکہ اسکو قتل کر دیا جائے۔ لینن باہر نکلا اور کہا ”میں موجود ہوں“ ”اور تمھارے سامنے ہوں“ لیکن اس قدر شور و غل برپا تھا۔ کہ لینن! لینن!! کے سوائے کوئی آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔ آہستہ آہستہ شور کم ہوا اور اس کے ساتھ ہی لینن کی دلیری بڑھی۔ اور اسنے پھر اپنے الفاظ کو دُہرایا۔ یہ تھا لینن، اور اس کا اُصول، اور یہ تھا اُسکی ترقی اور کامیابی کا راز ÷

رپورٹ مُسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ۔ زیرِ نظر رپورٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے چھتیسویں اجلاس (۱۹۲۲ء) کی کارروائی اور مفید لیکچروں پر مشتمل ہے۔ یہ سب لیکچرس اردو زبان میں ہیں اور قابل مقرروں کے مُرتب کیے ہوئے ہیں۔ اُردو زبان۔ علمِ کیمیا۔ جغرافیہ کا تصور۔ مصوری و نقاشی۔ اصلاح تمدن ابجد کی تعلیم کھیلوں کے ذریعہ وغیرہ۔ غرض تمام لیکچرس اپنے اپنے موضوع کے لحاظ سے قابل قدر ہیں اور لائقِ مطالعہ۔ قیمت فی جلد صرف ۸؍

صدر دفتر کانفرنس مذکور الصدر سے دستیاب ہوسکتی ہے۔

بحر الفضائل فی منافع الافاضل

تصنیف محمد بن قوام بن رستم بن احمد بن محمود بدر خزانہ البلخی المعروف بہ کرخی

از نوشتۂ حکیم سید شمس اللہ قادری ماہر آثار قدیمہ حیدرآباد دکن

جنوری سنہ ۱۹۲۹ء میں اردو سوسائٹی کے زیر اہتمام بمقام مدراس، ادب اردو کی ابتدائی تاریخ پر ہم نے ایک لکچر دیا تھا اور اس میں زبان اردو کی قدامت ثابت کرنے کے لیے جو دلائل پیش کیے تھے، ان میں سے ایک دلیل یہ بھی تھی کہ زبان فارسی کی لغات بحر الفضائل میں جو آٹھویں صدی ہجری کے اخیر ایام کی تصنیف ہے۔ اردو زبان کے الفاظ موجود ہیں۔ جن سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے سے مدت پہلے اردو زبان سرحد دکن میں آ چکی تھی۔ جب ہمارا یہ لکچر شایع ہوا تو مختلف اشخاص نے بحر الفضائل اور اس کے مصنف کی نسبت بعض استفسار کیے جنکے جواب میں یہ مختصر مضمون تحریر کیا گیا ہے

بحر الفضائل فارسی زبان کی لغت ہے۔ اس میں عربی، فارسی، ترکی، یونانی وغیرہ زبانوں کے وہ الفاظ ہیں جو فارسی زبان کی درسی تصنیفات میں عموماً، اور فردوسی، انوری، خاقانی، وغیرہ شعراء کی منظومات میں خصوصاً مستعمل ہوئے ہیں۔

(۱) محمد بن قوام کا زمانہ | محمد بن قوام نے مخزن الاسرار نظامی کی شرح بھی لکھی ہے[۱]، جو اس لغت کی بہ نسبت زیادہ مشہور و مقبول ہوئی ہے، چنانچہ مؤید الفضلا اور کشف اللغات وغیرہ میں اسکے حوالے اکثر مقامات پر آئے ہیں۔ اسکی تاریخ تصنیف ڈاکٹر اسپرنگر نے سنہ ۹۱۰ھ اور ڈاکٹر ریو نے سنہ ۹۰۰ھ بیان کی ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ کتاب سنہ ۷۹۵ھ کی حدود میں تصنیف ہوئی ہے۔ چنانچہ مصنف نے حمد و ستایش کے تحت میں پندرھویں شعر

کیست درین دائرۂ زیر پاے   کو لمن الملک زند جز خداے

کی شرح کرتے ہوئے سن مذکور کا اس طرح ذکر کیا ہے۔

از آفرینش آسمان و زمین بقول حکما و اصحاب زکوۃ و صاحب کفات یک لک و نود و دو ہزار و چہار صد و نود و شش سال است و این سال سن خمس و تسعین و سبعمایہ من الہجرت بود۔

---

[۱] یہ شرح سنہ ۱۲۸۸ھ میں مطبع نول کشور لکھنؤ میں چھپ گئی ہے لیکن اس میں مصنف کا نام محمد بن قوام کے بجائے ظہور الحسن بجھوری از اولاد سید ابو الحسن عریضی لکھا ہوا ہے۔ یہ تلبیس و تدلیس ہے۔

اسی طرح ایک اور مقام پر مقالۂ ہفتم میں شعر

پیشتر از پیشتر آن وجود | کاب نخوردند ز دریائے جود

کے تحت میں حسب ذیل عبارت لکھی ہے -

یعنی آن کہ درین وقت کہ از ہجرت پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم ہشت صد و نود و پنج سال است (صفحہ ۱۰۵)

اس سے ظاہر ہے کہ محمد بن قوام آٹھوین صدی کے نصف آخر مین گذرا ہے -

(۲) محمد بن قوام کے عرفیت کی تحقیق | محمد بن قوام کی عرفیت مختلف نسخون مین مختلف طرح سے پائی جاتی ہے -

کرخی	چار نسخون میں	
کرئی	تین نسخون مین	
سکزی	ایک نسخے مین	

اسپرنگر اور ایتھے نے کرئی کو بکری لکھا ہے - چونکہ حرف جار ہے - اس لیے یہ غلطی ہوئی -

کرخ - بغداد کے ایک محلے کا نام ہے[۵۱] -

کرئی کے نام سے ہندوستان مین بزمانۂ اکبر بادشاہ دو مقام آباد تھے - ایک صوبۂ لاہور کی سرکار بہت کا قصبہ تھا[۵۲] - دوسرا صوبۂ گجرات مین سرکار احمد آباد کا ایک پرگنہ ہے[۵۳] -

سکز - سیستان کا قدیم نام ہے - عربون نے اسے معرب کر کے سجز بنا لیا ہے - رستم اسی ولایت مین پیدا ہوا تھا - اس لیے اُسے سکزی کہا کرتے تھے -

اسی اختلاف کے باعث کسی ایک عرفیت کا معین کرنا دشوار ہو گیا ہے - تاہم ڈاکٹر ریو کا رجحان کرخی کی جانب ہے - اور نسخون کی کثرت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے -

(۳) مختلف کتبخانون مین محمد بن قوام کی تصنیفات کے قلمی نسخے | شرح اور لغت کے جن نسخون کا ہمین علم ہے - اُن کی تفصیل ذیل مین درج ہے -

بحر الافاضل کے نسخے

کتبخانۂ آصفیہ مین[۵۵] (۲) فن لغت نمبر ۸ نمبر ۱۵	کتبخانۂ دیوان ہند مین (۱)	نمبر ۱۶۲
کتبخانۂ مخطوطات مشرقیہ مین (۱) نمبر ۴ -	کتبخانۂ شاہ نور مین (۱)	

شرح مخزن الاسرار کے نسخے

کتبخانۂ آصفیہ مین (۱) فن مثنویات نمبر ۱۰۵	کتبخانۂ برٹش میوزیم مین (۱) اے - اے - وی - ام ۲۶۱ -	
کتبخانۂ دیوان ہند مین (۱) نمبر ۹۹	کتبخانۂ شاہان اودھ مین (۱)	نمبر ۱۵۲

---

۵۱ قاموس صفحہ ۱۴۸ - ۵۲ آئین اکبری جلد اول صفحہ ۲۷۰ - ۵۳ آئین اکبری جلد اول صفحہ ۴۹۳ - مرآۃ احمدی جلد اول صفحہ ۱۳۱

۵۵ کتب خانۂ آصفیہ (حیدر آباد) کی فہرست مین اس کا نام غلطی سے بحر الافاضل لکھا گیا ہے -

کتبخانۂ ایشیاٹک سوسائٹی مین (۱) نمبر ۶۲۹ - کتبخانۂ آسٹریا مین (۱) منظومات نمبر ۲۱۲

(۴) بحر الفضائل کے ابواب و فصول | بحر الفضائل دو جلدون مین منقسم ہے - پہلی جلد مین عام لغات ہین - دوسری جلد مین اُن اسماء و اعلام اور بعض متفرق الفاظ کو جمع کیا ہے جنکا تعلق فارسی لغات سے ہے -

دونون جلدون کی تقسیم و تبویب اس طرح کی گئی ہے:

قسم اوّل - در لغات اہلِ فضل و اصطلاحات ایشان بترتیب حروفِ تہجی - در بست و ہشت باب -

قسم دوم - در ابواب متفرقہ -

باب اوّل - در اسامی بعضے از اہل و اولاد و کارداران و غزوات و اسباب و پیغامبران -

باب دوم - در الفاظ و ادوات و غیر آن بترتیب حروفِ تہجی و در آخر این باب تنوین اعداد و فصل است

باب سوم - در کنیتہائے و درین باب چہار فصل است -

باب چہارم در اسامی ماہہا و ایامِ ہر ملت و درین باب ہفت فصل است -

باب پنجم - در اسامی بروج و کواکب و سیارہ و ثابتہ - درین باب سہ فصل است -

باب ششم - در اسامی اقلیمات و بعضے شہرہائے مشہور -

باب ہفتم - در حلیۂ آدمیان -

باب ہشتم - در اوزانِ درہم و دینار و رطل و صاع و جز آن -

باب نہم - در الفاظ صفتہائے کہ اہلِ فضل را بکار آید - درین باب شش فصل است -

باب دہم - در الفاظ متناسب از ہر نوع و درین باب نہ فصل است -

باب یازدہم - در اسامی وخمار و روانی و اسباب -

باب دوازدہم - در اسامی پردہ ہا و اوقات نواختنِ سرود و راگہا و در مزامیر و آنچہ خوانند و درین باب سہ فصل است

باب سیزدہم - در اسامی ہفتاد و دو ملتِ اہلِ بدعت و بعضے اسباب مقامِ ایشان و درین باب سہ فصل است -

باب چہاردہم - در بعضے الفاظ ہندوی کہ در نظمِ ہندوی استعمال کنند -

(۵) بحر الفضائل اور اردو زبان | جلد اوّل مین مصنف نے اکثر الفاظ کے ہندی مترادف بیان کیے ہین - اِنمین بیشتر الفاظ ایسے ہین جو اس وقت بھی ہماری زبان مین مروج ہین - جلد دوم کا چودھوان باب اُن ہندی الفاظ سے مختص ہے جو ہندی نظمون مین پایا کرتے ہین - یہ باب ادب اردو کی ابتدائی تاریخ مین خاص اہمیت رکھتا ہے - کیونکہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کتاب کی تالیف کے وقت آٹھوین صدی کے اخیر ایام مین مسلمان فارسی زبان کے علاوہ عام طور پر ہندی زبان بھی بولتے تھے - اس زمانے مین بالیقین نظمین بھی لکھی گئی تھین اور وہ مسلمانون مین اس قدر مقبول اور مشہور تھین کہ مصنف کو اُن کا لغت فارسی مین مدوّن کرنے کی ضرورت پیش آئی -

حضرت منیر شکوہ آبادی

(از پنڈت لشن نرائن حامی بی اے)

سید اسمٰعیل حسین نام منیر تخلص۔ سید احمد حسین شاہ فیض آبادی کے فرزند رشید تھے شاعری کا مذاق طبیعت میں خلقی اور فطری تھا۔ ابتدائے شباب سے شعر کہنے لگے تھے۔ اوزیر علی اور مطیعا ۔۔۔ شاگرد رشید شیخ ناسخ سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ چند روز میں شاہ دوز ہانت وطباعی نے ایسا ملکہ پیدا ہوگیا کہ اپنے تمام حریفوں سے بازی لے گئے۔ اپنے اُستاد حضرت رشک سے ایسی عقیدت رکھتے تھے جیسے علامہ آزاد دہلوی اپنے اوستاد ذوق مرحوم سے آپ کا کلام لفظ ومعنی کا طلسم ہے جس میں خیالات کی متانت اور جدت کے ساتھ شوخی وبیباکی دست وگریبان ہے۔ باغ وبہار سبزہ وگل کے مضامین چمنِ طبع میں خوب خوب سرسبز ہوتے ہیں۔ فن شعر میں وہ وہ باتیں پیدا کی ہیں کہ اُنکے معاصرین کے خیال میں بھی نہیں آئیں۔ خصوصاً عشق ومحبت کے جذبات وواردات کے بیان میں تو کلام کو سحرِ سامری کا نمونہ بنا دیا ہے۔ قادر الکلامی کا یہ عالم ہے کہ مشکل سے مشکل زمینوں میں چار چار غزلیں کہی ہیں اور ہر غزل میں بیس بیس پچیس پچیس اشعار نکالے ہیں۔ ہر چند کلام میں آورد بھی ہے جو لازمہ معنی آفرینی کا ہے تاہم شگفتگی اور لطافت ہر جگہ موجود ہے۔ تشبیہ واستعارے سے خوب کام لیتے ہیں جنکی رنگینی سے دیوان پر لالہ زار کا دھوکا ہوتا ہے۔ ندرتِ خیالات، جدتِ مضامین، رفعتِ تخیل، علوِ فکر، لطفِ تشبیہ، آپ کے آئینہ کلام کے جوہر ہیں اور حق یہ ہے کہ موشگافی اور باریک بینی میں آپ ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ اگرچہ لفظی صنائع وبدائع کے مقابلے میں آپ نے معنوی خوبیوں کا بہت کم لحاظ رکھا ہے تاہم ابتذال سے کلام کو بچایا ہے۔ غزل، قصیدہ، مخمس، قطعہ جو کچھ کہا ہے بےمثل ہے۔ قصیدے کا انداز ذوق اور سودا سے ملا دیا ہے اور تغزل کے تو بادشاہ ہیں۔ شاعری میں جو صنعتیں عام ہیں جیسے ایہام مراعات النظیر، طباق، تعلیل، تفضیل، لف ونشر وغیرہ سب برتی ہیں اور اس طرح کہ اُن کو دیکھکر اہلِ فن حیرت میں آجاتے ہیں نئی اور انوکھی تمثیلات سے قطع نظر آپکے بیش بہا افتادہ مضامین پڑھی ایک عالم ہے۔ معمولی سے معمولی بات بھی جب آپکی زبان سے نکلتی ہے تو اُسکی شانِ نزول کچھ اور ہوتی ہے۔ افسوس کہ ایسے جوہر قابل کی نا قدر شناس زمانے نے بقدر واجب قدر نہ کی۔ البتہ خُلد آشیان

نواب رامپور آپکے کمال کے نہایت گرویدہ تھے اور بڑی تکریم و احترام سے پیش آتے تھے۔
فلاپ دون پرور ہمیشہ اہل کمال کا دشمن رہا ہے۔ چنانچہ آپ بھی اِس کلیہ سے مستثنےٰ نہ رہ سکے ایک شخص مصطفےٰ بیگ نامی نے ایک طوائف نواب جان کو قتل کیا اور الزام آپ پر لگایا اسی سلسلے میں آپکو کالے پانی ہونا پڑا۔ اِس دوران میں جو جو مصائب آپ کو پیش آئیں اُن کا بیان آپ نے ایک قصیدے میں بڑے ۔۔۔ انداز میں کیا ہے سب سے بڑی تکلیف اِس عرصے میں جو آپ نے محسوس کی وہ ترک افیون کی اذیت تھی۔ آپ کو افیون کھانے کی عادت تھی اور وہی آپ کی فکرِ فلک پیما کو عالمِ بالا کی سیر کراتی اور مضامین کے بجائے آسمان سے تارے اُتار کر لاتی تھی۔ اسیری کے عالم میں بھی شاعری کا ذوق ہمدم تھا۔ چنانچہ اِس زمانے کی چند رُباعیات ذیل میں درج ہیں۔

(۱)

غربت میں وطن خانہ بدوشوں کو بلا
زہرِ غربت سشکر فروشوں کو بلا
جب لختِ جگر کھا کے لگی پیاس منیر
کالا پانی سفید پوشوں کو ملا

(۲)

ہر چند کہ ہم دل کے کڑے ہوتے ہیں
جاڑے کے مگر صدمے بڑے ہوتے ہیں
سردی کا خوف دیکھو عشرہ پانی میں
کس کے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں

(۳)

زندان میں جو بڑھ چلنے کے آہنگ ہوئے
کپڑے بھی ہم سے عازمِ جنگ ہوئے
ملبوس خلافِ وضع کے شکوے ہیں
پہنا عرض کیا تو پائنچے تنگ ہوئے

(۴)

ہر چند محاسبوں میں کم وقعت ہیں
پر قیدیوں کے کفیلِ قسمت ہیں
لکھتے ہیں رہائی و اسیری سب کی
ہم نقل نویسِ دفترِ قسمت ہیں

(۵)

مینا کو بھی ہوا ہے گِلہ ہم سے
ٹرک ٹرک کر بولتا ہے حقا ہم سے
برسات میں کس غضب کی گرمی ہے منیر
جھلوانے لگی آگ بھی پنکھا ہم سے

جن دنوں آپ فرخ آباد میں مقیم تھے۔ راقم کے والد مرحوم پنڈت دیبی پرشاد صاحب صادق وہاں ڈپٹی اگزیکیٹو انجنیر کے عہدے پر مامور تھے۔ اور آپس میں ایک ارتباط خاص تھا۔

لالہ مادھو رام جوہر کے مکان پر ہر ہفتے ایک مشاعرہ ہوا کرتا تھا جس مین والد مرحوم اور حضرت منیر ہمیشہ شریک ہوتے تھے - لالہ مادھو رام کو جنکا یہ شعر زبان زد خاص و عام ہے سہ[1]

ب جگہ تمام سے بیٹھو مری باری آئی		تا اے بلبل شیدا تو سُنا ہنس ہنس کر

حضرت منیر سے تلمذ تھا - ایک دفعہ جوہر نے یہ طرح پیش کی - پانی سے - انسانی سے - اس زمانے مین والد مرحوم فخر تخلص کرتے تھے اور حضرت جوہر کے یہان غزل پڑھنے کا پہلا موقعہ تھا - والد مرحوم نے کہا سے

گرچہ شاعر ہون نیا فخر سے یہ کہتا ہون		بڑھکے ہے میری غزل سعدی خاقانی سے

اسپر منیر نے ہنس کر فرمایا کہ "پنڈت جی ابھی آپ کا شوق ابتدائی منزل مین ہے اور آپ نے غزل بھی یہ پہلی ہی کہی ہے" - لہذا مین یہ صلاح دونگا کہ آپ اس مقطع اور تخلص دونون ہی کو بدل دین چونکہ آپ کا اخلاص میرے ساتھ صادق ہے اس لیے مین آپ کے واسطے تخلص بھی یہی تجویز کرتا ہون - اگر پسند ہو تو آپ اس مقطع کو یون کر دیجیے سہ

کیا عجب ہے کہ عنایت سے خدا کی صادق		بڑھکے ہو میری غزل سعدی و خاقانی سے

والد صاحب نے اسکو قبول کیا - اور اسی روز سے آپ حضرت منیر کے زمرۂ تلامذہ مین داخل ہو گئے۔

والد مرحوم فرماتے تھے کہ جب کبھی مین رخصت لے کر فرخ آباد سے وطن کا قصد کرتا تو منیر صاحب مجھ سے گلے مل مل کر رو دیتے تھے اور ہمیشہ ایک نہ ایک چیز اپنی یادگار کے طور پر مجھے نذر دیتے تھے - چنانچہ اب بھی میرے پاس پانچ رومال اور دو قلمدان اُنکی یادگار موجود ہین -

حضرت منیر کے متعلق ابھی بہت سے واقعات قابل ذکر میرے دل مین موجود ہین - مگر اس وقت خوف طوالت سے نظر انداز کرتا ہون - آیندہ کسی مضمون مین تفصیل سے لکھونگا - ذیل مین آپ کے چند اشعار پیش کرتا ہون اُمید ہے کہ دلچسپی سے خالی نہونگے سہ

شادی کرون عروس مضامین نور سے		نکلے برات کوچۂ بین السطور سے
گھونگٹ سے تیرے کان کی بالی نظر آئی		دیوار چمن توڑکے پتا نکل آیا
مول لے کر کبھی دنیا مین نہ پی ہم نے شراب		ایک کوڑی کو بھی تیزاب مین گلنے نہ دیا
سر جھکین گے در پیر مُغان بے پیر کے ماتھے		سجدے کی خطا جائیگی تقدیر کے ماتھے
شادی ہے دختِ رز سے کسی دین پرست کی		توبہ کے در پہ بجتی ہے نوبت شکست کی

---

[1] راقم کے والد حضرت منیر سے عمر مین چودہ برس بڑے تھے - آپ سنہ ۱۸۲۶ء مین پیدا ہوئے اور سنہ ۱۹۲۱ء مین بعمر ۹۴ سال انتقال کیا - اور حضرت منیر سنہ ۱۸۴۰ء مین پیدا ہوئے - اور ۱۸۹۶ء مین رہگرائے عالم بقا ہوئے -

رہ کرکے اُس بُتِ گمراہ نے دھوکا دیا　　گر پڑے اندھے کوئیں میں چاہ نے دھوکا دیا

قیس کی وحشت کا دفتر منتشر مدت سے ہے　　بھائی کے رشتے سے باندھا چاہیے شیرازہ آج

کچھ جوانی ہے ابھی کچھ ہے لڑکپن اُن کا　　دو دغا بازوں کے قبضے میں ہے جوبن اُن کا

کل ہی کی وعدہ خلافی سے وہ محجوب نہیں　　کئی شب کا ہے ہلالِ خمِ گردن اُن کا

ہاں تیری زلفوں کے کالے ہوئے ہیں　　یہ دو سانپ چوٹی کے پالے ہوئے ہیں

تشریف لائیے جو تعلّی کی شان سے　　کرسی اُتار لاؤں ابھی آسمان سے

ساون میں بھی وعدہ کوئی پورا نہیں کرتے　　باتوں میں جھلاتے ہیں کچھ اچھا نہیں کرتے

کب دل سخنِ تلخ سے کھٹا نہیں کرتے　　تم اپنے ترش ہونے سے چوکا نہیں کرتے

میں مر گیا تو کہتے ہیں دم دے گیا مجھے　　انصاف آپ کیجیے مُردے میں دم کہاں

فراقِ یار میں ہر طرح دن گزر جاتا　　قضا جو رحم نہ کھاتی تو کیا میں مر جاتا

بہتانِ گریہ سے نہ گئی میری آبرو　　کیا سوکھے گھاٹ اُترے ہیں طوفان آپ کے

ساقی نے کی جو چشمِ سیہ سے نگاہِ قہر　　نشہ ہرن ہوا بھی تو کالا ہرن ہوا

دو برقِ تجلی سے کسی اور کو دھوکا　　آنکھیں نہیں کیا طالبِ دیدار کے منہ پر

شیرِ پنجاب — از مسٹر شیو نراین بھٹناگر ایڈیٹر اخبار "تیج" دہلی۔ قیمت ۸؍

یہ لالہ لاجپت رائے آنجہانی کی مختصر سوانح عمری ہے جس میں لالہ جی کے ذاتی حالات کے علاوہ انکی قومی و ملکی خدمات کا ذکر بھی مجملاً کیا گیا ہے۔ لالہ جی نے جس قدر قومی خدمت کی ہے اسپر ایک مبسوط کتاب مرتب کیجا سکتی ہے۔ اور ہمکو امید ہے کوئی دردمندِ قوم اہلِ قلم اس طرف خود ہی متوجہ ہوگا۔ مسٹر بھٹناگر نے لالہ جی کی وفات کے بعد سرسری طور پر اسکو مرتب کرکے شائع کر دیا ہے تاکہ اہلِ ملک کے لیے کچھ معلومات بہم پہونچ جائیں۔ شروع میں لالہ جی کی تصویر ہے اور آخر میں بعض رہنمایانِ ہند کے تعزیت نامے اور بعض سخنوروں کے نوحے درج ہیں۔ مؤلف سے پتہ مندرجۂ بالا پر مل سکتی ہے +

دیوار کا جنّ

(از مسٹر حامد اللہ افسر بی۔ اے۔ میرٹھی)

ایک دن کا ذکر ہے ہم سب بیٹھے ہوئے جنوں اور بھوتوں کا ذکر کر رہے تھے یہ ایک ایسا مبحث ہے جو گو بے نتیجہ سہی مگر اس قدر دلچسپ اور دلکش ہوتا ہے کہ بعض اوقات دل میں دھڑکن شروع ہو جانے کے باوجود اسے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ لطف یہ ہے کہ جس قدر آدمی اس قسم کی گفتگو میں شریک ہوتے ہیں وہ قریب قریب سب ہی ایک آدھ کہانی سنا دیتے ہیں۔ یہی بات میں نے سانپ کے ذکر میں دیکھی۔ اسکا ذکر بھی جب شروع ہو جاتا ہے تو مشکل ہی سے ختم ہوتا ہے۔ ہاں تو ہم سب بیٹھے ہوئے جنوں کی کہانیاں کہہ رہے تھے لیکن اب تک جتنی کہانیاں سنائی گئی تھیں وہ ذاتی تجربات پر مبنی نہ تھیں بلکہ مجھ مجھ سے سنی ہوئی تھیں اس مجلس میں ایک ادھیڑ عمر کے نحیف و زار مگر شریف صورت اجنبی شخص بھی شریک تھے جو ہمارے ایک دوست کے ساتھ آئے تھے۔ کبھی کبھی جب ہم میں سے کوئی شخص زیادہ وضاحت و خوش بیانی کے ساتھ اپنی کہانی کے دوران میں کسی جن کی صورت شکل قد اور حرکات و سکنات کا حال بیان کرنے لگتا تھا تو اجنبی شخص آنکھیں پھاڑے منھ کھولے مجسم حیرت کا پتلا بنے اسکی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ آخر جب سب باری باری سے ایک ایک کہانی سنا چکے تو ہم سب انکی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد بولے۔ "کہانی وہانی تو مجھے آتی نہیں۔ کہیے تو جو کچھ خود مجھ پر گذری ہے وہ سنا دوں۔ یہ آپ لوگ جانتے ہی ہیں کہ واقعات اکثر افسانوں سے زیادہ عجیب ہوتے ہیں۔ اتفاق سے میرا واقعہ آج ہی صبح ظہور میں آیا ہے اس لیے مجھ پر تو اسکا بہت ہی اثر ہے"

ہم سب بہت غور سے سننے کے لیے تیار ہو گئے اور اجنبی شخص سے سب نے ایک زبان ہو کر درخواست کی کہ خدا کے لیے اپنا واقعہ سنائیے۔ بہت اشتیاق پیدا ہو گیا ہے

اجنبی شخص نے اپنی کہانی شروع کی :-

تقریباً ایک سال کا عرصہ گذرا کہ میں نے حسین گنج[1] میں ایک چھوٹی سی کوٹھی کرایہ پر لی۔ اس کوٹھی کے جس کمرے میں میرا بستر تھا اسکی دیواروں کا چونا کہیں کہیں سے اکھڑا ہوا تھا شاید مجھ سے پہلے جو کرایہ دار

---

[1] لکھنؤ کے ایک محلے کا نام ہے۔

اس مین رہتے تھے اُنکی بے احتیاطی سے ایسا ہُوا ہو - ایک جگہ سے چُونا کچھ اس طرح اکھڑا تھا کہ اچھی خاصی آدمی کی صورت بن گئی تھی - ایسا اکثر ہوتا ہے کہ چُونا اُکھڑ جانے سے دیوار پر انسان کی سی یا کبھی کسی جانور کی سی صورت بن جاتی ہے لیکن یہ صورت کچھ اس طرح بنی تھی کہ ہُو بہُو انسان کا چہرہ معلوم ہوتا تھا - آنکھ ناک کان سب صاف معلوم ہوتے تھے - سوتے وقت یا صبح کو بیدار ہونے کے بعد مین اس صورت کو بڑی دیر تک تکتا رہتا تھا - اور رفتہ رفتہ اس صورت کا نقشہ کچھ ایسا نظر مین سما گیا کہ مین اُسے واقعی کسی انسان کا چہرہ سمجھنے لگا - اور کچھ مدھم سا احساس یہ پیدا ہو گیا کہ یہ شخص بھی میرے ہمراہ اس کمرے مین رہتا ہے - سب سے زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ اور جہان جہان سے چُونا اُکھڑ گیا تھا اُسمین کچھ تبدیلیان ہو جاتی تھین جیسا کہ ہوتا رہتا ہے - لیکن یہ صورت جیسی تھی ویسی ہی رہی اسمین بالکل تبدیلی واقع نہوئی -

اتفاق سے انھین دنون مجھے انفلوئنزا ہو گیا - اور مین کئی دن تک صاحب فراش رہا - اُن دنون سوائے پڑھنے یا سوچتے رہنے کے اور کوئی کام نہ کرتا تھا - چنانچہ اس زمانے مین دیوار کی شبیہ نے میرے حواس پر پورا تسلط کر لیا - رات اور دن برابر اسی کا خیال رہنے لگا - اب یہ صورت محض دیوار ہی تک محدود نہ تھی بلکہ جس طرف بھی دیکھتا میری نظر کے سامنے رہتی - اور اس کے خط و خال کچھ اس طرح میری نظر مین جم گئے تھے کہ ہزارہا آدمیون کی بھیڑ مین اُسے شناخت کر سکتا تھا -

میری صحت بحال ہو گئی مگر اس شکل نے اب بھی میرا پیچھا نہ چھوڑا - اسکا قبضہ میرے حواس پر بدستور رہا - اب مجھے اس صورت کے انسان کی تلاش ہوئی اور گلی گلی کوچہ کوچہ اُسکو ڈھونڈھنے لگا - مجھے کامل یقین تھا کہ اس صورت کا آدمی ضرور دنیا مین موجود ہے اور وہ مجھے کہین نہ کہین ضرور ملیگا مگر ایسا کیونکر ہوگا ؟ اسکی کوئی معقول دلیل میرے پاس نہ تھی - میرا خیال تھا کہ اُسے مجھ سے اور مجھے اُس سے کوئی روحانی تعلق ضرور ہے - مین اسی جستجو مین ایسے مقامات پر جانے لگا جہان عموماً آدمیون کا مجمع رہتا ہے - جلسون مین - فٹ بال اور کرکٹ کے میچون مین - اسٹیشنون پر - سینما مین - ہر آدمی کی شکل کو غور سے دیکھتا - مگر سب بے سود - اُسکا کہین پتہ نہ لگا -

اب اس صورت والے آدمی کی تلاش خبط کے درجے تک پہونچ گئی - مین شہر کے بڑے بازارون مین سڑک کے کنارے کھڑا ہو جاتا اور ہر گذرنے والے کی صورت دیکھتا رہتا - لوگ مجھے دیوانہ سمجھنے لگے - پولیس مجھے مشتبہ نظرون سے دیکھنے لگی - آخر ایک دن لاٹوش[1] روڈ پر کھڑا ہوا تھا کہ ایک تانگا قریب سے گذرا اس مین ایک انگریز بیٹھا ہوا تھا - ہُو بہُو وہی صورت تھی - وہی آنکھ وہی ناک وہی نقشہ - ایک میم اور ایک

[1] لکھنؤ کی ایک سڑک کا نام ہے -

بچہ اسکے ساتھ تھا۔ نظر پڑتے ہی مجھ پر سناٹا سا چھا گیا۔ چند منٹ تو مین بُت بنا کھڑا رہا۔ لیکن پھر تانگے کے پیچھے بھاگا۔ تھوڑی دُور بھاگنے کے بعد مجھے ایک خالی تانگا نظر پڑا۔ مین کود کر اُسمین بیٹھ گیا۔ اور تانگے والے سے کہا کہ تیز دوڑا کر اس انگریز والے تانگے کے پیچھے لگاو۔ ہم آگے پیچھے چار باغ اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ اُن لوگون نے کانپور کا ٹکٹ خریدا۔ مین بھی پیچھے پیچھے پلیٹ فارم پر پہنچا اور بہت کوشش کی کہ کسی طرح گفتگو کرنے کا موقعہ مل جائے مگر کچھ تو ہمت نہ پڑی اور کچھ اس لیے بھی گفتگو کا موقع نہ ملا کہ اور دو انگریز اُنکے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ گاڑی آگئی اور یہ سب دوسرے درجے مین سوار ہو گئے۔ مین کانپور کا ٹکٹ خریدنے کے لیے جانے ہی والا تھا کہ وہ انگریز تنہا اپنے درجے سے نکلا۔ مین نے بے دھڑک آگے بڑھکر اُسے مخاطب کیا اور کہا کہ میرا خیال ہے کہ مین آپ سے کہین ملا ہون۔ کیا براہ کرم آپ مجھے اپنا نام بتائینگے؟۔ اُس انگریز نے ذرا تیوری چڑھا کر میری طرف دیکھا اور بغیر کچھ بولے ہوئے جیب سے ملاقاتی کارڈ نکال کر مجھے دیا اور سیدھا چل دیا۔ شاید مجھے دیوانہ سمجھا ہو۔

کارڈ پر نظر ڈالی تو مین یقین کیا بتاؤن کہ میرا کیا حال ہوا۔ آنکھون کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ سر چکرانے لگا۔ دل بانسون اُچھلنے لگا۔ اس انگریز کا نام تھا مسٹر ٹامس وال۔ نظام کے نام تک مین دیوار کا لفظ موجود تھا۔ وہ ایک امریکن کمپنی کا ایجنٹ تھا۔ کمپنی کا صدر دفتر بمبئی مین تھا۔ یہ سب مجھے اسی کارڈ سے معلوم ہوا۔ اسکے بعد مجھے کچھ معلوم نہین کہ کیا ہوا۔ شام کے وقت ہوش آیا تو مین نے خود کو اسپتال مین پایا۔ وہان مجھے کئی ہفتہ رہنا پڑا۔ اسپتال چھوڑے ہوئے اِس وقت زیادہ سے زیادہ ایک مہینہ ہُوا ہے۔"

یہان اجنبی شخص خاموش ہو گیا۔ ہم سب حیرت سے کبھی اُسکا مُنہ تکتے تھے کبھی ایک دوسرے کو دیکھتے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر اُس نے اپنی عجیب داستان کا سلسلہ شروع کیا!

"مین پھر حسین گنج والے مکان مین چلا گیا۔ اب میری جستجو مین اور سرگرمی پیدا ہو گئی۔ مین نے اس انگریز کے حالات معلوم کرنے کے لیے جگہ جگہ خطوط لکھے۔ مین نے امریکہ کی اُس کمپنی کو خط لکھا جسکا وہ ایجنٹ تھا خود اُسے ایک طویل خط لکھا مگر کوئی جواب نہ آیا۔ اور کچھ سُراغ نہ چلا۔ آج صبح میری آنکھ اتنی دیر مین کھلی کہ دھوپ کمرے کے اندر آگئی تھی۔ مین نے آنکھ کھلتے ہی دیوار کی طرف دیکھا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ دیوار والی صورت قریب قریب بالکل مِٹ چکی تھی۔ رات آنکھ لگنے سے پہلے وہ شکل ہمیشہ کی طرح پورے طور پر نمایان تھی ایسی کہ گویا اب بولا چاہتی ہے۔ رات بھر مین خدا جانے کیا ہو گیا کہ اُسکا نشان بھی باقی نہ رہا۔

مین بہت افسردہ خاطر بستر سے اُٹھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اخبار آگیا۔ پہلے ہی صفحہ پر بہت جلی حروف مین یہ عنوان درج تھا" مسٹر ٹامس وال کی موٹر اُلٹ گئی۔ اور وہ سخت مجروح ہوئے۔ حالت بہت تشویشناک ہے"۔ اسی اخبار مین اگلے صفحہ پر یہ خبر درج تھی کہ "مسٹر وال کا انتقال ہوگیا"

ہم سب نے یک زبان ہوکر کہا" آپ نے بڑا عجیب اور حیرت انگیز واقعہ سنایا"

اجنبی شخص نہایت متانت سے بولا- واقعہ کے عجیب ہونے مین کوئی شک نہین- میری داستان کے اہم اجزا تین ہین- پہلی بات تو لکھنؤ کے ایک مکان کی دیوار کے اکھڑے ہوئے چونے مین انگلستان کے ایک شخص کی نہ صرف تصویر ہونا بلکہ اُسکا گوشت و پوست والی ہستی سے متعلق ہونا ہے۔ علمی تحقیقات نے ابھی اتنی ترقی نہین کی ہے کہ اِس معمے کو حل کر سکے۔ دوسری بات اُس شخص کے نام کا اِس جگہ سے متعلق ہونا ہے۔ جہان اُسکی شبیہ کسی نامعلوم طاقت نے بنادی تھی۔

ہم سب نے اِن باتون کی اہمیت کو متفقہ طور پر تسلیم کیا- اور ہر شخص تعجب انگیز لہجے مین کہانی کے مختلف حصون پر تبصرہ کرنے لگا۔ جب اجنبی شخص اُٹھکر چلنے لگا تو ہم مین سے ایک شخص نے کہا" جناب! آپ نے اپنی داستان کا تیسرا جزو نہین بتایا"۔ اور واقعی کسی کو خیال ہی نہین رہا تھا-

اجنبی شخص نے کمرے کا کواڑ کھولتے ہوئے کہا" ہان مین بھول ہی گیا تھا، تیسرا اہم جزو یہ ہے- کہ مین نے یہ ساری داستان ابھی آدھ گھنٹے کے اندر گڑھی ہے- السّلام علیکم- خدا حافظ"

رسیدِ کتب

انتخاب غالب- مرتبہ مولوی محمد عبدالرزاق- قیمت- ۵ر

اکبر و اقبال کی پیشین گوئیان- ایضاً- قیمت ۶ر

ہندوستان کے معاشرتی حالات- از مسٹر عبداللہ یوسف علی- ایم- اے- قیمت- عہ

طرۂ امیر- مرتبہ مسٹر امیر احمد علوی بی- اے- قیمت- عہ

تاریخ التعلیم- از ڈاکٹر ضیاء الدین احمد- قیمت- ۱۲ر

وقارِ حیات- (سوانح نواب وقار الملک)- قیمت- ۵ر

رپورٹ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (۱۹۲۴ء) قیمت- عہ

صراط حمید- از مسٹر محمد الیاس برنی- ایم- اے- قیمت عہ

الایمان- از مولوی محمد مقتدیٰ خان شروانی-

تنقیدِ کتب

چشم و چراغ مصنفہ فطرت نگار سُدرشن، چھوٹی تقطیع، حجم ۲۰۰ صفحات - قیمت فی جلد ۱۲؍
ملنے کا پتہ:- سرسوتی آشرم پستکالیہ انارکلی لاہور

منشی پریم چند کے بعد افسانہ نگاری مین جو شہرت و قبولیت مسٹر سُدرشن کو حاصل ہوئی ہے وہ محتاجِ تعارف نہین - گزشتہ چند سال مین آپکی دوسری تصانیف کے علاوہ کہانیون کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہین جو اس امر کی دلیل ہین کہ مسٹر سُدرشن کی کہانیان عام طور پر بہت مقبول ہوئی ہین کتاب زیرِ ریویو بھی اُن کی پندرہ کہانیون کا ایک دلکش مجموعہ ہے - شروع مین مصنف نے ایک مختصر دیباچے مین افسانہ نگاری کے اصولون پر اجمالاً روشنی ڈالی ہے اور مغربی دنیا مین فنِ افسانہ نگاری مین جو اختراع و ترقی ہوئی ہے اُسکے دو نمونے پیش کیے ہین - یہ دونون نمونے صرف چند سطری قصے ہین لیکن اس قدر مختصر ہونے کے ساتھ ہی بلحاظ مفہوم انکو مکمل کہا جا سکتا ہے - ان نمونون کو پیش نظر رکھکر سُدرشن صاحب نے خود بھی ایک دو مختصر قصے لکھنے کی کوشش کی ہے چنانچہ "دنیا کی سب سے بڑی کہانی" اسی طرز کا ایک قصہ ہے جو صرف ڈھائی صفحون پر ہے مگر اس مین ایک لطیف نکتہ بیان کیا ہے جو نتیجہ خیز بھی ہے - باقی افسانے بھی بہت دلکش و دلچسپ ہین - اور ان مین بعض بہت موثر اور بہ لحاظِ نتیجہ قابلِ داد ہین - سرورق رنگین چھاپا گیا ہے - اسپر ایک خیالی تصویر بھی شایع ہوئی ہے - لکھائی چھپائی نہایت دیدہ زیب اور کتاب بحیثیت مجموعی قابلِ دید ہے -

---

گڑیا کا گھر - از مسٹر عبدالشکور ایم - اے - بی - ٹی حجم ۱۴۸ صفحات - چھوٹی تقطیع - حضرت مصنف سے انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے دستیاب ہو سکتی ہے -

یہ مسٹر ہنرک ابسن کے ڈرامہ "ڈالس ہاؤس" کا مشرقی چربہ ہے - جو انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی کی مجالسِ ادبیہ کے سلسلۂ مطبوعات کی ایک کڑی ہے - شروع مین پروفیسر بشیر احمد ہاشمی - ایم - اے - ایم - ایڈ (لیڈس) نے ایک مقدمہ لکھا ہے جس مین مسٹر ابسن کے حالاتِ زندگی اور ان کے علمی و ادبی کارنامون پر تبصرہ کیا ہے نیز ضمناً اس ڈرامہ کی خصوصیات پر ایک نظر ڈالی ہے -

ڈرامہ مین ایک عورت اور اُسکے شوہر کا کریکٹر دکھایا ہے جس مین ازدواجی زندگی کا ایک دلکش مرقع کھینچا گیا

ہے۔ اس ڈرامہ کے لکھنے سے بظاہر مصنف کی غرض ازدواجی زندگی پر درپردہ نکتہ چینی کرنا ہے لیکن بنظرِ غور دیکھا جائے تو زن و شو کے تعلقات کا جو نمونہ اس مین پیش کیا گیا ہے وہ کچھ برا نہین۔ ہمکو افسوس ہے کہ اس چھوٹی سی کتاب مین زبان کی خامیان بکثرت موجود ہین۔ اصل ڈرامہ کے علاوہ مقدمہ بھی اس قسم کی لغزشون سے پاک نہین ہے۔ مثلاً

از مقدمہ :-

"مگر مین اس سنت کی تمامی تقلید نہین کیا چاہتا"

"ہنرک ابسن ۲۰ مارچ ۱۸۲۸ء کو بمقام برزن (ناروے) مین پیدا ہوا"

"میرا خیال ہے کہ "گڑیا کا گھر" کا چھلکتا ہوا ماحول روم کی نشاط پرور فضا کا صدقہ ہے"

"ابسن کے کریکٹر...... اپنے مستانہ واقعیت مین سمندر کی سنکتی ہوئی موجون کے مشابہ ہے"

از ڈرامہ :-

"نادر مرزا- (اسکے قریب جاکر اسکے کان سے کہتے ہوئے) تم اب تک ویسی ہی سادہ لوح ہو"

"مرزا پہاڑ پر نہ جاتے تو تم کم بہیم' کبھی جانبر نہین ہو سکتے تھے"

"نوشابہ - یا عجب! مین تمھین نہین پہچان سکی"

لطف یہ ہے کہ اس ڈرامہ پر ایک دو نہین تین آدمیون نے نظرثانی کی ہے یعنی مسٹر ہاشمی، شیخ عبدالرشید اور حضرت رشید صدیقی- ہاشمی صاحب کی نظرثانی کرنے کی حقیقت تو خود موصوف کے مقدمہ سے ظاہر ہے۔ شیخ عبدالرشید صاحب کی تحریر کا کوئی نمونہ ہمارے سامنے نہین مگر معلوم ہوتا ہے کہ رشید صدیقی صاحب نے بھی زبان کی اصلاح کی طرف توجہ نہ فرمائی !!-

باایںہمہ یہ ڈرامہ دلچسپ ہے اور بیکار وقت اسکے مطالعے مین نہایت خوبی کے ساتھ گزارا جاسکتا ہے-

---

طرۂ امیر - مرتبۂ مولوی امیر احمد صاحب علوی بی-اے- چھوٹی تقطیع- ضخامت ۱۰۴ صفحات- قیمت عہ/

ملنے کا پتہ- مسٹر مشیر احمد علوی بی اے- کاکوری ضلع لکھنؤ

منشی امیر مینائی صاحب مرحوم کا شمار اردو کے مستند و مشاہیر شعراء مین ہے- دو ضخیم دیوان اور ایک واسوخت کا مجموعہ آپ کی یادگار ہین- طرۂ امیر مین منشی صاحب کے دو دواوین "مرآۃ الغیب" اور "صنم خانۂ عشق" سے چیدہ چیدہ غزلین انتخاب کرکے جمع کی گئی ہین- شروع مین حضرت مرتب کا ایک بسیط مقدمہ ہے جو بانوے صفحات پر چھپا ہے- اس مین منشی صاحب کے حالاتِ زندگی، لکھنؤ اور رام پور کے

نوابون کے دربارون سے تعلقات اور آخر مین دکن کا سفر وغیرہ۔ غرض تمام باتین شرح وبسط کے ساتھ لکھی ہین اور اُن کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے حضرت داغ کے کلام سے اُنکے کلام کا موازنہ بھی کیا ہے، مگر قابل مرتب نے اپنے ممدوح کو اُنکے معاصرین پر بیجا تفوق دینے کی کوشش نہین کی بلکہ دیانتداری کے ساتھ امیر و داغ کے رتبے کو یہی اپنی اپنی جگہ قائم رکھا ہے اور یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ علمی قابلیت کے لحاظ سے حضرت امیر کو جناب داغ پر فوقیت حاصل ہے مگر شاعرانہ نازک خیالیون اور زبان کی صفائی و سلاست مین یقیناً حضرت داغ کو امیر صاحب پر فضیلت ہے، جسکا اعتراف اگرچہ کشادہ دلی کے ساتھ نہین کیا گیا مگر مقدمہ کے مطالعے سے یہ حقیقت خود بخود ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ ہماری راے مین کلام امیر کا یہ ایک بہترین انتخاب ہے۔

اسلامی لغت[1] - از سید حامد حسین رضوی (علیگ)

اُردو زبان کی روز افزون توسیع و ترقی اس بات کی مقتضی ہے کہ مختلف علوم و فنون پر مستقل و مستند کتابین لکھے جانے کے ساتھ ہی ہر شعبۂ علوم کی لغت بھی مرتب کی جائے تاکہ مصطلحات کے سمجھنے مین آسانی ہو۔ خوشی کی بات ہے کہ بعض اہل علم و قلم نے اِس ضرورت کو محسوس کر لیا ہے اور اسکو پورا کرنے مین کوشان ہین۔ اسلامی معاملات کے متعلق گو اُردو مین کافی ذخیرہ موجود ہے لیکن کوئی ایسی لغت موجود نہ تھی جس سے مخصوص مصطلحات آسانی کے ساتھ معلوم ہو سکین۔ سید حامد حسین رضوی (علیگ) صاحب نے اِس کمی کو محسوس کرکے "اسلامی لغت" کے نام سے ایک لغت کی تدوین شروع کی ہے جسکی پہلی جلد شائع ہو گئی ہے اور ہمارے سامنے ہے۔

اِس جلد مین صرف چار باب ہین یعنی از الف تا ثاے مثلثہ الفاظ و اصطلاحات کی تشریح و توضیح مین سب سے پہلے قرآن شریف سے امداد لی ہے اور اُسکے بعد احادیث و اقوال ائمہ دین و علمائے اسلام سے استفادہ کیا ہے۔ مصطلحات عقائد کی تشریح مین زیادہ تر اہل تسنن و اہل تشیع کے مسائل سے استفادہ کیا ہے۔ بعض بعض مقامات پر اسلام کے دوسرے فرقون کے معتقدات بھی لکھدیے ہین۔ مصطلحات کی

[1] متوسط التقطیع۔ حجم ۲۶۴ صفحات۔ کتابت و طباعت صاف۔ قیمت فی جلد ۲؎

ملنے کا پتہ۔ مؤلف۔ محلہ نالہ۔ جھالرا پاٹن (راجپوتانہ)

تشریح مین شرعی احکامات بھی نقل کیے ہین جو بہت مفید اور کارآمد ہین - ایمۂ مجتہدین اور حکماء وفضلاء اسلام کی مختصر سوانح عمری بھی درج ہے - غرض مؤلف نے امکانی کوشش سے کام لیکر اس لغت کو مکمل بنانے کی کوشش کی ہے اور اگر یہ سلسلہ پایۂ تکمیل تک پہونچ گیا تو اہل اسلام کے علاوہ عام شائقین کی ضرورت کو بھی پورا کر سکے گا -

تاریخ التعلیم

(حصہ اوّل) نوشتۂ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب بالقابہ سابق پروفیسر اور پرو وائس چانسلر مدرستہ العلوم علی گڈھ - قیمت ۱۲ -

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب بالقابہ کی تمام عمر درس و تدریس اور علمی تحقیقات مین بسر ہوئی ہے اور مختلف ممالک کے طریقۂ تعلیم کا انھون نے بغور مطالعہ ومشاہدہ کیا ہے جسکا نتیجہ یہ کتاب ہے - اسمین فن تعلیم و تدریس کی گزشتہ تاریخ مجملاً بیان کی گئی ہے - قدیم ہندوستان - یونان - رُوما وغیرہ ممالک مین جو طریقۂ تعلیم پہلے رائج تھا اسکا دلچسپ تذکرہ اور ماہران فن تعلیم مثلاً کومی نس - ملٹن - لاک - روسو - اسپنسر وغیرہ کے اصول و نظریے ایک دلکش انداز سے بیان کیے ہین - اور جا بجا اُن پر تبصرہ بھی کیا ہے - تعلیم نسوان کی حمایت مین مشاہیر فن کے اقوال و نظریے پیش کیے ہین - ابتدائی طریقۂ تعلیم نصاب تعلیم اور تعلیم کی غرض وغایت سے بحث کی ہے - غرض یہ کتاب اس قابل ہے کہ نہ صرف معلمین و مدرسین ہی کو اسکا مطالعہ کرنا چاہیے بلکہ عوام کو بھی اس سے سبق حاصل کرکے اپنے بچون کو صحیح طریقے پر تعلیم دلانے کا انتظام کرنا چاہیے بظاہر موضوع کتاب خشک ہے مگر فن تعلیم پر مختلف اہل علم کی رائین نیز مصنف کا انداز بیان دلچسپ ہے جس سے اسکا مطالعہ کسی کے لیے بھی بار خاطر نہین ہو سکتا - صدر دفتر مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ سے دستیاب ہو سکتی ہے -

---

تواریخ انگلستان - انگلستان کی تاریخ اگرچہ ہندوستان کے تمام ہائی اسکول اور کالجون مین پڑھائی جاتی ہے - لیکن اس سے طلباء کی ایک محدود تعداد کے علاوہ انگریزی زبان سے ناواقف اصحاب کوئی فائدہ نہین اُٹھا سکتے - اور موجودہ زمانے مین سیاسی جد وجہد کی ترقی نے یہ ضرورت پیدا کر دی ہے کہ عوام انگلستان کی تاریخ سے کچھ نہ کچھ واقفیت حاصل کرین - تاکہ واقعات کو سمجھنے مین آسانی ہو - اس ضرورت کو پورا کرنے کی غرض سے مسٹر سالگ رام ورما - ایم - اے - بی - ایس - سی - نے مسٹر ٹلے کی تاریخ "انگلش پیپل" کا اردو مین ترجمہ کیا ہے - ترجمے کی زبان صاف اور آسان ہے - متعدد تصاویر ونقشہ جات دے کر اسکو دلچسپ

بنانے کی کوشش کی گئی ہے - امید ہے کہ عام شائقین کے لیے اسکا مطالعہ لطف سے خالی نہ ہوگا۔

قیمت فی جلد عہ

سلطنتِ ہندوستان اور لنکا یہ ہندوستان کا جغرافیہ ہے جو جدید اصول پر مرتب کیا گیا ہے - ہر صوبہ کے قدرتی آثار، آب وہوا، پیداوار تجارت وغیرہ غرض اُن ضروری باتون کا ذکر اسمین موجود ہے جو ایک جغرافیے کی کتاب مین ہونا چاہیین متعدد نقشے بھی دیے ہین جو علم جغرافیہ جاننے کے لیے لازمی ہین ہر بیان کے آخر مین اس کے متعلق سوالات ہین - اصل کتاب کے مصنف مسٹر سی - مارسین - ایم - اے ایل ایل بی ہین جو مدراس یونیورسٹی مین بیس سال تک جغرافیے کے ممتحن رہ چکے ہین اور متعدد کتابون کے مصنف ہین اور مسٹر ایم - ایل جین ایم - اے - ایل - ٹی نے اسکو اُردو مین ترجمہ کیا ہے - امید ہے کہ طلباء کے لیے اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔ قیمت فی جلد عہ

دونون کتابین میسرز میکملن اینڈ کمپنی لمیٹڈ کی طرف سے شائع ہوتی ہین -

بانگِ درا - ڈاکٹر اقبال ہندوستان کا وہ عالی دماغ شاعر ہے جسکی شہرت مغربی ساحل سے گزر کر سات سمندر پار یورپ تک پہنچ چکی ہے یہ ڈاکٹر صاحب کے اُردو کلام کا مجموعہ ہے جو گزشتہ چند سال کے دوران مین کئی بار طبع ہوکر ہاتھون ہاتھ فروخت ہو چکا ہے - یہ مجموعہ جب پہلی بار چھپا تھا تو اسکی قیمت پانچ روپیہ تھی - چونکہ بعض کم مایہ اہل ذوق اس قیمت مین خرید نہین سکتے تھے اس لیے دوسرے ایڈیشن مین اسکی قیمت نصف کر دی گئی تاکہ قدردانانِ کلام اقبال اسکے مطالعے سے مستفید ہو سکین -

زیر نظر مجموعہ شیخ مبارک علی صاحب نے شائع کیا ہے جو ظاہر مین سابق ایڈیشنون سے زیادہ دیدہ زیب اور نظر فریب ہے - معنوی خوبیون کا اعادہ تحصیلِ حاصل ہے - کیونکہ یہ مجموعہ ملک مین کافی شہرت اور قبولیت حاصل کر چکا ہے - جن حضرات نے اب تک "بانگِ درا" کا مطالعہ نہین کیا ہے اُن کو یہ جدید ایڈیشن شیخ مبارک علی تاجر کتب لوہاری دروازہ لاہور سے منگا نا چاہیے -

شاعر اور شاعری

(از منشی تلوک چند محروم - بی - اے)

(شاعر)

شکوہ سنجی آج کرتے ہین بھری محفل مین ہم
گرچہ ہین دلدادہ تیرے نام کے اے شاعری!

جب سنبھالا ہوش، تو پایا اسے تیرا اسیر
دل پہ سو پھندے ہین تیرے دام کے اے شاعری!

تیری الفت نے ہمین آخر نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے اے شاعری!

تیری نسبت سے ہوئے ناکارہ ہم، آوارہ ہم
ہو گئے مورد ہر اک الزام کے اے شاعری!

تو اگر مقبول دوران ہے تو پھر ہوتے ہین کیون
دار ہم پر گردشِ ایام کے اے شاعری!

کس لیے رکھتا ہے یون ہم کو زمانہ تلخ کام؟
ہم نہ طالب نغمے کے نہ جام کے اے شاعری!

ہو گئے کافی ہماری بیخودی کے واسطے
صبح کے جلوے، ستارے شام کے اے شاعری!

پختہ کاران جہان کا کعبۂ مقصد ہے اور
ہم پجاری ہین خیالِ خام کے اے شاعری!

اے فدائے روئے رنگینت دلِ حیرانِ ما
شعلۂ مضطر چرا انداختی در جانِ ما

(شاعری)

مین جواب اسکا تجھے دیتی ہون سن اے شکوہ سنج!
آنکھ سے تیری ابھی پردہ اٹھا دیتی ہون مین

جو نگاہِ جستجو کی منزلِ مقصود ہے
وہ جہانِ حسن شاعر کو دکھا دیتی ہون مین

آ نہئے اس خاکدان مین صاف رہ سکتے نہین
دل اگر کوئی مکدر ہو جِلا دیتی ہون مین

کفر و دین سے ہو گیا بالا مرا محوِ جمال
اک نظر سے تفرقے سارے مٹا دیتی ہون مین

عشق کے چرچون کو دیتی ہون نویدِ زندگی
حسن کے جلوون کو پیغامِ بقا دیتی ہون مین

اور کر دیتی ہون اس اجڑی ہوئی محفل کا رنگ
اپنے افسون سے اسے جنت بنا دیتی ہون مین

گام زن جن پر رہے ہین صوفیانِ با صفا
عالمِ قدسی کی وہ راہین دکھا دیتی ہون مین

جسکی نے پر بزمِ انجم مین ہوا کرتا ہے رقص
گوشِ باطن کو وہی نغمے سنا دیتی ہون مین

طائرانِ خوش نوا کو پھانسنے کے واسطے
دامِ رنگین حسنِ ظاہر کے بچھا دیتی ہون مین

تربیت کے ہون جو قابل اُنکو رکھ لیتی ہون پاس　باقیون کو ہاتھ سے اپنے اڑا دیتی ہون مین
چاہنے والے کا اپنے از رہ عزّ و وقار　مرتبہ شاہان عالم سے بڑھا دیتی ہون مین
فکر دُنیا کے عوض دیتی ہون فکر معنوی　سوچ اے محروم! کیا لیتی ہون کیا دیتی ہون مین
شکوہ تیرا بھی سُنا، لیکن مجھے جو تجھ سے ہے　وہ شکایت ایک مطلع مین سُنا دیتی ہون مین

اب مری زُلفون کے پھندون مین اُلجھ کر رہ گیا!
دل ترا دُنیا کے دھندون مین اُلجھ کر رہ گیا

جذباتِ اثر

(از مرزا جعفر علی خان اثر بی۔ اے لکھنوی)

کارگاہِ عاشقی مین فرد کامل ہو گیا　جس کو تم نے دیکھکر دل کہدیا دل ہو گیا
کچھ نہ پوچھو طے ہوئی راہِ محبت کس طرح　جس جگہ تھک کر گرے سامانِ منزل ہو گیا
اب یہ ہنگامہ ہے ناصح دل بہلنے کے لیے　ختم اک مدت ہوئی شورِ سلاسل ہو گیا
آ کب تک لیلئے پردہ نشین اپنا حجاب　دل تصوّر مین ترے آغوشِ محمل ہو گیا
اِک لطیفہ ہے کہ جس مین لاکھ معنی ہین نہان　دل جو اپنی آرزو مین آپ بسمل ہو گیا
ختم کر جولانیان اے ہمتِ مشکل پسند　امتیازِ آسان و مشکل کا بھی مشکل ہو گیا
یہ بھی کیا موہوم ہے میری اُمیدون کی طرح　جس قدر نزدیک پہنچا دُور ساحل ہو گیا
ایک دل وہ بھی سراسیمہ باندازِ جنون　کارفرما زندگی کا لطف حاصل ہو گیا
اُف تری سرمستیان اے جلوۂ حیرت طراز　جسکو جتنا ہوش تھا اُتنا ہی غافل ہو گیا
ایک حرفِ زیر لب نے کر دیا بے خود مجھے　اور وہ سمجھا بہت مغرور سائل ہو گیا
عشق کہتے ہین جسے وہ بھی ادائے حُسن ہے　آپ ہی جلوہ دکھایا آپ مائل ہو گیا

ایک گردش مین نگاہِ مست ساقی کی اثر
کفر ایمان ہو گیا۔ ایمان باطل ہو گیا

انسان

(از مسٹر شیام موہن لال جگر بریلوی ۔ بی ۔ اے)

کسی کی راہ میں اب خاک ہو کے سمجھا ہوں
مرا وجود ہے کیا چیز اور میں کیا ہوں

میں ہی تھا مقصدِ تخلیقِ دہر روزِ ازل
بہارِ حسنِ دو عالم ہے میرا حسنِ عمل

گدائے دولت ادراک میرا علم و ہنر
مری نگاہ کا محتاج عقل کا جوہر

جمیل مہر و فلک سے بھی میری ہستی ہے
بلند شانِ ملائک سے میری پستی ہے

بہار، موجِ تبسم کی میرے شیدائی
خزاں، ظہورِ نمِ اشک کی تمنائی

حیات و مرگ مرے پردہ ہائے سازِ وجود
ازل، ابد مری ہستیِ مستقل کے حدود

جبینِ عشق مرے سجدے سے منور ہے
نگاہِ حسن مرا خوشہ چینِ جوہر ہے

ہے ذاتِ پاک کی آئینہ دار ذات مری
بنائے رونقِ دیں، رونقِ صفات مری

غزل

(از جناب ساغر (دہلوی))

تسخیرِ دو عالم ہے اس نرگسِ جادو میں
اور آبِ بقا پنہاں ہے خنجرِ ابرو میں

ظاہر میں ہیں دو لیکن یکتا و یگانہ ہیں
ہے معجزۂ وحدت آنکھوں کی ترازو میں

تم لاکھ چھپو آخر طالب تو پکاریگا
ہٹ جائینگے سو پردے اک نعرۂ یاہو میں

کیا قصۂ غم کہتے ہم شامِ شبِ فرقت
تم بھی نہ تھے پہلو میں دل بھی نہ تھا قابو میں

اک وجد میں رہتا ہے ساغر مئے وحدت سے
زاہد تجھے ملتا ہے کیا اس ما و من و تو میں

پپیہا

(از جناب پروفیسر رام پرشاد کھوسلا ناشاد ایم۔اے)

تو کس کو اے پپیہے "پی پی" سنا رہا ہے — شاخِ شجر پہ بیٹھا کس کو بلا رہا ہے
کس کے فراق میں تو صبح و مسا ہے نالاں — کس کو تو عشقِ صادق اپنا بتا رہا ہے
ہے اس قدر پریشان تو کس حسین کی دھن میں — کس مہ جبین کی رہ میں آنکھیں بچھا رہا ہے
کس ماہرو سے ملنے کی آرزو ہے تجھکو — کس کے فراق کا غم تجھکو ستا رہا ہے
تیری ہر اک صدا سے وارفتگی ہے پیدا — سودا کسی کا سر میں تیرے سما رہا ہے
تن من کی سدھ نہیں ہے دن رات بیکل ہے — نالوں سے آسمان کو سر پر اٹھا رہا ہے
سچا ہے عشق تیرا تو "پی" ملے گا تجھکو — کیوں مفت میں تو اپنی جان کو گھلا رہا ہے
محرم بنالے اپنا کوئی تو اس جہان میں — کیوں عشق کی مصیبت تنہا اٹھا رہا ہے

رمزوں سے عشق کے ہے ناشاد خوب واقف
تو ریت پیت کی کیا اسکو سکھا رہا ہے

تنویرِ سحر

(جناب ایم سلیمان صاحب بی۔اے۔بی۔ایل)

سحر نامۂ زندگی ہے سحر — سنائی ہے خلدِ بریں کی خبر
ہوا زندگی بخش چلنے لگی — ترنم سے معمور دنیا ہوئی
ترنم۔تعطر کی رانی ہے یہ — جہان کی نئی زندگانی ہے یہ
عروسِ سحر خلد کی حور ہے — جبینِ سحر سربسر نور ہے
ہے خود نور اور نور افشان ہے یہ — گل افشان ہے اور گل بدامان ہے یہ
اٹھو خواب سے کیف حاصل کرو — نئی زندگانی سے کچھ بہرہ لو
جبینِ سحر خیز پر نور ہے — مسرت سے دل اسکا معمور ہے
موذن بر آورد بانگ حیات — کہ خیر من النوم آمد صلواۃ

کلامِ شاد

(از حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم)

خواب تھا میں خواب جی کا ہو گیا
بیچ میں چونکا تو تھک کر سو گیا

ٹکٹکی باندھے اسی کو دیکھنا
میں تو صاحب اک نظر میں کھو گیا

کون ظالم باغبان تھا؟ اے چمن
جائے گل، کانٹے جو تجھ میں بو گیا

خاک کا ذرہ تھا، دل کی کیا بساط
گرتے ہی تیری نظر سے کھو گیا

لطف تو یہ ہے، کہ آپ اپنا نہیں
جو ہوا تیرا، وہ تیرا ہو گیا

بھول بیٹھا اپنے بیگانے کو بھی
پھر نہ پلٹا اس جہان سے جو گیا

روح اک مزدور جسمِ زار بار
بوجھ کا ڈھونا تھا لازم ڈھو گیا

کچھ اثر ایسا ہوا منھ دیکھکر
آج تو ناصح بھی مجھ پر رو گیا

مجھ پہ رونا غیر کا، جانے بھی دو
کیسا رونا؟ اپنی آنکھیں دھو گیا

قبر سے میری تھی الفت ابر کو
جب جب آیا چار آنسو رو گیا

شاد شکر اشکِ ندامت کا کرو
دل میں جو جو داغ تھا وہ دھو گیا

ستانے کا ترے کس کو گمان تھا؟
ارے پیری! کبھی میں بھی جوان تھا

کریں یارب کہاں جا کر بسیرا
کٹی وہ شاخ جس پر آشیان تھا

مٹا یا مفت مجھکو رہروؤں نے
میں آخر نقشِ پائے رفتگان تھا

خدا بخشے! ہمارا صبرِ مرحوم
ہمیشہ اپنے دل سے بدگمان تھا

گلہ کرتا نہ کیونکر ہر خریدار
ترا اے زندگی! سودا گران تھا

مرے لاشے کے بھی بندھوا دیے ہاتھ
غضب وہ پاک دامن بدگمان تھا

ہوئی کھوٹی تمنا کی نہ منزل
لیں ہر کاروان اک کاروان تھا

دلِ مضطر کا شکوہ کیا کروں شاد
کہ دشمن تک ہمارا رازدان تھا

نغمۂ عشق

(از جناب بشیر احمد مسرور (کپورتھلہ))

اے سرودِ غیب! ان اے نے نوازِ خوش نوا
کیف آور، روح پرور ہے تیری ہر اک صدا

تیری ہر لے ہے بہشتِ سرخوشی میرے لیے
ہر سرودِ خوش ہے تیرا زندگی میرے لیے

میٹھے میٹھے، دھیمے دھیمے رس بھرے نغمے ترے
دل مین آکر شوق و مستی کے ترانے بن گئے

دل مین آتا ہے تو ساغر نوشیان کرتا ہوا
لڑکھڑاتا، ڈگمگاتا، مستیان کرتا ہوا

آسمانی محفلون کا بادۂ گلفام ہے
یا کوئی روحانیون کے میکدے کا جام ہے

تیرے پیمانے انوکھے، طرفہ میخانے ترے
مست متوالے ترے، ہشیار دیوانے ترے

ہُو کے عالم مین تو اک موسیقیِ خاموش ہے
ہائے و ہُو کی محفلون مین شورِ نوشانوش ہے

بزمِ انجم مین ترنم ریز ہے تیری نوا
محفلِ گردون مین تیرے نغمہ ہے دلربا

سورج آیا تیری موجِ نور مین بہتا ہوا
چاند چمکا تیری رنگین داستان کہتا ہوا

سینۂ پُرسوز مین درد آکے بن جاتا ہے تو
جانِ مضطر پر گھٹائین غم کی برساتا ہے تو

شعبدہ ہے، سحر ہے، چلتا ہوا جادو ہے تو
تیرا نغمہ ہے کہ نیرنگِ جہانِ آرزو

تازہ رکھتا ہے خیالون کے چمن تو ہر زمان
فکرِ رنگین مین تو کرتا ہے بہار آرائیان

خوش نوایانِ چمن کی آنکھ کا تارا ہے تو
قمریون اور کوئلون کو جان سے پیارا ہے تو

پھول برساتی ہین مستون پر تری رنگینیان
ہے ادا کس کی یہ تجھ مین کس کا ہے حسنِ بیان

تیری آہنگِ سرور انگیز مین گم ہے خیال
ہین نگاہون مین ہزارون عالمِ کیف و جمال

آرزوئین شاد ہین تیرے ترنم زار مین
حسرتین ہین مست اس کیفیتِ سرشار مین

تو ہے بنیادِ زمین و آسمانِ زندگی
تو ہے جانِ زندگی، تو ہے جہانِ زندگی

آپ کو جس نے تری گہرائیون مین کھو دیا
عالمِ رفعت مین اُسکا بول بالا ہو گیا

لطفِ سخن

(حضرت احسن مارہروی)

دی گئی خوابِ تصوّر کی یہ تعبیر مجھے ۔۔۔ کہ ہر اک شے میں دکھائی تری تصویر مجھے

جس طرح باندھ گئی زلفِ گرہگیر مجھے ۔۔۔ یوں نہ پابند کرے گی کوئی زنجیر مجھے

آتے جاتے ہوئے رہتا ہوں سرِ دامنِ یار ۔۔۔ خاکِ پا ہو کے یہ ہاتھ آئی ہے توقیر مجھے

عالمِ حسن کا ایک ایک مرقّع دیکھا ۔۔۔ تیری صورت کی ملی کوئی نہ تصویر مجھے

یوں نہ گھبرا کے بناکام، کہ دم پر بن جائے ۔۔۔ سانس تو لینے دے اے نالۂ شبگیر مجھے

دے گیا حسنِ ادا، سونپ گئی وحشتِ عشق ۔۔۔ گرہِ زلف تجھے، حلقۂ زنجیر مجھے

رکھ کے زانو پہ سرِ عجز مرا قاتل نے ۔۔۔ رتبہ معراج کا بخشا تہِ شمشیر مجھے

صورتِ نقشِ قدم خاک بسر ہوں، لیکن ۔۔۔ خضر کہتے ہیں درِ یار کے رہگیر مجھے

نظر آئی شبِ غم جامِ شکستہ کی طرح ۔۔۔ دل کے ہر گوشے کی ٹوٹی ہوئی تعمیر مجھے

بلکہ کے ہر کوشش و تدبیر کا دستورِ عمل ۔۔۔ دے گیا کاتبِ قسمت خطِ تقدیر مجھے

نہ بچا جنبشِ مژگان کی ادا سے نہ بچا ۔۔۔ لے گئی کھینچ کے آخر کششِ تیر مجھے

شاعری ہو گئی بدنام بوجہِ احسن
نیک نامی نے کیا خوب ہی تشہیر مجھے

جناب طالب باغپتی

جمالِ یار تو منت کشِ حجاب نہ تھا ۔۔۔ نقاب پردۂ ادراک تھا نقاب نہ تھا

دکھا کے لوٹ گیا اک تماشۂ ہستی ۔۔۔ حباب، آئینۂ آب تھا حباب نہ تھا

جوان تھے تو ہر اک چیز میں جوانی تھی ۔۔۔ شباب فلسفۂ حسن تھا شباب نہ تھا

سکون موت ہے دل کی طپش دلیلِ حیات ۔۔۔ مریضِ عشق کو بے وجہ اضطراب نہ تھا

جسے نصیب کی گردش سمجھتے تھے طالب
وہ ایک خوابِ جوانی تھا انقلاب نہ تھا

کمزوری کیلئے

For Debility



سب قسم کی کمزوری میں جسمیں رگ پٹھوں کی قوت اور جسمانی طاقت میں کمی نمایاں ہو انجیلرس ایملشن ایک نادر بے بہا دوا ہے۔ جو لوگ کثرت کار یا زیادہ عیش پرستی کی وجہ سے کمزور و نڈھال ہو گئے ہیں۔ ان کے لیے یہ ایملشن خاص طور پر مفید اور صحت بخش و مقوی دوا ثابت ہوگا۔ نمونیا انفلوئنزا۔ اور مختلف قسم کے بخار وغیرہ سخت امراض کے بعد زائل شدہ قوت از سر نو حاصل کرنے اور تھکے ماندے رگ پٹھوں کو تندرست کرنے کے حق میں تو یہ ایملشن ایک بے نظیر دوا ہے۔

انجیلرس ایملشن کو ہندوستان بھر میں ایک غیر معمولی شہرت حاصل ہو گئی ہے اور تمام بڑے بازاروں میں یہ فروخت ہوتا ہے اور لوگ اسکے استعمال کی سفارش کرتے ہیں آپ اپنے احباب سے اسکے بابت پوچھئے۔

انجیلرس ایملشن میں کسی قسم کی حیوانی چربی یا روغن نہیں ہوتا ہے۔ اور اسکی تیاری میں بھی انسانی ہاتھ چھو نہیں پاتے ہیں۔ اس لیے ہر ایک ذات اور ہر ایک مذہب کے لوگ اسکو استعمال کر سکتے ہیں۔

ANGIER'S EMULSION

Of all Chemists and Bazars

انجیلرس ایملشن بازاروں اور انگریزی دوا فروشوں سے خریدیئے

لوٹو انعام

لدانت کا خون

صرف نام کے لیے

۵ ؎ درجن دادکی دوا پر ۶۱ قیمتی چیزیں انعام

فیشن ایبل رولڈ گولڈ روا ئے رسٹ واچ اور پاکٹ واچ انعام ہی میں شامل ہیں انعام کی چیزوں کو
دیکھتے ہی دل
پھڑک اُٹھے گا

کیسا ہی پرانا خراب ہے
خراب داد کیوں نہ ہو
اس دوا کے لگاتے
ہی ۲۴ گھنٹے میں
بغیر کسی تکلیف
کے جڑ سے جاتا
ہے۔ داد کی
بارہ ڈبیوں کی
قیمت ۵ ؎ ہے
اور ساتھ میں نیچے کی
قیمتی اکسٹھ (۶۱) چیزیں
مفت انعام میں داد کی دوا
ساتھ بھیجی جاتی ہیں۔

۱۰- خوبصورت جل چھپی (۱۱) بڑھیا عطر کی شیشی
۱۱- خوشبودار صابن ۱۲- بہت بڑھیا
تاش ۱۴ فونٹین پین ۱۵ خوبصورت
رومال ۱۶۔ بڑھیا قینچی - ۱۷ خوبصورت
آئینہ - ۱۸- خوبصورت کنگھا - ۱۹
سندر کھلونا - ۲۰ خوبصورت چاقو
۲۱ خوبصورت عجیب شیشی - ۲۲
سندر ... ۲۳ بہت بڑھیا کالر کے بٹن
۲۴ خوبصورت بالی - ۲۵ بہت بڑھیا
پیانو جرمنی ہارمونیم - ۲۶ بال اڑانے کا
صابن ۲۷ بڑھیا شیشہ کی دوات ۲۸ خوبصورت
پنسل کلپ ۲۹ خوبصورت پنسل -
۳۰ بڑھیا پستول ۳۱ -
چالیس تماشہ والا بائسکوپ
۳۲ بہت بڑھیا ربڑ کی
گیند ۳۳ خوبصورت
بانسری ۳۴ بڑھیا
چرمی تھیلی ۳۵ خوبصورت
منی بیگ ۳۶ سندر سرمئی
لگانیکا تنکا ۳۷ خوبصورت
چمچہ ۳۸ چابی ۳۹ مضبوط تالا -
۴۰ سندر کنٹھی ۴۱ دودھ پیا جانے کا
آلہ ۴۲ کان سے میل نکالنے کا اوزار ۴۳ خوبصورت
گھونگرو - ۴۴ خوبصورت ایرنگ ۴۵ گولی ۴۶ خوشبودار



انعام کی چیزیں
۱- رولڈ گولڈ روا ئے
پاکٹ واچ ۲-
گھڑی کی چین
۳- انگوٹھی
۴- بڑھیا تاش
۵- جھنجھنا - ۶-
سوت کا لچھا ۷ -
خوبصورت سوئی بنڈل
۸ نگینہ کی انگوٹھی ۹ بہت بڑھیا چشمہ

تیل کی شیشی - ۴۷ سندر تماشے کا گیند - ۴۸ خوبصورت ناک کا پھول ۴۹ آٹومیٹک سندر ریچھ ۵۰ مسخرہ ۵۱- عجیب جیبی ۵۲ چابی کا رنگ ۵۳
دانت سے میل نکالنے کا اوزار ۵۴ فونٹین پین قلم کا کلپ ۵۵ چھاتی پر لگانیکا سیفٹی پن ۵۶ نب ۵۷ بلیڈ ۵۸ خوبصورت چھلا ۵۹ ہیر کلپ ۶۰
حجامت بنانیکا سیفٹی اُسترہ ۶۰ سندر فیتہ - ۶۱ بڑھیا رولڈ روا ئے رسٹ واچ نوٹ:- جیسا آرڈر تیس انعامی کوپن نکال آچکا ہے اُنکو بھی
انعام میں اکسٹھ ہی چیزیں دیجائینگی۔

دی فرینڈس آف انڈیا ۲۸۱ اپرچیت پور روڈ کلکتہ

دار الاشاعت پنجاب لاہور

بچوں کے لیے کتابیں

وہ کتابیں جو اخبار پھول کے سلسلے میں چھپ کر مقبول ہوئیں اور جو تعلیم اطفال کی گویا پہلی سیڑھیاں ہیں

ننھی کتاب ننھے بچوں کیلئے جو قاعدہ ختم کر چکتے تھے ایسی کوئی دلچسپ کتاب موجود نہ تھی جسے وہ شوق سے پڑھ سکتے اور انکے دلمیں مطالعہ کا شوق پیدا ہوتا۔ سید امتیاز علی صاحب تاج بی اے نے یہ خوبصورت کتابیں چھاپکر گویا بچوں کے لیے ایسے طلسمی کھلونے مہیا کر دیے ہیں جن سے کھیل کھیل کر وہ علم حاصل کر سکتے ہیں ہر کتاب جلی اور کھلے کھلے حرفوں میں اعلیٰ صفحوں پر چھاپی گئی ہے ان میں بیس کے قریب دو رنگ اور تین رنگ کی تصویریں ہیں جو ان بہت ہی آسان اور پیاری اور ایسی چیزوں پر ننھے ننھے سبق لکھے گئے ہیں جنمیں بچے بیحد دلچسپی لیتے ہیں قاعدہ پڑھا کر یہ کتاب بچوں کے ہاتھ میں دیجئے اور پھر دیکھئے انکے دلمیں پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا ہوگا۔ قیمت ۱۰/

اسی سلسلے کی دوسری کتابیں

ننھی کتاب ۱۰/ پیاری کتاب ۱۰/ دلاری کتاب ۱۰/ ہماری کتاب ۱۰/

تاج گیت ننھے بچوں کے لیے چھوٹی چھوٹی اور پیاری پیاری نظمیں اور آسان گیت زبانی یاد کرنیکے قابل قیمت ۳/

تاج پھول ننھے بچوں کے اخلاق و عادات درست کرنیکے لیے نہایت فائدہ مند سبق قیمت ۳/

امتیاز پہیلی ننھے بچوں کے لیے بہت سلیس زبان میں عجیب دلچسپ اور باتصویر کہانیاں قیمت ۲/

پچیس کتابوں کا سٹ چھوٹے بچوں کے لیے۔ بچوں کا انصاف ۳/ تخت کا مالک ۳/ چالاک ۳/ دو بہنیں ۳/ شیر اور بانس والا ۳/ عقلمند انگشتانہ ۳/ روس کا شہنشاہ ۳/ سفید کبوتر ۳/ لال پری ۳/ بہن کی محبت ۳/ گل بانو ۳/ مینڈک شہزادہ ۳/ عجیب شہر ۳/ احسان کا بدلہ ۳/ چپ شہزادی ۳/ کبڑا ابو ۳/ فیاض بیگم ۳/ مغرور شہزادی ۳/ پتھر کا فقیر ۳/ مغرور شہزادی ۳/ نیکی کا پھل ۳/ بدی کا بدلہ ۳/ بلوری جوتا ۳/ نقلی شہزادہ ۳/ ابراہیم الکن ۳/

بچوں کا ہفتہ وار اخبار

پھول

اردو میں سب سے پہلا۔ پابند اوقات کثیر الاشاعت اور مقبول عام اخبار جو اٹھارہ سال سے جاری ہے

اور جسمیں

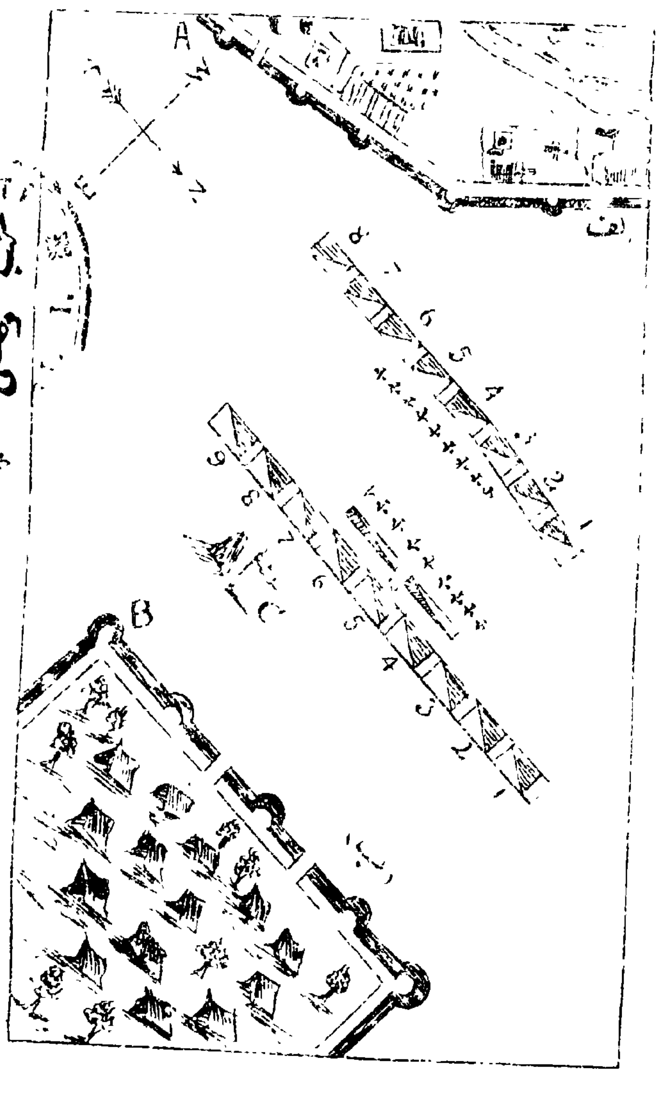
دلچسپ قصے۔ اخلاقی کہانیاں حفظان صحت علم تاریخ جغرافیہ کے مضامین دلچسپ معلومات اور مزیدار نظمیں عمدہ لطیفے معمے اور تصویریں اور ہفتہ بھر کی ضروری خبریں درج ہوتی ہیں نمونہ مفت چندہ سالانہ صہ/

دار الاشاعت پنجاب۔ ۱۹۵ ریلوے روڈ لاہور



نقشہ میدان جنگ سوم پانی پت

PLAN OF THE BATTLE OF PANIPAT



تشریح نقشہ میدان جنگ سوم پانی پت

(الف) مرہٹوں کا لشکر

(افواجِ مرہٹہ کا رخ مشرق کی طرف تھا)

مرہٹے لشکر کے بڑے بڑے سرداروں کی جمعیت بہ ترتیب نقشہ

۱ ابراہیم خان
۲ داماجی گیکواڑ
۳ ستبودیو پٹیل
۴ بھاؤ صاحب اور خاص پائیگاہ
۵ جسونت راؤ
۶ شمشیر بہادر
۷ ملہار راؤ ہلکر
۸ جنکوجی سندھیا

(ب) شاہ ابدالی کا لشکر

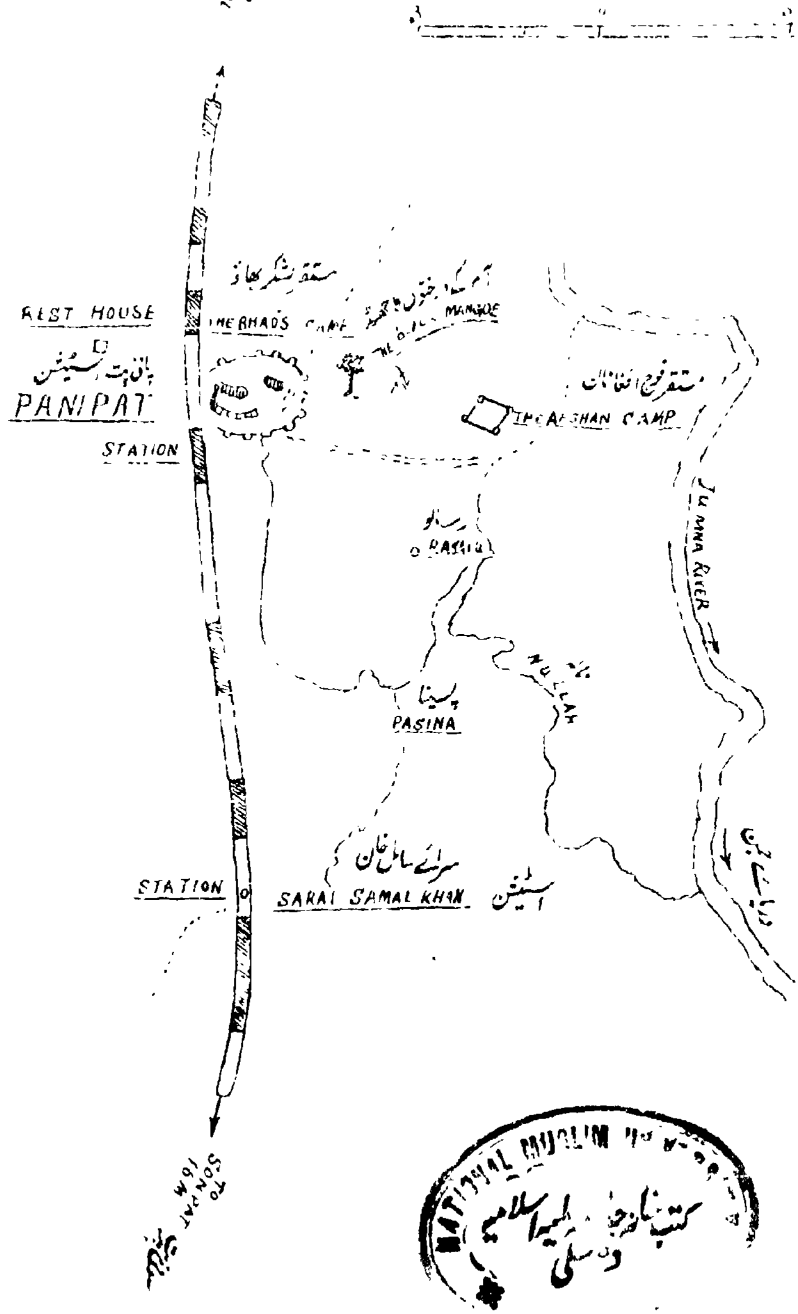
(افغانوں کی فوج کا رخ جنوب کی طرف تھا)

افغانی فوج کے بڑے بڑے سرداروں کی جمعیت بہ ترتیب نقشہ

۱ برخوردار خان
۲ امیر بیگ اور دیگر مغل حکام
۳ درانی خان
۴ حافظ رحمت خان
۵ احمد خان بنگش
۶ اشرف الوزراء
۷ شجاع الدولہ
۸ نجیب الدولہ
۹ شاہ پسند خان
۱۰ شتری توپخانہ اور ایرانی گولندار

نوٹ:۔ فریقین کے درمیان تقریباً ۵ میل کا فاصلہ تھا۔

نقشہ پانی پت و علاقہ گردونواح



زمانہ

جلد ۵۲ اپریل ۱۹۲۹ء نمبر ۴

پانی پت کا خونین میدان

از سید جالب صاحب دہلوی سابق ایڈیٹر "ہمدم" لکھنؤ

نمبر ۲

آدینہ بیگ کی سازش مرہٹون سے

سکھون کو آدینہ بیگ خان کی غفلت و مسامحت سے اس طرح زور بانڈھنے کا موقعہ ملا تھا جو جہان خان سے دلی کاوش رکھتا تھا اور اپنے کو پنجاب کا حکمران بنانا چاہتا تھا۔ آدینہ بیگ خان کی عماد الملک سے بھی سازش تھی۔ جب سکھون سے اُسکی توقعات پوری نہین ہوئین تو اُس نے عماد الملک سے رجوع کیا اور اس نے رگھوبا کو پنجاب پر حملہ آور ہونے کے لیے اُبھارا اور آدینہ بیگ خان کی طرف سے اس امر کا اطمینان دلایا کہ وہ ان کے لئے تسخیر پنجاب مین ہر قسم کی سہولت پیدا کریگا۔ رگھوبا نے پانچ دریاؤن کی زرخیز سرزمین کو تاراج کرلے کا یہ موقعہ بہت اچھا سمجھا اور پنجاب مین مغلیہ شہنشاہ دہلی کا اقتدار بحال کرنے اور اُسکو افغانون کے پنجے سے چھڑانے کا اعلان کرکے عوام کو اپنی اس مہم کا موافق و مؤید بنایا۔ آدینہ بیگ خان نے حسب وعدہ مرہٹون کا ساتھ دیا اور سکھون کی طرف سے بھی کوئی مزاحمت نہین ہوئی۔ سرہند پر شاہ ابدالی کا قلعدار سردار عبد الصمد خان مرہٹون کے سامنے تاب مقاومت نہ لاسکا۔ اور قلعہ مسخر ہونے پر اُنکے ہاتھون مین قید ہوگیا مرہٹون نے سردار موصوف کا سامانِ امارت ضبط کیا۔ اور سکھون نے جو آدینہ بیگخان کے ساتھ تھے اہلِ شہر کا مال و متاع لوٹا۔

مرہٹے اٹک تک پنجاب قابض ہو گئے

سرہند سے رگھوبا اور مرہٹہ سردار باطینان تمام بڑھتے اور ملک پر اپنا عمل دخل کرتے ہوئے لاہور پہنچے۔ اور وہان سے اور آگے بڑھے۔ گجرات کے مقام پر جہان خان اور شاہ ابدالی کے دیگر سردارون نے کسی قدر ان کا مقابلہ کیا۔ مگر جمعیت کم ہونے کی وجہ سے شکست کھائی اور اٹک پار اُترکر کابل بھاگ گئے۔ مرہٹون نے دریائے اٹک تک اُن کا تعاقب کیا۔ اور بعد ازان ملتان اور سندھ کا شمالی علاقہ بھی لے لیا۔ جب مرہٹہ سپاہیون نے جنکو اپنے گھرون سے نکلے ایک عرصہ گذر چکا تھا۔ رگھوبا سے واپسی وطن کا تقاضا کیا۔ تو اس نے آدینہ بیگ خان سے ۷۵ لاکھ روپیہ سالانہ شہنشاہ دہلی کے نام سے مگر فی الحقیقۃ مرہٹون کے لیے مقرر کرکے اسکو اپنی طرف سے لاہور و ملتان دونون صوبون کا حاکم بنا دیا۔ اور ستاباجی پٹیل اپنے ایک سردار کو مالیات کی نگرانی کے لئے لاہور مین اسکے ساتھ چھوڑا۔

مرہٹون کا عروج اقتدار

اس وقت مرہٹون کی قوت انتہائے عروج پر تھی۔ اور شیواجی کے جانشین مہاراجہ شاہو نے بالاجی باجی راؤ کو اُسکے دادا اور باپ کے منصب پیشوائی پر مقرر کرتے ہوئے جو تحریری ہدایات دی تھین۔ اُنکے بموجب مغلون کے تخت شہنشاہی کی آڑ مین اُنھون نے سارے ہندوستان پر اپنا اقتدار قایم کرلیا تھا اور دکن مین دریائے تنگ بھدرا کے کنارے سے لیکر شمال مین دریائے اٹک کے کنارے تک اپنے جھنڈے گاڑ دئے تھے۔ اور اُن کے عامل ہندوستان کے عرض مین احمد آباد گجرات سے لیکر بردوان تک اور طول مین راولپنڈی (پنجاب) سے لیکر ارکاٹ (احاطۂ مدراس) تک انکے لئے "چوتھ" اور "سردیش مکھی" وصول کر رہے تھے۔ رگھنا تھ راؤ جب شمالی ہند مین یہ فتوحات حاصل کرنے کے بعد پونا مین اپنے بھائی پیشوا کے پاس واپس گیا۔ تو وہان کے لوگ اُسکے لشکر کی شان و شوکت دیکھکر دنگ رہ گئے۔ اور اسنے ہندوستان کے ایسے نادر تحائف پیشوا کی خدمت مین پیش کئے جنکی خوشنمائی اور چمک دمک نے مرہٹون کی مرکزی حکومت کے کارکنان کی آنکھون کو خیرہ کر دیا۔ رگھنا تھ راؤ کو اپنی اس عظیم الشان کامیابی پر ناز تھا کہ اسنے مرہٹہ سوارون کے گھوڑون کو دریائے اٹک مین پانی پلایا تھا ہندوؤن کی قدیم روایات مین دریائے اٹک کو ہندوستان کی ایک قدرتی سرحد مانا جاتا تھا۔ لہذا اٹک تک کا علاقہ مرہٹون کے ہاتھون مسخر ہونے پر تمام دکنیون مین فخر و مسرت کا ایک زبردست احساس پیدا ہوا اور رگھنا تھ راؤ کو خاص طور سے راجہ ستارہ نے اپنے سامنے طلب کرکے خلعت عطا کیا۔

رگھنا تھ راؤ کا تفاخر اور بھاؤ کا رشک

رگھنا تھ راؤ کو اپنی شان و شوکت کی ان داستانون کے بیان کرنے مین ایک خاص لطف آتا تھا۔ جس سے اُسکے بڑے چچا زاد بھائی سداشیو راؤ بھاؤ کو جو وسط ہند و کرناٹک کی لڑائیون مین جوہر شجاعت دکھا چکا تھا۔ اور قدرتی اوصاف سپہ گری سے متصف تھا۔ رشک پیدا ہوا۔ اور اسنے رگھوبا کے

فخر و ناز کو توڑنے کے لیے ایک پہلو نکال لیا۔ کیونکہ رگھوبا کو اپنی طویل مہمات کے دوران مین کثیر اخراجات کا زیر بار ہونا پڑا تھا۔ اور اُسکی ہُنڈیان مرہٹون کے مرکزی خزانے پر لکھی ہوئی شمالی و وسطی ہند کے اکثر مہاجنون اور ٹھیکہ دارون کے پاس تھین۔ یہ ہنڈیان جب کچھ عرصے کے بعد پونا مین پہنچنے لگین تو کارکنانِ صیغۂ مال کو اُن کی ادائگی مین دقتین پیش آئین اور بالآخر ان کی رپورٹین پیشوا تک پہونچین۔ چند ماہ بعد حساب کرنے سے معلوم ہوا کہ رگھوبا نے اپنی شاندار و کامیاب مہمات مین جتنا روپیہ پیدا کیا۔ اُس سے ایک روایت کے بموجب ۲۰، ۲۲ لاکھ اور دوسری روایت کے موافق اسّی بیاسّی لاکھ زیادہ اُسکو فوجی ضروریات مین خرچ کرنا پڑا۔ اور لوازم شان و شوکت بہم پہنچنے اور بعید علاقون مین مرہٹون کی قوت کا سکّہ لوگون کے دلون پر بٹھنے کے سوا مرکزی خزانے کو اُن تازہ فتوحات سے کچھ حاصل نہین ہوا بلکہ اُلٹا ۴۰ لاکھ روپیہ علاقجات دکن کی آمدنی سے خرچ کرنا پڑا۔ اور چونکہ مرہٹے ابتدا سے لُوٹ مار کے عادی تھے اور کسی مہم کی کامیابی کا اُسکے مالی نتائج ہی سے اندازہ کرتے تھے۔ اِس لیے بھاؤ کو رگھوبا کے چڑانے کا موقعہ ہاتھ آیا۔ اور اُسنے پیشوا کے روبرو اس معاملے پر اسکو مطعون کیا۔

بھاؤ کی سپہ سالاری مہم ہندوستان

رگھوبا کو قدرتی طور پر یہ ناگوار گذرا کہ مالی پہلو کو نمایان کرکے اُسکے شاندار کارنامون پر پانی پھیرا جائے۔ اِس لیے کچھ عرصے بعد جب احمد شاہ ابدالی کی آمد آمد کا غلغلہ ہوا۔ اور جو مرہٹہ سردار رگھوبا کی واپسی پر شمالی ہند مین رہ گئے تھے اُن کو مدد پہنچانے اور ابدالی کے حملے کو ایسی قوت کے ساتھ پسپا کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ پھر ہندوستان کا رُخ نہ کرسکے۔ تو رگھوبا کو جس مین سیاسی جوڑ توڑ کی قابلیت یقیناً بہت زیادہ تھی۔ اور شمالی علاقون کے حالات کا عملی تجربہ بھی ہوچکا تھا۔ محض مالی پہلو کو مدِ نظر رکھکر اس تازہ مہم کی کمان سپرد نہین کی گئی۔ اور سداشیو راؤ بھاؤ کو اس کا افسر مقرر کیا گیا۔ جس نے اپنے برادرِ عم زاد پیشوا کو خوش کرنے کے لئے اُسکے بڑے بیٹے وسواس راؤ کو جو ۱۷-۱۸ سال کی عمر کا ایک نہایت خوبصورت نوجوان تھا۔ مہم کا اعلےٰ افسر نامزد کرایا۔ اور خود برائے نام اُسکے ماتحت سپہ سالاری کا عہدہ قبول کیا۔ مگر درحقیقت پونا سے مرہٹہ فوج کی روانگی کے وقت سے لیکر میدانِ پانی پت مین اُسکی تباہی تک بھاؤ ہی اُسکے سیاہ و سپید کا پورا مالک تھا۔ بعض مرہٹہ روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدا مین رگھوبا ہی کو اِس مہم کی افسری کے لئے نامزد کیا گیا تھا۔ مگر اس نے بھاؤ کے طعنے کا خیال کرکے اِس ذمہ داری کو قبول کرنے سے انکار کیا اور پیشوا سے ایسے لوگون کو بھیجنے کے لیے کہا جو خزانے کو کچھ فائدہ پہونچا سکین۔

شاہ ابدالی کے حملے کا آغاز

احمد شاہ ابدالی نے اپنے بیٹے تیمور شاہ کی اور اپنی شادیان تیموریہ شاہزادیون سے کرکے دہلی کے خاندان شہنشاہی سے مذہبی اتحاد کے علاوہ دنیوی قرابت کا تعلق بھی پیدا کر لیا تھا۔ لیکن بحیثیت حکمران افغانستان کے مغلون کے اقتدار کی بحالی اُسکا کوئی دلی مقصد نہین ہو سکتا تھا لیکن اگر عماد الملک مرہٹون کو پنجاب پر۔ جسکو شاہ ابدالی نے سرہند تک عملاً اپنی سلطنت مین شامل کر لیا تھا مسلط نہ کراتا تو اسمین شبہ ہے کہ احمد شاہ پھر ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی ضرورت محسوس کرتا کیونکہ اُسکے لئے اپنے آبائی مُلک ہی مین کافی مصروفیتین موجود تھین اور افغانون کی فطرت اُنکے مختلف قبائل کو شاہ موصوف کے خلاف سرکشی پر آمادہ کرتی رہتی تھی۔ چنانچہ مرہٹون کے پنجاب کو تاخت و تاراج کرنے کے وقت بھی وہ بلوچی سردار ناصر خان حاکم قلات کی تادیب مین مصروف تھا۔ پہلے اسکا بیٹا تیمور شاہ۔ جو سکھون کی بغاوت کے بعد ہی لاہور سے رخصت ہو گیا تھا۔ شاہ کے پاس پہنچا۔ اور بعد ازان جہان خان نے پہنچکر پنجاب پر مرہٹون کی تاخت و دستبرد کا سارا حال بیان کیا۔ شاہ ابدالی قدرتی طور سے اُسپر سخت غضبناک ہوا۔ مگر بلوچیون کی مہم نے کچھ عرصے تک اسکو ہندوستان پر توجہ کرنے کی اجازت نہین دی۔ جب ناصر خان کا زور ٹوٹ گیا اور شاہ کو بلوچستان کی طرف سے اطمینان ہو گیا۔ تو اُسنے وہین سے اپنی سپاہ کو درست کرکے شکارپور کا راستہ لیا۔ اور بالائے سندھ سے دریائے اٹک کے کنارے کنارے شمال کی طرف بڑھکر پشاور کے قریب اسکو عبور کیا۔ یہان افغانی سپاہ کی ایک اور جمعیت آکر شاہ کے ساتھ شامل ہوئی اور اُسکو لے کر وہ لاہور کی طرف تیزی سے بڑھا۔ سابا جی مرہٹون کا عامل اور آدینہ بیگ خان صوبہ دار نے دتاجی سیندھیا اور ملہار راؤ ہلکر کو۔ جو روہیلکھنڈ مین اپنی فوجین لیے پڑے ہوئے تھے۔ شاہ ابدالی کی پیشقدمی سے مطلع کیا۔ مگر نجیب الدولہ سے مصالحت ہو جانے کے بعد بھی اُنکی مدد کو نہ پہونچ سکے۔ آدینہ بیگ خان کے پاس لاہور مین فوجی قوت بہت کم تھی اس لئے اُس نے اور سابا جی نے فرار کو قرار پر ترجیح دی۔

شاہ ابدالی کی پیشقدمی ہندوستان کی طرف

احمد شاہ ابدالی کا پنجاب کی سرحد مین مقام سرہند تک اپنا عمل دخل کرنا ضروری تھا۔ مگر لاہور پہنچنے سے پہلے ہی نجیب الدولہ کی طرف سے مرہٹون کے ہاتھون محصور ہونے کی فریاد اور شہنشاہ عالمگیر ثانی کی طرف سے عماد الملک کی شرارتون کی شکایت شاہ موصوف کے پاس پہنچی تھی۔ اور لاہور سے سرہند تک متعدد قاصد پہنچے۔

سورج مل کی مروت اور عماد الملک کے ساتھ

اسی وقت مین عماد الملک نے شہنشاہ عالمگیر ثانی کو کوٹلہ مین قتل کرکے محی السنہ کو دہلی مین تخت پر بٹھایا۔ جب شاہ ابدالی سرہند سے آگے بڑھا تو عماد الملک اُس کے غصہ سے خوف زدہ

ہوکر سورج مل جاٹ کے علاقے مین چلا گیا۔ اور اگرچہ ابھی چند سال قبل ہی عماد الملک سیندھیا اور ہلکر دونون کو اس کے علاقے پر چڑھا لے گیا تھا۔ مگر امرائے شہنشاہی کا راجپوتانہ کے ہندو رؤسا کے دلون مین اس قدر وقار و احترام تھا اور مذہبی تعصب ایسا ناپید تھا۔ کہ عماد الملک جب اس سے رجوع لایا۔ تو سورج مل نے اسکی سابق شرارت کا مطلق کوئی خیال نہین کیا۔ اور اپنے ایک مضبوط قلعے مین اسکو اور اسکے رفقاء کو جگہ دی اور عرصۂ دراز تک خاطر مدارات کرتا رہا۔

عماد الملک کا انجام سورج مل جاٹ کے ایک قلعے مین پناہ گزین ہونے کے بعد سے عماد الملک کا اقتدار سیاسی بالکل زائل ہوگیا۔ اور پھر اس نے ملکی معاملات مین کوئی نمایان حصہ نہین لیا۔ عہد شاہ عالم مین اسکو دہلی کے دربار مین منھ دکھانے کی جرأت نہین ہوئی اور وہ عرصۂ دراز تک سورج مل کی مہمانداری سے بہرہ ور ہونے کے بعد فرخ آباد۔ بوندیلکھنڈ و وسط ہند مین مختلف رؤساء کی فیاضی سے بسر اوقات کرتا رہا۔ اور اسی زمانے مین حج و زیارت مدینہ سے بھی مشرف ہوا۔ اپنی عمر کا آخری ایام اس نے علاقۂ گوالیار مین بسر کیا۔ جہان دربار سیندھیا کی طرف سے باون قریات عماد الملک کو گذارے کے لئے دئے گئے۔ جو اب تک اسکی اولاد کے قبضے مین ہین۔ اور ریاست باونی کدورہ کہلاتے ہین۔ انگریزون کا جب وسط ہند پر تسلط ہوا۔ تو انھون نے عماد الملک کے جانشین ناصر جنگ کو جاگیر پر قابض پایا اور اسکا قبضہ برقرار رکھا۔ عماد الملک کی قبر وہین واقع ہے۔ دربار مغلیہ کے امراء مین کوئی امیر ایسا نہین گذرا جس کے طرز عمل سے ہندوستان کی قوت کو اس قدر نقصان پہنچا۔

دتاجی سیندھیا کی فوج کی تباہی احمد شاہ ابدالی کی پیش قدمی کے وقت دتاجی سیندھیا اور ملہار راؤ ہلکر کی جو افواج شمالی ہند مین موجود تھین۔ انکی قوت فارسی تاریخون مین ۸۰ ہزار سوار جرار بیان کی گئی ہے مگر اس مین یقیناً مبالغہ ہے یا ان دونون سردارون کی پوری جمعیت کو بشمول بھیر و بنگاہ شمار کر لیا گیا ہے۔ مرہٹون کے مستند مورخ کپتان گرانٹ ڈف نے دکنیون کی تعداد ۳۰ ہزار لکھی ہے۔ جو سیندھیا اور ہلکر کے درمیان تقریباً مساوی طاقت کے دو ٹکڑون مین منقسم تھی۔ ایک روایت کے بموجب دتاجی نے بوڑیہ کے قریب احمد شاہ ابدالی کی پیشقدمی کو روکنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ اور اپنی فوج کو دہلی کی طرف ہٹا لے گیا۔ ملہار راؤ ہلکر ابدالی کے بڑھنے کی خبر پاکر مقام کوٹ پوتلی قصبۂ ریواڑی کے نواح مین۔ جو علاقۂ میوات کی سرحد پر واقع ہے۔ ہٹ آیا۔ دتاجی سیندھیا کا اس وقت دہلی مین رہنا بے موقع تھا۔ اور مرہٹون کی ایک روایت کے بموجب اسکی بی بی بھاگیرتی بائی نے جس کے وضع حمل کا زمانہ قریب تھا۔ اس کی منت سماجت بھی کی کہ وہ دار السلطنت سے جنوب کی طرف ہٹ جائے۔

مگر دتاجی نے دہلی کو چھوڑنے سے انکار کیا۔ اور ایک سپاہ کو جن راؤ وابلے اور بالوجی سیندھیا کی ماتحتی مین براڑی گھاٹ پر تعینات کردیا کہ وہ احمد شاہ ابدالی کو عبور دریا سے روکین۔ دتاجی نے خود اپنی بڑی فوج کے ساتھ دہلی مین چھاؤنی ڈالی۔ مگر دار السلطنت کی عزت ملحوظ رکھی۔ اور اسکی فوج نے شہرانون پر ہاتھ نہین ڈالا۔ حالانکہ چند روز بعد ہی جب احمد شاہ ابدالی دہلی پہنچا۔ تو افغانون نے بےتکلف اہل شہر کو لوٹنا شروع کردیا۔ اور نجیب الدولہ اور سرداران روہیلہ نے۔ جو سال گذشتہ مرہٹون کے ہاتھون سخت تکلیف اٹھانے اور آیندہ اس سے زیادہ روز بد دیکھنے کا خوف رکھنے کے باعث شاہ ابدالی کے ساتھ ہو گئے تھے۔ شاہ موصوف سے کہہ سن کر بمشکل افغانون کو باشندگان دار السلطنت پر ایسی بدعات سے رکوایا۔ جیسا کہ اوپر ظاہر کیا جا چکا ہے۔ مرہٹون کی تاخت و تاراج صرف حصول زر کے مقصد پر مبنی تھی اور اس مین مذہبی عداوت یا قومی منافرت کا کوئی جذبہ شامل نہ تھا۔ اور ہندو چونکہ اپنی کفایت شعاری کی عادت اور بنج بیوپار کی قابلیت کے باعث آج کل کی طرح اُس وقت بھی نسبتہً مالدار تھے۔ اِس لئے مرہٹہ لٹیرون کے ہاتھون وہی زیادہ نقصان اُٹھاتے تھے۔ اور سیندھیا اور ہلکر کی فوجین جن دیہات سے گذرتی تھین اُنکو بےچراغ کر دیتی تھین۔ لہذا دیہاتیون کے دلون مین مرہٹون کے خلاف غم و غصہ پیدا ہوا۔ اور اُسکا خمیازہ بالفاظ کپتان گرانٹ ڈف دتاجی کو یہ بھگتنا پڑا۔ کہ گاؤن والون نے باوجودیکہ ان دیہات کی آبادی زیادہ تر ہندوؤن پر مشتمل تھی۔ بوجہ غصہ و عداوت کے اسکو احمد شاہ ابدالی کی نقل و حرکت سے مطلع نہین کیا۔ شاہ ابدالی نے اِس موقعہ پر یہ چال کی کہ اپنی فوج کے ایک حصے کو براڑی گھاٹ کے گرد و نواح مین جمنا پار نقل و حرکت دیتا رہا۔ جسکو دتاجی نے شاہ کی اصل فوج خیال کیا۔ اور براڑی گھاٹ کی حفاظت کا انتظام کردینے پر وہ مطمئن رہا۔ مگر شاہ ابدالی نے اپنی بڑی فوج کے ساتھ نجیب الدولہ کی واقفیت علاقہ اور دیہاتیون کی چشم پوشی کی بدولت دہلی کے قریب چپکے سے جمنا کو عبور کرلیا اور عین مکر سنکرانت کے تہوار کے روز جب کہ سیندھیا نے دہلی مین اپنی فوج کی پریڈ کرائی اور افسرون کو اپنے ہاتھ سے تل چاول تقسیم کئے تھے۔ شاہ ابدالی کی سپاہ نے اسکو دو طرف سے گھیر لیا۔ یعنی ہراولی دستہ نے براڑی گھاٹ پر جمنا سے گذر کر جن راؤ وابلے کے محافظ دستہ کو منہزم کرکے دہلی کا رُخ کیا اور شاہ ابدالی اپنی بڑی سپاہ کے ساتھ دوسری جانب سے حملہ آور ہوا۔ دتاجی سیندھیا نے بڑی پامردی سے مقابلہ کیا۔ مگر چونکہ اُسکی فوج تعداد مین بھی شاہ ابدالی کی سپاہ سے کم تھی اور اسکے حملے سے غافل بھی تھی۔ اِس لئے افغانون نے بہت جلد اسکو مغلوب کرلیا۔ دتاجی اور اسکا سوتیلا بھائی جیوتبا میدان کارزار مین کھیت

رہے اور اُسکا دادا اور نوجوان بھتیجا جنکوجی پسر جیاپا سیندھیا دونون ہزار بقیۃ السیف آدمیون کے ساتھ بمشکل اپنی جان بچا کر بھاگا جسکی دتاجی نے خود نوجوان موصوف کو تاکید کی تھی۔ جنکوجی جب سورج مل جاٹ کے قلعہ کومبھیر مین پہنچا۔ تو اُسکے بدن پر چھوٹے بڑے ستائیس زخم تھے۔ سورج مل نے اُسی وقت جراحون کو بلوا کر بڑے زخمون مین ٹانکے دلوانے اور دوسرون مین ریشم جلا کر بھروایا اور جنکوجی کے رفقاء کو بھی پناہ دی۔ اس قلعہ کومبھیر مین اس وقت عمادالملک غازی الدین اور راجہ ناگرمل بھی موجود تھے اور اردو زبان کے سب سے بڑے شاعر حضرت میر تقی میر بھی راجہ موصوف کی رفاقت مین دہلی سے روانہ ہوئے تھے جسکا حال انھون نے اپنی خود نوشت سوانح عمری "ذکر میر" مین لکھا ہے اور اسکے ضمن مین پانی پت کی جنگ سوم کا بھی ذکر کیا ہے!

ملہار راؤ ہولکر کی فوج کی تباہی

دتاجی سیندھیا کی فوج شاہ ابدالی کی اس تیزدستی سے بالکل تباہ ہوگئی۔ اور شاہ موصوف دہلی مین ٹھہرا۔ مگر اس نے دربار مغلیہ کی سیاسیات مین کچھ دخل نہین دیا اور محی السنہ جسکو عمادالملک نے تخت نشین کیا تھا۔ بدستور حکمران رہا۔ اور شاہ ابدالی دہلی سے رخصت ہوگیا۔ ملہار راؤ ہولکر نے اہل رسیدہ دتاجی سیندھیا سے زیادہ دانشمندی کا اظہار کیا۔ اور قصبۂ تواڑ کی سے مرہٹون کے قومی طریقے پر قزاقی لڑائیون کا سلسلہ جاری کرنے کے ساتھ جنوب کی طرف ہٹنا شروع کیا۔ اسکے ساتھ ہی ہولکر نے سورج مل سے امداد چاہی۔ سورج مل نے صاف جواب دیدیا۔ کہ وہ ملہار راؤ کی موجودہ قوت کے ساتھ شاہ ابدالی سے نبرد آزما ہونے کی طاقت نہین رکھتا۔ اگر افغان اسکے علاقے پر حملہ آور ہونگے تو وہ اپنے مضبوط قلعون مین پناہ لے گا۔ اور جس طرح بن پڑیگا اپنی جان بچائیگا سورج مل نے ہولکر کو بھی صلاح دی کہ وہ فی الحال جنوب کی طرف ہٹ جائے اور شاہ ابدالی کا سامنا نہ کرے۔ ہولکر نے اس مشورے پر عمل کیا۔ اور لمبے لمبے کوچ کرکے آگرہ کے اُس طرف نکل گیا۔ مگر اس اثناء مین اسکو اپنے جاسوسون سے یہ خبر ملی کہ ایک بڑا بدرقہ کثیر سامان رسد اور کچھ خزانہ لیے ہوئے احمد خان بنگش کے ایک سردار کی زیر حفاظت شاہ ابدالی کے لشکر کو جارہا ہے۔ ہولکر کو بمصداق ع بدزد طمع دیدۂ ہوشمند اس سے لالچ پیدا ہوا۔ اور اسنے اپنے سوارون کی ایک مضبوط جمعیت کے ساتھ تیزی سے جمنا کو عبور کیا اور بدرقہ پر حملہ آور ہو کر احمد خان بنگش کے محافظ دستہ کو یکایک جا دبایا۔ اور کسی قدر سامان رسد اور روپیہ اُن سے چھین لینے مین کامیاب ہوگیا۔ اور اسکے بعد جمنا کو دوبارہ عبور کرکے سکندرہ پہنچا۔ اور وہان شہنشاہ اکبر اعظم کے مقبرے کے حوالی مین اپنا کیمپ ڈالا۔ کیونکہ ہولی کا تہوار آگیا تھا۔ ملہار راؤ ہولکر کی فوج کے لوگ تو سکندرہ مین ہولی منارہے تھے اور یہان احمد شاہ ابدالی کو جب بدرقہ کے لٹ جانے کی خبر پہنچی تو

وہ قدرتی طور پر سخت غضبناک ہوا اور اُس نے افغان سوارون کا ایک زبردست دستہ جس کی تعداد دس سے پندرہ ہزار تک بتائی جاتی ہے اپنے وزیراعظم کے بھانجے شاہ پسند خان کی سرکردگی مین ہولکر کی تادیب کے لئے بھیجا۔ جس نے ایک شبانہ روز مین اسی کوس کا فاصلہ طے کیا اور دہلی پہنچ کر صرف ایک روز دم لیا اور یہان سے ایک رات مین درمیانی فاصلہ طے کرکے اور خاموشی کے ساتھ جمنا کو عبور کرکے علی الصباح وہ ایسے وقت پر سکندرہ مین پہنچ گیا۔ جبکے ملہار راؤ ہولکر کی فوج کے لوگ ہولی کا تہوار منا رہے تھے اور دھولہنڈی کے ناچ رنگ مین مشغول تھے شاہ پسند خان کے افغانون کی ناگہانی تاخت نے ہولکر کی فوج کو بڑے درجے تک تباہ کر دیا۔ اور ملہار راؤ کو تین سو آدمیون کے ساتھ گھوڑون کی ننگی پیٹھ پر چڑھکر بمشکل بھاگنے کا موقع ملا۔ باقی اُسکا تمام سامان افغانون کے ہاتھ آیا۔ جس مین وہ خزانہ بھی شامل تھا جو احمد خان بنگش کے بدرقہ سے چند روز قبل چھینا گیا تھا۔ سیندھیا اور ہولکر کی ان فوجون کی تباہی سے دہلی سے لے کر چنبل تک کا علاقہ قریب قریب مرہٹون سے صاف ہوگیا۔ اور احمد شاہ ابدالی نے اسکے بعد قصبہ کول حال علی گڈھ کی طرف متوجہ ہوکر قلعۂ ثابت گڈھ کو جسکا نام سورج مل نے بدل کر رام گڈھ رکھا تھا لڑکر چھین لیا اور اس مین قیام اختیار کرکے اسکے گرد اپنی چھاؤنی ڈالی۔ اس اثناء مین شاہ ابدالی کو پنجاب سے یہ اطلاع ملی کہ آدینہ بیگ خان جو بہت چالاک و خودغرض تھا۔ فوت ہوگیا۔ اور سکھون نے شورش کرکے اُسکے سالے اور دیوان اور پیشکار کو جو دونون ہندو تھے۔ تباہ کر دیا۔ اسپر شاہ ابدالی نے زین خان کو فوجدار سرہند اور بلند خان کو صوبہ دار لاہور و ملتان مقرر کرکے دس ہزار سوارون اور کچھ پیادون کی جمعیت کے ساتھ پنجاب مین انتظام کی غرض سے بھیجا۔ اور خود فصل گرما کے تین سخت مہینے قصبۂ کول مین گذارے۔ جسکے نواح مین متعدد باغ واقع تھے اور شکار بھی بکثرت ملتا تھا۔

مرہٹہ فوج کی شان و شوکت کے ساتھ دکن سے روانگی

رگھوبا نے شمالی ہندوستان کے قدیم دربارون مین دخل و تصرف حاصل کرکے مرہٹہ فوج کا رنگ بدل دیا تھا۔ اور اَب وہ مفلوک الحال نیم برہنہ لٹیرے نہین رہے تھے۔ جو قزاولی طریقے کی لڑائیان لڑتے تھے اور گھوڑون کی ننگی پیٹھ پر سوار ہوکر بھی کوسون کے دھاوے مارتے تھے۔ اور آندھی کی طرح یکایک پہنچکر اپنے دشمنون پر چھا جاتے تھے۔ اور سرسبز علاقون کو لوٹ کر تباہ کر دیتے تھے۔ اَب ان مین ایک باقاعدگی پیدا ہوگئی تھی اور شان و شوکت بڑھ گئی تھی۔ جو اُن کی قدیم تیزدستی مین مانع آتی تھی۔ دکن سے جو فوج شاہ ابدالی کے مقابلے کی غرض سے روانہ ہوئی اُسکی کمان اگرچہ سداشیو راؤ بھاؤ کے سپرد کی گئی۔ جس نے رگھوبا کو فضولخرچی کا

طعنہ دیا تھا۔ مگر اپنی ماتحت فوج کو رگھوبا کے تیار کردہ سامانِ شان و شوکت سے آراستہ کرنے میں اُسکو دریغ نہین ہوا۔

ابراہیم خان گاردی مرہٹون کا معتمد افسر

چنانچہ مرہٹہ مورخ کپتان گرانٹ ڈف نے لکھا ہے کہ بھاؤ کی فوج جو بوقت روانگی بیس ہزار چیدہ سوارون اور دس ہزار مغربی وضع پر تربیت یافتہ پیدل اور قواعددان پیادون پر مشتمل تھی جن مین سے آخر الذکر حصہ ابراہیم خان گاردی کے ماتحت تھا۔ جس نے فرانسیسی افسران کے ماتحت رہکر یورپین طریقے پر فوج کو آراستہ کرنے اور تربیت دینے کا ڈھنگ سیکھا تھا۔ گاردی بھاؤ کا بڑا معتمد علیہ افسر تھا اور آخر وقت تک اپنے آقا کا نمک حلال رہا۔ جیسا کہ آگے چل کر ظاہر ہوگا۔ زمانہ حال کے تاریخ نگار کنلنگیڈ و پارسینس نے میدان پانی پت کی عظیم تباہی کا الزام بھاؤ پر سے ہٹانے کی کوشش مین ابراہیم خان گاردی پر اسکو دھمکیان دینے کا فرضی الزام قائم کرنا چاہا ہے۔ مگر کوئی سند اپنے بیان کی پیش نہین کی ہے۔ بخلاف ازین فارسی تاریخون مین اسکا ذکر موجود ہے کہ افغانون نے معرکۂ پانی پت سے قبل ابراہیم خان گاردی کو اتحاد مذہب و قومیت کا واسطہ دلاکر مرہٹہ لشکر سے توڑ لینے کی سخت کوشش کی۔ مگر وہ کامیاب نہین ہوسکے۔ اور گاردی نے اپنے ماتحت آدمیون کے ساتھ جن مین مسلمانون کی معقول تعداد شامل تھی۔ مرہٹون کی طرف سے پورے جوہرِ شجاعت دکھائے اور وہ میدانِ جنگ سے ایسی حالت مین اُٹھایا گیا جب کہ اُسکا بدن زخمون سے چور چور تھا۔ ابراہیم خان گاردی کے بھائی فتح خان کا بعد مین عرصۂ دراز تک پیشوا کی ملازمت مین رہنا بھی ثابت کرتا ہے کہ گاردی پر کنلنگیڈ و پارسینس کا عائد کردہ الزام غلط ہے۔ ورنہ اگر وہ پانی پت کے معرکے مین کسی موقعہ پر بھاؤ کی ذرا بھی حکم عدولی کرتا۔ تو پیشوا و مرہٹہ سردار اُسکے بھائی اور اہلِ خاندان سے ضرور بدگمان ہوجاتے اور اُسکو اپنی ملازمت مین توپخانے کی افسری کے اہم عہدے پر نہ رکھتے۔

مرہٹہ فوج کا سازوسامان

بقول گرانٹ ڈف بھاؤ کی فوج کے پاس بلند و وسیع خیمے تھے۔ جنکے اندرونی حصے ریشمی اور سپید براق کپڑے سے منڈھے ہوئے تھے اور اوپر بڑے بڑے طلائی و نقرئی کلس لگے ہوئے تھے۔ جو بڑی دُور سے دکھائی دیتے تھے رنگین دھاریدار مضبوط کپڑے کی اونچی قناتین بڑے بڑے افسرون کے خیام کے گرد تنی رہتی تھین۔ ہاتھیون کی کثیر تعداد۔ ہر وضع کے جھنڈے۔ شاندار ساز و یراق سے آراستہ عمدہ نسل کے گھوڑے اور ایک ہندوستانی فوج کے ساتھ کے تمام وہ سازوسامان جنکے باعث اسکا نظارہ اِس قدر موثر ہوتا ہے۔ بھاؤ کے لشکر مین ہر جگہ سے فراہم کئے گئے تھے۔ افسران کا لباس زربفت و کمخواب کا تھا۔ اور فوج کے تمام اشخاص اُن اسباب نمود مین جو بآسانی حاصل شدہ

دولت کا لازمہ ہوتے ہین سبقت لیجانی چاہتے تھے۔ جو شجاع و نامور افسر مرہٹون کے مرکز حکومت مین اس وقت موجود تھے وہ بھاؤ کی رفاقت مین بھیجے گئے۔ مثلاً بلونت راؤ گنپت مینڈلی۔ شمشیر بہادر جو باجی راؤ کا فرزند اسکی مسلمان بیوی سے تھا۔ اور جسکا بیٹا بعد مین علاقہ بوندیلکھنڈ کا مرہٹون کی طرف سے حکمران اور ریاست باندہ کا بانی ہوا۔ نارو شنکر (راجہ بہادر) وتیقل سیو دیو (دینچورکر) ٹریمبک سیتو داشیو (پورندھری) جو سب اوّل درجے کے سردار اور کئی کئی ہزار سوارون کے افسر تھے۔ انکے علاوہ بعض ایسے مرہٹہ سردار بھی بھاؤ کے ماتحت تھے۔ جنکے اسلاف مُغل شہنشاہون کے عہد مین خاص اثر و اقتدار رکھتے تھے اور اب پیشواؤن کے زیر انتظام برہمنون کے عروج سے اُنکی وہ قوت باقی نہ رہی تھی مگر ذاتی شجاعت کے جوہر خاندانی سے وہ متصف تھے۔

بھاؤ کی روانگی سے قبل جملہ مرہٹہ سردارون کے نام جو اس وقت شمالی علاقون مین موجود تھے احکام جاری ہوچکے تھے۔ کہ انکو معہ اپنی فوجون کے بھاؤ کے جھنڈے کے نیچے مجتمع ہوجانا چاہیے۔ چنانچہ بھاؤ کی فوجی قوت اثنائے راہ مین برابر بڑھتی رہی اور دریائے چنبل کو عبور کرنے سے پہلے جنکوجی سیندھیا جو دتاجی سیندھیا کے تباہ شدہ لشکر سے نکل بھاگنے مین کامیاب ہوا تھا اور سورج مل کی زیر نگرانی قلعہ کومبھیر مین اُسکے زخمون کا علاج کرایا گیا تھا۔ ملہار راؤ ہلکر جو سکندرے پر اپنی فوج کے افغانون کے ہاتھ سے تباہ ہونے کے وقت بمشکل اپنی جان بچا سکا تھا۔ دتاجی گائیکوار۔ جسونت راؤ بنواڑ۔ آپاجی راؤ اٹھاؤلے۔ انتاجی منکیسر۔ گوبند پنت بوندیلے۔ جس نے چاندپور و امروہہ کے گرد روہیلون کے دیہات بڑی بیدردی سے تباہ کئے تھے۔ اور متعدد دیگر سردار اپنی فوجون کے ساتھ بھاؤ کے لشکر مین شریک ہوگئے۔ اورین صاحب نے تاریخ زوال سلطنت مغلیہ مین مرہٹہ ذرائع سے اطلاع کی بناء پر لکھا ہے کہ چنبل کو عبور کرنے کے وقت گاردی کے دو ہزار سوارون اور نو ہزار پیادون کے علاوہ جنکو مغربی طریقون پر فوجی تربیت دی گئی تھی۔ اور جو توڑہ دار بندوقون سے مسلح تھے پانچ چھ ہزار مزید بے قاعدہ پیادے اور اٹھاون ہزار سواران جرار بھاؤ کے جھنڈے کے نیچے موجود تھے۔ جن مین سے پانچ ہزار ملہار راؤ ہلکر۔ دس ہزار جنکوجی سیندھیا۔ آٹھ ہزار دتاجی گائیکواڑ۔ دو ہزار جسونت راؤ بنواڑ اور باقی ماندہ دیگر مرہٹہ سردارون کے رسالون کے جوان تھے۔ چالیس نئی وضع کی توپین گاردی کے توپخانے مین تھین اور توپون کی مجموعی تعداد دو سو سے کم نہین تھی۔ جن مین سے اکثر توپین بہت بھاری تھین۔ انکے علاوہ پنڈارون کے دو سردار اپنے پندرہ پندرہ ہزار لٹیرے اور مفلوک الحال سوارون کے ساتھ بھاؤ کے لشکر مین آکر شریک ہوگئے تھے۔ ان پنڈارون مین مسلمانون کا عنصر کافی موجود تھا

چنبل کو عبور کرنے کے بعد راجپوتانہ کے راجگان بھی اپنی جمعیتوں کے ساتھ مرہٹوں سے آکر ملے اور سورج مل جاٹ بھی ہولکر کے کہنے سے تیس ہزار آدمیوں کے ساتھ شریک ہوا۔

مرہٹوں اور راجپوتوں کے احساسات

اگرانٹ ڈف راجپوتوں کی شرکت سے یہ یاد کرانا چاہتا ہے کہ شمالی ہند کے ہندؤوں نے اس معرکہ کو قومی مقصد بنالیا تھا مگر یہ انگریزی مورخین کا عام رنگ ہے اور اس ملک کی معمولی سیاسی لڑائیوں پر وہ اسی طرح مذہبی رنگ چڑھانے کی کوشش کرتے ہیں درحقیقت یہ ہندوستانیوں اور افغانوں کی باہمی کشمکش تھی۔ بھاؤ کے خود سے خود اس سے بعض فاحش غلطیاں کرادی ہوں۔ مگر ہولکر سیندھیا وغیرہ مرہٹہ سردار اسکو اسی رنگ میں دیکھتے تھے اور راجپوت سردار اور سورج مل بھی یہی جذبات رکھتے تھے اور شاہ ابدالی انکے نزدیک ایک بیرونی حملہ آور تھا جو مغل شہنشاہی حکومت ہند کے دو صوبوں پنجاب اور سندھ کو چھین چکا تھا۔ اور بقیہ علاقوں کو بھی مسخر کرنا چاہتا تھا۔ ابدالی کے جو ہم قوم روہیلے اور بنگش پٹھان ہندوستان میں بعض شہنشاہی علاقوں پر متصرف تھے۔ وہ اسکا ساتھ دے رہے تھے۔ اور مرہٹے اور راجپوت ان پٹھانوں کا زور توڑنا۔ احمد شاہ ابدالی کو افغانستان واپس جانے پر مجبور کرنا۔ اور شہنشاہی صوبوں کو اس سے چھڑانا چاہتے تھے۔ اور خود شہنشاہ کے کارکنان کی حیثیت سے اُن پر متصرف ہوکر فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ مرہٹوں کے ان خیالات کا ثبوت اُن خطوط سے ملتا ہے۔ جو انھوں نے نواب شجاع الدولہ صوبہ دار اودھ کو لکھے تھے۔ جسکا نانا نواب برہان الملک اگرچہ خود مغل تھا اور نصف صدی قبل ایران سے آکر دربار شہنشاہی میں ملازم ہوا تھا۔ اور مرہٹوں نے اسکے ہاتھ سے ایک مرتبہ میدان جنگ میں شکست بھی کھائی تھی۔ مگر صفدر جنگ کے شہنشاہ کا وزیر اعظم بننے پر اب اسکے بیٹے شجاع الدولہ کو وہ ایک ملکی امیر سمجھنے لگے تھے۔ اور شاہ ابدالی کی رفاقت سے باز رکھنا چاہتے تھے۔

بھاؤ کے ایک خط کا مضمون

مرہٹہ سپہ سالار کا ایک خط بنام شجاع جو ہنوز محفوظ ہے اس میں بھاؤ نے نواب ممدوح کو اس طرح نشیب و فراز دکھایا ہے کہ "ہم اور آپ ایک کشتی کے بادبان ہیں یعنی شہنشاہ ہندوستان کے خادم و خیرسگال ہیں۔ افغان لوگ ہندوستان والوں کی جان و مال اور ناموس کے دشمن ہیں۔ اور یہاں کے مسلمانوں کو ہندؤوں سے بھی بدتر جانتے ہیں۔ ہندوستان کے امرا میں جس کو ان افغانوں سے دلی نفرت ہے۔ وہ صرف آپ ہیں۔ اور باقی سب امراء ایک دوسرے سے متفق ہیں۔ احمد خان بنگش کو اگرچہ دربار شہنشاہی سے امیر الامراء کا مرتبہ ملا ہے۔ مگر ہم قومی کے اثر سے وہ افغانوں کی شرکت اختیار کرینگے۔ بالفرض افغان اس وقت وکیلوں (مرہٹوں) پر غالب

آ گئے۔ تو اس وقت شاہ افغانستان اور آنکے رفیق سردارون کا دور دورہ ہوگا۔ تمھین کون پوچھیگا اور ولایت کے ہزارہا اُمراء کی آواز مین ایک (ہندوستانی) امیر کی آواز نقارخانے مین طوطی کی صدا کا حکم رکھیگی۔ اور شہنشاہ ہند بھی کیا کرسکین گے۔ اور اُن کو بیٹھنے کے لئے کونسا ٹھکانہ ملیگا۔ ہمارا مقصود پٹھانون کی بیخ کنی ہے۔ جنکا دماغ شاہ ابدالی کی امداد سے فلک الافلاک پر پہنچ گیا ہے۔ اسکے بعد ہم امیر تیمور صاحبقران کے مکان کو آباد کرنا چاہتے ہین ہم یہ گوارا نہین کرسکتے۔ کہ اغیار انکی جگہ بیٹھین اور وہ دربدر پھرین۔ اگر تم کو بھی اس خاندان کا پاس نمک ہے اور اپنے ولی نعمت کے مکان کی رونق منظور ہے تو بلا تامل ہمارے شریک حال ہو جاؤ۔ اگر تم نے ہمارا ساتھ دیا اور ہم نے افاغنہ پر فتح پائی۔ تو وارث سلطنت شاہزادہ عالی گوہر کو تخت شہنشاہی پر بٹھا کر اور تم کو وزارت عظمے کا منصب دلاکر آمدنی ملک مین سے اپنا حصہ مقرر کرانے کے بعد ہم دکن کو واپس چلے جائینگے۔ اور ہمارا مقصد آپکی رفاقت سے یہ نہین ہے کہ آپ ہمارے لشکر مین شامل ہوکر غنیم سے لڑین۔ بلکہ ہماری غرض یہ ہے کہ آپ اپنے ملک کو واپس چلے جائین۔ اور احمد شاہ ابدالی کے بلانے پر اُسکے پاس نہ جائین"۔ خط کے اختتام پر نواب کے خاندان اور مرہٹون کی روایتی دوستی کا حوالہ دیا گیا تھا کہ "سری منت باجی راؤ پردھان اور نواب برہان الملک مغفور مین جو عہد و پیمان ہوئے تھے وہ خاص و عام پر ظاہر ہین۔ پس باوجود ان قدیم مراسم دوستی و اخلاص مندی کے ہم سے موافقت نہ کرنا اور ہمارے خلاف دوسرون سے ملنا بعید از انصاف ہے"۔

اس خط کو پڑھنے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ مرہٹون کے دلون مین مذہبی عداوت کے جذبات موجود تھے۔ یا شجاع الدولہ اس قسم کے جذبات مرہٹون کے دلون مین سمجھتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو بھاؤ کو ایسا نامہ وداد شجاع الدولہ کے نام بھیجنے کی ہمت نہ پڑتی اور شجاع الدولہ شاہ آبدالی کی شرکت مین پس و پیش نہ کرتے۔ بلکہ سکرتال پہنچ کر نجیب الدولہ کو مرہٹون کی گرفت سے چھڑانے کے بعد روہیلہ سردارون کے ساتھ ہی شاہ ابدالی کے استقبال کو روانہ ہو جاتے۔ مگر اُنھون نے ایسا نہین کیا اور نجیب الدولہ کو خطرناک حالت سے نکالنے مین مدد دینے کے بعد اپنے علاقے کو روانہ ہو گئے۔ نجیب الدولہ چونکہ شجاع الدولہ کی شرکت شاہ ابدالی کے ساتھ بہت ضروری سمجھتا تھا۔ اس لئے اُس نے شاہ ابدالی سے بوقت ملاقات یہ عذر کردیا کہ شجاع الدولہ کسی قدر علیل بھی ہو گئے تھے نیز اُن کو اپنے غربی علاقون مین مرہٹون کی شرارت سے بدامنی پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ لہذا فی الحال اُنھون نے اپنے مستقر حکومت کو چلا جانا ضروری سمجھا اور وہان کی حفاظت کے ضروری انتظامات کرنے کے بعد وہ

شاہ کی خدمت مین حاضر ہونگے - شاہ ابدالی شجاع الدولہ کی اِس حکمت عملی کو سمجھ گیا - کہ وہ اِس وقت الگ رہنا - فریقین سے ربط ضبط قائم رکھنا - اور آخر مین غالب فریق کا ساتھ دینا چاہتے ہین

شجاع الدولہ کی شاہ ابدالی کے ساتھ شرکت

مگر جب مرہٹون کے شجاع الدولہ سے نامہ و پیام کرنے کی شاہ کو اطلاع ملی - تو نجیب الدولہ کو اندیشہ پیدا ہوا اور خط و کتابت اور معتمدین کی زبانی پیام رسانی پر اکتفا نہ کرکے اُس نے نواب شجاع الدولہ کو شاہ ابدالی کے ساتھ شرکت کی ترغیب دینے کے لئے خود نواب موصوف کے پاس جانا ضروری سمجھا - خصوصاً جب کہ اُنھین یہ معلوم ہوا کہ بھاؤ نے اپنا خط ایک معزز شخص کے ہاتھ مع تحائف گران بہا شجاع الدولہ کو بھیجا ہے اور راجہ نارو شنکر اول درجے کا مرہٹہ سردار عنقریب شجاع الدولہ کو لانے کے واسطے جا رہا ہے - نجیب الدولہ چونکہ نواب شجاع الدولہ کی بروقت امداد کے بیحد منت پذیر تھے اور "امیرالامرا" کا لقب شہنشاہ دہلی سے حاصل کرنے کے باوجود تسلکر تال سے جو خطوط انھون نے شجاع الدولہ کو - جو ابھی تک اپنے باپ کے موروثی منصب وزارت عظمٰی پر فائز نہین ہونے پائے تھے لکھے تھے - ان مین "معروضہ" "گذارش" کے الفاظ استعمال کرتے تھے - اِس لئے بمصداق ع خوشامد ہرکرا کردی خوش آمد - شجاع الدولہ کے دل مین اُنکی بڑی جگہ ہوگئی تھی - چنانچہ جب نجیب الدولہ از خود یا شاہ ابدالی کی طرف سے پیام رسان بن کر براہ اٹاوہ قنوج آئے - تو شجاع الدولہ خود اپنے صدر مقام سے بڑھکر مہدی پور منضافات ملانوان مین پہنچے - بوقت ملاقات اِن دونون سردارون کی جو گفتگو ہوئی وہ تاریخ مالوہ مین بالتفصیل مندرج ہے اور وہان سے لیکر تاریخ اودھ مین بھی مولوی نجم الغنی نے بجنسہ نقل کردی ہے - لہذا اسکے اعادہ کی یہان ضرورت نہین - مختصر یہ ہے کہ نجیب الدولہ نے مرہٹون کی لوٹ کھسوٹ کی عادت سے اُن کو خوف دلایا اور بھاؤ نے جو تنبیہ آمیز طریقے زبردست پا ہوتے ہی اختیار کرلئے تھے اور جن مین گاہے گاہے مذہبی عداوت کا رنگ بھی جھلکنے لگتا تھا - اُنکی طرف اشارہ کرکے کہا کہ مرہٹے صرف زبانی شہنشاہ دہلی کی اطاعت کا دم بھرتے ہین - مگر اُن کو موقعہ ملے گا - تو وہ شہنشاہ دہلی کو تخت سے اُتار دینگے - اور دارالسلطنت دہلی مین ہندو راج قائم کرلینگے - جب مغلیہ سلطنت ہی نہ رہیگی - تو آپ کو مرتبہ وزارت کہان سے ملے گا - اِس قسم کی باتون سے نجیب الدولہ نے شجاع الدولہ کو شیشے مین اُتار لیا بلکہ ایک روایت مین یہان تک مذکور ہے کہ شجاع الدولہ جب کسی طرح آمادہ نہ ہوئے کیونکہ وہ افغانون سے بھی مرہٹون کے برابر ہی خوف کھاتے تھے تو نجیب الدولہ نے پہلے اُنکو اپنے سر کی قسم دی اور بعد ازان تلوار نکال کر اُن کے سامنے رکھدی اور اپنا سر جھکا کر کہا کہ وہ اُسکو قلم کر ڈالین

کیونکہ نواب موصوف کو ساتھ لئے بغیر تنہا جانے پر وہ شاہ ابدالی کا مورد غضب ہوگا۔ اور ایک بیرونی شخص کے ہاتھ یا حکم سے مارے جانے کے بجائے وہ اسکو ترجیح دیتا ہے کہ نواب شجاع الدولہ جیسے شفیق سرپرست کے ہاتھ سے اُسکی زندگی کا اختتام ہو۔ اس پر شجاع الدولہ مجبور ہوگئے اور اپنے نابالغ ولیعہد میرزا امانی کو۔ جو بعد مین بلقب آصف الدولہ مسند نشین اور وزیر الممالک کے موروثی عہدے پر فائز ہوئے اودھ مین اپنا قائم مقام اور راجہ بینی بہادر کو انکا مختار بنا کر دس بارہ ہزار فوج کے ساتھ ہمراہی نجیب الدولہ شاہ ابدالی کے پاس گئے۔ جس نے اپنے وزیر اعظم شاہ ولی خان کو ایک منزل استقبال کے لئے بھیجا۔ اور اپنے بیٹے تیمور شاہ سے سرحد لشکر پر استقبال کرایا۔ اور اپنی غیر معمولی عنایات سے نواب موصوف کے دل کا خوف زائل کرایا۔ تاہم شجاع الدولہ نے شاہ کے لشکر مین پہنچنے کے بعد بھی مرہٹون سے سلسلۂ نامہ و پیام جاری رکھا اور اپنے طور پر وہ مصالحت کی کوشش کرتے رہے۔

بھاؤ مین ناعاقبت اندیشی و غرور

بھاؤ کے تحقیر آمیز طریقون سے مرہٹون کو شدید نقصان پہنچا اور خود مرہٹہ مورخین بھی پانی پت کی تباہی کو انہی طریقون کا ایک نتیجہ قرار دیتے ہین۔ رگھوبا جیسے ہوشیار و تجربہ کار شخص کو مرہٹہ فوج کی کمان اس موقعے پر سپرد نہ کئے جانے کی کمی اس طریقے سے پوری ہوسکتی تھی کہ ملہار راؤ ہولکر جنکوجی سیندھیا وغیرہ جو سردار ہندوستان کی مہمات و معاملات کا تجربہ رکھتے تھے۔ اُنکے مشورون پر عمل کیا جاتا۔ اور سورج مل جاٹ اور راجپوت راجاؤن کی صلاح مانی جاتی۔ جو اپنے آپ کو مغل شہنشاہ کے کارکنان کی حیثیت سے پیش کرکے عام باشندگانِ ملک کی ہمدردی و تائید بیرونی حملہ آور شاہ ابدالی اور اُسکے پٹھان رفقاء کے مقابلے مین حاصل کرنی چاہتے تھے۔ اور اس معرکۂ جنگ مین کوئی مذہبی رنگ پیدا نہین ہونے دینا چاہتے تھے۔ مگر بھاؤ نے ازراہ غرور اپنے تجربہ کار سردارون اور سورج مل و راجپوت راجگان دونون کے مشورون کو ٹھکرایا اور اپنی حرکات سے اُن کو سخت بددل کردیا۔ سورج مل نے اپنے ایک قلعے مین بھاؤ اور سربرآوردہ مرہٹہ سردارون کی ضیافت کی جس مین بعض روایات کے بموجب عماد الملک بھی موجود تھا۔ اور سورجمل نے متھرا کے حوالی مین جب بھاؤ کا استقبال کیا تھا۔ اس وقت بھی عماد الملک اسکے ساتھ تھا۔ دیگر روایات کے بموجب مرہٹون کے دہلی پر قابض ہونے کے بعد بھی عماد الملک خفیہ طور پر بھاؤ کی ملاقات کے واسطے آیا تھا۔ اثناء ضیافت مین جو مشورہ سورج مل نے دیا تھا۔ اُسکی عماد الملک نے بھی تائید کی۔ سورج مل کے مشورے کے الفاظ بھی بعض یادداشتون مین مندرج ہین۔ خلاصہ مطلب

نکالا یہ ہے کہ سورج مل نے بھاؤ کو صلاح دی کہ وہ اپنے لشکر کے بھاری سامان گرانبار توپوں اور عورتوں کو جنھیں بھاؤ نے فتح کی قوی امید پر اپنے ہمراہ لیا تھا اور یہ پہلا موقعہ تھا کہ قریباً تمام بڑے بڑے مرہٹہ سرداروں نے اپنی زنانہ سواریوں کو شمالی ہند کی لڑائی میں ساتھ رکھا تھا اور اس طرح اپنے لشکر میں بڑی حد تک مغلوں کے لشکر کی سی ایک شان پیدا کر لی تھی اُسکے قلعوں میں چھوڑ دیں - جنکی حفاظت کا وہ کامل اطمینان دلا سکتا ہے - اور خود ہلکی توپوں اور سواروں کے ساتھ آگے قدم بڑھا کر روہیلوں کے علاقے میں پھیل جائیں اور مرہٹوں کے قدیم طریقے کے بموجب قزاولی لڑائیوں کا سلسلہ جاری کریں - پٹھان سردار جب اپنے علاقوں کے مرہٹوں کی دستبرد سے تباہ ہونے کی خبر پائیں گے تو مجبوراً شاہ ابدالی کا ساتھ چھوڑ کر انکی حفاظت کے لئے چلے جائینگے - اور چونکہ شاہ ابدالی کا سرہند سے آگے قدم بڑھانا محض ان روہیلہ سرداروں کی درخواستوں کا نتیجہ ہے - اس لئے جب یہ اُس کا ساتھ چھوڑ دینگے تو پنجاب کو افغانستان سے ملحق کرنے کے سوا اُسے خاص ہندوستان کے معاملات سے کوئی دلچسپی باقی نہ رہے گی اور اس مُلک کی گرمی بھی افغان سپاہیوں کو پریشان کرے گی اس لئے شاہ ابدالی اپنے وطن کو واپس چلا جائیگا - اپنے حامیوں کی واپسی کے بعد پٹھانوں کے حواس بھی درست ہو جائینگے اور وہ یا تو ہم سے پہلے کی طرح صلح کرینگے - یا ہم اُنکے علاقوں کو چھین لینگے اور ادھر کے قضیئوں سے نجات پاکر پنجاب کو بھی آسانی افغانوں کی گرفت سے چھڑا سکیں گے - سورج مل کا یہ مشورہ اس وقت کے حالات کی بناء پر بہت مناسب تھا - مگر بھاؤ نے اسپر کان نہیں دھرا - بلکہ سورج مل کو یہ جواب دیا کہ وہ ایک چھوٹا سا زمیندار ہے اور مُلک گیری کے معاملات کو نہیں سمجھ سکتا - اسی موقعے پر اُس نے بہترین کاردان مرہٹہ سردار ملہار راؤ ہولکر کی بھی - جس نے سورج مل کے مشورے کو قرین صواب بتایا تھا - توہین کی اور اُسکے گڈریوں کی نسل سے ہونے کا ایسے طریقے پر اشارہ کیا کہ ملہار راؤ ہولکر کو سخت ناگوار گذرا اور چونکہ سورج مل کو مرہٹہ سرداروں میں ملہار راؤ ہولکر پر سب سے زیادہ اعتماد تھا - اس لئے ہولکر کی اہانت سے اُسکو بھی صدمہ پہنچا اور وہ موقعہ کا منتظر رہا -

دہلی اور لال قلعے میں مرہٹوں کا داخلہ

اس اثناء میں برسات کا موسم شروع ہو چکا تھا - شاہ ابدالی اپنی افواج کے ساتھ دریائے جمنا کے پار انوپ شہر میں مقیم تھا - لہذا مرہٹوں نے جمنا کے عبور کرنے میں دقت محسوس کرکے دار السلطنت دہلی کا رُخ کیا - جہاں شاہ ابدالی دتاجی سیندھیا کی جمعیت کا قلع قمع کرنے کے بعد اپنے ایک سردار یعقوب علی خان کو قلیل جمعیت کے ساتھ بغرض حفاظت چھوڑ گیا تھا - کیونکہ تخت وزارت شہنشاہی کی جو عظمت و عقیدت دیگر فرقہائے رعایا کی طرح مرہٹوں کے دلوں میں بھی تھی - اسکو مدنظر رکھکر اس کا

خیال نہ ہوتا تھا کہ مرہٹے دہلی پر کسی بڑے ارادے سے پیش قدمی کرینگے۔ بھاؤ اور اسکے سردار نواب سعد اللہ خان مرحوم مشہور وزیر اعظم شاہجہان عالمگیر کی حویلی کے قریب آکر ٹھہرے۔ جس مین اس وقت ایک بہت بڑا محلہ آباد ہے۔ اور ایک پرانی عمارت جو "نہر والی حویلی" کے نام سے ہنوز باقی ہے اور اصلی حویلی کی سابق عظمت شان کا کسی قدر پتہ دیتی ہے۔ اس حویلی کو اپنا مستقر قایم کرنے کے بعد مرہٹون نے بھی لال قلعہ کو لینا چاہا۔ یعقوب علی خان نے ابتدا مین مزاحمت کی۔ اور وٹھل راؤ شیدیو اور ہولکر کے جو پانسو کے قریب آدمی اسد برج کی طرف سے فصیل پر چڑھکر قلعے مین داخل ہوگئے تھے ان مین سے بعض کو مغل قراولون نے قتل کر ڈالا اور باقیماندہ نے فصیل سے کُود کر بھاگنے کی کوشش مین اپنے کو ہلاک کرلیا قلعہ کے دوسری طرف خضری دروازے پر جھنکوجی سیندھیا کے آدمیون نے ہتھوڑے بجائے۔ مگر پھاٹک کو توڑ نہ سکے۔ اس طرح اول روز مرہٹون کا حملۂ قلعۂ دہلی پر ناکام رہا۔ مگر دوسرے روز ابراہیم خان گاردی نے دریا کی ریتی مین دو توپین لگا کر جب قلعہ پر گولے پھینکنے شروع کئے اور اُن سے شاہی عمارات کو صدمہ پہنچنے لگا۔ تو یعقوب علی خان نے جو ایسی قلیل جمعیت کے ساتھ کسی طرح قلعے کی حفاظت نہین کرسکتا تھا۔ ملہار راؤ ہولکر کے ذریعے سے طرح مصالحت ڈالی۔ اور شہنشاہی ناموس واسباب اور ساکنانِ قلعہ کی جان و مال کی حفاظت کے تحریری موثق وعدے حاصل کرکے خود معہ اپنے سامان و رفقاء کے قلعے سے نکل کر پہلے حویلی علی مردان خان مین جو دریا کے قریب تھی جا ٹھہرا اور بعد ازان کشتیون پر دریائے جمنا کے پار اُترکر شاہ ابدالی کی فوج مین جا ملا۔ یعقوب علی خان کے قلعے سے نکل جانے کے بعد شاہی محافظون نے قلعے کے دروازے مرہٹون کے لئے کھول دئے۔ اور بھاؤ معہ اپنے نامی سردارون اور راجپوت راجاؤن کے قلعے کے اندر داخل ہوگیا۔

بھاؤ کی شدید غلطی

اس موقعے پر بھاؤ سے وہ نہایت شدید غلطی سرزد ہوئی جس نے اس معرکے کو ایک مذہبی رنگت دے دی اور اُسکے اکثر ہوا خواہون کو اُس سے ناراض کردیا۔ ملہار راؤ ہولکر کی وساطت سے یعقوب علی خان دُرانی محافظِ قلعہ سے جو عہد و پیمان ہوئے تھے۔ اُن مین شاہی ناموس واسباب حکومت کے علاوہ ساکنین قلعہ کی جان و مال کے تحفظ کا اطمینان دلایا گیا تھا۔ بھاؤ نے اُن عہود پر اس حد تک توعمل کیا کہ عماد الملک کے دست گرفتہ "محی السنہ" بادشاہ کو کسی قسم کا آزار نہین پہنچایا اور شاہی ناموس پر بھی کوئی دستِ تعدی دراز نہین کیا۔ لیکن شاہ ابدالی کے حملے کو ٹالنے کے لئے اپنے کو روپئے کا ضرورتمند ظاہر کرکے عمالِ شہنشاہی پر دباؤ ڈالا۔ یہان خزانۂ شاہی نادر شاہ کی دستبرد کی نذر ہوچکا تھا۔ اور اُسکے جانے کے بعد ملک مین ہر طرف شورش تھی

صوبون سے خراج بالکل نہین آتا تھا اور جو آتا بھی تھا۔ وہ راستے مین لُٹ جاتا تھا۔ خزانہ بالکل خالی تھا۔ البتہ بعض شاہزادون اور عمّال کے پاس کچھ زر و جواہر موجود تھا۔ جو اُنھون نے پوشیدہ کر رکھا تھا یہ پوشیدہ مال چند سال کے بعد نجیب الدولہ کے پوتے غلام قادر نے شاہ عالم اور ارکان خاندان شہنشاہی و خدّام دولت پر انتہا درجے کا جبر و تعدّی کر کے اُن سے وصول کیا۔ مگر وہ اس سے کوئی فائدہ نہ اُٹھا سکا اور سخت اذیّت کے ساتھ ہلاک ہونے کے علاوہ اپنا نام نمک حرامون کی فہرست مین لکھوا گیا۔ اور ایک صدی سے زیادہ گذرنے کے بعد آج بھی اُسکا تذکرہ غصّہ و نفرت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ بھاؤ کو جب خزانۂ شہنشاہی سے روپیہ حاصل کرنے مین مایوسی ہوئی تو اسنے قلعے کے اسباب زینت و سامانِ شوکت پر نظر ڈالی اور دیوانِ خاص کی نقرئی چھت اکھڑوا کر ۱۷ لاکھ روپے اُس سے ڈھلوائے۔ اِسکے علاوہ اُس نے تخت و چتر اور دیگر سامان دربار کو بھی سونے چاندی کے لالچ مین توڑ دایا۔ اور قدم شریف۔ درگاہ حضرت محبوب الٰہی و قطب صاحب مین اور بہادر شاہ اوّل و محمد شاہ کے مقبرون پر جو طلائی شمعدان و عود سوز وغیرہ تھے۔ اُنکو بھی گلوا ڈالا اِس ناگوار طریق عمل کی سورج مل و دیگر راجپوت راجاؤن نے سخت مخالفت کی اور ملہار راؤ ہولکر و جھنکوجی سیندھیا نے بھی بھاؤ کو روکا۔ راجپوتانہ کے راجاؤن نے صرف زبانی مخالفت پر اکتفا نہین کی۔ بلکہ یہان تک کہا کہ وہ چتر و تخت اور دربار شہنشاہی کے سامان کو ہاتھ نہ لگائے۔ اور اسکے بدلے مین وہ پانچ لاکھ روپے نقد بھاؤ کو نذر کرینگے۔ لیکن بھاؤ نے پہلے کی طرح اِن لوگون نصیحت کا کوئی اثر قبول نہین کیا۔ اور اسکا نتیجہ یہ نکلا کہ سورج مل اور راجپوتانہ کے راجگان سخت بددل ہو گئے اور آخر کو موقعہ پا کر اپنی فوجین بھاؤ کے لشکر سے نکال کر اپنے علاقون کو واپس چلے گئے۔ اِس سے ظاہر ہے کہ راجپوتانہ کے راجاؤن اور ہولکر۔ سیندھیا اور دوسرے مرہٹہ سردارون کے دلون مین دہلی کی شہنشاہی کا خاص احترام تھا۔ اور وہ اِس لڑائی کو مذہبی نقطۂ نظر سے نہین دیکھتے تھے بلکہ ایک معمولی سیاسی کشمکش سمجھتے تھے۔ بھاؤ نے قدم شریف اور دوسری درگاہون کے سامان پر جو دستبرد کی اس سے ہندؤون کو بھی رنج پہنچا اور مسلمانون نے تو اُسکو ایک مذہبی اہانت سے تعبیر کیا۔

بھاؤ کی ہندو راج بحال کرنے کی کوشش

بھاؤ نے جسکی شامتِ اعمال نے مرہٹون کو اس تباہی عظیم مین مبتلا کیا۔ صرف دربار شہنشاہی کے سامان اور آثار متبرکہ کے اسباب ہی کو غصب و برباد نہین کیا بلکہ جو غلطی ہیمو بقال سے دو صدی قبل سرزد ہوئی تھی اُسکا بھاؤ کی طرف سے اعادہ کیا گیا یعنی اُس نے پیشوا کے نوجوان بیٹے وسواس راؤ کو دہلی کے تخت پر بھی بٹھانا چاہا۔ ملہار راؤ ہولکر کی جو یادداشتین جنگ سوم

پانی پت کے متعلق موجود ہین - اُن سے تو ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ وسواس راؤ کو قلعۂ دہلی مین تخت پہ بٹھا دیا گیا تھا اور دیوانِ خاص کی چھت کی چاندی اور چتر کے سونے سے کچھ روپے اور اشرفیان بھی نئے فرمانروا کے سِکّے کی تیاری گئی تھین - مگر یہ صرف ہولکر کا بیان ہے اور باقی ماندہ مرہٹہ سردارون اور راجپوت رئیسون کی یادداشتون سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وسواس راؤ کو تخت پر بٹھانے کا ارادہ بھی کیا گیا اور اسکے ابتدائی انتظامات بھی عمل مین آئے مگر آخر مین اِس تجویز کا عملدرآمد شاہ درّانی سے تصفیہ ہونے تک ملتوی کر دیا گیا اور عمّاد الملک نے جس شاہزادہ محی السنہ پسر کام بخش کو شہنشاہ بنایا تھا - اُسکو تخت سے اُتار کر شہنشاہ عالمگیر ثانی کے ولیعہد شاہزادہ عالی گوہر کا حق وراثت تسلیم کیا گیا جو اُس وقت بہار و بنگال پر دوبارہ شہنشاہی اقتدار قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے - اور اُنکی عدم موجودگی کے باعث اُن کے بڑے بیٹے شاہزادہ جوان بخت عرف جہاندار شاہ کو جنکی اولاد اس وقت بنارس مین اور ایک شاخ اُسکی لکھنؤ مین موجود ہے - اُن کے باپ کی نیابت مین تخت پر بٹھایا گیا اور اُن سے وزارتِ عظمےٰ کا باضابطہ فرمان شجاع الدولہ کے حق مین جاری کرایا گیا جنکے ساتھ مرہٹہ سردارون کی خفیہ خط وکتابت برابر جاری تھی - اور شاہ ابدالی چونکہ اس نامہ وپیام سے بے خبر نہ تھا - لہذا وہ مرہٹون کی وساطت سے اُنکے وزیر اعظم بننے پر شجاع الدولہ سے بدگمان ہو سکتا تھا -

وسواس راؤ کو اگرچہ تختِ مہاراجگی پر نہین بٹھایا گیا - مگر بھاؤ کی اِس تجویز نے بھی مرہٹون کے مقصد کو کافی نقصان پہنچا دیا - اور مسلمانون کو قدرتی طور پر خوف زدہ کرنے کے علاوہ راجپوتانہ کے راجگان کو بھی مرہٹون کی طرف سے بدگمان کر دیا - کیونکہ یہ راجگان ہندوستان مین ہندو راج کے بحال ہونے کی حالت مین تختِ فرمان روائی پر اپنا خاص حق سمجھتے تھے اور سیواجی بانی حکومت مرہٹہ کو بھی قدیم خاندانی عزت مین اپنے سے گھٹ کر جانتے تھے - پھر پیشوا اُن کی - جو ذات کے برہمن تھے - حکومت اپنے اوپر وہ بھلا کس طرح قبول کر سکتے تھے - چنانچہ جب بھاؤ کی فوج کو دہلی مین پڑے پڑے رسد کی قلت محسوس ہونے لگی اور دریاے جمنا برسات کی وجہ سے طغیانی پر اور ناقابل عبور ہونے کے باعث احمد شاہ ابدالی پر حملہ آور ہونے کا موقعہ نظر نہ آیا - اور بھاؤ نے دہلی سے ہٹ کر شمال کی طرف بڑھنا شروع کیا - تو سورج مل اور دوسرے راجپوت راجگان معہ اپنی افواج کے بھاؤ کے لشکر سے کھسکے -

شجاع الدولہ کا خط بنام سورج مل

اِس موقعہ پر ان رؤساء کے جو احساسات تھے اسکا پتہ کسی قدر اُس خط سے

چلتا ہے۔ جو شجاع الدولہ نے سورج مل کو لکھا تھا اور جس کا پورا مضمون مولانا نجم الغنی صاحب نے اپنی تاریخ اودھ مین بضمن حالاتِ شجاع الدولہ نقل کردیا ہے۔ شجاع الدولہ نے سورج مل کو "کنور صاحب برادر مہربان" کے القاب سے ملقب کیا ہے اور روابط محبت باہمی کے افزایش پذیر اور مہمات طرفین بھی واحد ہونے کا اطمینان ظاہر کرکے اُسکی طرف سے کوئی نامۂ و پیام موصول نہ ہونے کی شکایت کی ہے۔ اسکے بعد شاہ آبدالی کے آنے اور افغان سردارون کے اُن سے جاکر ملنے کی اطلاع دی ہے۔ کہ شاہ موصوف کا شقہ اُنکے بلانے کے لئے بھی صادر ہوا تھا۔ اور جب بھاؤ کی آمد آمد کا شہرہ ہوا تو تمام سردارون نے اُنکے ساتھ عہد موافقت باندھا اور بھاؤ کے مقابلے کے لئے یک دل و یک جہت ہوگئے۔ کیونکہ بھاؤ کا آنا ہندوستان کے اختلال کا باعث ہے اور اس فساد کشور آشوب کا دفع کرنا تمام رئیسون کے اتفاق کے بغیر ممکن نہین اور جو رفاقت سے پہلو تہی کریگا۔ وہ ہدف تیر ملامت ہوگا۔ لہذا آپ بھی مصلحتِ کار کو سوچین۔ اور گو آج آپ بھاؤ کا ساتھ دے رہے ہین لیکن وہ نخوت دغرور سے آج کسی کی قدر و وقعت نہین سمجھتا اور کل بگڑ جائیگا۔ لہذا بہتر یہی ہے کہ اُسکی رفاقت سے کنارہ کش ہوکر سرداران ہندوستان سے موافقت کرین اور شاہ آبدالی کی خدمت مین پیش کرنے کے لئے عرضداشت وشوقِ ارادت بھیج دین جسکے بعد وہ شقۂ مرحمت اور جاگیر کا نسلاً بعد نسلٍ فرمان اُن کے لئے حاصل کرکے بھجوادین گے۔ سورج مل نے خفیہ طور پر شجاع الدولہ کو اُنکے محبت نامہ کا موافقت آمیز جواب دیا۔ مگر مرہٹون سے بھی جو اُسکے علاقے سے اس قدر قریب گویا اُسکے سر پر مسلط تھے۔ علانیہ بگاڑ نہین کرنا چاہا۔ اور قدرتی طور پر اُسکی ہمدردی بھی شاہ آبدالی کے مقابلے مین مرہٹون کے ساتھ تھی جو اُسکے ہموطن وہم مذہب تھے۔ چنانچہ اُس نے بھاؤ سے یہ عذر کیا کہ برسات کے بعد پٹھان شاید فرخ آباد کی طرف سے اُسکے علاقے پر حملہ آور ہونگے۔ کیونکہ احمد خان بنگش صرف پانچ چھ ہزار آدمی اپنے ساتھ لائے ہین۔ اور اپنی سپاہ کے حصۂ اعظم کو بہادر و تجربہ کار سردارون کے ماتحت فرخ آباد مین چھوڑ آئے ہین۔ لہذا وہ اپنے علاقے کی حفاظت کے لئے جارہا ہے اور وہان سے سامانِ رسد مرہٹون کے لشکر مین بھجواتا رہیگا۔ اور اُنکے مجروحین کو اپنے قلعون مین رکھکر اُن کا علاج کریگا۔ بھاؤ اُسکے اصل منشاء کو پاگیا۔ مگر غرور نے اُسکو سورج مل و دیگر راجپوت سردارون کے منانے کی اجازت نہیں دی۔ اُسے اپنی بھاری توپون پر سب سے زیادہ بھروسہ تھا۔ جنکے ذریعے سے وہ کرناٹک و دکن مین مضبوط مقامات کو مسخر کرچکا تھا۔ کنکیڈ و پارسینس نے اپنی تاریخ مین۔ جو مرہٹہ ذرائع معلومات سے ترتیب دی گئی ہے۔ لکھا ہے کہ بھاؤ نے ابراہیم خان گاردی سے مشورہ کیا۔ تو اُسنے بھاؤ کے خیال کی تائید

کی اور ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دی کہ اگر اسکو سورج مل کے قلعون مین چھوڑا جائیگا تو وہ اپنی توپون سے مرہٹہ افواج پر فیر کریگا - مگر اس الزام کی ان مورخون نے کوئی سند نہین دی ہے نہ ہولکر یا نانا فرنویس یا دیتھل شیدیو نے اپنی چٹھیون مین گاردی کے اس قسم کی کڑی دھمکی دہلی یا پانی پت مین دینے کا ذکر کیا ہے - بظاہر یہ فرضی افسانہ مرہٹون کی تباہی انگیز شکست کا الزام بھاؤ پر سے ہلکا کرنے کے لئے بعد مین تصنیف کیا گیا ہے - اور اسکی کوئی اصلیت نہین ہے -

مرہٹون کا کنج پورہ کو چھین لینا دریاے جمنا کی طغیانی مرہٹہ اور شاہ ابدالی کے لشکرون کو باہم جنگی کارروائیان شروع کرنے مین مانع تھی - مگر دریا کے کنارے کنارے وہ فوجی نقل و حرکت کے لیے آزاد تھے چنانچہ شاہ ابدالی نے اپنی فوج کے ایک حصّے کو انوپ شہر سے دہلی کی طرف حرکت دی اور جب مرہٹون نے قلعۂ شاہجہان آباد مین عمل دخل کیا - تو اس وقت شاہ کی سپاہ قلعے کے سامنے دریا پار شاہدرہ مین موجود تھی اور یعقوب علی خان قلعۂ دہلی سے نکل کر معہ اپنے رفقاء کے کشتیون سے دریا کو عبور کر کے اس ٹکڑے مین شامل ہوگیا تھا - بھاؤ شاید برسات کا پورا زمانہ دہلی ہی مین گذار دیتا - مگر ایک طرف تو وہان رسد ملنے مین دقت ہوئی اور دوسری جانب اسکو یہ اطلاع ملی کہ شاہ ابدالی نے اپنا خزانہ اور غلّے کا ذخیرہ معہ ایک دستہ سپاہ کے کنج پورہ مین چھوڑا ہے جو دہلی سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے - صاحبزادۂ آفتاب احمد خان بیرسٹر اور انکے بھائی صاحبزادۂ سلطان احمد خان ممبر عدالت کونسل آف ایجنسی ریاست گوالیار اسی مقام کے حکمران خاندان کے چشم و چراغ ہین - جنکے والد ماجد نواب غلام احمد خان صاحب کلامی مرحوم بھی جو اعلیٰ درجے کے انشا پرداز و شاعر تھے اسی ریاست مین ایک اعلیٰ عہدے پر مامور تھے مرہٹون اور شاہ ابدالی کی باہمی آویزش کے وقت کنج پورہ کا قلعہ اس زمانے کے عام طریق جنگ کے لحاظ سے خاصا مضبوط تھا اور سردار نجابت خان وہان کے جاگیردار تھے - جنکی مدد کے لئے شاہ ابدالی نے اپنے سردار عبدالصمد خان اور قطب خان کو دس ہزار سوار و پیادہ کی جمعیت کے ساتھ وہان خزانہ و غلّہ کی حفاظت کے لئے چھوڑا تھا یہ عبدالصمد خان وہی سردار تھا جسکو ہولکر و سیندھیا نے پنجاب پر پیشقدمی کرنے کے وقت سرہند پر گرفتار کیا تھا - اور دریاے اٹک پر پہنچنے کے وقت اسکو چھوڑ دیا تھا یا وہ خود کسی طرح انکے ہاتھ سے چھوٹکر افغانستان چلا گیا تھا اور وہان سے شاہ ابدالی کے ساتھ پھر ہندوستان آیا تھا - بھاؤ نے نارو شنکر پنڈت کو - جو بعد مین لقب راجہ سے ملقب ہوا - اور جسکے بھائی بھوانی شنکر کی ایک عظیم الشان حویلی مسجد فتحپوری کے بالمقابل اس وقت بھی دہلی مین موجود ہے - چھ ہزار منتخب سوارون کے ساتھ دہلی مین

قلعہ و شہر کی حفاظت پر تعینات کیا اور باقی ماندہ لشکر کو ساتھ لے کر خود آگے بڑھا اور پندرہ ہزار تجربہ کار آدمیون کو معہ ابراہیم خان گاردی کے توپخانے کے ایک حصّے کے کنج پورہ کی تسخیر کے لیئے بھیجا۔ صمد خان اور قطب خان نے مقابلہ کیا۔ مگر گاردی کی توپون نے بہت جلد قصبے مین آفت برپا کردی۔ اور وہ قلعے کے حوالہ کرنے پر مجبور ہوئے۔ اِس موقعہ پر بھاؤ نے پٹھانون پر سخت مظالم کیئے قطب خان صمد خان دونون کو قتل کرا دیا۔ اور شاہ ابدالی کا خزانہ اور غلّہ کا ذخیرہ چھین لیا۔ اسکے علاوہ مرہٹہ سپاہیون نے قصبے مین بعض مساجد وغیرہ کی بھی بے حُرمتی کی۔ جس سے مسلمانون کے لیئے مزید وجہ خوف پیدا ہوئی۔ اور بھاؤ کی ناعاقبت اندیشی سے لڑائی مین مذہبی رنگ اور بڑھ گیا۔

شاہ ابدالی نے فوج کی موجودات لی

احمد شاہ ابدالی کو جب کنج پورہ پر مرہٹون کے قابض ہونے اور اپنا خزانہ اور غلّے کا ذخیرہ چھِن جانے کا حال معلوم ہوا۔ اور مذہبی اہانتون کی بھی خبر ملی۔ تو اُسکو سخت غصّہ آیا۔ اور اس امر پر شاہ نے بہت پیچ و تاب کھایا کہ وہ کنجپورہ سے اِس قدر قریب تھا اور دریا کی طغیانی کے باعث وہان کے پٹھانون کو کوئی مدد نہین پہنچا سکا۔ شاہ کے لئے اب زیادہ عرصے تک صبر کرنا مشکل تھا۔ چنانچہ کنجپورہ کے واقعے کے چند روز بعد ہی اُسنے ایک بلند مقام پر ٹھہر کر اپنی سپاہ کی موجودات لی۔ پٹھانون کے رسالے مرتب ہوکر اپنے اپنے سردارون کے ماتحت شاہ کے سامنے سے گذرتے تھے۔ اور متصدی ہر رسالے کے آدمیون کی تعداد لکھتے جاتے تھے۔ فارسی تاریخون کی روایات کے بموجب کُل چوبیس دستے یا رسالے اِس روز شاہ ابدالی کے سامنے سے گذرے۔ ہر ایک رسالے مین کم و بیش سو ہزار سوار تھے۔ اور شاہ ولی خان وزیر اعظم خان جہان خان۔ شاہ پسند خان۔ احمد خان بلوچ۔ برخوردار خان۔ امیر اللہ خان قزلباش وغیرہ بڑے بڑے سردار ایک سے لے کر پانچ رسالون تک کے افسر تھے۔ انہی مین چھ دستے شاہ کے باڈی گارڈ رسالے کے تھے۔ جن مین افغانون کے علاوہ ازبک و ترکمان وغیرہ بھی شامل تھے اور ان مین ایک معقول تعداد شاہ کے چیلون اور غلامون کی تھی۔ جنکی وفاداری و جان نثاری پر شاہ کو بہت بھروسہ تھا اور اپنی لڑائیون مین نازک وقت پر وہ اُن سے کام لیتا تھا۔ دو ہزار اونٹ "زنبورکون" کے تھے۔ جو پُرانی وضع کی لمبی لمبی بندوقین ہوتی تھین۔ اور ان مین سے چھوٹی اور موٹی شترنال کہلاتی تھین۔ ہر اونٹ پر دو دو آدمی سوار تھے۔ جو زنبورچی کہلاتے تھے۔ یہ زیادہ تر کابل اور اسکے نواح کے لوگ تھے۔ اِنکے علاوہ چالیس توپین بھی شاہ کی فوج مین تھین۔ شاہ کے ہندوستانی مددگارون مین نواب شجاع الدولہ کے ساتھ دس ہزار سوار دو ہزار پیادے اور تیس ضرب توپ نجیب الدولہ کے ساتھ چھ ہزار سوار بیس ہزار پیادے بتیس ضرب توپ۔ نواب فیض اللہ خان۔ حافظ رحمت خان اور

دوندے خان کے ساتھ چار پانچ ہزار سوار پندرہ ہزار پیادے بارہ ضرب توپ احمد خان بنگش کے ساتھ دو ہزار سوار تین ہزار پیادے پانچ ضرب توپ تھین۔ شجاع الدولہ کی فوج مین گوشائین تلنگے معقول تعداد مین شامل تھے۔ اور روہیلہ سردارون اور نواب بنگش کی افواج مین بھی ہندوؤن کا عنصر موجود تھا اور انتظامی عہدے زیادہ تر ہندوؤن ہی کے ہاتھ مین تھے۔

شاہ ابدالی نے جمنا کو عبور کیا

فوج کی موجودات لینے کے بعد شاہ ابدالی کو عبور دریا کی فکر ہوئی اور شاہدرے سے جو شہر دہلی کے بالمقابل جمنا کے اس طرف واقع ہے۔ اور چند سال قبل اردگرد کے چالیس پینتالیس دیہات سمیت ممالک متحدہ سے شہنشاہی صوبۂ دہلی کے لئے حاصل کرلیا گیا ہے۔ تنہا سوار ہو کر وہ چند محافظین کے ساتھ دریا کے کنارے کنارے پانی کی کیفیت دیکھتا ہوا کوسون تک چلا گیا۔ باغپت کے مقام پر جو دہلی سے ۱۸ میل کے فاصلے پر ضلع میرٹھ مین ایک قصبہ اور تحصیل کا صدر مقام ہے۔ اور جہان کے رئیس لفٹننٹ نواب جمشید علی خانصاحب اس وقت صوبۂ ہذا کی قانونی کونسل کے ممبر ہین۔ شاہ کو دریا کی حالت کچھ مناسب معلوم ہوئی اور اُسنے دریا کے کنارے اپنا ڈیرہ کھڑا کرکے فوج کے سوارون کو دریا مین پایاب جگہ تلاش کرنے کے لئے بھیجا۔ کئی سوارون کے گھوڑے اس کوشش مین دور دور تک ڈوبتے رہے مگر تیسرے دن ایک موقعہ پر دریا مین پانی کچھ کم پایا گیا۔ شاہ نے اسی موقعہ کو عبور دریا کے لئے منتخب کیا اور اپنی سپاہ کے سامنے ایک تقریر کرکے اُن کو غیرت و ہمت دلائی۔ اُسکے بعد حکم دیا کہ ہر سوار ایک ایک پیدل کو اپنے پیچھے بٹھالے۔ اور شاگرد پیشہ توپخانے کے بیلون اور گھسیارون کے ٹٹوؤن کا سہارا لے کر پار جائین۔ شاہ ابدالی کے حکم نے افغانون اور پٹھانون مین ایک جوش پیدا کر دیا۔ اور دو روز مین ساری فوج اسی طریقے سے جمنا کو عبور کرنے مین کامیاب ہو گئی۔ قریباً پانسو آدمی اور کئی سو مواشی اس کوشش مین تلف ہوئے جنکی لاشین مختلف گھاٹون پر نکالی گئین۔ شاہ ابدالی نے خود نصف سپاہ کے دریا کو عبور کرلینے کے بعد اُس کنارے پر جا کر ڈیرہ کیا۔ اور دوسرے روز بقیہ فوج کو اپنی نگرانی مین دریا عبور کرایا۔

مرہٹون سے افغانون کی پہلی مڈبھیڑ

بھاؤ کو دریا کی حالت دیکھتے ہوئے ابھی افغان سپاہ کے اس طرف پہنچنے کی توقع نہین تھی۔ اور اُسنے کنجپورے سے اپنے کچھ آدمیون کو دہلی سے توپخانۂ شہنشاہی کی توپین لینے بھیجا تھا۔ کیونکہ اب اسکی طرف سے راجہ نارو شنکر دہلی مین مرزا جوان بخت لیعہد کے ماتحت امور سلطنت کا کارپرداز تھا۔ شہنشاہی توپخانے کی توپین قدیم وضع کی بہت بھاری بھاری تھین۔ اور میدانی لڑائیون مین مطلق کارآمد نہین ہوسکتی تھین البتہ سنگین مورچون کے مسخر یا

قلعون کی غنیم کے حملے سے محافظت کرنے مین اُن سے کام لیا جا سکتا تھا۔ ان بھاری توپون سے مرہٹون کو کچھ فائدہ حاصل نہین ہوا۔ بلکہ وہ میدانِ پانی پت مین اُن کے گلے کے لئے چکّی کا پاٹ بنگئین لیکن شہنشاہی توپون کے ساتھ رکھنے سے بھاؤ کو اپنی جنگی قوت مین اضافہ کرنا اِس قدر مقصود نہین تھا۔ جس قدر وہ اِس علاقے کے عوام کے دلون پر یہ اثر ڈالنا چاہتا تھا کہ مرہٹے شہنشاہ دہلی کے حامی کی حیثیت سے ایک بیرونی غنیم کے حملے کی مدافعت کر رہے ہین۔ اور مُلک اور شہنشاہ کی حفاظت کے لئے لڑ رہے ہین۔ اگر مرہٹون کا خبر رسانی کا انتظام ناقص نہ ہوتا اور دیہات کی آبادی کو وہ اپنی لُوٹ کھسوٹ کی عادت سے اپنا مخالف نہ بنا لیتے۔ تو شاہ ابدالی کی فوج کو ایسی آسانی کے ساتھ دریا کے عبور کرنے کا موقع نہ ملتا اور ابراہیم خان گاردی اگر دریا کے کنارے مورچے بنا کر اپنی توپون کا استعمال کرتا۔ تو یقیناً افغانون کو عبورِ دریا سخت دشوار ہو جاتا۔ مگر بھاؤ کو اُس وقت خبر ملی۔ جب افغانون کی پوری سپاہ تین دن مین اطمینان کے ساتھ دریا کو عبور کر کے اس طرف آ گئی اور سرائے سنبھالکہ کے قریب جو دہلی انبالہ کالکا ریلوے لائن پر ایک قصبہ ہے۔ افغانون کے ہراولی دستون سے مرہٹون کے ہراولی دستون کی مڈبھیڑ ہوئی۔ یہ جہان خان رہی سردار تھا۔ جو ہولکر و سیندھیا کی پنجاب مین پیش قدمی کے وقت وہان کا نائب تھا اور مقام گجرات پر جہان حضرت شاہ دولہ علیہ الرحمۃ کا مزار شریف واقع ہے۔ جنکے "چوہے" سارے شمالی ہند مین مشہور ہین۔ مرہٹون سے ہلکا مقابلہ کر کے اور شکست کھا کر افغانستان چلا گیا تھا۔ اِس پہلی مڈھ بھیڑ مین دونون طرف کے سوارون کی لڑائی ہوئی دو دو تین ہزار آدمی فریقین کے مقتول و مجروح ہوئے۔ مگر لڑائی کا کوئی نتیجہ ظاہر نہین ہوا اور شام ہونے کے بعد مرہٹہ و افغان اپنے اپنے لشکرون کو پلٹ گئے۔ بھاؤ نے اِس لڑائی مین خاطر خواہ کامیابی نہ ہونے پر سونی پت کی طرف قدم بڑھایا اور شاہ ابدالی انکے پیچھے پیچھے چلا۔ روزانہ فریقین کے آدمیون مین ہلکی جھڑپین ہوتی رہتی تھین یہان تک کہ بھاؤ پانی پت کے تاریخی میدان مین پہنچ گیا۔ اور اُس نے قصبے مین اپنا عمل دخل کر کے وہان ایک دو ٹوک لڑائی کی طرح ڈالی۔

مرہٹہ افواج کی موجودات

اوپر شاہ ابدالی کے شاہدرے پر اپنی فوج کی موجودات لینے کا ذکر کیا گیا ہے۔ کاشی راؤ نواب شجاع الدولہ کے میر منشی نے سوم جنگِ پانی پت کا جو حال اپنے چشم دید واقعات کی بناء پر اپنے ورثاء کی اطلاع کے لئے تحریر کیا ہے۔ اور جو اس معرکے کا ایک مستند بیان سمجھا جاتا ہے کیونکہ کاشی راؤ نہ صرف خود نواب شجاع الدولہ کے لشکر ابدالی مین داخل ہونے کے وقت سے لیکر جنگ کے اختتام اور نواب موصوف کے رخصت ہونے تک سارے معرکے مین موجود رہا۔ بلکہ وہ

نواب کے معتمد علیہ کارکن کی حیثیت مین مرہٹون سے مصالحت کی گفت و شنید اور نامہ و پیام بھی کرتا رہا۔ اس مین کاشی راؤ نے لکھا ہے کہ بھاؤ کنجپورہ کی تسخیر کے بعد دہلی واپس آیا اور اُس نے اپنی ماتحت سپاہ کی موجودات لی۔ دیگر تاریخون سے بھاؤ کی اِس واپسی دہلی کا پتہ نہین چلتا۔ مگر اسکے انھی ایام مین اپنی سپاہ کی موجودات لینے کا اُن مین بھی حوالہ دیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ موجودات کنجپورہ پر چڑھائی کرنے کے وقت لی گئی ہو۔ بہرحال کاشی راؤ نے اس موجودات مین مرہٹہ سپاہ کی تعداد حسب ذیل ظاہر ہونے کا ذکر کیا ہے۔

ابراہیم خان گاردی کے ساتھ دو ہزار سوار اور نو ہزار پیادے جو توڑے دار بندوقون سے مسلح اور مغربی طریقے پر قواعد دان تھے اور چالیس توپین (جنکے گولہ انداز اکثر مسلمان تھے) خاص پائیگاہ کی فوج چھ ہزار سوار۔ ملہار راؤ ہولکر کی فوج پانچ ہزار سوار جنکوجی سیندھیا کی دس ہزار سوار۔ دتاجی گائیکواڑ کے تین ہزار سوار۔ جسونت راؤ پنوار کے دو ہزار سوار۔ شمشیر بہادر و بیلاجی جادون و راجہ وٹھل شیدیو کے تین تین ہزار سوار۔ بلونت راؤ برادر نسبتی و معتمد علیہ بھاؤ کے سات ہزار سوار۔ قبواس راؤ خلف پیشوا کی خاص پائیگاہ کے پانچ ہزار سوار۔ آنتاجی منکیسر کے پانچ ہزار سوار۔ ان کے علاوہ بعض دیگر سردارون کے ہزار ہزار اور پانچ پانچ سو سوارون کے دستے تھے۔ جنکے نام کاشی راؤ کو جنگ کا حال بہت سے عرصے کے بعد لکھنے کے وقت یاد نہین آئے۔ مذکورۂ صدر سردارون کے دستون مین سوارون کے ساتھ کچھ پیادہ سپاہی بھی شامل تھے۔ اور پچیس تیس ہزار بے قاعدہ سوار پنڈارون کے تھے جنکے سردارون کے نام کاشی رائے نے چرکوسی یا چرکھاری۔ اور ہول سیوار یا ہل سوار لکھے ہین۔ ان نامون سے یہ دونون سردار بظاہر ہندو معلوم ہوتے ہین مگر پنڈارون مین بہت سے مسلمان بھی موجود تھے۔ دو تین ہزار سوار راٹھور اور کچھواہہ راجگان کے وکلاء کے ساتھ تھے۔ یہ راجگان خود تو سورج مل کی طرح بھاؤ کے لشکر سے چلے گئے تھے۔ مگر اپنے وکلاء انھون نے مرہٹون کے کیمپ مین باقی رکھے تھے۔ جو اپنے آقاؤن کو یہان کے واقعات سے مطلع کرتے رہتے تھے اور مرہٹون کے لیئے اپنے علاقون سے رسد بھی منگاتے تھے۔ اِس طرح مرہٹون کی طرف باقاعدہ سوارون کی جمعیت ساٹھ (بقول گرانٹ ڈف ۵۵) ہزار اور پیادون کی پچیس سے تیس ہزار تک تھی اور بھیڑ و بنگاہ کو ملا کر تاریخ الفنسٹن کے بموجب مرہٹون کی طرف تین لاکھ آدمیون کی بھیڑ بھاڑ تھی۔ اور دیگر محتاط اشخاص بھی دو لاکھ سے کم کا تخمینہ نہین کرتے تھے۔ افغانون کی سپاہ مین بقول گرانٹ ڈف مرہٹہ مورخ اکتالیس ہزار آٹھ سو سوار اور اڑتیس ہزار پیادے اور ستر توپین تھین۔ افغان سپاہیون کے ساتھ ایک بڑی تعداد ایسے نوجوانون

گی بھی تھی - جنکی انھون نے یتیم بچون کی حیثیت سے پرورش کی تھی - یہ لڑائی مین حصہ نہین لیتے تھے لیکن سامان کے سنبھالنے مین مدد دیتے تھے اور لڑائی ختم ہو جانے پر لوٹ مین حصہ لیتے تھے - ان اعداد کو مدنظر رکھکر کہا جا سکتا ہے - کہ افغانون کی طرف جنگی سپاہیون کی قوت مرہٹون سے کچھ ہی کم تھی - لیکن بے قاعدہ سپاہیون اور بھیر و بنگاہ سے مرہٹون کی جمعیت افغانون سے قریباً دگنی ہو گئی تھی - ان مین سے اکثر آدمیون سے ذرا دلی لڑائیون مین مرہٹون کو قیمتی مدد مل سکتی تھی - مگر باقاعدہ میدانی لڑائی مین وہ مصرت بیکار بلکہ مرہٹہ لشکر پر ایک بار تھے اور اس بار نے آخر مین اسکی کمر توڑ دی -

پانی پت پر دونون فوجون کی صف آرائی

بھاؤ نے قصبۂ پانی پت کی آبادی کو اپنے لشکر کے بیچ مین لے کر اپنے لئے مضبوط لائن تیار کی - جسکے گرد ساٹھ فیٹ چوڑی اور بارہ فیٹ گہری خندق کھدوائی اور جو مٹی اس کھدائی مین نکلی - اس سے اونچا دمدمہ تیار کرا کے اسپر اپنی بھاری توپین قائم کین - اور اس مضبوط حصار کے اندر مرہٹہ سردارون کے کمپ الگ الگ قائم ہوئے - ہر کمپ کے گرد پہرہ چوکی کا انتظام تھا اور سردار کے خیام کمپ کے وسط مین نصب کئے گئے جن مین ایک حصہ زنانہ ڈیرون کا تھا -

احمد شاہ ابدالی مرہٹون کے پیچھے جب پانی پت پر پہنچا - اور اس نے مرہٹون کو مضبوط لائن کے اندر دیکھا - تو چار کوس آگے بڑھکر ایک مقام کو جو شمال مغرب کی طرف قصبہ پانی پت کے عین مقابل تھا - اپنے لشکر کے قیام کے لئے پسند کیا اور افغانون نے اپنے ملک کے دستور کے موافق پتھرون اور درختون کے تنون سے سنگھڑین حفاظت کے لئے بنائین - اور ان کے عقب مین توپین لگائین - لشکرگاہ کے اندر افغان و روہیلہ سردارون کے کمپ الگ الگ قائم کئے گئے - اور ہر سردار کی طرف سے اپنے کمپ کے سامنے دیدبانی اور حفاظت کا انتظام کیا گیا - دن کو ایک کمپ کے آدمی دوسرے کمپ مین جاتے اور مشاغل تفریح مین شریک ہوتے تھے - شاہ ابدالی نے اپنے خیام قریباً وسط لشکر مین لگائے تھے اور کمپ کے اگلے حصے مین بھی ایک لال ڈیرہ نصب کیا تھا - جس مین شاہ روزانہ چند گھنٹے گذارتا اور دشمن کے لشکر کی خبرین سنتا تھا - اور گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے کمپ کے گرد چکر لگاتا اور بعض اوقات پانی پت کی طرف بڑھ جاتا تھا -

گرد و نواح کی لڑائیان

بھاؤ نے پانی پت پہنچنے سے قبل ہی گوبند راؤ پنڈت بوندیلے کو - جو پیشوا کی طرف سے بوندیلکھنڈ اور انتربید (دوآبہ مابین گنگ و جمن) کے غربی حصون کوڑہ جہان آباد - اٹاوہ وغیرہ کے

علاقون مین تحصیل وصول مالگذاری پر مامور تھا۔ یہ حکم بھیجدیا تھا کہ اپنے علاقے سے وہ مرہٹون کی امداد کے لئے فوج فراہم کرے اور افغانون کے لشکر کی رسد کو روکے۔ گوبند راؤ بوندیلے اس کام مین خاص مہارت رکھتا تھا اور نجیب الدولہ پر مرہٹون کی چڑھائی کے وقت اس نے گنگا کو عبور کرکے روہیلون کے سینکڑون گانون تباہ و ویران کر دئے تھے۔ بھاؤ کے حکم سے اس نے دس بارہ ہزار فوج اکٹھی کی۔ اور میرٹھ کو اپنا مستقر بنایا۔ اُسکے رسالے والے شاہ آبدالی کے لشکر کے عقب مین دُور دُور پھر کر گانوؤن کو تاراج کرتے اور رسد لانے والی پارٹیون کو لُوٹتے رہے۔ پانی پت سے لیکر دہلی تک ذرائع آمد و رفت پہلے ہی مرہٹون کے ہاتھ مین تھے۔ اِس لئے گوبند راؤ بوندیلے نے جب روہیلون اور بنگش کے علاقون سے لشکر آبدالی مین رسد پہنچنے کی رُوک تھام کی تو افغانون کو قلتِ اجناسِ خوراک سے بیحد تکلیف پہنچنے لگی اور بعض روایات کے بموجب چاول کا بھاؤ دو روپے سیر اور آردِ گندم کا ایک روپے سیر تک لشکر آبدالی مین چڑھگیا۔ افغان اِس طریقۂ جنگ کے عادی نہ تھے۔ اِس لئے وہ پریشان ہوئے۔ لیکن اُن کے ہندوستانی رفیقون نے شاہ کو ترکی بہ ترکی جواب دینے کی صلاح دی اور وزیر اعظم کے بھانجے عطائی خان کو جسکا باپ سردار عبدالصمد خان کنج پورہ مین مرہٹون کے ہاتھون قتل ہوا تھا۔ پانچ ہزار افغان سوارون کے ساتھ گوبند راؤ کی دستبرد کی رُوک تھام کے لئے مامور کیا گیا۔ اور عنایت خان خلف حافظ رحمت خان رئیس بریلی کے رسالے کے پانسو جوان افغانون کی رہنمائی و امداد کے لئے دئے گئے۔ عطائی خان سہ پہر کو لشکر شاہ سے خاموشی کے ساتھ نکل کر غازی الدین نگر کو۔ جسکے نواح مین بوندیلے کی موجودگی کی اطلاع ملی تھی۔ روانہ ہوا۔ اور رات بھر مین چالیس کوس کی منزل طے کرکے طلوع آفتاب کے ساتھ اُس مقام پر جا پہنچا جہان گوبند راؤ پنڈت ڈیڑھ ہزار آدمیون کے ساتھ ایک آمون کے باغ مین مقیم تھا۔ افغانون کو یکایک اپنے سرون پر پاکر گوبند راؤ پنڈت اور اُسکے سوارون سے کچھ بن نہین پڑا اور چونکہ بوندیلے کا سن پچھتر سال سے متجاوز ہو چکا تھا اور جسم بہت فربہ تھا۔ اِس لئے جلد سوار ہو کر نکل بھاگنے کا اسکو موقعہ نہین ملا اور عطائی خان کے سوارون نے اُسکو قتل کر ڈالا۔ اُسکے سپاہیون کا سامان لوٹ لیا۔ اور گوبند راؤ پنڈت کا سر کاٹکر اساتھ لائے اور احمد شاہ آبدالی کی خدمت مین اسکو نذر گذرانا۔ شاہ ممدوح نے اِس مہم کے سر کرنے پر اُسکو خلعت دیا۔ اور اُسکے بعد لشکر شاہ مین فرخ آباد اور روہیلکھنڈ سے رسد پہنچنے لگی۔

گوبند راؤ پنڈت بوندیلے جیسے قابل و تجربہ کار سردار کے مارے جانے سے بھاؤ کو قدرتی طور پر

سخت رنج پہنچا۔ اور شجاع الدولہ کی معرفت اندرونی طور پر جو گفت وشنید صلح کی بابت قریب قریب طے ہو رہی تھی اور جس مین مرہٹہ بتدریج شاہ ابدالی کے افغانستان واپس چلے جانے کے سابق مطالبہ کو چھوڑ کر پہلے لاہور اور بعد ازان سرہند تک افغانون کی حکومت مین داخل ہونے اور شجاع الدولہ و سرداران روہیلہ و نواب نجیب کے علاقون پر کوئی دست درازی کئے بغیر اپنی فوجون کو دکن واپس لیجانے پر رضامند ہو گئے تھے۔ وہ بند ہو گئی۔ بھاؤ کا دعوےٰ تھا کہ گوبند پنڈت صرف اپنے لشکر کے لئے رسد فراہم کرتا تھا اور اُسکو اس طریقے پر دھاوا کرکے قتل کر ڈالنا جائز نہین تھا۔

اس واقعہ کے بعد شاہ ابدالی نے جہان خان کو چھ ہزار سوارون کی جمعیت کے ساتھ مرہٹون کی رسد لانے والی پارٹیون کی گرفتاری کے لئے اور شاہ پسند خان کو اسی قدر جمعیت کے ساتھ پانی پت کے آس پاس کے دیہات کو تباہ کرنے کے لئے مامور کیا۔ اور بہادر خان کو چھ ہزار سوارون کے ساتھ مرہٹون کی لائن کی نگرانی سپرد کی۔ جہان خان کے آدمیون سے مرہٹون کی رسد لانے والی جماعتون سے کئی بار مقابلے ہوئے۔ اور اُنکی رسد افغانون نے چھین لی۔ بہادر خان کے سپاہی مرہٹہ کیمپ کے گرد لگے رہتے تھے اور جو آدمی باہر نکلتے تھے اُنکو گرفتار کرا تے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ نے پہلے عہ اور بعد ازان صہ فی سر انعام مقرر کیا تھا اور احمد خان نجیب مرہٹون کو زندہ گرفتار کرکے لانے پر دو روپے سے صہ فی کس تک انعام دیتے تھے۔ ان ماخوذین کو احمد خان دن بھر قید رکھتے اور آدھی رات کو غلہ وغیرہ دیکر چھوڑ دیتے تھے۔ اسی دوران مین مرہٹون کو ایک اور نقصان بھی پہنچا گنارو شنکر برہمن نے دہلی سے اپنے آدمیون کے ہاتھ روپیہ اور سامان رسد ایک فوجی بدرقہ کی زیر حفاظت مرہٹون کے لشکر کو روانہ کیا تھا۔ پانی پت کے قریب یہ لوگ افغانون کے خوف سے شب کو سفر کر رہے تھے۔ شب کی تاریکی مین اتفاق سے اس بدرقہ کا ایک حصہ جسکے پاس روپیہ تھا۔ راستہ بھول کر شاہ ابدالی کے لشکر کی طرف چلا گیا جہان افغانون نے تمام آدمیون کو قتل کرکے اُنکا روپیہ چھین لیا۔

ان وجوہ سے مرہٹون کی طرف سامان خوراک کی قلت شروع ہوئی۔ اور جس قدر ذخائر غلے کے قصبۂ پانی پت مین موجود تھے۔ تھوڑے ہی دنون مین انھون نے کھا پی کر برابر کر دئے۔ سورج مل اور راجپوتانہ کے راجہ اپنے علاقون سے کچھ رسد مرہٹون کو بھیجتے تھے۔ اور سورج مل نے کئی مرتبہ روپیہ بھی روانہ کیا۔ مرہٹون کی ایک دستاویز سے توظاہر ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ سورج مل نے ایک کرور کی رقم بھیجی۔ جو مرہٹون کے لشکر مین پہنچ بھی گئی۔ مگر چونکہ بنجارے وغیرہ جو غلہ جان جوکھون اُٹھا کر لاتے تھے اُسکی وہ بہت بڑی قیمت طلب کرتے تھے۔ اس لئے روپے کی قلت بھی محسوس ہونے لگی اور آخری ایام مین تو یہان تک

نوبت پہنچی - کہ عورتون کے زیورات اور طلائی و نقرئی ظروف و سامان کو گلوا کر انکی اشرفیان اور روپے اُن ٹکسالون مین ڈھالے گئے - جو مرہٹہ کیمپ مین قائم کی گئی تھین - الغرض اب مرہٹے گویا محاصرے مین آگئے اور اسکی مدت جس قدر طوالت پذیر ہوتی گئی - اُنکی تکالیف و مشکلات بڑھتی گئین -

تین دریائی لڑائیان

ملہار راو ہولکر او جنکوجی سیندھیا اس طریقۂ جنگ کے ابتدا سے مخالف تھے - مگر بھاؤ نے انکے مشورون پر کان نہین دھرا - جس روز نارو شنکر کا دہلی سے بھیجا ہوا روپیہ اور غلہ افغانون کے ہاتھ آگیا - تو ہولکر نے دشمن پر حملہ کرنے کی رائے دی - چنانچہ اسکے بعد ایک لڑائی مرہٹون اور افغانون کے درمیان ہوئی - مرہٹہ مؤرخین اسکو وزیر کی لائن پر باقاعدہ حملہ قرار دیتے ہین - جو ہولکر کی زیر کمان پندرہ ہزار آدمیون کی جمعیت سے کیا گیا تھا - اور مرہٹے دھاوا کرتے ہوئے افغانون کی صفوف کو توڑ کر وزیر کے کیمپ مین گھس گئے تھے - مگر جب چارون طرف سے وزیر کو کمک پہنچی - تو مرہٹون پر دباؤ پڑا اور وہ پیچھے ہٹ آنے کے لئے مجبور ہوئے - مرہٹون نے ابتدائی حملے مین دو ہزار پٹھانون کو قتل کر ڈالا تھا - مگر بعد مین اُن کو بھی بقول گرانٹ ڈف ایک ہزار اور فارسی تاریخون کے بموجب تین چار ہزار آدمیون کا نقصان اُٹھانا پڑا - اور پٹھانون نے مرہٹہ کیمپ تک انکا تعاقب کیا -

دوسری لڑائی کی ابتدا کے متعلق بھی اسی طرح مرہٹہ و فارسی روایات کا اختلاف ہے مرہٹہ روایات کے بموجب بھاؤ نے وسواس راؤ - ملہار راؤ ہولکر - بلونت راؤ گنپت مینڈلی اور کئی دیگر نامی سردارون کی معیت مین شاہ ولی خان وزیر اعظم پر جو ایک مسجد مین نماز پڑھنے جارہے تھے - حملہ کیا اور وزیر کو چارون طرف سے گھیر لیا - مگر اُنھون نے اپنے حواس برقرار رکھے اور کیمپ مین اطلاع بھیجی نجیب الدولہ و دیگر سردار اُن کی امداد کے لئے دوڑے اور سخت خونریز لڑائی واقع ہوئی - نجیب الدولہ اپنے آدمیون کے ساتھ مرہٹون کو دباتے ہوئے آگے نکل آئے اور مرہٹون کے کیمپ کے قریب پہنچ گئے اُس وقت بلونت راؤ نے کئی ہزار آدمیون کے ساتھ نجیب الدولہ پر دھاوا کیا اور تین ہزار آدمی نجیب الدولہ کے مارے گئے - سردار موصوف پر یہ ایک نازک وقت تھا اور مرہٹہ مؤرخین کا دعوےٰ ہے کہ مرہٹے اس روز کی لڑائی قریب قریب جیت چکے تھے - نجیب الدولہ اس طرح گھرے تھے کہ وہ شاید زندہ پلٹ کر شاہ ابدالی کے لشکر مین نہ جاسکتے - اور قتل یا گرفتار ہو جاتے - مگر شام کے قریب ایک بندوق کی گولی بلونت راؤ کے لگی - جس سے اُن کی حالت غیر ہونے لگی - بھاؤ اپنے برادر نسبتی و مشیر خاص کو مہلک زخم پہنچنے سے بدحواس ہوگیا اور اُسنے مرہٹون کو واپسی کا حکم دیدیا - سیر المتاخرین و خزانۂ عامرہ کی روایات کے بموجب شاہ ولی خان وزیر کو مرہٹون نے نہین آگھیرا تھا

بلکہ خود افغانون نے شاہ کے حکم سے مرہٹون کے توپخانے پر باقاعدہ حملہ کیا تھا۔ اور اُن کے تمام سردار اپنی فوجون کے ساتھ اس حملے مین شریک ہوئے تھے۔ مرہٹے حملے کی خبر پاکر مقابلے کو نکلے اور دونو فوجون مین باہم لڑائی ہوتی رہی۔ نجیب الدولہ نے اس موقعہ پر زیادہ جوش دکھایا اور اپنے آدمیون کے ساتھ بندوقین مارتے ہوئے مرہٹون کے مورچون مین گھس گئے۔ جہان وہ مرہٹون کے درمیان گھر گئے۔ مگر نجیب الدولہ کے رفقاء نے مرہٹون کے سردار بلونت سنگھ کو بندوق کا نشانہ بنایا۔ جس سے لڑائی کا رنگ بدل گیا۔ نجیب الدولہ کے کئی ہزار آدمی ضائع ہوئے مگر وہ بخیریت مرہٹون کی لائن سے نکل کر اپنے لشکر مین آ گئے۔

تاریخ فرخ آباد مین ایک شبخون کا ذکر ہے۔ جو ابراہیم خان گاردی نے احمد خان بنگش کی فوج پر مارنا اور ایک دم حملہ کرکے اُنکی توپون کو چھین لینا چاہا تھا۔ مگر احمد خان کے آدمی ہوشیار تھے اور اُن کی توپون مین گراب بھرا ہوا رہتا تھا۔ جب مرہٹون کی آمد کا اُن کو پتہ لگا تو اُنھون نے توپون کو بتی دکھائی۔ جب توپین چلین تو گاردی کے سینکڑون آدمی مجروح و مقتول ہوئے۔ اور وہ واپس چلے گئے۔ اسی قسم کے ایک شبخون کا تاریخ رام پور مین حوالہ دیا گیا ہے۔ جو نواب فیض اللہ خان کے ماتحت سردار رضی خان کی فوج پر گاردی کے بھائی فتح خان نے مارنا چاہا تھا لیکن رضی خان نے بڑی گرمی کے ساتھ دشمن کی مدافعت کی۔ اور مرہٹے تین سو آدمیون کا نقصان اُٹھاکر اور اپنی چند توپین چھوڑکر واپس ہو گئے۔ نواب فیض اللہ خان نے جنگ ختم ہونے کے بعد رام پور واپس آکر رضی خان کو اس روز کی فتح پر خلعت دیا اور ایک موضع جاگیر مین عنایت کیا۔ مرہٹہ مورخون کی کتابون مین ان دونون شبخونون کا کوئی حوالہ نہین دیا گیا ہے بلکہ وہ افغانون پر الزام لگاتے ہین۔ اور فارسی تاریخون سے بھی اسکی تائید ہوتی ہے۔ کہ اُنھون نے شب کو دھوکے سے جنگل مین مرہٹون کے گھسیارون اور لکڑہارون وغیرہ پر حملہ کیا اور کئی ہزار آدمیون کو جان سے مار ڈالا۔ شاہ ابدالی نے صبح کو جاکر دیکھا تو لاشون اور سرون کے انبار پائے۔ اور مرہٹون کو جب اس ہولناک واقعہ کی خبر ہوئی تو غم و غصہ کے ساتھ عالم ہراس و اضطراب اُن پر چھا گیا۔

مصالحت کی سلسلہ جنبانی یہ لڑائیان فریقین مین ہو رہی تھین اور دونون طرف سے روزانہ توپین بھی چلتی تھین مگر اندرونی طور پر مصالحت کی سلسلہ جنبانی بھی قائم تھی۔ بھاؤ کے پیام شجاع الدولہ کے پاس اور ملہار راؤ ہولکر کے نجیب الدولہ کے پاس آتے تھے۔ اور معتمد علیہ اشخاص بھی آتے جاتے تھے۔ چنانچہ شجاع الدولہ نے راجہ دیبی دت و کاشی راؤ کو بھاؤ کے پاس بھیجا۔ اور بھاؤ نے بھوانی شنکر برادر زادہ

تا۔ دشنکر و گنیش راؤ کو روانہ کیا۔ نواب شجاع الدولہ صلح کی طرف مائل تھے اور اُنھون نے وزیر کی معرفت احمد شاہ ابدالی کو بھی مطلع کیا۔ احمد شاہ نے کہدیا تھا کہ مین آپ لوگون کا بُلایا ہُوا آیا ہون اگر آپ مرہٹون سے صلح کرنی چاہین۔ تو آپ کو اِس بارے مین کامل اختیار ہے۔ لیکن اگر جنگ ہوئی تو اِس وقت آپ لوگون کو میری مرضی پر چلنا ہوگا۔ نجیب الدولہ چونکہ مرہٹون کے ہاتھون بہت اذیت پا چکے تھے اور اُن کے علاقے کو گوبند راؤ پنڈت نے ویران کردیا تھا۔ نیز بھاؤ کے غرور کا حال اُنکو معلوم تھا۔ جس مین مذہبی تعصب کا رنگ بھی صاف جھلکتا تھا۔ اس لئے انھون نے ہمیشہ صلح کی مخالفت کی اور کہا کہ اس وقت مرہٹے مجبور و لاچار ہین۔ اس لئے تمام شرائط ماننے کو تیار ہین۔ لیکن اس خطرے سے چھوٹنے کے بعد وہ کسی عہد و پیمان کی پروانہ کرینگے۔ شاہ ابدالی اپنے ملک کو واپس چلے جائینگے اور یہان ہم سب کے علاقون کو مرہٹے جی بھر کے تاراج کرینگے اور ہندوستانی امراء کو نان شبینہ سے محتاج کردینگے۔ نجیب الدولہ نے شاہ ابدالی کی خدمت مین جاکر بھی اپنے یہی خیالات بیان کئے۔ اور ان کے وزیر اعظم شاہ ولی خان کو بالکل اپنے موافق کرلیا۔ اس لئے شجاع الدولہ کی کوششین مصالحت کے متعلق کامیاب نہ ہوسکین۔ لیکن ہندوستان کے دستور کے موافق آخری معرکہ شروع ہونے کے وقت تک نامہ و پیام بھاؤ اور شجاع الدولہ کے درمیان جاری رہے۔ ملہار راؤ ہولکر اور نجیب الدولہ کے درمیان بھی خفیہ نامہ و پیام ہوتے تھے۔ اور اُن دونون نے ایک دوسرے کے ساتھ رعایت برتنے کا معاہدہ کرلیا تھا۔ جسکا عملی طور پر نفاذ بھی کیا گیا۔ اور ملہار راؤ ہولکر کے نکتہ چین اسپر برابر یہ الزام لگاتے رہے کہ اسنے معرکۂ پانی پت مین کافی بہادری نہین دکھائی اور جان چُرا کر بھاگ گیا۔ چنانچہ وٹھل راؤ شیودیو اور ملہار راؤ ہولکر کی ایک مشترکہ عرضداشت بنام بالاجی باجی راؤ پیشوا جو اصل فارسی زبان مین موجود ہے اور جسکا ترجمہ کنکیڈ و پارسینس کی تاریخ مرہٹہ مین دیا گیا ہے۔ اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیشوا کو اسی بناء پر ان سے رنج تھا اور یہ اسکے مورد عتاب تھے۔ انھون نے پیشوا کو یقین دلایا ہے کہ ان کی طرف سے کوئی کوتاہی معرکۂ جنگ مین نہین ہوئی اور یہ محض اتفاق ہے کہ وہ اپنے زخمون سے شفا پاگئے۔

مرہٹون کی زار و نزار حالت

مرہٹون کی حالت ڈھائی ماہ تک حصار کے اندر پڑے پڑے برابر خراب ہوتی گئی۔ اور جب رسد کے ملنے کا کسی طرف سے سہارا نہین رہا۔ اور قصبۂ پانی پت کے اصلی باشندے بھی۔ جنکے ذخائر اجناس کو مرہٹے ختم کرچکے تھے۔ اُنکے ساتھ بھوک کے مرنے لگے۔ مویشی جو دانہ چارہ میسر نہ آنے کے باعث ہلاک ہوتے تھے۔ اُنکی لاشون کو پھینکنے یا دبانے کا بھی موقعہ نہ ملتا تھا۔ گویا ایک انگریزی

مورخ کے الفاظ مین لاکھون آدمی مرغیون کی طرح ایک بڑے کھانچے مین بند تھے - جس مین زندون کی غلاظت اور مرنے والون کی لاشون کے سڑنے سے سخت عفونت پھیلی ہوئی تھی - جو لوگ حصار سے باہر قدم رکھتے تھے - اُن کو پٹھان - جو روز افزون سختی کے ساتھ نگرانی کر رہے تھے - سنگوا لیتے تھے - آخر مین دو روز تک برابر جب سپاہ کو آذوقہ میسّر نہ آیا اور سینکڑون آدمی گرسنگی سے جان بلب اور بعض ہلاک بھی ہوگئے - تو ہولکر اور بڑے بڑے مرہٹہ سردار بھاؤ کے خیمے پر آئے اور اُنھون نے لشکر کی صورت حال بیان کر کے کہا کہ بھوکھ اور وبائی امراض سے تڑپ تڑپ کر مرنے کی بجائے - یہ بہتر ہے کہ میدان جنگ مین مردانہ وار جان دیجائے - اور کم از کم بزدلی و نامردی کا الزام اپنے اوپر نہ لیا جائے - بھاؤ پہلے ہی صورتحال سے بیحد پریشان تھا - اپنے سردارون کی اِس رائے سے اتفاق کیا - اور سردارون کے رخصت ہونے پر اپنے ہاتھ سے پان کے بیڑے اُن کو دئے - جو غلہ وغیرہ لشکر مین باقی تھا - وہ سب لوگون کے درمیان تقسیم کر دیا گیا تاکہ وہ لڑائی پر جانے سے پہلے آخری کھانا پیٹ بھر کھا لیکن - اسکے ساتھ ہی فوج کے تمام حصّون کو لڑائی کے لئے کمر بندی کے لیے حکم سُنا دیا گیا اور سردارون اور سپاہیون نے "کیسری بانے" (زرد لباس) زیب تن کئے جس سے یہ مراد تھی کہ وہ اپنی جان قربان کرنیکو جا رہے ہین - آدھی رات کو بھاؤ نے بدست خاص ایک پرچہ دیوان کاشی رائے نواب شجاع الدولہ کے معتمد کارندے کو جسکی وساطت سے گفتگوئے مصالحت ہو رہی تھی - لکھکر بھیجا کہ وہ نواب سے کہے کہ "پیالہ اب لبریز ہو چکا ہے اور ایک قطرے کی بھی گنجایش نہ رہی تھی - اگر دوست کو کچھ کرنا ہے تو اُسکا یہ آخری وقت ہے ورنہ صاف جواب دینا چاہئے کیونکہ نوشت و خواند کا وقت گذر چکا ہے"۔

مرہٹون کی لڑائی کے لئے پیش قدمی

یہ تحریر بھاؤ کی کاشی رائے کو نصف شب کے بعد پہنچی اور وہ تین بجے کے قریب اسکا مضمون نواب شجاع الدولہ کو پڑھکر سُنا رہا تھا کہ دیوان موصوف کے جاسوس یہ خبر لائے کہ مرہٹے آلات حرب سے آراستہ و پیراستہ ہو کر حصار سے نکل رہے ہین اور بارادۂ جنگ شاہ ابدالی کے لشکر کی طرف بڑھ رہے ہین - نواب شجاع الدولہ یہ سُنکر فی الفور شاہ ابدالی کے ڈیرے پر گئے اور وہ شاہ کو جگانے کے لئے آدمیون سے کہہ رہے تھے کہ شاہ موصوف ہتھیار لگائے حصۂ خوابگاہ سے برآمد ہوئے اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر مرہٹہ لائن کی طرف چلے - اسکے ساتھ ہی اُنھون نے کاشی رائے کے بُلانے کے لئے نواب شجاع الدولہ سے کہا اور جب دیوان موصوف آیا تو اُسکے جاسوسون کی لائی ہوئی خبر کے متعلق اُس سے مزید تفصیلات دریافت کر رہے تھے کہ چند افغان سپاہیون کو اپنے لشکر سے پون کوس آگے اُنکو مرہٹہ لائن کی طرف سے واپس آتے ہوئے دیکھا - جنکے پاس کچھ مال غنیمت بھی تھا - شاہ کے دریافت کرنے پر انھون نے کہا کہ مرہٹون نے پیشقدمی کرنی چاہی تھی - مگر اقبال شاہی سے وہ پیچھے ہٹا دیے گئے - اور اُنکا سامان وہ لوٹ لائے - شاہ کو یہ متضاد خبر سُنکر تعجب ہوا اور اُنھون نے متانت و اطمینان کے

کے ساتھ قلیان (حقہ) کا سرا اپنے ملازم کے حوالے کرتے ہوئے شجاع الدولہ سے کہا کہ "تمھارے آدمی کی اطلاع کو مین درست پاتا ہون"۔ اسکے بعد فوج کو جلد آگے بڑھنے کا حکم سنایا اور مقابلے کے انتظامات کی بذاتِ خود نگرانی کرنے لگے۔ ابھی شب کی تاریکی قدرے باقی تھی۔ جب صبح کی ابتدائی روشنی ہوئی تو مرہٹون کی سیاہ قطار در قطار توپون کو آگے لئے ہوئے بڑھتی نظر آئی۔ دونون لشکرون مین مختلف سردارون کی فوجین جس ترتیب کے ساتھ قیام پذیر تھین۔ وہ نقشہ مین دکھائی گئی ہے۔ مرہٹون نے پیشقدمی مین بڑے درجے تک اس ترتیب کو قائم رکھا تھا۔ اور شاہ ابدالی نے بھی اپنے سردارون کو تقریبًا وہی ترتیب قائم رکھنے اور آہستہ آہستہ دشمن کی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔ نواب احمد خان بنگش کے ساتھ چونکہ فوجی قوت بہت کم تھی۔ اس لیئے انکو عورتون کی حفاظت کے لئے چھوڑنا چاہا۔ مگر نواب موصوف نے کہا کہ عورتون کی حفاظت محلیون اور خواجہ سراؤن کے سپرد ہونی چاہیئے۔ میرا کام میدان جنگ مین لڑنے کا ہے۔ اور شاہ میری جمعیت کے قلیل ہونے کی پروانہ کرین۔ کیونکہ انہی تھوڑے سے آدمیون کے ساتھ مین نے بڑے بڑے میدانون مین کامیابی حاصل کی ہے۔ اسپر شاہ نے انکو میسرہ کی طرف جانے کا حکم دیا اور خود اس لال ڈیرے مین چلے گئے۔ جس مین وہ دشمن کی نقل و حرکت دیکھنے اور جاسوسون کی رپورٹ سننے کے لئے آخری حصہ شب مین اور سہ پہر کو اکثر بیٹھا کرتے تھے اور اب فوج کے آگے بڑھ جانے کی وجہ سے وہ ڈیرہ پیچھے رہ گیا تھا۔

گاردی کی پلٹنون کا افغانون پر حملہ

مرہٹون کی توپون کے گولے پہلے تو شاہ کی فوج تک نہ پہنچتے تھے۔ اور سامنے میدان مین گرتے تھے۔ اب کچھ گولے فوج کے درمیان گرے۔ جن سے کچھ آدمیون کو نقصان پہنچا مگر چونکہ دونون فوجین متحرک تھین۔ اس لیئے جلد توپون کے گولے فوج کے اوپر سے گذرنے لگے اور سپاہیون کے لیے بے ضرر ہو گئے۔ یہ کیفیت جب ابراہیم خان گاردی نے دیکھی تو اس نے بھاؤ کے سامنے۔ جو قلب سپاہ مین بسواس راؤ کے ساتھ جاگزین تھا۔ حاضر ہو کر عرض کیا کہ مین جب اپنے آدمیون کی تنخواہ کا تقاضا کرتا تھا تو آپ کو ناگوار گذرتا تھا۔ آج ملاحظہ فرمائین۔ کہ جو تنخواہ ان لوگون کی ملی ہے وہ ضائع نہین ہوئی ہے اسکے بعد اسنے ایک جھنڈی ہاتھ مین لی اور اپنے آدمیون کو جو بندوقین چلاتے بڑھ رہے تھے۔ حکم دیا کہ وہ فیر بند کردین اور بندوقون پر سنگینین چڑھا کر افغانون پر حملہ آور ہون۔ گاردی کی باقاعدہ فوج کے سنگینون کے ساتھ ہلہ کرنے سے روہیلون کی جو اسوقت انکے مقابل تھے۔ صفین ٹوٹ گئین اور وہ بھاگنے لگے۔ مگر حافظ رحمت خان نے جو بوجہ علالت اب تک صفِ جنگ مین شریک نہوئے تھے۔ اور پالکی مین پڑے ہوئے آرہے تھے۔ جب انکو بھاگتے

دیکھا تو روہیلون کو سخت ملامت کی اور ان کو ساتھ لے کر میدان کی طرف چلے - اور عنایت خان خلف حافظ رحمت خان نے افغان سردارون کے ساتھ گاردی کے دستون پر حملہ کیا - اور احمد خان بنگش بھی اسکی مدد کو آگئے - گاردی کے آدمیون نے انتہائی شجاعت و استقامت کا ثبوت دیا - اور اُن پر دباؤ پڑتے دیکھکر دوسرے مرہٹہ سردار بھی اپنی فوجون کے ساتھ انکی مدد کو آگئے - اور سخت خونریز لڑائی ہونے لگی - جنتاجی کا ٹیکوا رمعہ اپنے آدمیون کے ابتدا سے گاردی کے ساتھ تھا اور مرہٹے برابر گھسے چلے آتے تھے - لیکن اس وقت ابراہیم خان گاردی عنایت خان کے آدمیون کے ہاتھون پیہم زخم کھا کر اپنے آدمیون کو لڑانے کے ناقابل ہوگیا - اور جنتاجی کا ٹیکوا کے بھی بار بار زخم لگے - اب دونون فوجین آپس مین مل گئی تھین - اور شپا شپ تلوارین چل رہی تھین - مرہٹے چابک دست تھے - اور انکے سوار تیزی کے ساتھ نقل و حرکت کرتے تھے - مگر جب دست بدست لڑائی ہونے لگی - تو افغانون کے بھاری جسم اور ہتھیارون کا اُن پر بوجھ پڑا -

وزیر شاہ ابدالی پر تنگ وقت

عین اس حالت مین بھاؤ نے خود اپنی درمیانی تازہ دم فوج کو بڑھا کر وزیر پر دباؤ ڈالا ان کا بھتیجا عطائی خان جس نے گوبند پنڈت بوندیلے کو شباشب چالیس کوس کا دھاوا کر کر غازی الدین نگر مین پہنچکر معہ اُسکے آدمیون کے قتل کیا تھا - وزیر کے برابر مارا گیا اور بعض دیگر افغان سردار بھی قتل ہوئے - یہان اس قدر خونریز لڑائی ہوئی کہ آٹھ دس ہزار پیادے کابلی اور ایک ہزار اونٹ زنبورک کے - جو وزیر کی خاص جمعیت مین شامل تھے - مرہٹون کے ہاتھون قتل و بیکار ہوگئے اشرف الوزراء معہ دو تین سو سوارون اور ۵۰ - اونٹ زنبورک کے اُنکے آگے باقی رہ گئے - مگر وزیر نے جو از سر تا پا غرقِ آہن تھا - اپنی جگہ نہین چھوڑی اور اپنے آدمیون کو برابر للکارتا تھا - اِس اثناء مین نواب شجاع الدولہ نے اپنے وکیل سے کہا کہ وزیر کی طرف سے آواز نہین آتی اسکا کیا سبب ہے؟ خبر لاؤ - وکیل گھوڑا دوڑا کر اُدھر گیا - تو دیکھا کہ وزیر پر بڑا نازک وقت ہے - وہ اپنا سر دے پٹکتا تھا - مُنھ سے کف جاری تھا - اور اپنی فوج کے آدمیون پر جو جان بچانے کے لئے بھاگے جاتے تھے - سخت الفاظ مین غیظ و غضب ظاہر کر رہا تھا - کہ نامردو کہان بھاگے جا رہے ہو؟ ولایت یہان سے بہت دور ہے - مگر آدمیون پر بظاہر کوئی اثر نہین ہوتا تھا - ایسی حالت مین وکیل شجاع الدولہ کو دیکھکر وزیر نے کہا کہ شجاع الدولہ سے جا کر کہو کہ - اِس وقت مجھپر تنگ وقت ہے - اگر اب بھی انھون نے مدد نہ دی تو کب دینگے - وکیل نے فوراً واپس آکر نواب شجاع الدولہ کو اطلاع دی - نواب نے کہا کہ اس وقت وہان تک پہنچنا بہت مشکل ہوگا - اب تک نواب کی فوج لڑائی مین پورے طور سے مشغول نہین ہوئی تھی تو بھی

زنجیرہ بند کی ہوئی تیار تھین- کئی دفعہ ایسا معلوم ہوا کہ مرہٹے ان پر حملہ آور ہو رہے ہین اور برچھیان اور تلوارین چمکتی نظر آئین- مگر دونو فوجین بھڑنے نہین پائین- اب شجاع الدولہ نے خود اپنی فوج کو مرہٹون پر دباؤ ڈالنے کا حکم دیا اور وزیر کو مدد دینی چاہی مگر وہان تک پہنچ نہین سکے۔

نجیب الدولہ کی ہوشیاری نواب شجاع الدولہ کے بائین طرف نواب نجیب الدولہ اپنی فوج کو جسکی تعداد روہیلہ سردارون کی سپاہ موجودہ میدان پانی پت مین سب سے زیادہ تھی- اس طریقے پر آگے بڑھا رہے تھے کہ پیادے آگے آگے اور سوار اُن کے پیچھے تھے اور ایک مستند روایت کے بموجب خود نجیب الدولہ بھی اس وقت گھوڑے سے اُترے ہوئے اپنے آدمیون کے ساتھ اگلی صف مین چل رہے تھے- بیلدار پیادون سے آگے پیچھے اور کُدالین لئے ہوئے مٹی کھود کھود کے ڈالتے جاتے اور ایک ہاتھ اونچی دیوار اُٹھاتے تھے- جسکی آڑ مین پیادے بڑھتے تھے اور سوار بندوقون کو اٹھاکر گولیان چلاتے جاتے تھے- جو پیادون کے سرون کے اوپر سے سن سن کرتی ہوئی مرہٹون کی طرف جاتی تھین- اور پیادے بھی دیوار کی آڑ مین ہوکر بندوقین چھوڑتے تھے- اس اثناء مین بیلدار گولی کے نصف ٹپے پر آگے مٹی کی دیوار اُٹھاتے تھے- نجیب الدولہ بہت ہوشیاری و احتیاط کے ساتھ لڑ رہے تھے- اور انکے پاس گولی بارود بھی بافراط موجود تھی- اور بانون کے بیسیون چھکڑے ساتھ تھے- نجیب الدولہ کے بالمقابل جھنکوجی سیندھیا کی پوری سپاہ اور ہولکر کے دستے تھے- اسی جھنکوجی نے اپنے چچا دتاجی سیندھیا کے ساتھ سکرتال پر نجیب الدولہ کو بہت تنگ کیا تھا- اور اسکے علاقے کے سینکڑون دیہات کو تباہ کر ڈالا تھا- لہذا نجیب الدولہ اس لڑائی سے اپنا خاص تعلق سمجھتے تھے- اور یہی کہکر اپنے آدمیون کو ہمت دلاتے تھے- جھنکوجی خاص طور سے نجیب الدولہ کی فکر مین تھا- اور وہ بھی اسکو مغلوب کرنا چاہتے تھے۔

ہولکر اور نجیب الدولہ کے تعلقات برخلاف ازین ملہار راؤ ہولکر کی نسبت نجیب الدولہ کے دل مین عداوت کے کوئی خیالات نہین تھے- اور یہان تک مشہور تھا کہ ان دونون مین باہم دوستانہ معاہدہ ہوچکا ہے- کہ جنگ مین ایک دوسرے کے حال سے تعرض نہ کریگا- کم از کم ملہار راؤ ہولکر کو اُسکے معاصر مرہٹہ سردار برابر طعنہ دیتے رہے- اور بالاجی باجی راؤ پیشوا کے دل مین بھی اس قسم کا شبہ تھا- اور وہ ملہار راؤ کے معرکۂ پانی پت سے زندہ بچکر نکلنے کو اچھی نظر سے نہین دیکھتا تھا- چنانچہ ریتھل ورتشدیو دریچو رگرنے کمپ گنگوردنی واقع مالوہ سے جو خط رگھناتھ راؤ برادر پیشوا کو بھیجا تھا- اُس مین رگھوبا کے خطوط صوبہ دار ملہار راؤ ہولکر کے پاس آنے کا ذکر کرکے لکھا تھا کہ "ہم دونون ایک ہی کمپ مین ساتھ رہتے ہین .... پیشوا جو ہم کو خط نہین لکھتے اسکی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ اس بات پر ناراض ہین کہ ہم میدان جنگ مین کام نہین آگئے- یہ سچ ہے کہ کوئی شخص موت سے بچ نہین سکتا۔

مگر جتنا زمانہ کسی کی حیات کا مقدر ہے۔ اس مین اُسکا موت سے بچ جانا بھی ناگزیر ہے۔ یہ محض خدا کی ایک مہربانی تھی۔ کہ ہمین سخت مجروح ہونے کے بعد بھی آرام ہوگیا۔ یہ کس قدر صحیح ہے کہ "زندگی کے معنی فرض کے ہین اور حیات خود قوتِ لایموت مہیّا کرتی ہے"۔ باوجود اسکے ہمکو ندامت کا سخت ناگوار احساس ہے۔ جو کچھ کہ گذرا ہے اُسکو ہم بھولے نہین ہین۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہماری تمام کوششین میدانِ جنگ مین بُری بھلی جیسی کچھ بھی تھین خدائے قادر و توانا کے غصّے کی وجہ سے بیکار ثابت ہوئین"۔۔۔۔

اسی طرح ہولکر کے دیوان کی جو چٹھی رگھناتھ راؤ کے نام گرانٹ ڈف نے جلد سوم تاریخ مرہٹہ مین دی ہے اسمین بھی دیوان موصوف نے اس امر پر اظہارِ افسوس کیا ہے "کہ گذشتہ ایام مین سرگباشی پیشوا باجی راؤ نے اپنے مفاد ملہار راؤ ہولکر کو تفویض کئے۔ مگر امسال سرینت (پیشوا) کے سروج سے پلٹنے کے وقت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صوبیدار (ہولکر) کو انکا وہ اعتماد حاصل نہین ہے۔ ملہار راؤ ہولکر کی طرف سے ادائے فرض مین کوئی غفلت نہین ہوئی۔ جنگِ پانی پت مین شریک ہونے والے جو لوگ بھاگ کر بچ رہے ہین۔ وہ آنجناب سے ملے ہونگے اور انھون نے صحیح احوال آپ سے بیان کیا ہوگا۔ ایک شکست کو سراہنے سے بھلا کیا فائدہ ہے؟ یہ سب لوگون کو بخوبی معلوم ہے کہ سرکار کے قدیم ملازمین سیندھیا اور پنوار کا لڑائی مین کیا حال ہوا؟ آنجناب نے صوبیدار کے معاملات دکن مین ترق کئے جانے کی جو اطلاع لکھکر بھیجی ہے۔ اُس سے اُن پر سخت رنج و مایوسی طاری ہے۔ وہ اکثر شکایات کرتے ہین کہ اُنکی کوشش کا اگر یہ ثمرہ ہے۔ تو آیندہ کی کیا امید ہوسکتی ہے"؟

ان تحریرون سے عیان ہے کہ ملہار راؤ ہولکر کے میدانِ پانی پت پر دشمن کے مقابلے مین طرح دینے کا خیال پیشوا سے لے کر ادنےٰ اہلکارون تک سب لوگون کے دلون مین جاگزین تھا۔ اور اسپر پیشوا کا عتاب بھی ہولکر کی جاگیرات دکن کی ضبطی کی صورت مین نازل ہوا تھا۔ ملہار راؤ ہولکر نے خود لڑائی کا جو حال لکھا ہے۔ اسمین بھی اپنی صفائی پیش کی ہے۔ مگر نانا فرنویس کی ایک مشہور تحریر مین جو حال معرکۂ جنگ کے احوال پر مشتمل ہے۔ ہولکر اور دیگر سردارون پر بھاؤ کو میدانِ کارزار مین چھوڑ دینے کا صاف الزام لگایا گیا ہے۔ اور خود "آخر دم تک" آقا کے ساتھ رہنے" پر فخر کیا گیا ہے۔

نجیب الدولہ و جھنکوجی سیندھیا کی آویزش

نجیب الدولہ نے اپنے پیادون کے ساتھ جھنکوجی سیندھیا کی فوج پر دباو ڈالا۔ اور بیک وقت دو دو ہزار گولے انکے سپاہیون نے مرہٹون پر پھینکے۔ ان کی آواز سے دل دہلتے تھے۔ اور دھوئین کی تاریکی مین کچھ نظر نہین آتا تھا۔ اسی دھوئین کی آڑ مین نجیب الدولہ کے آدمی آگے بڑھتے رہے اور مرہٹے بوجہ تاریکی اُن پر گولیان چلانے یا بھالون سے حملہ آور ہونے کا پورا موقع

یا سکے۔ اسکے بعد پیادون نے دو طرفہ ہٹ کر توپون کو آگ برسانے کا موقعہ دیا جس سے جھنکوجی سیندھیا کی
رج اور ہولکر کے دستون کو پیچھے ہٹنے کے سوا کوئی چارۂ کار نظر نہین آیا۔ اور مرہٹہ لائن مین اس طرف
بیدگی واقع ہوئی۔

اہ پسند خان اور پنوارٹ

نجیب الدولہ کی بائین طرف شاہ پسند خان افغانون کا مشہور سردار معہ اپنی فوج کے
بڑھتا آیا۔ یہ دلاور و آزمودہ کار سردار ایسی قوت کے ساتھ لڑ رہا تھا۔ کہ مرہٹون کو
سکے سامنے دم لینے کی فرصت نہ ملتی تھی اور پنوارٹ کے جو دستے اسکے مقابل تھے اُن کی قوت برابر
گھٹتی جاتی تھی۔

اہ ابدالی کا آخری زبردست حملہ

اسی طرح پورے خطِ حرب پر صبح سے دوپہر تک لڑائی جاری رہی۔ ہرچند گارڈی
کے زخمی ہونے کے بعد اُسکی پلٹنون کا زور ٹوٹ گیا تھا اور افغانون کی نسبت
رہٹون کا زیادہ نقصان ہو رہا تھا۔ تاہم مرہٹے ایسی شجاعت کے ساتھ لڑ رہے تھے اور افغان سپاہ
ے قلب مین اس قدر گھسے ہوئے تھے کہ بظاہر غلبہ اُنھین کا معلوم ہوتا تھا۔ اور وزیر شاہ ولی خان
بشاہ ابدالی کے قلب لشکر کا محافظ تھا۔ اپنی جان کو سخت خطرے مین پاتا تھا۔ شجاع الدولہ کی طرف
ے کوئی قابل ذکر مدد وزیر کو نہین پہنچ سکی۔ اگرچہ اُنکی فوج نے مرہٹون کی بعض جمعیتون کو اُنپر
یدہ دباؤ ڈالنے سے روکا۔ اسی اثناء مین احمد شاہ ابدالی نے اپنے محافظ دستون کا ایک حصہ
زیر کی کمک کے لئے بھیجا۔ جس سے افغانون کے پانوٗن پھر جم گئے۔ مگر اب تک مرہٹون کا زور
رہا تھا۔ اور افغانی لائن کا زیادہ دیر تک قائم رہنا دشوار نظر آتا تھا کہ اس نازک وقت مین
اہ ابدالی نے اپنی زبردست حربی قابلیت کا اظہار کیا اور اپنے بقیہ محافظ دستون کو ساتھ
کر اور وزیر کی فوج کے پس پا شدہ آدمیون کو سمیٹ کر ایک زبردست حملہ کیا۔ جس نے میدان
رزار کی حالت بدل دی۔ مرہٹے شاہ کے اس آخری طاقتور حملے کی تاب نہ لاسکے۔

ڈپر عالمِ یاس طاری ہوا

بسواس راؤ کے جب مہلک زخم لگا۔ تو بھاؤ کی آنکھون مین جہان تاریک ہوگیا کیونکہ
وہ اپنے بھتیجے سے اولاد کی طرح محبت کرتا تھا۔ اُسکی جان پر زد پڑنے سے بھاؤ کی
یا کمر ٹوٹ گئی۔ اسکے ساتھ ہی خود بھاؤ کے بھی کئی زخم لگے۔ اسنے بسواس راؤ کو ہاتھی کے ہودے مین
نے کا حکم دیا۔ اور خود ہاتھی سے اُتر کر اپنے عربی گھوڑے پر بیٹھا اور لڑائی کے بھنور مین کود پڑا۔ فوج جب
نے سپہ سالار کی رہنمائی سے محروم ہوگئی تو اُس کے پانوٗن میدان سے اُکھڑنے لگے۔ اس سے پٹھانون کو
ے تو تعجب ہوا۔ مگر پھر اُنکی ہمت بڑھ گئی اور نیا جوش پیدا ہوگیا۔ وہ تمام سمتون سے مرہٹون کو گھیرنے

ہوئے چلے۔ حتی کہ چار بجتے بجتے سارا میدان مرہٹہ جنگجویون سے خالی ہوگیا۔ اور ہر طرف لاشون کے انبار نظر آنے لگے۔ مرہٹہ سپاہی میدان کے چارون طرف بھاگے اور افغان سوار انکے تعاقب مین چلے۔ یہ حالت شام ہونے کے بعد شب مین بھی قائم رہی۔ اور چونکہ چاندنی رات تھی۔ اس لئے افغان سوارون نے مفرور مرہٹون کا دس بارہ کوس تک پیچھا کیا۔ اور سب کو قتل کرکے انکا سامان لوٹ لیا۔ کئی ہزار مرہٹہ سپاہی جائے پناہ پانی پت کو واپس گئے اور بڑی دقت سے خندق کو طے کرکے اور دمدمہ پر چڑھکر حصار کے اندر داخل ہوئے۔ کچھ لوگون کے ہاتھ پانون خندق مین کودنے کے وقت ٹوٹے۔ اور جو لوگ حصار کے اندر پہنچ گئے تھے انکو بھی کوئی امن نہین ملا۔ بلکہ وہ رات بھر بھوکے پیاسے پڑے رہے۔ اور افغانون نے شب ہی مین قصبہ کے گرد پہرے لگا دیے اور علی الصباح آکر جس قدر بھی مرد عورتین اور بچے حصار کے اندر ملے ان سب کو گرفتار کرلیا۔ عورتون اور بچون کو افغانون کے پرانے دستور کے موافق بطور کنیز و غلام اپنے ساتھ لیجانے کے لئے الگ رکھا اور انھین کچھ کھانے کو دیا۔ کیونکہ دو ہفتے سے مرہٹون کے لشکر مین سامان رسد کی کمی تھی۔ اور تین تیس گھنٹے سے انھین مطلق غذا نہین ملی تھی۔ مرد قیدیون کے ساتھ افغانون نے بظاہر بہت ظالمانہ مگر بباطن شاید ہمدردانہ سلوک کیا کہ انھین غیر ملک مین ذلت و مصیبت کی زندگی بسر کرنے کے لئے باقی رکھنے کے بجائے قید ہستی ہی سے چھڑا دیا۔ اور سب کو قتل کر ڈالا۔

افغانون نے قیدیون کو کیون قتل کیا؟

کپتان گرانٹ ڈف نے لکھا ہے کہ "شاید خونخوار ترین جنگلی اقوام کو بھی مرہٹون کی زار حالت دیکھکر اُن پر کچھ ترس آتا۔ مگر افغانون کو مطلق رحم نہین آیا۔ اور انھون نے اپنی قوم اور بنی نوع انسان کے دامن پر بدنامی کا مستقل دھبا اس طریقے سے لگایا کہ دوسرے روز صبح کو وہ اُن بدنصیب اسیرون کو وہان سے نکال کر لے گئے اور اپنے لشکر مین لیجا کر اُن کو تقسیم کرلیا۔ عورتون اور بچون کو تو انھون نے لونڈیون اور غلامون کے طور پر زندہ رہنے دیا۔ لیکن مردون کو قطار مین بندھوا کر کھڑا کیا اور انکے سر اتار کر اپنے دل کو محظوظ کرتے رہے اور بعد مین اُنھون نے ڈیرون کے آگے بطور نشانات فتح کے اُن سرون کو اوپر تلے رکھکر انبار لگائے اور کلہ منار بنائے"۔ دیگر انگریز مورخون نے بھی اس معاملے پر اسی طریقے سے رائے زنی کی ہے۔ اور بعض نے شاہ ابدالی کے ہندوستانی رفقاء کو بھی اسمین شریک سمجھا ہے۔ اور اس سے مسلمانون کی بے رحمی اور ہندو مسلمانون کی عداوت باہمی کا نتیجہ نکالا ہے۔ حالانکہ یہ سراسر غلط ہے۔ مرہٹہ قیدیون مین سے کئی ہزار مردون کو ضرور قتل کیا گیا۔ لیکن نواب شجاع الدولہ تو درکنار۔ جو آخر وقت تک مرہٹون کے ساتھ مصالحت کئے جانے مین ساعی رہے۔ روہیلہ سردار یا نواب

بنگش - حتیٰ کہ نجیب الدولہ بھی - جنھون نے مرہٹون کے ہاتھون سے سخت اذیت اُٹھائی تھی - اور جنکے بیٹے اور پوتے کو مرہٹون ہی نے تباہ و برباد کیا اِس عام خونریزی مین شریک یا اُسپر رضامند نہین تھے اور اگر اُنکا بس چلتا تو وہ ضرور اِن بدنصیبون کی جانین بچانے مین کوشش کرتے - جیسا کہ آگے چل کر دیگر حالات سے ظاہر ہوگا -

رہے افغان - اُنکے اِس ہولناک فعل کی بابت کوئی معذرت پیش کرنے کی ہم کو ضرورت نہین کیونکہ اوّل تو اُنکی جبلّت ہی ایسی ہے کہ قتل و خونریزی کو وہ ایک معمولی بات سمجھتے ہین - اور خصوصًا جس زمانے مین یہ واقعات رُونما ہوئے - اُس وقت ہندوستان تو کیا سارے مشرق اور مغرب کے اکثر مُلکون مین بھی انسانی جان کی کوئی قدر و قیمت نہین تھی - پھر شاہِ ابدالی کے سپاہیون کی نسبت اِس امر واقعہ کو فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ وہ ایک بیرونی حملہ آور کی فوج کے آدمی تھے جو اس ملک مین بالکل اجنبی تھے - اور یہان کے لوگون کی زبان بھی نہین سمجھتے تھے - انکو صرف مال غنیمت جمع کرنے کی فکر تھی - اور اپنی روزمرّہ کی خوراک بھی اُنکو شاہ کے ہندوستانی رُفقاء کے علاقون سے بہم پہنچتی تھی اور ان ہندوستانی رفیقون کی نسبت انکو یہ اعتماد نہین تھا کہ وہ زیادہ عرصے تک انکا ساتھ دینگے - پانی پت کے ارد گرد کے دیہات کو پندرہ پندرہ کوس تک مرہٹون نے خود تباہ کر دیا تھا - ایسی حالت مین وہ ان ہزارہا قیدیون کی خوراک کا کیا انتظام کرتے ؟ اور انکو ساتھ لئے پھرنے مین جو خطرہ متصوّر تھا - اُسکو جنگی کارروائیون کے دوران مین کس طرح اُٹھاتے وہ معرکۂ پانی پت مین مرہٹون کے شکست کھانے کو بھی ایک لطیفۂ غیبی سے تعبیر کرتے تھے اور اُنکو لڑائی کے دوسرے روز یہ خیال نہین ہو سکتا تھا کہ کل کی لڑائی کے نتیجے نے مرہٹون کی قوت پر ایک شدید ضرب لگا دی ہے - بلکہ پانی پت سے چالیس پینتالیس میل کے فاصلے پر دارالسلطنت دہلی مین مرہٹون کا ایک سردار (راجہ بہادر) نارو شنکر فوج کی ایک جمعیت کے ساتھ موجود تھا - اور دکن سے پیشوا کے ایک لشکرِ جرّار کے ساتھ اپنے بھائی اور بیٹے کی کمک کے لئے آنے کی خود مرہٹون کو امید تھی - جس سے افغانون کا معرکہ پانی پت کے بعد اپنی شکستہ قوت کے ساتھ عہدہ برآ ہونا یقینًا دشوار ہوتا - اور اس زمانے مین اسیرانِ جنگ کی کسی بڑی تعداد کو قید رکھنے کا دستور بھی نہین تھا - بلکہ یا تو اُنھین قتل کر ڈالا جاتا تھا - یا مقتدر اشخاص کو بھاری فدیہ کی توقع پر یا بطور یرغمال رکھکر اور دیگر آدمیون سے انکے اسلحہ و سامان چھین کر اور لڑائی مین شامل نہ ہونے کا قول لے کر سرحد پار اُتار دیا جاتا تھا - مگر مرہٹون کا اصلی مُلک پانی پت سے سینکڑون کوس دُور تھا - اور تھوڑے ہی فاصلے پر اُنکے دوست راجستھان مین موجود تھے - اور مرہٹون کی کمک آنے پر

ان رہا شدہ قیدیون کو گھوڑے اور ہتھیار بآسانی حاصل ہو سکتے تھے - اس لئے افغانون نے ان بدنصیب قیدیون کو قتل کر دینا اپنی عافیت کے لئے ضروری سمجھا - اور اگر مرہٹون کو فتح نصیب ہوتی - تو وہ بھی غالباً افغانون کے ساتھ اس سے کچھ بہتر سلوک نہ کرتے -

افغانون کو بھی مرہٹون سے مذہبی عداوت نہین تھی

ہزارہا مجبور قیدیون کا ایکدم قتل کر دیا جانا یقیناً ایک ہولناک و درد انگیز واقعہ تھا - مگر اسمین افغانون کی جبلت کے سوا مذہبی عداوت یا قومی منافرت کا کوئی شائبہ بھی شامل نہین تھا - چنانچہ کپتان گرانٹ ڈف نے اپنی تاریخ مین ایک بوڑھے برہمن کی روایت ان الفاظ مین نقل کی ہے کہ "افغانون نے اُن مرہٹہ قیدیون کی قطارین بندھوائین - اور ہر بدنصیب کو تھوڑے تھوڑے سے بُھنے ہوئے چنے دلئے (کیونکہ وہ دو شبانہ روز سے بھوکے تھے) اور بہشتی اُن کے چلوؤن مین پانی ڈالتے جاتے تھے - (یہ چنے کھانے اور پانی پینے کے بعد) پھر اُن کے سر قلم کر دئے جاتے تھے - نارو جھگونت کلکارنی مقام ارلاسنے - جو قتل کی غرض سے لیجائے جانے والے اشخاص مین شامل تھا - اپنے بچ جانے کا حال اس طرح بیان کیا کہ " وہ مرہٹہ فوج مین کارکن تھا اور افغان جو بھاؤ کے توپخانے مین تھے - اُنکی ایک جماعت کا حساب دکن سے روانگی کے وقت اُسکے ہاتھ مین تھا - جب مرہٹون نے اُن لوگون (افغانون) کے ہموطنون پر حملہ کیا - تو حسین خان نے - جو ایک مشہور شخص تھا - بھاؤ سے آکر کہا کہ جو آدمی اسکے ساتھ ہین - وہ اس وقت لڑنے سے گھبراتے ہین کیونکہ روہیلون اور آبدالیون دونون نے اُنکو یقین دلایا ہے کہ اگر وہ اپنے بادشاہ کے خلاف ہتھیار اُٹھاتے پائے جائینگے تو فوراً ہی قتل کر دئے جائین گے - (فارسی بیانات مین اس کا صاف تذکرہ ہے جو افغان مرہٹون کی سروس مین تھے اُنھین اُنکے ہمقومون کی طرف سے پہلے کئی قسم کی ترغیبات دی گئین اور جب اُنکا اثر نہ ہوا - تو نہ صرف اُن کو بلکہ اُنکے بال بچّون اور اعزّہ کو بھی - جو افغانستان مین تھے - قتل کر دئے جانے کا خوف دلایا گیا - بعض لوگ اس دھمکی سے خوف زدہ ہو گئے - مگر اکثر نے اسکا کوئی اثر قبول نہین کیا اور گارڈی کے زیر حکم پانی پت کے میدان مین اپنی توپون پر کام کرتے رہے اور جان دے کر اپنے آقا کے حقِ نمک سے ادا ہو گئے) حسین خان نے بھاؤ کی منت سماجت کی اور اپنا نام کٹوا لیا - مگر سداشیوراؤ (بھاؤ) کو یقین دلایا کہ جب بھی اُسکو اطمینان کے ساتھ موقعہ ملیگا - وہ اپنے کام پر حاضر ہو جائیگا - اُسنے انکا نمک کھایا ہے - اور اُسے بہت رنج ہے کہ اس وقت وہ اُنکی نوکری چھوڑنے پر مجبور ہو گیا ہے - بعد مین حسین خان برابر بھاؤ کو چٹھیان بھیجتا رہا - جن سے وہ (روایت کا بیان کرنے والا برہمن) آگاہ تھا - اُس روز جب بہشتی نے

اُس (برہمن) کے چلّو مین پانی ڈالا - وہ وہی تھا - جو حسین خان کے یہان کام کرتا تھا - وہ (بھشتی) فوراً ہی تبعداً - (حسین خان) کے پاس دوڑا ہوا گیا اور کہا کہ "ہمارا باھمن قطار مین ہے اور ابھی قتل ہونیوالا ہے" حسین خان آگے بڑھ آیا اور اُسنے اپنے ہموطنون سے اُنکی مادری زبان مین کچھ کہا - جسکو راوی نے یہ سمجھا کہ "مَین اُس شخص کو اپنا غلام بنانا چاہتا ہون" اِتنا کہکر حسین خان نے اس (برہمن) کا ہاتھ پکڑا اور اُسکو گھسیٹتا ہوا اپنے ڈیرے کی طرف لے گیا - جہان وہ ایک روز مقیم رہا - اسکے بعد جمعدار نے ایک مترجم کے ذریعے سے اُس سے دریافت کیا کہ "تُم اسکے پاس رہنا پسند کریگا یا دکن واپس جائیگا" - اسیر راوی نے جواب دیا کہ وہ خوشی سے اُنکے پاس رہے گا، جمعدار نے مترجم سے کہا کہ "اس سے کہو کہ وہ جھوٹ بولتا ہے" - اسکے تھوڑی دیر بعد حسین خان نے اُسکو ایک طرف بُلایا اور ہندوستانی زبان مین (جس کو وہ جب اُسکا جی چاہتا تھا تو اچھی طرح بول سکتا تھا) اس سے کہا کہ سواروں کی ایک جماعت جو اُسکے ایک دوست کے آدمی ہین اُسکو لشکر سے بحفاظت لیجا کر بیس کوس پر چھوڑ آئیگی اس فیاض افغان نے اُسی وقت اسکو پانچ طلائی مُہرین بھی دین اور کہا کہ وہ اِسکی احتیاط رکھے کہ اُسکے محافظون کو یہ نہ معلوم ہونے پائے کہ اسکے پاس روپیہ ہے - اسکے بعد وہ ایک دوسرے سے رخصت ہوگئے - جب کچھ دُور تک گئے - تو راوی کو جمعدار کے مشورے کا خیال آیا اور یہ سوچ کر کہ شاید اسکے محافظ اسکی تلاشی لین - اسنے مُہرون کو اپنے مُنھ مین رکھ لیا اور اُسکے تھوڑی دیر بعد جب وہ سوار اپنے لشکر کی طرف مُڑے - تو اس نے اپنے مال کو محفوظ خیال کیا - لیکن ان مین سے ایک شخص نے جو دوسرون سے زیادہ چالاک تھا اُسکو اشرفیان مُنھ مین رکھتے ہوئے دیکھ لیا تھا - اور جب اُسکے ساتھی کچھ دُور نکل گئے تو وہ اُس مال کو لینے کے لئے چلا - تھوڑی دیر مین راوی نے جو جہان تک اُسکے پاؤن یاری دیتے تھے - بڑی تیزی کے ساتھ بھاگ رہا تھا اپنے پیچھے سے آواز سنی کہ "او - باھمن"، - اور پیچھے مُڑکر دیکھا تو ایک افغان - جسکی آنکھین بڑی بڑی - اور ڈاڑھی بہت لمبی تھی - اسکے تعاقب مین چلا آرہا تھا - راوی اُسے دیکھکر سخت خوف زدہ ہوا - افغان نے ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی مین کہا - "او باھمن - تیرے مُنھ مین کیا ہے" آخر افغان نے راوی کو وہ پانچون اشرفیان مُنھ مین سے نکال کر دینے پر مجبور کردیا - اسکے بعد افغان نے کہا "اب چل دے" - اور خود گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا اپنے ساتھیون سے جا ملنے کے لئے واپس چلا گیا -

اس مرہٹہ برہمن پر جو واردات گذری - اُس سے عیان ہے کہ افغانون کا لُوٹ کے سوا کوئی مقصد نہین تھا - اور چونکہ مرہٹون کی کمک دکن سے آنے کا ہر وقت کھٹکا تھا - اور دارالسلطنت دہلی

اُنکے قبضے مین تھا۔ اِس لئے افغان آیندہ جنگ کے خطرے کو مدِ نظر رکھکر دشمن کے آدمیون کی قوت گھٹانی چاہتے تھے اور مقتولین کا مال و متاع اور ہتھیار بھی بآسانی ہاتھ آجاتے تھے۔ اگر مذہبی عداوت کا جذبہ افغانون کے دلون مین ہوتا۔ تو حسین خان جمعدار توپخانۂ بھاؤ۔ جو خود افغان تھا۔ اپنی جماعت کے سابق محاسب کی جان نہ بچاتا۔ اور اگر اس نے مروت کی تھی۔ تو دیگر افغان سوار۔ جنکی زیرِ حفاظت حسین خان نے برہمن مذکور کو لشکرِ ابدالی سے باہر بھجوایا تھا راستے مین اُس "کافر" کو قتل کردیتے۔ تاہم اس سے انکار نہین ہوسکتا کہ بھاؤ کے غرور اور غلطیون نے افغانون کے دلون مین۔ مذہبی عداوت کے جذبات بھی پیدا کر دئے تھے۔ اور وہ کافرون کے قتل سے خود ثواب حاصل کرنے اور اپنے متوفی اعزہ کو ثواب پہنچانے کی ڈینگین مارتے تھے۔

ہندوستانی رفقائے ابدالی کا ہمدردانہ برتاؤ

شاہِ ابدالی کے ہندوستانی رفقاء کا دامن مرہٹہ قیدیون کے اس قتلِ عام سے پاک ہے، اور ہموطنی و دوستی کے تعلقات کا اثر برابر واقعات سے ظاہر ہوتا ہے۔ روہیلہ سردارون مین نجیب الدولہ کو سب سے زیادہ مرہٹون کا خوف تھا اور اُنکے بیٹے ضابطہ خان کو مرہٹون نے بعد مین جس طریقے پر تباہ کیا۔ اُسکے لحاظ سے یہ خوف کچھ بیجا بھی نہین تھا۔ لیکن پانی پت کا میدان سر ہوجانے کے بعد نجیب الدولہ کی طرف سے بھی کسی عداوت کا اظہار نہین ہوا۔ اگرچہ اُنکی غلطی سے دو ممتاز مرہٹہ سردارون کی جانین گئین۔ شجاع الدولہ کھلم کھلا مرہٹون کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتے رہے۔ اور بقول کاشی رائے جن چھ سات ہزار مرہٹون نے اُنکے کیمپ مین پناہ لی تھی۔ اُنکو درانیون کی بے رحمی سے محفوظ رکھنے کے لئے نواب نے اپنے آدمیون کے پہرے لگا دیئے تھے۔ اِن مرہٹون کی خورد و نوش کا انتظام نواب نے اپنی طرف سے کیا۔ اور بعد ازان کپڑے اور کچھ خرچ دیکر اُنکو رخصت کردیا۔ اور علی ابراہیم خان نے اپنی تاریخِ جنگ مرہٹہ و شاہ ابدالی مین لکھا ہے کہ نواب شجاع الدولہ نے دار الخلافۃ (دہلی) مین پہنچنے کے بعد تیس ہزار دکھنی مردون اور عورتون کو جو درانیون کے ہاتھون مین اسیر تھے اور شاہ درانی کی معاودتِ وطن کے وقت قید سے چھوٹے تھے۔ اپنی حمایت و پناہ مین لیکر اور زادِ راہ دے کر اور کچھ فوج انکے ہمراہ کرکے بھوپال نگر مین جو سورج مل جاٹ کے علاقے مین تھا۔ پہنچوا دیا۔

مرہٹون کا نقصان جان و مال

کاشی رائے لکھتا ہے کہ لڑائی ختم ہونے کے بعد تمام بڑے بڑے سردارون نے شاہ ابدالی کو تہنیتِ فتح کی نذرین پیش کین۔ اور شاہ میدانِ جنگ کا سرسری معائنہ کرکے۔ جس مین کُشتون کے پشتے اور لاشون کے انبار لگے ہوئے تھے۔ اپنے خیمے کو واپس ہوگیا۔ اور تمام

دیگر افسران بھی اپنے اپنے ڈیرون مین چلے گئے اور ادنےٰ افسران اور یکہ سپاہیون کو اپنی مرضی کے موافق لوٹ کھسوٹ جاری رکھنے کے لیے چھوڑ دیا - مرہٹون کے لشکر مین صرف غلہ نہین تھا اور آخر وقت مین روپے کا بھی توڑا ہو گیا تھا - اور عورتون کے زیورات اور ظروف گلوا کر روپے اشرفیان بنوالی پڑی تھین - لیکن اور سب اقسام کا سامان بافراط موجود تھا - بقول کاشی راے ایک ایک افغان سوار آٹھ آٹھ دس دس اونٹ قیمتی سامان سے لدے ہوئے لاتا دیکھا جاتا تھا - گھوڑے بکریون کے ریوڑ کی طرح ہانکے جا رہے تھے اور ہاتھیون کی بھی بڑی تعداد پکڑی گئی - علی ابراہیم خان نے لکھا ہے کہ پانسو ہاتھی - پانچ ہزار گھوڑے - دو لاکھ بیل (مویشی) بہت سا قیمتی جواہر و زر نقد اور بیشمار اسلحہ و ظروف کثیر المقدار اسباب اور ہزار ہا خیمے معہ سامان آرایش وغیرہ لشکر ابدالی کے ہاتھ آئے ہر افغان سپاہی کے پاس اتنا مال تھا کہ وہ اسکو سنبھال نہین سکتا تھا - مرہٹون نے اول مرتبہ شمالی ہند کی جنگی کارروائیون مین اپنی عورتون کو ساتھ لیا تھا - کیونکہ بھاؤ کو اپنے فتح پانے کا پورا یقین تھا - معرکۂ پانی پت کے بعد بیچاری عورتین افغانون کے ہاتھون مین پڑین اور معزز خاندانون کی صرف چند عورتون کا حال بعد مین سُننے مین آسکا - ورنہ وہ سب ایکدم غائب ہو گئین - فارسی تاریخون مین بھاؤ کے لشکر کے آدمیون کی تعداد مبالغے کے ساتھ پانچ لاکھ سے دس لاکھ تک بیان کی گئی ہے اور اسی بناء پر مقتولین کا شمار بھی تین سے آٹھ لاکھ تک لگایا گیا ہے - لیکن گرانٹ ڈف کے نزدیک تین لاکھ نفوس بمقام پانی پت لشکر بھاؤ مین موجود تھے - منجملہ انکے جنگجویون مین سے ۱/۴ کے قریب اپنی جان سلامت لیجا سکے - اور بہیر و بنگاہ کے آدمیون مین سے بھی چوتھائی سے زیادہ نہین بچے - اس طرح قریباً دو لاکھ مرہٹے اور دکھنی میدان پانی پت مین قتل و ہلاک ہوئے - شاہ ابدالی اور انکے ہندوستانی رفقاء کی افواج نے بھی کافی نقصان اُٹھایا اور اُنکے مقتولین کی تعداد بیس ہزار سے کم نہین رہی - مگر فتح کی خوشی نے اس نقصان پر کسی کو توجہ نہین کرنے دی

مرہٹہ سردار جو لڑائی مین بچے

مرہٹون کے سربرآوردہ سردارون مین صرف تین اشخاص ملہار راؤ ہولکر وٹھل شیودیو اور دتاجی گائیکواڑ کی جانین معرکۂ پانی پت کے زخمون سے شفا پانے کے بعد محفوظ رہین انتا مانکیسر اور شمشیر بہادر بھی زخمی ہونے کے باوجود میدان سے نکلنے مین کامیاب ہو گئے تھے مگر جن گانوؤن کو پہلے مرہٹون نے لوٹا کھسوٹا تھا - اُنکے دیہاتیون کو اب ان شکست خوردہ لوگون سے اپنے سابق نقصان کا بدلہ لینے کا موقعہ تھا - چنانچہ جو مرہٹے افغانون کے ہاتھ سے بچ نکلے تھے ان مین سے سینکڑون کو دیہاتیون نے راستہ مین قتل کر کے اُنکا سامان و اسباب لوٹ لیا - سردار انتاجی مانکیسر

زمیندار فرخ نگر کے آدمیون کے ہاتھون مقتول ہوا باجی راؤ پیشوا کا بیٹا شمشیر بہادر جو سخت زخمی تھا معہ تین چار آدمیون کے سورج مل جاٹ کے قلعہ ڈیگ مین پہنچا - علی ابراہیم کی روایت کے بموجب پاربتی بائی زوجۂ بھاؤ بھی معہ اپنے چند محرمون کے اُسی کے ساتھ تھی - ڈیگ مین زوجۂ بھاؤ نے دو تین روز ٹھہر کر اپنے خاوند کی مراسم تعزیت ادا کین اور بعد ازان سورج مل نے معقول بدرقہ محافظین کے ساتھ اُسکو دکن کی طرف رخصت کر دیا - شمشیر بہادر اپنے زخمون کی شدت کے باعث ڈیگ مین ٹھہرنے پر مجبور ہوا - اور بعد مین وہین اُسکا انتقال ہو گیا - مرہٹہ روایات مین بھاؤ کی بیوہ پاربتی بائی اور وسواس راؤ کی بیوہ لکشمی بائی کو راجہ وجھنڈے کے گوالیار پہنچانے کا ذکر ہے غالباً یہ دونون خواتین اپنے گرامی قدر شوہرون کی طرح لڑائی کے بگڑنے پر پانی پت سے ایک ساتھ روانہ ہوئین اور دکن پہنچنے تک ساتھ ہی رہین - ملہار راؤ ہولکر پانی پت سے پہلے کرنال کی طرف گیا اور وہان سے متھرا ہو کر بھرت پور مین پہنچا اور سورج مل کی میزبانی سے مستفید ہوا - دتاجی کا ٹیکوا نے میدان پانی پت سے نکل کر پہلے دہلی کا رُخ کیا اور وہان سے وہ راجہ نارو شنکر کے ساتھ بڑودہ اور پھر دکن پہنچا - وٹھل شیدیو کچھ روز بعد ملہار راؤ ہولکر کے ساتھ شامل ہو گیا - اور پیشوا کا دل چونکہ ان دونون کی طرف سے صاف نہ تھا - جیسا کہ سردار وٹھل شیدیو کے متذکرۂ صدر خط بنام رگھناتھ راؤ سے عیان ہے - اِس لئے ایک عرصے کے بعد پونا مین گیا - مادھوجی سیندھیا اور نانا فرنویس بھی - جو بعد مین اِس قدر عروج پر پہنچے - میدانِ پانی پت سے بمشکل اپنی جانین بچا لے گئے -

مادھوجی سیندھیا پر کیا گذری! مادھوجی سیندھیا اُس روز کے واقعات اپنے دوستون سے خود بیان کیا کرتے تھے - کہ وہ ایک اصیل گھوڑی پر سوار تھے - جو پچاس ساٹھ کوس کا دم رکھتی تھی - جب وہ میدان سے ایک طرف کو نکل کر چلے - تو متعدد افغان سوارون نے اُنکے قیمتی ساز و سامان کو دیکھکر لوٹ کی امید مین انکا تعاقب کیا - لیکن انکی گھوڑی نے اپنی تگ و تاز مین ان سب کے گھوڑون کو پیچھے چھوڑ دیا - ہان ایک طاقتور و گران ڈیل افغان کا گھوڑا بہت اعلےٰ درجے کا تھا وہ برابر انکے پیچھے لگا رہا - انھون نے اپنی گھوڑی کو بہت گرمایا اور دوڑایا - مگر افغان سوار نے انکا تعاقب چھوڑا اسی طرح وہ دونون بہت دُور نکل آئے - آخر ساٹھ کوس کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اُنکی گھوڑی تھک کر کھڑی ہو گئی - افغان کے گھوڑے مین ابھی دم باقی تھا - وہ فوراً ہی اُنکے سر پر آ پہنچا - اور انھین اپنی جان کا خطرہ پیدا ہوا - گھوڑی چونکہ بیکار ہو چکی تھی - اِس لئے وہ فنون سپہگری کے استعمال سے مجبور تھے اور افغان جسمانی حیثیت سے اُن سے کہین زیادہ طاقتور تھا - اگر وہ قتل کرنا چاہتا

تو بآسانی اُسمین کامیاب ہوجاتا۔ مگر اُسکو صرف مال لوٹنے کا خیال تھا۔ چنانچہ اُس نے ان کے قریب آتے ہی ایک تبر انکے مارا جس سے انکا گھٹنا ٹوٹ گیا۔ اسکے بعد افغان نے انکی پگڑی مین سے جیغہ۔ گلے مین سے مالا۔ اور زین پر سے دیگر قیمتی سامان لیا۔ خورجیون کو ٹٹولا اور سب چیزون کو اپنے گھوڑے پر رکھکر اپنے لشکر کو واپس چلا گیا۔ ان کو گھٹنے کے ٹوٹنے سے بڑی تکلیف تھی۔ مگر گھوڑی آگے چل نہین سکتی تھی اور جنگل مین رات گذارنی مشکل تھی۔ اس لئے انھون نے گھوڑی کو آہستہ آہستہ بڑھایا۔ اتفاق سے ایک بستی قریب ہی مل گئی۔ وہ بمشکل اسکے سرے تک پہنچ سکے اور وہان گھٹنے کی تکلیف اور پیاس کی شدت سے بیہوش ہونے لگے۔ ایک چھپر سامنے تھا۔ انھون نے اُسکے دروازے پر پہنچکر پانی مانگا۔ وہان سے ایک عورت پیالے مین پانی لئے ہوئے نکلی۔ اس نازک حالت مین ان کے لئے اسکی ذات وعقیدے کا خیال کرنا مشکل تھا۔ انھون نے پانی پی لیا۔ اور اس سے مدد چاہی۔ عورت نے ہمدردی کا اظہار کیا۔ اور پھر ایک مرد کو بُلا کر اُسکی مدد سے ان کو گھوڑے سے اُتارا۔ اور چھپر کے اندر لیجا کر لٹایا۔ اور تین شبانہ روز پیہم انکی تیمارداری و خدمتگزاری کی۔ تین روز کے بعد جب انکو گھٹنے کی چوٹ سے ذرا افاقہ ہوا۔ تو انھون نے اپنی گھوڑی پر سوار ہو کر چلنے کا قصد کیا۔ انکے میزبانون نے انکو روکنا چاہا مگر انکو ڈر لگا ہوا تھا کہ مبادا افغانون کے لشکر کے لوگ ادھر آنکلین اور گھوڑی اور بقیہ سامان چھین لین۔ لہذا یہ نہ رکے۔ اور روانہ ہوگئے۔ روانگی کے وقت تک انکو اپنے ہمدرد معاونون کی بابت کچھ معلوم نہین ہوسکا مگر اس بستی کے مقام اور راستہ کو انھون نے یاد رکھا اور کتنے ہی سال کے بعد جب اپنی جمعیت کے ساتھ انکا ادھر کے علاقے مین گذر ہوا تو انھون نے بستی مین جا کر اپنے میزبانون کو تلاش کیا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ وہ مسلمان ہین اور مفلوک الحال ہو کر اس بستی مین آ رہے ہین۔ جس عورت نے انکی اُس وقت خدمت کی تھی۔ وہ موجود تھی۔ اسکو انکے شناخت کرنے مین دقت ہوئی۔ مگر انھون نے اسکو فوراً پہچان لیا۔ اور بعد مین اُسکو اور اُسکے بیٹے کو گوالیار مین لیجا کر بڑی عزت کے ساتھ رکھا۔ اور ہمیشہ وہ خاندان انکا موردِ عنایات رہا۔ اس واقعہ سے عیان ہے کہ لڑائی کی اسپرٹ دیہات مین نہین پہنچی تھی اور ہندو مسلمانون کے دل آپس مین بالکل صاف تھے۔

ہولکر پر الزام وسواس کے مُہلک زخم لگنے پر بھاؤ نے اسکو ہاتھی کے ہودے مین لٹا دیا تھا۔ اور خود ہاتھی سے اُتر کر اور اپنے عربی گھوڑے پر سوار ہو کر بہادرون کی موت مرنے کے لئے اُس مقام پر چلا گیا تھا جہان معرکۂ جنگ سب سے زیادہ خطرناک تھا۔ ایک روایت ہے کہ خود لڑائی کے بھنور مین کودنے سے پہلے بھاؤ نے ملہار راؤ ہولکر کو ان "ہدایات" پر کاربند ہونے کا پیام بھیجا جو اسے دیجا چکی تھین۔ مگر اُن ہدایات

کا کہین ذکر ہے۔ نہ بھاؤ کا وہ پیام ہولکر تک پہنچنے کا واقعہ پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے۔ البتہ لڑائی کے شاہدون کا بیان ہے کہ بھاؤ کے گھوڑے پر چڑھکر صفوف قتال مین داخل ہونے کے تھوڑی دیر بعد ہی ملہار راؤ ہولکر مع اپنے چند رفقاء کے میدان سے ایک طرف نکل گئے۔ اور انکے بعد ہی دتاجی گائیکواڑ بھی روانہ ہوگئے۔ ہولکر کے نکتہ چین مرہٹون کے پاؤن میدان جنگ سے اُکھڑنے کا انہی کو باعث قرار دیتے ہین کیونکہ اس وقت تک مرہٹے بڑے جوش کے ساتھ لڑ رہے تھے، اور افغانون کی صفون مین گھسے ہوئے تھے۔

بسواس راؤ کا حسن

بہر حال بھاؤ کے اُتر جانے کے بعد ہی بسواس راؤ کا ہاتھی کے ہودے ہی مین دم نکل گیا۔ گرانٹ ڈف کی روایت کے بموجب بھاؤ کی بیوی پاربتی بائی بھی اس وقت ہاتھی پر اسکے ساتھ موجود تھی۔ اور جب بسواس راؤ کے مہلک زخم لگا۔ تو بھاؤ نے کمال حسرت واندوہ کے ساتھ پاربتی بائی سے کہا کہ وہ اپنے بھائی پیشوا کو اب منہ نہین دکھا سکتا۔ یہ روایت اگر درست ہے۔ تو پاربتی بائی کا افغانون کے ہاتھون مین پڑنے سے بچ رہنا بہت تعجب انگیز ہے۔ کیونکہ فارسی تاریخون سے ظاہر ہوتا ہے کہ خواصی کا ہاتھی چونکہ بہت بڑا اور خوب اراستہ و پیراستہ تھا اس لئے برخوردار خان کی جمیعت کے افغان سپاہیون نے جب اُسکو دیکھا۔ تو وہ زیور و سامان کے لالچ سے اُسکے گرد ہوگئے۔ جو مرہٹہ سردار خواصی مین بیٹھا تھا۔ اُسکو مرہٹون نے مار گرایا۔ یا ممکن ہے کہ وہ اپنے آقا کی ناموس پاربتی بائی کو اُس قیامت خیز ہنگامہ سے نکال لیجانے کی غرض سے خاتون موصوف کو ساتھ لیکر ہاتھی سے اُتر گیا ہو اور افغان سپاہیون نے فقط فیلبان کو لاش کا نگہبان پایا ہو انھون نے زیور وغیرہ کو تو لاش پر سے اُتار لیا۔ اور لاش کو جس سے سرداری کی شان عیان تھی۔ پالکی مین ڈال کر لیچلے۔ پالکی اتفاقیہ نواب شجاع الدولہ کے ڈیرے کے سامنے سے گذری۔ نواب نے افغانون سے حال دریافت کیا۔ اور جب اُنکو بسواس راؤ کی لاش دستیاب ہونے کا پتہ لگا۔ تو نواب نے ان افغانون کو دو ہزار روپے اُسی وقت بطور انعام دیکر لاش کو اپنے کیمپ مین ایک خیمے کے اندر رکھا۔ ان افغان سپاہیون نے اپنے لشکر مین پہنچکر بسواس راؤ کی لاش کے ملنے اور شجاع الدولہ کے اُسکو لے لینے کا ذکر کیا۔ شدہ شدہ یہ خبر شاہ نے سُنی اور اپنے خاص آدمی نواب کے پاس بھیجکر لاش کو دیکھنے کے لئے منگایا۔ اُس وقت جملہ افغان سردار اور سپاہی لاش کو دیکھکر بے اختیار اُسکے حُسن وجمال او رتناسب اعضاء کی تعریف کرتے تھے ایک افغان جو لاش کے معائنہ کے وقت موجود تھا اُسکا بیان ہے کہ بسواس راؤ کے دونون ہاتھ زانو تک پہنچتے تھے۔ چہرے کا رنگ مرنے پر بھی نہین بدلا تھا۔ بلکہ وہی شباب کی آب وتاب رکھتا تھا۔ آنکھین بڑی بڑی تھین اور کسی قدر کھلی ہوئی تھین۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ آرام سے سو رہا ہے۔ ایک زخم

تلوار کا گردن کے پیچھے دونون کانون کے درمیان آدھا انگل گہرا تھا اور تیر کا زخم بائین طرف کی بھون پر لگا تھا لیکن ان زخمون کے لگنے سے اسکی پوشاک پر آگے کی طرف خون مطلق نہین گرا تھا اور نہ اُنکے صدمے سے چہرا بگڑا تھا۔ ہر شخص عین عالم شباب مین اسکی موت پر متاسف تھا۔ افغانون نے وسواس راؤ کی لاش پر شور مچایا کہ وہ اسکو خشک کرکے او مصالحہ بھر کر افغانستان بہیجا ئینگے۔ شاہ ابدالی نے اُس وقت کچھ جواب نہین دیا۔ مگر لاش نواب شجاع الدولہ کو واپس نہین بھجوائی۔ بلکہ برخوردار خان کی جسکے آدمیون نے لاش کو ہاتھی پر پایا تھا سپرد کردی۔ اور وہ برخوردار خان کے دیوان موتی لال کھتری کے ڈیرے کے متصل ایک خیمے مین رکھی گئی۔ نواب شجاع الدولہ کو جب یہ حال معلوم ہوا تو وہ سوار ہوکر شاہ ابدالی کے پاس گئے۔ اور اُن سے کہا کہ آپ افغانستان سے ہماری امداد اور سرکشون کی تادیب کے لئے تشریف لائے ہین اور کچھ عرصے کے بعد واپس چلے جائینگے۔ ہم اور سرداران روہیلہ اس مُلک مین مستقل طور سے سکونت پذیر ہین اور باشندگان مُلک سے ہمارا ہر وقت کا ساتھ ہے۔ لہذا ہم کو اس ملک کے رسم و رواج پر عمل کرنا پڑتا ہے۔ قواعد اخلاق بھی اسی امر کے مقتضی ہین۔ کہ کسی شخص سے خواہ کیسی ہی سخت دشمنی ہو۔ وہ اسکی زندگی کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ اور بعد مرگ کوئی اثر خصومت کا باقی نہین رہتا اس مُلک کا دستور یہ ہے کہ مقتولین جنگ کی لاشین اُن کے ورثاء کے حوالے کردی جاتی ہین۔ تاکہ وہ اپنے مذہبی طریقے پر اُن کو اوّل منزل پہنچائین۔ وسواس راؤ کی لاش اگر ولایت بھجائی جائیگی۔ تو ہماری سخت بدنامی ہوگی اور مرہٹون سے ایک مستقل دشمنی قائم ہو جائیگی۔ لہذا اسکی لاش کو ہندؤون کی مذہبی مراسم کے بموجب جلانے کا حکم دیجئے۔ دیگر سرداران ہندوستانی نے بھی شجاع الدولہ کے بیان کی تائید کی اور شاہ نے برخوردار خان کو حکم بھیجا کہ وہ وسواس راؤ کی لاش نواب شجاع الدولہ کے حوالے کردین۔ چنانچہ نواب نے اپنے وکیل کاشی رائے کی معرفت اُس لاش کو منگایا اور گنیش شنکر پنڈت اور دیگر ہندو کارندون کی وساطت سے پُورے سامان کے ساتھ صندل کی لکڑیون مین اُسکے پھونکنے کا انتظام کردیا۔

بھاؤ کی لاش کی دستیابی

بھاؤ کی لاش اب تک دستیاب نہوئی تھی اور اُسکی مُسلّمہ شجاعت کے باعث سرداران روہیلہ کو اندیشہ تھا کہ بھاؤ اگر میدان جنگ سے زندہ نکل گیا ہے۔ تو وہ پانی پت کے آس پاس مرہٹون کی منتشر قوت کو سمیٹ کر پھر مقابلے کی تیاری کریگا۔ نواب شجاع الدولہ کو بھاؤ کا انجام متحقق ہونے کا خیال تھا۔ اِس لئے اُنھون نے گھوڑے پر سوار ہوکر اور گنیش راؤ پنڈت شیشا دھر پنڈت۔ کاشی رائے اور دیگر اشخاص کو۔ جو بھاؤ کے گہرے شناسا تھے۔ اپنے ساتھ لیکر

میدانِ جنگ کا گشت لگایا - اور لاشون کے انبار مین ڈھونڈھنا شروع کیا - جس پر جسونت راؤ نیوا سنبھاجی ماگھ بنلاجی اور دیگر نامی سردارانِ مرہٹہ کی لاشین ملین - اِن سبھون نے اپنے سینون پر تلوارون اور بھالون کے زخم کھائے تھے - سنبھاجی ماگھ کا بدن تلوارون کے زخمون سے چور چور تھا - جنکی تعداد چالیس سے کم نہین تھی - مگر بھاؤ کی لاش ہنوز دستیاب نہین ہوئی تھی کہ ایک مقام پر جہان کئی نامور سردارون اور خاصہ رسالے کے افسران کی لاشین پڑی ہوئی تھین ایک لاش بلاسر کے نظر آئی - اُسکو الٹ پلٹ کر دیکھا - تو تین بیش بہا و آبدار موتی اُسکے نیچے سے نکلے - اور پھر چند موتی اور بھی کپڑون مین دبے ہوئے پائے گئے - اِن موتیون کو مرہٹون کے وکیل کشن پنڈت نے پہچانا - کہ یہ اُس مالا کے ہین جو بھاؤ کے گلے مین پڑی تھی - اسکے بعد لاش کو بغور دیکھا گیا - تو پاؤن مین ایک چھوٹا سا گول اور پیٹھ مین لمبا نشان زخم کا پایا گیا - جس سے اِس لاش پر بھاؤ کی ہونے کا احتمال اور قوی ہوا - کیونکہ دکن کی ایک لڑائی مین بھاؤ کے پاؤن مین بندوق کی گولی لگی تھی - اور مظفر خان توپخانۂ پیشوا کے کمانیر نے - جسکو بھاؤ نے موقوف کر دیا تھا - اپنے داماد حیدر خان کو بھاؤ کے مارنے پر آمادہ کیا تھا اور ایک شخص نے پونا کے قریب دربار کے موقعہ پر سردار موصوف کی پشت مین کٹار ماری تھی لاش کے ہاتھون اور گھٹنون پر گھٹے بھی پڑے ہوئے تھے - کیونکہ بھاؤ علے الصباح باقاعدہ سورج دیوتا کو ڈنڈوت کیا کرتا تھا - نواب شجاع الدولہ نے لاش کے تمام ٹکڑون کو مرتب کرایا - مگر سر باوجود تلاش کے نہ مل سکا - لہٰذا اسی حالت مین لاش کا کریا کرم ہندؤن کے مراسم کے بموجب مرہٹون کے ہاتھ سے کرایا گیا - اسکے بعد سردار برخوردار خان کی فوج کا ایک افغان سوار ملا جو اپنے ہاتھ مین کوئی چیز کپڑے مین لپٹی ہوئی لٹکائے تھا - اُسکو جب لالچ دیا گیا تو اُس نے کپڑے کو کھولکر ایک سر نواب شجاع الدولہ کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ یہ لاش جو خاک پر پڑی ہے اُسکا سر یہ ہے - جو مین نے اُسی تن پر دیکھا تھا - یہ ایک چالاک و بارعب شخص تھا - اور بیش بہا مالائین گلے مین ڈالے ہوئے تھا - اسکا جسم اور گھوڑے کا ساز جواہر سے آراستہ تھا - اور بڑی جرأت و بیباکی کے ساتھ افغانون پر حملے کر رہا تھا - جب اسکے گھوڑے کے بندوق کی گولیان لگین اور وہ چلنے سے عاجز ہو گیا تو یہ جوان اُسپر سے اُترکر دوسرے گھوڑے پر سوار ہوا - اور اُسی طرح لڑتا رہا - پھر اُس دوسرے گھوڑے کے بھی خستہ و بیکار ہو جانے پر ایک اصیل گھوڑی لی اس اثناء مین یہ برابر چابکدستی سے بھالے اور تلوار مارتا تھا - اور میدان نہین چھوڑتا تھا - پھر اسکے دو زخم گولیون اور نیزے کے کاری لگے - اور گھوڑے کے زین پر بیٹھنے کی طاقت نہ رہی تو یہ زمین پر گرا - ہم پانچ افغان سوارون نے بطمع جواہر جو یہ پہنے ہوئے تھا اِسکا تعاقب کیا - اور چونکہ یہ پیدل آہستہ آہستہ جا رہا تھا -

اس لئے ہم بہت جلد اُسکے سر پر پہنچ گئے اور اُس سے پوچھا کہ تو کون ہے؟ اور کس مرہٹہ لشکر کا سردار ہے۔ تو سچ بتا دے۔ اور ہم سے جان کا خوف نہ کر۔ ہم جہان تو کہے گا۔ تجھکو پہنچا دینگے۔ مگر اُس نے ہمارے سوالات کا کچھ جواب نہین دیا۔ جس پر ہمارے ساتھ کے ایک سوار نے بگڑکر اُسکے نیزہ مارا۔ یہ جوان اگرچہ پیدل تھا۔ لیکن اس نے افغان سوار کے نیزے کو پھرتی سے اپنے بھالے پر روکا۔ اور اُسکا نیزہ بیکار کرکے اُسکو زخمی کیا۔ یہ دیکھکر ہم نے اُسکو مغلوب کرنے کا ارادہ کرلیا۔ تاہم اُس نے دو تین سوارون کو اس حالت مین بھی زخمی کردیا۔ بعد ازان زخمون کی کثرت سے چُور ہوکر یہ زمین پر گرا۔ اس وقت میرے ساتھ کے ایک سوار نے گھوڑے سے اتر کر اس کا سر کاٹ لیا اور اُسکے بدن پر جو جواہر تھا وہ اتار کر ہم نے آپس مین تقسیم کرلیا۔ سر کو وہ لئے جاتا تھا کہ مین نے اُس سے لے لیا۔ یہ حال سُنکر نواب شجاع الدولہ نے اُس افغان سے سوال وجواب کیا۔ تو ظاہر ہوا کہ در حقیقت اسی نے کاٹا ہے اور یہ اُسکو چھپانے جارہا تھا تاکہ زیور و جواہر کی بابت اُس سے کوئی پرسش نہو۔ اس سر کو نواب شجاع الدولہ نے اپنے مرہٹہ ساتھیون کو دکھایا تو اُنھون نے آنکھون مین آنسو بھر کر کہا کہ دکھن کا نامور بہادر سردار (بھاؤ) یہی ہے۔ نواب شجاع الدولہ نے کچھ اور انعام کا وعدہ کرکے وہ سر اُس افغان سے لے لیا۔ اور بعد ازان اُنہی برہمنون کے ہاتھ سے ہندو مراسم کے موافق اُسکو اول منزل کرا دیا۔ جس مقام پر بھاؤ کی لاش ملی تھی۔ وہان ایک آم کا درخت تھا۔ جو قریب ستر بہتر سال بعد تک باقی تھا۔ اب گورنمنٹ پنجاب نے اس جگہ ایک یادگاری نشان بنوادیا ہے۔ دیگر مرہٹہ سردارون کی لاشین بھی اسی طرح جلا دی گئین۔ اور افغان مقتولین مین سپاہیون کی لاشین گڑھے کھود کھود کر بعد یکجائی نماز کے دبا دی گئین۔ اور افسرون کی الگ الگ قبرین بنائی گئین۔ اور نماز جنازہ بھی پڑھی گئی۔

مرہٹہ مقتولین کی لاشین بھی کچھ گڑھون مین دبائی یا مٹی سے چھپا دی گئین۔ خاصکر وہ جو افغان سردارون کے ڈیرون کے قریب پڑی ہوئی تھین۔ اور باقی لاشین یونہی کھُلے میدان مین پڑی ہوئی ہفتون بعد تک طعمۂ زاغ و زغن ہوتی رہین۔ اور بیسیون برس بعد تک مُردون کی ہڈیان کھیتون مین ہل چلانے کے وقت نکلتی رہین اور اب بھی گاہے گاہے برآمد ہوتی ہین۔ قصبۂ پانی پت کے لڑکے میدانِ کارزار مین کھیلتے ہوئے اکثر سکّے اور دیگر اشیاء پاتے تھے اور قصبے کے چارون سمتون مین چالیس چالیس کوس تک مرہٹون کے سامان کی دھات کی اشیاء لوگون کو ملتی رہین۔ کنکئیڈ کی یہ روایت کہ آمراؤ گر نے جو شجاع الدولہ کی فوج مین گوشائیون اور آمیتون کے دستون کا افسر تھا۔

وسواس راؤ، جنکوجی سیندھیا اور سبنھاجی واگھ اور جسونت راو بنوالکر کی لاشین کریا کرم کے لئے تین لاکھ روپیہ دیکر ایک افغان سے حاصل کین۔ درست نہین معلوم ہوتی۔ کیونکہ مرہٹہ سرداروں کی لاشون کو تلاش کرنے اور اول منزل پر پہنچانے مین کاشی رائے برابر شریک رہا اور اگر امراؤ گر جو اسکا دوست و ہمعصر تھا۔ اور دونون ایک ہی سرکار نواب شجاع الدولہ کے ملازم تھے) روپیہ دیکر لاشون کو حاصل کرتا۔ تو وہ اپنے رسالے مین ضرور اسکا حوالہ دیتا۔

جنکوجی سیندھیا اور بابو پنڈت کا اتلاف جان

بسواس راؤ کی لاش کے سلسلے مین ایک اندوہناک واقعہ پیش آیا۔ جسکے باعث دو نامور و ممتاز مرہٹہ سرداران جنکوجی سیندھیا اور بابو پنڈت کی جانین حسرت انگیز طریقے پر تلف ہوئین۔ اس واقعے کی پوری کیفیت دیوان کاشی رائے معتمد نواب شجاع الدولہ نے اُس بیان مین لکھی ہے۔ جو اُس نے اپنی زندگی کے آخری سالون مین اپنے جانشینون کی واقفیت کے لیئے جنگ سوم پانی پت کے متعلق بزبان فارسی مرتب کیا تھا اور جسکا دانا پور کے کرنیل جیمس براؤن نے انگریزی ترجمہ کرکے فروری ۱۷۹۱ء مین اُسکو چھپوایا تھا۔ کاشی رائے کی یہ کتاب اٹھارھوین صدی مسیحی کے آخری اور اُنیسوین صدی مسیحی کے ابتدائی سالون مین بہت مشہور و مروج تھی اور علی ابراہیم خان نے اپنی تاریخ جنگ مرہٹہ و ابدالی لکھنے مین اس سے بڑی مدد لی مگر اب عرصۂ دراز سے کاشی رائے کی اصل فارسی کتاب بہت کم یاب بلکہ نایاب ہے۔ اور کرنیل جیمس براؤن کا انگریزی ترجمہ ہی اسکی یادگار ہے۔ جو انگلستان و ہندوستان مین دو تین دفعہ شائع ہوچکا ہے۔ کاشی رائے نے اپنی کتاب کو اگرچہ جنگ پانی پت کے کتنے ہی سال بعد قلمبند کیا۔ مگر وہ اُس معرکے کی نسبت ایک نہایت مُستند و باوثوق بیان سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ کاشی رائے نے تمام واقعات اپنی آنکھون سے دیکھے۔ یا اُنکی صحیح اطلاع معتبر وسائل سے اُسکو ملی اور اُسنے خود رسالۂ مذکور مین تحریر کیا ہے۔ کہ گو وہ اِن واقعات کو ایک عرصے کے بعد لکھ رہا ہے۔ مگر حتی الامکان اسنے کوئی ضروری امر فروگذاشت نہین کیا ہے۔ خصوصاً جنکوجی سیندھیا اور بابو پنڈت کی جانین ضائع ہونے کی نسبت اُسکا بیان یقیناً درست و قابلِ اعتبار ہے۔ کیونکہ وہ خود اس معاملے مین ایک کارکن تھا۔

کاشی رائے کا بیان جنکوجی سیندھیا کے واقعے کی نسبت

کاشی رائے بسواس راؤ کی لاش کے متعلق افغان سپاہیون کے مذکورۂ بالا مطالبہ اور ہندوستانی اُمراء کی اُسکو ہندو مذہب کی مراسم کے بموجب جلانے کی جدّ و جہد کا ذکر کرکے لکھتا ہے کہ یہ معاملہ کوئی دو روز تک زیر بحث رہا نجیب الدولہ

اور فی الحقیقت جملہ ہندوستانی رؤسا اِس درخواست مین شریک تھے (کہ بسواس راؤ کی لاش جلانے کے لئے ہندوؤن کے سپرد کردیجائے) مین بھی اسی وجہ سے بیگم راج وکیل نجیب الدولہ کے ساتھ برخوردار خان اور اُنکے دیوان موتی لال کے ڈیرون پر بھیجا گیا۔ دوسری دفعہ مین تنہا گیا۔ اس وقت موتی لال نے مجھ سے دریافت کیا کہ مین صرف اسی کام (بسواس راؤ کی لاش حاصل کرنے) کے لئے آیا ہون۔ یا کوئی اور کام اسکے علاوہ بھی اپنے سر لے سکتا ہون۔ مین نے کہا کہ جس کام کو بھی وہ کہین۔ مین تا بقدر اُسکے سرانجام دینے کو تیار ہون۔ اِسپر وہ (موتی لال) چپکے سے مجھے اندر کے دو ڈیرون مین لے گیا۔ ایک ڈیرے مین مین نے راجہ بابو پنڈت بھاؤ کے وکیل کو پایا۔ جو زخمی تھا۔ اُسکے ساتھ مین کچھ دیر تک بات چیت کرتا رہا۔ اسکے بعد مین دوسرے ڈیرے مین گیا۔ جہان راؤ جنکوجی سیندھیا بیٹھا ہوا تھا۔ اسکے بندوق کی گولی کا زخم تھا۔ اور ہاتھ مین برچھی لگی تھی۔ جس کو وہ رومال کی گلبندڑی مین ڈالے ہوئے تھا۔ اور کوئی تیئیس سال کی عمر کا مضبوط جوان تھا۔ وہ برہان پوری چیرہ نا فرمانی رنگ کا سر پر باندھے اور گجراتی مشرع کا گھٹنا پہنے تھا۔ مجھے دیکھکر اُس نے سر نیچا کر لیا۔ مین نے یہ دیکھکر کہا کہ "آپ ایسا (اظہار ندامت) کیون کرتے ہین۔ انسان سے جس بہادری و جانفشانی کی امید ہوسکتی ہے۔ وہ آپنے کی۔ اور اِس لڑائی کے کارنامے ہمیشہ انسانون کو یاد رہین گے"۔ یہ سُنکر جنکوجی نے اپنا سر اُٹھایا اور کہا کہ "سچ ہے۔ تقدیر پر کسی شخص کا زور نہین چل سکتا۔ مشیتِ ایزدی مین دَم مارنے کی جگہ نہین ہے۔ کاشکے مین میدانِ جنگ مین مارا جاتا۔ مگر میری قسمت مین یہ لکھا تھا کہ یہان لایا جاؤن۔ اب یہ لوگ مجھ سے روپیہ مانگتے ہین۔ اور جو کچھ یہ طلب کرتے ہین۔ اسکا ادا کرنا میرے لئے کچھ مشکل بھی نہین ہے۔ مگر اُسکو اس وقت یہان حاصل کرنا ممکن نہین۔ تم میرے باپ (جیاپا سیندھیا) کے دوست تھے اور ہمارے اور نواب (شجاع الدولہ) کے خاندان مین ہمیشہ مراسم اتحاد رہے اور میرے باپ نے اُن کی بہت کچھ خدمت کی ہے۔ اگر نواب صاحب اپنی سرکار سے اس وقت میری رہائی کے لئے روپیہ دے دین۔ تو یہ ایک ایسا احسان ہوگا۔ جسکو مین عمر بھر نہ بھولون گا۔ (جنکوجی سے یہ سُنکر) مین نے اُن کو اطمینان دلایا کہ نواب اس موقع پر کوتاہی نہ کرینگے۔ اور یہ معلوم کرنا چاہا کہ کتنا روپیہ درکار ہے موتی لال نے کہا کہ سات لاکھ روپیہ مانگ رہے ہین۔ مین نے جواب دیا کہ اتنا روپیہ تو اِس وقت کوئی نہ دے سکے گا۔ البتہ مناسب رقم ہو تو نواب صاحب ضرور دے دینگے۔ موتی لال نے کہا کہ شاید اِس سے کم رقم پر معاملہ طے ہو جائے مین فوراً نواب صاحب

کی خدمت مین واپس آیا - اِس وقت نواب موصوف نجیب الدولہ کے ساتھ ایک مسند پر بیٹھے ہوئے ناچ دیکھ رہے تھے - مین نے اُن سے تمام وہ گفتگو بیان کی جو اُس کام (یعنی اس راؤ کی لاش کی ہندوؤن کو حوالگی) کی بابت ہوئی تھی - جس کے لئے انھون نے مجھے بھیجا تھا - لیکن چونکہ مجھے اس خصومت کا حال خوب معلوم تھا - جو نجیب الدولہ کو جنکوجی کے گھرانے اور ذات سے تھی - اور یہ خیال تھا کہ نجیب الدولہ بہت ہوشیار ہے - اور اس نے جنکوجی کے زندہ ہی گرفتار ہونے کی کچھ سُن گُن پائی ہوگی - اس واسطے مین نے جنکوجی کا احوال اس وقت نواب صاحب سے کہنا مناسب سمجھا اور ڈیرے کے دوسرے حصّے مین چلا گیا - لیکن نجیب الدولہ نے مجھے غور سے دیکھا تھا - اور بعد مین نواب (شجاع الدولہ) سے کہا کہ کاشی راے کے بشرے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھ اور بات بھی کہنا چاہتا ہے - جس کو میرے سامنے نہین کہہ سکتا - شجاع الدولہ نے جواب دیا کہ میرے اور آپ کے درمیان کوئی پردہ نہین ہے - اور فوراً مجھے بُلایا - اور گنگا جی کی قسم مجھے دلا کر کہا کہ نجیب الدولہ کے موجود ہونے کی صورت مین جو کچھ مین کہتا وہ بیان کر دون - اِس طرح مجبور ہو کر مین نے (جنکوجی اور بابو پنڈت کے برخوردار خان کے ڈیرون مین موجود ہونے اور اُن سے روپیہ طلب کئے جانے اور جنکوجی کے نواب صاحب سے مدد چاہنے کا) سب حال بیان کر دیا - نجیب الدولہ جو اپنے دل کی باتین چھپانے اور ظاہر داری برتنے مین کمال رکھتا تھا - اُسکو سُن کر بظاہر بہت خوش ہوا - اور کہنے لگا کہ اپنے دشمنون سے مصیبت کے وقت سلوک کرنا بہت مناسب ہے - اور اس سے مَردون کی نیکنامی ہمیشہ رہتی ہے - آپ جنکوجی کی رہائی کے لئے سعی کرین اور کچھ روپیہ طے ہوگا - اُسکا نصف حصّہ مین دونگا - نجیب الدولہ کا یہی طریقہ تھا - مگر نواب سے رخصت ہونے کے بعد وہ سیدھا اشرف الوزراء کے ہان گیا - اور اُن کو تمام باتون سے مطلع کر دیا -

چونکہ ایک طرف نجیب الدولہ سیندھیا کے خاندان کو نیست و نابود کرنا چاہتا تھا - اور دوسری جانب وزیر بھی برخوردار خان کا دشمن تھا - جسکو وہ اُسکے خفیہ نامہ و پیام کا حال ظاہر کرکے نقصان پہنچانا چاہتا تھا - اِس لئے وہ اُسی وقت سوار ہو کر شاہ ابدالی کے پاس گیا اور جنکوجی سیندھیا کا برخوردار خان کے ڈیرے مین ہونے کا حال اُن سے کہا - شاہ موصوف نے برخوردار خان کو بُلایا اور جنکوجی کو چھپائے رکھنے کی بابت اُس سے دریافت کیا - اسنے وزیر کو بیٹھے دیکھکر صاف انکار کیا کہ مجھے اِسکا کچھ علم نہین - اُس وقت وزیر نے مجھے شہادت دینے کے لئے بُلایا - لیکن میرے سب حال کہہ دینے کے بعد بھی برخوردار خان انکار ہی کرتا رہا - جس پر شاہ نے اپنے نسقچیون کو حکم دیا کہ جا کر

برخوردارخان کے ڈیرے کی تلاشی لین - اس طرح جب برخوردارخان بالکل مجبور ہوگیا تو اُسنے اپنے آدمیون کو حکم بھیجدیا کہ شاہ کے نسقچیون کے پہنچنے سے پہلے جنکوجی اور بالوپنڈت دونون نظربندون کو ٹھکانے لگاکر ڈیرون کے اندر ہی دفن کردین - برخوردارخان کے ملازمون نے اُسکے حکم کی تعمیل کی اور اس طرح اُن دونون بدنصیبون کی جان گئی -

نجیب الدولہ کا طریق عمل | کاشی رائے کے مندرجۂ بالا بیان سے نجیب الدولہ پر ان دونون سردارون کے اتلافِ جان کی پوری ذمہ داری عائد ہوتی ہے - مگر کاشی رائے کا محض قیاس ہے جو خاندان سیندھیا کے ساتھ نجیب الدولہ کے جذباتِ خصومت کو مدِنظر رکھکر قائم کیا گیا ہے اور ان جذبات کا ہونا اُس تکلیف و پریشانی کو مدِنظر رکھتے ہوئے چندان تعجب انگیز نہین - جو نجیب الدولہ کو سکرتال مین کئی مہینے برابر اُٹھانی پڑی - جب کہ دتاجی و جنکوجی سیندھیا نے اُسکا محاصرہ کررکھا تھا اور مرہٹے اسکے علاقے کو بے رحمی سے تاراج کررہے تھے - نجیب الدولہ نے اگر فی الحقیقت ذاتی دشمنی سے جیاپا سیندھیا کے نوجوان ہونہار فرزند جنکوجی کی جان پانی پت مین ضائع کرائی - تو قدرت نے اسکا بہت ہولناک انتقام نجیب الدولہ کی اولاد سے لے لیا - جسکے بیٹے ضابطہ خان کو مرہٹون نے اس طرح تباہ کیا کہ آج تک "سبل گڈھ" کے کھنڈر اُس واقعہ پر نوحہ کنان ہین - اور نجیب الدولہ کے پوتے غلام قادرخان کو بھی خاندان سیندھیا ہی کے ایک ممبر نے شاہ عالم پر ظلم و ستم کرنے پر شدید ترین عقوبت مین گرفتار کیا - مگر اس وقت کے حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ دوسرا قیاس کرنا بھی ممکن ہے کہ نجیب الدولہ جو شاہ ابدالی کو ہر طریقے پر خوش کرنا چاہتا تھا - کیونکہ شاہ موصوف نے اسکو اسکے دشمنون کے خطرے سے بچایا تھا - وہ جنکوجی کو قتل کرانے کے درپے نہو بلکہ صرف اسکا اور بالوپنڈت کا زرِ فدیہ بجائے برخوردارخان کے - جو اس معاملے کو پوشیدہ طور پر بالا بالا طے کرکے خود فائدہ اٹھانا چاہتا تھا - وزیر و شاہ کو دلانا چاہتا ہو وزیر کو اس سے برخوردارخان کو زک دینے کا ایک موقعہ دستیاب ہوا - اور برخوردارخان نے وزیر کی اندرونی خصومت سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیئے اُن دونون سردارون کو جلد سے جلد قیدِ حیات سے چھڑانا ضروری سمجھا - بہرحال نجیب الدولہ کی نسبت خواہ بُری ہو یا بھلی - مگر جنکوجی سیندھیا جیسے بہادر نوجوان اور بالوپنڈت جیسے مدبر کا اِس حسرت انگیز طریقے پر مارا جانا بہت دردناک تھا - اور شجاع الدولہ نجیب الدولہ و دیگر سردارانِ روہیلہ اسکا ہمیشہ رنج و افسوس کے ساتھ ذکر کیا کرتے تھے -

ابراہیم خان گاردی کا انتقال | سماؤ کا نامور افسر توپخانہ ابراہیم خان گاردی میدان پانی پت مین سخت زخمی

ہوگیا تھا۔ مگر اُسکے بچ جانے کی امید تھی۔ وہ بحالتِ زخمداری نواب شجاع الدولہ کے کیمپ مین پہنچ گیا تھا۔ اور نواب نے اُسکو پناہ دی تھی اور پوشیدہ طور سے اودھ مین بھیجنے کا انتظام کررہے تھے۔ کیونکہ نواب اُسکی جنگی قابلیت کے معترف و مدّاح تھے۔ اور اُسکی تیار کردہ پلٹنون نے میدانِ کارزار مین جو زبردست مہارتِ فنونِ حرب دکھائی تھی۔ اُسکا اُنکے دل پر کافی اثر تھا۔ مگر افغانون کو جب گاردی کے نواب شجاع الدولہ کے پاس ہونے کی خبر ملی۔ تو چونکہ اسکی پلٹنون کے حملے سے ان کا بہت زیادہ نقصان ہوا تھا۔ اور اُنکے بہت سے اعزہ و اقارب میدانِ پانی پت مین مارے گئے تھے۔ اس لیئے انھون نے شاہ ابدالی کے پاس جاکر گاردی کو اپنے عزیزون کے خون کے عوض قتل کیئے جانے کا مطالبہ کیا۔ شاہ نے شجاع الدولہ سے پوچھا تو پہلے انھون نے انکار کیا۔ مگر قسم دیئے جانے پر مان لیا۔ کہ وہ انکے ہان موجود ہے اور اسکی شجاعت و نمک حلالی کی تعریف بھی کی۔ افغانون نے اُسکی حوالگی پر زور دیا۔ تو نواب نے کہا کہ جو شخص میری پناہ مین آیا ہے۔ خواہ وہ دشمن ہو۔ مگر اُسکی حفاظت مجھپر فرض ہے۔ افغانون نے کہا کہ ہمارے ہزارون بھائیون کا خون اسکی گردن پر ہے اور وہ کافرون کی طرف ہوکر شاہِ اسلام سے لڑا۔ شجاع الدولہ نے اسکو تسلیم نہین کیا۔ اور فارسی تاریخون مین لکھا ہے کہ افغانون کے زیادہ شور مچانے پر نواب شجاع الدولہ اپنی سپر و شمشیر ہاتھ مین لے کر لڑائی کے ارادے سے کھڑے ہوگئے۔ اُس وقت اشرف الوزراء نے افغانون کا ہجوم اور جوش دیکھکر شجاع الدولہ کو الگ لیجا کر سمجھایا کہ فی الحال گاردی کو ہمارے لشکر مین بھیج دیجیئے۔ مین اُسکی حفاظتِ جان کا ذمہ دار ہون اور افغان سپاہیون کو ٹھنڈا کرکے ایک ہفتے بعد اسکو تمھارے پاس واپس بھیج دونگا اور اس اثناء مین اس کا علاج برابر اُنھین جرّاحون سے کرایا جائیگا جنکو آپ نے مقرر کیا ہے۔ شجاع الدولہ نے وزیر سے گاردی کی حفاظتِ جان کا حلفیہ وعدہ لے کر اسکو اُنکے پاس بھجوا دیا۔ وہ اگرچہ اس وقت سخت زخمی تھا۔ مگر اس حالت مین بھی اس نے شاہ اور وزیر کے سوالون کے مردانہ وار جوابات دیئے اور جب کسی نے اسکی حالت اسیری پر چڑانا چاہا تو گاردی نے کہا کہ "مشیتِ ایزدی سے انسان مجبور ہے۔ بھاؤ جیسا لاثانی د[illegible] میدانِ کارزار مین مارا گیا۔ اور میری یہ حالت ہوئی۔ مگر مین نے اپنے مالکون کا حق نمک ادا کیا اور آیندہ جو کوئی مجھ سے خدمت لیگا۔ اُسکے کام مین ایسی ہی جانفشانی کرونگا"۔ شاہ نے اس کو اشرف الوزراء کے سپرد کردیا۔ اور علاج کے لیئے تاکید کی۔ مگر ایک ہفتہ بعد جس روز شاہ ابدالی دارالسلطنت دہلی مین داخل ہوئے۔ گاردی کا انتقال ہوگیا۔ کہا جاتا ہے کہ افغانون نے جرّاحون سے مل کر

اسکے زخمون پر زہر آلود مرہم کے پھائے رکھوا دئے تھے۔ گارڈی شہر دہلی کے باہر قبرستان مین دفن کیا گیا۔ مگر اب اسکی قبر کا نشان نہین ملتا۔

بھاؤ کا زبردست رسوخ و اثر

دوست دشمن دونون کا اِس امر پر اتفاق ہے کہ مرہٹون نے پانی پت مین کافی تہور و بسالت کا اظہار کیا۔ اور بالخصوص اُن کے سپہ سالار (بھاؤ) نے وہ جوانمردی و شجاعت دکھائی۔ جو افغانون سے بھی خراجِ تحسین وصول کئے بغیر نہین رہی۔ بھاؤ کو ملہار راؤ ہولکر سے پہلے اپنی جان بچا کر میدان سے نکل جانے کا موقع تھا۔ اور اگر وہ اس موقعہ سے کام لیتا۔ اور دہلی کا رُخ کرتا۔ تو وہان تیسرے چوتھے ہی روز راجہ ناروشنکر کی جمعیت کی بنیاد ون پر پانی پت کے بچے ہوئے آدمیون کی ایک خاصی بڑی فوج تیار ہو سکتی۔ اور چونکہ دکن سے چلی آرہی تھی۔ اُسکے آملنے پر مرہٹون کی قوت پھر شمالی ہند مین خاصی مضبوط ہو جاتی۔ مگر بسواس راؤ کو اپنے پہلو مین مہلک زخم کھا کر گرتے دیکھکر بھاؤ دل شکستہ و مایوس ہو گیا۔ اور اپنے نوجوان بھتیجے کی موت اور بڑے بڑے مرہٹہ سردارون کی عورتون اور بچون کی افغانون کے ہاتھون مین گرفتاری کے بعد اُسے دکن واپس جانے اور اپنے بھائی پیشوا کو منھ دکھانے کی ہمت باقی نہین رہی۔ اِس لئے اُسنے میدانِ جنگ مین بہادرون کی موت مرنا پسند کیا۔ اور اپنی زندگی کے آخری لمحات مین بھی پیدل و زخمی ہونے کے باوجود پانچ افغان سوارون کے مقابلے سے منھ نہین پھیرا۔ بھاؤ کے لاشۂ بے سر کو خود پیشوا کے وکیل اور دیگر خیر خواہون اور ملازمون نے شناخت کر لیا تھا۔ بعد مین سر بھی دستیاب ہو گیا تھا۔ مگر تن اور سر کے الگ الگ ملنے سے لاش کی اصلیت کے متعلق جو شبہ پیدا ہو گیا تھا۔ اُسکے باعث بھاؤ کے میدانِ جنگ سے زندہ نکل جانے کی افواہین شمالی ہند سے اُڑ کر دکن پہنچین۔ اور پہلے تو صرف اسکے قریبی عزیزون اور مداحون نے ان ضعیف توقعات کو اپنے دل مین جگہ دی۔ مگر بعد ازان پونا کی مرکزی قوت مین جو اضمحلال و انتشار پیدا ہوا۔ اُس نے دیگر اشخاص کو بھی اُن افواہون کے قبول کرنے پر مائل کر دیا۔ اور جن دو شخصون نے "بھاؤ" ہونے کا دعوے کیا۔ اُن مین سے ایک شخص کو بھاؤ کے سسرالی رشتہ دارون کی اس قدر تائید حاصل ہو گئی۔ کہ اسنے ایک مختصر جمعیت اپنے گرد فراہم کرنے مین کامیابی حاصل کر لی اور مرکزی حکومت کے ارکان کو اُسکے خلاف فوجی کارروائیان کرنی پڑین۔ اس خانہ جنگی مین سینکڑون جانون کا نقصان ہوا۔ اور چونکہ زوجۂ بھاؤ کے اس شخص کے فریب مین آجانے سے اسکے جرم کی نوعیت بہت سنگین ہو گئی تھی۔ اس لئے اسکو بہت سخت سزا دی گئی۔ اور ہاتھی کے پاؤن سے بندھوا کر سارے شہر مین اسکی لاش کی تشہیر کرائی گئی۔ دوسرے شخص کو چونکہ چندان کامیابی حاصل نہین ہوئی۔ اِس لئے

صرف قید کی سزا اُسکے لئے کافی سمجھی گئی اور اُسکی گرفتاری کا فرض بھی دوستون نے ادا کیا - ان واقعات سے عیان ہے کہ بھاؤ کی مرہٹون کے دلون مین کتنی زیادہ وقعت و عزت تھی - اور اگر وہ پانی پت مین بحالتِ یاس و حرمان اپنی جان نہ گنواتا - تو گو اُس زبردست شکست کی ہرگز تلافی نہین کرسکتا تھا - جو اُسکے لشکر عظیم کو پانی پت مین اُٹھانی پڑی - تاہم اِس شکست کے مضرت رسان اثرات مین ضرور کمی ہو جاتی اور پیشوا کے زوالِ اقتدار کی وہ کچھ روک تھام کرسکتا -

معرکۂ پانی پت فنِ حرب کے پہلو سے

شاہ ابدالی پانی پت مین اپنے ہندوستانی رفیقون سے کہا کرتا تھا کہ اُنکو اُسکا پورا اختیار حاصل ہے کہ اگر چاہین تو مرہٹون سے صلح کرلین - اور صلح کی جو شرائط اپنے نزدیک مناسب سمجھین - وہ قرار دین - وہ اُسکے لشکر مین اطمینان کے ساتھ پاؤن پھیلا کر سوئین - کیونکہ وہ اُنکی حفاظت کا ذمہ دار ہے - اور اُسکے افغان سپاہی اُنکے پسینے کی جگہ اپنا خون گرانے کو تیار ہین - لیکن اگر جنگ کی نوبت پہنچے گی - تو ہندوستانی سرداران کو اسکی رہنمائی قبول کرنی پڑیگی - اور اسمین کلام نہین کہ اگرچہ روہیلہ سرداروں اور نواب احمد خان بنگش نے لڑائی مین ہر قسم کی جانفشانی و تندہی سے کام لیا - اور نواب شجاع الدولہ نے بھی جو ابتدا مین لڑائی سے الگ رہے تھے - آخری نازک وقت مین اشرف الوزراء کو قیمتی مدد پہنچائی - لیکن تمام فوجی افسران جنھون نے سوم جنگ پانی پت پر خالص فنِ حرب کے پہلو سے نظر ڈالی ہے - اِس بارے مین ہم آہنگ ہین کہ شاہ ابدالی نے باغپت کے گھاٹ پر جمنا کو عبور کرنے کے وقت سے لیکر پانی پت کے میدانِ کارزار مین مرہٹون کے لشکر عظیم کو شکست فاش دینے کے وقت تک اِس پورے وقت مین اعلیٰ مہارت فنِ حرب کا ثبوت دیا - اور دکنی سردار جس طریقۂ حرب مین مشاق تھے - اُسی کو خود بڑی مستعدی و ہوشیاری کے ساتھ برت کر اُن کی ہزیمت کا سامان بہم پہنچایا - بھاؤ نے پانی پت کے گرد خندق اور دمدمے تیار کرکے اور اُنپر زنجیرہ بند توپین لگا کر اپنی حفاظت کا انتظام کیا تھا - مگر بعد مین یہی حصار اُنکی کمزوری کا باعث ہوا - اور مرہٹون کا لشکر خود اپنی تیار کردہ لائن کے اندر محصور ہوگیا - مرہٹے فی الحقیقت سیواجی کے وقت سے "گوریلا وارفیر" یعنی قزاقی لڑائیون یا اُردو کے سب سے بڑے شاعر حضرت میر کے الفاظ مین - جو اُنھون نے اپنی خود نوشت سوانح عمری "ذکرِ میر" مین جنگ سوم پانی پت کا حوالہ دیتے ہوئے مرہٹون کے طریقۂ جنگ کی نسبت استعمال کئے ہین - "جنگِ گریزپائی" مین مشاق تھے - اور کھلے میدان مین بڑی فوجون کے ساتھ قوت آزمائی پر کبھی آمادہ نہین ہوتے تھے - سیواجی کی کامیابی کا راز یہی تھا - کہ وہ اپنے سپاہیون کو پہاڑون اور جنگلون مین متفرق طور پر پوشیدہ رکھتا تھا اور جب موقعہ دیکھتا تھا - تو شہرون قصبون یا شاہی قلعون پر

طوفانِ برق و باد کی سرعت سے یکایک ٹوٹ پڑتا تھا - اور شہنشاہی افواج کی آمد سے پہلے لوٹ مار کرکے نکل جاتا تھا - شایستہ خان سپہ سالارِ افواجِ شہنشاہی پر شب کو خاص اُسکے محل مین حملہ کرنا - جس مین خانِ موصوف کا ایک بیٹا کام آیا اور خود اُسکے اپنی گردن شمشیر کے وار سے بچانے مین اپنے ہاتھ کی دو انگلیون سے دست بردار ہونا پڑا - سیواجی کا ایک خاص کارنامہ تھا - اور اسکے جانشینون نے بھی اُسی کا طریقۂ جنگ اختیار کیا - کہ مرہٹہ سوار ہلکے سامان کے ساتھ بھالون اور تلوارون سے مُسلح تیز رفتار گھوڑون پر چڑھکر کوسون کے دھاوے مارتے تھے - اور جس علاقے مین پہنچتے تھے - اُسکو اپنی تاخت و تاراج سے بے چراغ کر دیتے تھے - دشمن کا رسالہ اگر انکے ایک دستے کو گرفتار کرنے مین کامیاب ہو جاتا تھا - تو دوسرا دستہ داہنے بائین سے یکایک آ پڑتا تھا اور اپنے ساتھیون کو چھڑانے کے ساتھ رسالے کا سامان بھی لوٹ لیجاتا تھا - بعدہٗ جب شاہی فرامین کی رُو سے بڑے بڑے علاقون کی حکومت انکو حاصل ہوئی - تو انھین بتدریج میدان داری بھی سیکھنی پڑی - مگر جنگِ پانی پت سب سے بڑی میدانی لڑائی تھی - جو مرہٹون کو اپنے دورِ اقتدار مین لڑنی پڑی -

اگر بھاؤ اپنے خیرخواہ سورج مل جاٹ اور ملہار راؤ ہولکر کے مشورے کو رعونت کے مسترد نکرتا - اور شاہ ابدالی کے جمنا سے عبور کرلینے کے بعد بھی وہی قراولی لڑائی کی طرح ڈالتا - تو عجب نہین کہ وہ شاہ ابدالی کے ہندوستانی رفیقون کو شاہ کے لشکر سے اپنے علاقون کی حفاظت کے لئے جانے اور مرہٹون کے ساتھ مناسب شرائط پر صلح طے کرلینے پر مجبور کر دیتا - اور شاہ ابدالی بھی سرہند تک جو ہندوستان کی سمت مین پنجاب کا آخری مقام ہے - اپنا تسلط قائم کرکے اپنے وطن واپس چلا جاتا مگر بھاؤ کو ابراہیم خان گاردی کی قواعد دان پلٹنون اور توپخانے پر بڑا بھروسہ تھا - جنکو وہ دکن کی لڑائیون مین مضبوط قلعون کو بآسانی مسخر کرتے اور طاقتور فوجون کو شکست دیتے دیکھ چکا تھا - حقیقت مین یہ حصہ فوج کا مرہٹون کے لیئے بالکل نیا تھا - اور بھاؤ کو اُسکی مجبوریون اور کوتاہیون پر غور کرنے کا ابھی موقعہ نہین ملا تھا - بلکہ دہلی اور کنجپورہ کے قلعون کے دروازے گاردی کی توپون کے چند فیرون کے بعد ہی کھل جاتے دیکھکر اُسکے حوصلے اور بڑھ گئے تھے - برخلاف ازین شاہ ابدالی نے اپنی فراست سے یہ سمجھ لیا تھا کہ بھاری توپین قلعون کی تسخیر یا حفاظت مین تو کام آسکتی ہین - مگر رسالے کے ساتھ انکا اتحادِ عمل زیادہ عرصے تک قائم نہین رہ سکتا - لہذا اِس نے نقشۂ جنگ اس قسم کا تجویز کیا کہ اُسے خود مرہٹون کی لائن پر حملہ آور ہونے اور اپنی سپاہ کو گاردی کی توپون کی زد مین لانے کا موقعہ پیش نہ آئے -

بلکہ وہ مرہٹون کو اپنے حصار سے نکل کر حملہ آور ہونے پر مجبور کرے۔ اِس صورت مین اُنکی زیادہ بھاری توپین پیشقدمی کے وقت اُنکا ساتھ نہ دیسکین گی اور دوسری توپین بھی دونون طرف کے سوارون کی باہمی آویزش کے وقت بیکار ہو جائینگی۔ چنانچہ شاہ موصوف کا یہ خیال بالکل درست نکلا۔ اور گاردی کی توپون نے میدان کی دست بدست لڑائی مین کچھ زیادہ کام نہین دیا۔ البتہ اُسکی پلٹنون نے اپنی قواعد دانی کی بدولت ابتدائی حملہ مین غلبہ حاصل کرلیا۔ اور افغانون کے آٹھ دس ہزار آدمیون کو گرا کر اُن کی لائن توڑدی۔ اور افغان سپاہی ان کے مسلسل فیرون کی تاب نہ لاکر پیچھے ہٹنے اور بھاگنے لگے۔ لیکن چونکہ اِس قواعد دان فوج کی تعداد کچھ زیادہ نہین تھی۔ اِس لئے جب دشمنون نے دوبارہ ہجوم کیا۔ تو وہ چارون طرف سے گھر گئین اور توپین انکو مطلق مدد نہ پہنچا سکین۔ کیونکہ اگر اُن سے کام لیا جاتا تو اُنکی آتشباری پہلے خود ان پلٹنون کا سُتھراؤ کر دیتی۔ اِس اثناء مین گاردی کے شدید مجروح ہونے کے باعث وہ اپنے ہوشیار قائد سے بھی محروم ہوگئین کیونکہ مرہٹہ سردارون مین سے کوئی ان قواعد دان پلٹنون کو اُن کے مقررہ طریقے کے موافق لڑانے کی قابلیت نہ رکھتا تھا۔ ایک انگریز جرنیل نے اپنے جنگِ سوم پانی پت کے مشہور تبصرہ مین یہ بہت پتے کی بات کہی ہے کہ شاہ ابدالی کی جنگی چالین فی الحقیقت مرہٹون کو اُن کے مضبوط حصار ہی کے اندر بھوکا مار کر مغلوب کر چکی تھین۔ مگر مرہٹون کے لئے اتنی بڑی جمعیت کے ساتھ ہتھیار ڈال دینا اور اجنبیون کی اطاعت قبول کرلینا سخت دشوار اور اُس وقت کے طریقون کے لحاظ سے قریباً محال تھا۔ خصوصاً جب کہ اُنھین افغانون کی بیرحمی و خونخواری کا بھی علم تھا۔ لہذا جنگ کی بازی کے ہر جانے کا یقین رکھنے کے باوجود اُنھون نے میدانِ جنگ مین بہادرون کی موت مرنا پسند کیا۔ اور وہ اپنے حصار سے مہم کو سر کرنے کے لئے نہین بلکہ مَردون کی طرح مرنے کے لئے باہر نکلے۔ اور بہت جان توڑ کر لڑے۔ اور دشمنون کی صفون مین گھس گئے۔ بھاؤ کو چونکہ حالات نے سخت پریشان و مایوس کر دیا تھا۔ اِس لئے اُس نے اُن معمولی احتیاطون کو بھی۔ جو اتنے بڑے معرکۂ کارزار کے لئے لازمی تھین۔ استعمال نہین کیا اور اپنی پوری قوت شروع ہی سے لڑائی مین لگا دی۔ برخلاف ازین شاہ ابدالی نے ایک ہوشیار و آزمودہ کار جرنیل کی طرح اپنے خاص محافظ دستون کو ریزرو مین رکھا اور شجاع الدولہ پر بھی صفوفِ زد و خورد مین داخل ہونے کے لئے زور نہین دیا۔ اور جب مرہٹون کا زور کئی گھنٹے مسلسل شمشیر زنی و نیزہ بازی کے بعد گھٹنے لگا۔ تو اُس نے اپنے محافظ دستون اور نواب کی فوج سے جو تازہ دم تھین۔ مرہٹون پر جو خستہ ہو چکے تھے۔ نہ صرف سامنے کے رُخ سے حلہ کر دیا۔ بلکہ اپنی محافظ سپاہ کے

ایک حصے کو کسی قدر پیچھے کرکے مرہٹون کے بازو پر گرنے کا بھی حکم دیا۔ اور مرہٹون کی صفوف اس دو طرف کی مار سے بالکل اُلٹ گئین۔ اگر اس وقت بھاؤ کے پاس بھی کوئی ایسا ہی ریزرو موجود ہوتا تو شاہ ابدالی کی یہ جنگی چال ایسی آسانی سے کامیاب نہ ہو سکتی۔ اور کم از کم مرہٹون کو ترتیب کے ساتھ میدان سے ہٹ آنے کا موقعہ مل جاتا۔ گو اپنے سامان و اسباب اور عورتون کو۔ جو حصار کے اندر تھین۔ وہ اس حالت مین بھی افغانون کے ہاتھ مین پڑنے سے نہین بچا سکتے تھے کیونکہ حصار کے اندر واپس ہونا فاقون سے مرنے کے مترادف تھا۔ بھاؤ کے لئے یہ کچھ مشکل نہین تھا کہ وہ اپنی اور بسواس راؤ کی پائگاہون کی خاص افواج کو آخری یا مناسب وقت کی کوشش کے لئے ریزرو مین رکھتا۔ لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے مرہٹے کسی باقاعدہ میدان داری کے لئے حصار سے نہین نکلے تھے۔ بلکہ فاقہ کشی اور وبائی امراض سے ہلاک ہونے کے بجائے دشمنون سے لڑکر مرجانا چاہتے تھے۔ اور اُن سخت ناگوار حالات مین ان کے لئے کامیابی کی صرف ایک صورت تھی کہ وہ ایک دم زبردست حملہ کرکے افغانون کے پاؤن میدان سے اکھیڑ دیتے۔ مگر شاہ ابدالی ایک ہوشیار جرنیل کی طرح۔ مرہٹون کی ایسی کوشش کا مقابلہ کرنے کے لئے بھی تیار تھا۔ اور جاسوسون کے ذریعہ سے اپنے آپ کو مرہٹون کے کیمپ کی حالت سے باخبر رکھتا تھا۔ چنانچہ اُس نے فنِ حرب کے مسلمہ اصول سے مرہٹون کے طاقتور حملے کو برداشت کیا۔ اور آخرین اپنے ریزرو کو بڑی ہوشیاری و چابکدستی کے ساتھ استعمال کرکے اُن کو شکست دے دی جس نے اس وقت کے حالات کی وجہ سے ہزیمت کی صورت قبول کرلی۔

شاہ ابدالی بانیٔ آزاد افغانستان

شاہ ابدالی کا ایک طاقتور حکمران اور ہوشیار جرنیل ہونے کے علاوہ اپنے ہم قوم افغانون پر ایک یہ احسانِ عظیم بھی ہے کہ اُس نے اُن کو غیرون کی ماتحتی سے چھڑایا اور اس آزاد افغانستان کی بنیاد رکھی۔ جو آج کل اپنے جوان بخت وجوان سال حکمران شاہ امان اللہ خان غازی کی سرپرستی و رہنمائی مین اصلاح و ترقی کی شاہراہ پر بڑی تیزی کے ساتھ قدم بڑھا رہا ہے اور قرائن و آثار کو دیکھتے ہوئے عنقریب ایشیاء کی ایک اہم طاقت بننے والا ہے۔ شاہ ممدوح ایک باسطوت و جبروت حکمران کے بجائے ایک خوددار قومی لیڈر کی حیثیت رکھتے ہین۔ جو افغانستان کے تمام باشندون کو بلا تفریقِ نسل و عقیدہ ایک طاقتور قوم بنا دینا چاہتے ہین۔ اور مشرق جو ڈیڑھ صدی سے مغربی سرمایہ دارون کے عالمگیر اقتدار کی ہوس کا تختہ مشقِ ستم بنا ہوا ہے۔ اُسکو اس قعرِ ذلت سے نکالنے کے لئے دیگر مشرقی اقوام کے ساتھ برادرانہ اتحاد پر عمل کرنا چاہتے ہین۔ جس مین ہندوستان کے

جملہ محبانِ وطن بلکہ تمام ہمدردانِ بنی نوعِ انسان کی نیک خواہشین اُنکے شاملِ حال ہین-

تاریخ سے عیان ہے کہ افغانستان زمانۂ قدیم سے مختلف قبائل کا مسکن تھا- جو اپنے کوہستانی علاقون مین آزادانہ زندگی بسر کرتے اور باہم دگر برسرِ پیکار رہتے تھے اُنکی اِس آخرالذکر عادت سے ہمسایہ ملکون کے حوصلہ مند اشخاص نے فائدہ اُٹھایا - اور اگرچہ ہندوؤن کی قدیم افسانہ نما روایات کا جنکی آثارِ قدیمہ کے اکتشافات سے برابر تصدیق ہو رہی ہے- لحاظ نہ کیا جائے - تو بھی تاریخ کے زمانے کی مُستند روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ افغانستان کا مُلک دشوار گذار کوہستانی علاقون پر مشتمل ہونے کے باوجود ہمیشہ اپنی ہمسایہ اقوام کی ترکتازیون کا جولانگاہ بنا رہا- اور غزنی و غوری خاندانون کے اقتدار کے مختصر درمیانی وقفہ کے سوا کوئی باقاعدہ مستقل حکومت اس مین اس وقت تک قائم نہین ہوئی- جب تک نادر شاہ کی وفات کے بعد ملکِ ایران کی خانہ جنگی- اور مغلیہ سلطنت ہندوستان کی کمزوری کے وقت مین جرنیل احمد خان ابدالی نے اپنے ہمقوم افغان سردارون کی رضامندی و تائید سے تاجِ شاہی اپنے سر پر نہین رکھا اور افغانستان مین ایک مستقل و مضبوط مرکزی حکومت کی بنیاد نہین ڈالی - یہ بنیاد شاہ موصوف کے ہاتھ سے ایسے مبارک و مسعود وقت مین رکھی گئی کہ اگرچہ اُسکے بعد اندرونی حکومتِ افغانستان مین خاندان اور شخصیتون دونون کے انقلابات ہوئے- اور شاہ ابدالی کے کمزور و غیر ہردلعزیز پوتے کو انگریزی افواج نے ہندوستان سے ساتھ لیجا کر اپنی سنگینون کے سایہ مین تختِ کابل پر بٹھایا- لیکن شاہ ابدالی نے اپنی مسلسل شاندار فتوحات سے افغانون کے تمام قبایل مین باہمی عداوت و خانہ جنگی کے باوجود حبِّ وطن و حمایتِ آزادی کے ایسے طاقتور جذبات پیدا کر دئے تھے کہ شاہ شجاع کو اپنے انگریز حمایتیون کے بھروسہ پر زیادہ عرصے تک تختِ کابل پر متمکن رہنے کا موقع نہین ملا- اور تحریکِ آزادی کے قائد اعظم امیر دوست محمد خان کے ایک معرکے مین فتح پانے کے بعد ہی اپنے آپ کو انگریزی وکیل و ایجنٹ کے حوالے کر دینے اور کلکتہ مین لا کر رکھے جانے کے باوجود- جہان اُنکا بڑا مشغلہ لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل کے ساتھ شطرنج کھیلنا تھا- اُنکے نامور و شجیع فرزند اکبر خان نے افغانستان مین انگریزی فوج کو نہ صرف شکست دی بلکہ بالکل تہس نہس کر دیا- اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی مسلّمہ ہوسِ مُلک گیری کے باوجود- انگریزی حکومت کو اس امر پر مجبور کیا کہ وہ امیر دوست محمد خان کو کلکتہ سے کابل مین باقاعدہ مسندِ امارت پر بیٹھنے کے لئے واپس بھیجین - اور اُن سے عہد و پیمان کرین - اسکے بعد جب امیر دوست محمد خان کے پوتے امیر یعقوب خان نے اپنی کمزوری سے انگریزون کو امورِ مملکت مین مداخلت کا موقعہ دیا- افغان

ایک مرتبہ پھر حمایت آزادی کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور اوّل جنگ افغانستان کے بعض واقعات یعنی کیوگناری انگریز ایجنٹ اور اُنکے رفقاء وعملہ کے قتل وغیرہ کی صورت مین پھر دُوہرائے گئے۔ اور اگرچہ انگریزی فوج نے لارڈ رابرٹس آف قندہار کی زیر قیادت اِس ناپسندیدہ کارروائی کا انتقام لیا۔ اور غزنی کے شہر اور کابل کے مشہور قلعہ بالاحصار کو تباہ ومنہدم کر دیا۔ لیکن افغانستان پر مستقل قبضہ کرنے کی اس وقت بھی انگریزی حکومت کو ہمت نہین ہوئی اور امیر یعقوب خان کو اپنی کمزوری اور اپنے ہم قومون کے مقابلے مین غیرون کی پناہ ڈھونڈھنے کا خمیازہ اپنے تخت سے محرومی اور ڈیرہ دون کے مقام پر طویل نظر بندی کی صورت مین بھگتنا پڑا۔ اور انگریزون کے قومی خصائل مین بہادری وحب وطن کی قدردانی جس حد تک شامل ہے۔ اُس پر اِس واقعہ سے ایک روشنی پڑتی ہے کہ برٹش گورنمنٹ نے امیر یعقوب خان کے چھوٹے بھائی سردار ایوب خان مشہور فاتح میوند کے ساتھ۔ باوجودیکہ وہ صرف ایک صوبہ (ہرات) کے گورنر تھے۔ اُن کے بڑے بھائی سے بہتر سلوک کیا۔ یعنی اُنکے ایران کی نظر بندی سے نکل آنے کے بعد اُن کو امیر یعقوب خان سے کئی گُنا زیادہ وظیفہ بھی دیا گیا۔ اور سرحد سے نسبتہً قریب لاہور مین کئی سو رفقاء وخدام کے ساتھ مقیم ہونے کی اجازت دی گئی۔ افغانستان کی حکومت امیر دوست محمد خان کے دوسرے پوتے امیر عبدالرحمٰن خان مرحوم کو روسی ترکستان سے بلاکر سپرد کی گئی۔ جنھون نے اپنی زبردست ڈپلومیسی سے انگریزون اور روسیون کے درمیان افغانستان کو بطور ایک ''بفر اسٹیٹ'' کے محفوظ رکھا۔ اور فوجی قوت کو اُس وظیفہ کی مدد سے۔ جو اُنھین گورنمنٹ ہند سے ملتا تھا۔ اور مضبوط کیا۔ اور فوجی اسلحہ وسامان کے علاوہ بعض مصنوعات کے کارخانے بھی کابل مین قائم کئے۔ امیر عبدالرحمٰن خان منغفور گویا ''افغانستان جدید'' کے بانی تھے اور اُن کے اقبالمند وبیدار مغز پوتے (موجودہ شاہ امان اللہ خان خلداللہ ملکہٗ) اپنے معاملہ فہم ودُور اندیش دادا کی قائم کردہ بنیادون ہی پر دولتِ مستقلۂ افغانستان کی عظمت وقوت کا ایوان فلک فرسا تعمیر کر رہے ہین۔ اگر شاہ ابدالی مملکتِ افغانستان کی بنیاد نہ ڈالتا۔ تو وہ مُلک پہلے کی طرح برطانوی ہند وروسی ترکستان کے درمیان تقسیم ہو جاتا اور ہندوستان کو روسی حملے کا خطرہ کہین زیادہ شدت کے ساتھ ہر وقت لگا رہتا۔ جس کی رُوک تھام کی تدابیر مین اربون روپئے اور ہزارہا قیمتی جانون کا نقصان ہوتا۔ لہذا شاہ ابدالی کے افغان سپاہیون نے گو پانی پت کے میدان مین ہزارہا مرہٹون کو قتل کیا۔ مگر شاہِ موصوف نے افغانستان مین ایک مستقل حکومت قائم کرکے ہندوستان کے شمال مغربی علاقون کو ترکمانون اور رُوسیون کی پیہم تاخت وتاراج سے محفوظ کر دیا۔

نارد شنکر کا دہلی کو چھوڑ دینا

جنگ پانی پت کے نتیجے کی جب دہلی مین راجہ نارد شنکر کو خبر پہنچی - تو وہ بہت مضطرب ہوا - اور چونکہ دکن سے جلد کمک آنے کی اُسے کوئی اُمید نہین رہی تھی - اِس لئے وہ دار السلطنت کو چھوڑنے کی تیاریان کرنے لگا - دہلی اس وقت مرہٹون کی فوجی مہم کے لئے ایک مستقر کی حیثیت رکھتا تھا اور یہین سے روپیہ و سامان رسد بھاؤ کے لشکر کو بھیجا جاتا تھا - اس وقت بھی غلہ و دیگر اشیاء کے وسیع ذخائر نارد شنکر کے پاس موجود تھے - مگر جب اسکو معلوم ہوا کہ شاہ ابدالی نے دہلی کا رخ کیا ہے - تو وہ بالکل گھبرا گیا - اور اگرچہ اپنی جمعیت سپاہ کے ساتھ وہ کچھ مدت تک بآسانی شہر کی حفاظت کر سکتا تھا - لیکن اسنے شاہ کی آمد سے قبل وہان سے نکل جانے کو ترجیح دی -

اوپر لکھا جا چکا ہے کہ بھاؤ نے دہلی کو چھوڑنے سے قبل شاہزادہ جوان بخت عرف "جہان قدر" خلفِ اکبر شاہزادۂ عالی گوہر کو جنھون نے بعد مین شاہ عالم ثانی کا لقب اختیار کیا - اُنکے باپ کی نیابت مین تخت پر بٹھا دیا تھا - اور شاہزادۂ موصوف اپنی دادی زینت محل زوجۂ شہنشاہ عالمگیر ثانی کی ہدایات پر عمل پیرا تھا - جو ایک دانشمند و باہمت خاتون تھین اور اپنے فرزند کے لئے تخت شہنشاہی کو محفوظ کرنا چاہتی تھین - اور ایک طرف مرہٹون کو گستاخ نہین ہونے دینا چاہتی تھین اور دوسری جانب شاہ ابدالی کے افغان سپاہیون کی دستبرد سے بھی دار السلطنت اور اسکے باشندون کو محفوظ رکھنا چاہتی تھین - چنانچہ مرأت آفتاب نما مین لکھا ہے کہ "نواب زینت محل صاحبہ نے عنایت و مہربانی کی راہ سے اور حقوقِ بندگیِ قدیم پر نظر کر کے - اگرچہ مرہٹون سے کچھ حرکاتِ ناشائستہ بھی صادر ہوئی تھین (یہ اشارہ ہے بھاؤ کے اسبابِ شہنشاہی و سامانِ مقابر پر دستِ تصرف دراز کرنے کی طرف) اُن سے اغماض برت کر نارد شنکر کو شاہ ابدالی کی فوج کے پہنچنے کی آفت سے آگاہ فرمایا کہ مال و متاع اور نقدی مین سے جس قدر بھی ممکن ہو اپنے ساتھ لیکر وہان سے ہٹ جائے - بہرحال بیگم صاحبہ کی حمایت کی بدولت وہ دار الخلافت سے نکل آیا - مگر اوباشانِ شہر کے ہاتھون بہت سا مال اُسکا تلف ہوا - اور براؤ مذکور (نارد شنکر) نے - روانگی کے وقت ۲ ½ لاکھ روپیہ نقد اور دکن کی اجناس ملازمانِ حضرت بیگم صاحبہ کی خدمت مین پیش کین - اور جو ذخائر کہ منتشر تھے اور جابجا رکھے ہوئے تھے - اُن کے اُٹھانے کا بوجہِ اضطرار اسکو وقت نہین ملا - لہذا وہ بیگم صاحبہ کے ہاتھ آئے"۔ دیکھئے میدانِ پانی پت مین مرہٹون نے اِس قدر زبردست شکست کھائی - لیکن اُنکا جوقائمقام دہلی مین تھا - اُسکو ولی عہد اور اُن کی دادی صاحبہ نے ایسے طریقے پر رخصت کیا جس طرح کوئی اپنے وفادار ملازم کی خطرے سے حفاظت کرتا ہے - نارد شنکر کے دہلی کو چھوڑ دینے سے مفرورینِ پانی پت کا کوئی ٹھکانہ

باقی نہ رہا۔ اور جو بدنصیب بھوکے پیاسے منزلین طے کرتے وہان پہنچے۔ انھین جب دار السلطنت مین پناہ نہ مل سکی تو وہ سخت مایوس ہوئے۔ اور دکن کی طویل و دشوار گذار راہ کاطے کرنا اُن کے لئے محال ہوگیا۔ چنانچہ سینکڑون آدمی دہلی اور اُسکے گرد و نواح مین زندگی کی مصائب سے چھوٹ گئے اور ہزارون آدمی دہلی سے متھرا پہنچ کر علاقۂ بھرت پور مین داخل ہوئے اور سورج مل جاٹ کی مہربانی سے آذوقۂ حیات و زادِ راہ پاکر دکن چلے گئے۔

شاہ ابدالی کا داخلہ دار السلطنت مین

شاہ ابدالی پانی پت کی لڑائی جیتنے کے آٹھوین روز دار السلطنت دہلی مین داخل ہوئے۔ نواب زینت محل صاحبہ اور شاہزادۂ ولیعہد بہادر نے انکا استقبال کرکے شہر کے شاہی محلات مین اُنکو اُتارا۔ اور ایک لاکھ روپیہ بطریقِ ضیافت شاہ کی خدمت مین اور پچاس ہزار اشرف الوزراء کی خدمت مین پیش کیا۔ کچھ عرصے بعد امیر الامراء عماد الملک نے جو سورج مل کے قلعے مین مقیم تھا۔ اپنے معتمد علیہ دیوان ناگر مل کو شاہ ابدالی کے پاس بھیج کر درخواست کی کہ اگر شہنشاہ دہلی کی وزارتِ عظمےٰ کا منصب شاہ اسکو دلا دین۔ تو وہ ستر لاکھ روپے کا زر جوابہر نذر کرنے کو تیار رہے۔ شاہ نے اِسکو قبول کیا۔ اور اپنے معتمد علیہ یعقوب علی خان کو جس نے بھاؤ کے حملے سے ابتدا مین قلعۂ دہلی کی حفاظت کی تھی۔ دیوان ناگر مل کے ساتھ وصول نذرانہ کی غرض سے بھیجنا چاہا۔ مگر نواب زینت محل صاحبہ کو جب اسکی اطلاع ہوئی۔ تو انھون نے عماد الملک کے خلاف ایک دفترِ شکایت شاہ ابدالی کے سامنے کھولا اور احمد شاہ اور عالمگیر ثانی کے ساتھ اُسکی گستاخیان اور مظالم یاد دلا کر کہا کہ ہم اُس بانیِ فساد کو ہرگز وزیر نہین بنا سکتے۔ شاہ نے بیگم صاحبہ و شاہزادۂ ولیعہد کو قدرے اطمینان دلایا۔ مگر یعقوب علی خان کا عماد الملک کے پاس بھیجنا ملتوی نہین کیا۔ عماد الملک نے ایک عرصے تک یعقوب علیخان کو لیت و لعل مین رکھا۔ آخر مین ظاہر ہوگیا کہ عماد الملک خود مفلوک الحال اور دوسرون سے اعانت کا امیدوار ہے۔ اِس اثناء مین شاہ ابدالی اپنی سپاہ کے تقاضے سے مجبور ہو گئے اور اپنی ایسی عظیم الشان فتح سے کوئی اور فائدہ اُٹھائے بغیر اپنے ملک کو واپس چلے گئے۔ البتہ پنجاب و سندھ کے دونون صوبے معہ کشمیر اس وقت سے دہلی کے شہنشاہی اقتدار سے نکل گئے۔

جنگ پانی پت کے اثرات

جملہ مورخ اِس امر پر متفق الرائے ہین کہ پانی پت کی شکستِ عظیم نے مرہٹون کی توسیعِ اقتدار پر ایک ایسی ضرب لگائی جس سے وہ پھر پنپ نہین سکی۔ اور شمالی ہند مین اُن کو مستقل اقتدار پیدا کرنے کا کوئی اقتدار باقی نہین رہا۔ نارو شنکر اور جو چھ سات ہزار مرہٹہ سوارون اور پیادون کی جمعیت کے ساتھ دہلی پر قابض اور امورِ سلطنت پر حاوی تھا۔ جنگ پانی پت کے نتیجے کو

سنکر کچھ ایسا خوف زدہ ہوا کہ دہلی کو چھوڑ کر چلا گیا - اسکی اس کارروائی سے مرہٹون کو مزید نقصان پہنچا - کیونکہ جنگِ پانی پت کے بہت سے مرہٹہ مفرورین نے دہلی کا رُخ کیا - اگر نارو شنکر وہان موجود رہتا - تو ان مفرورین کو سہارا ملتا - اور نارو شنکر کے پاس جو مرہٹہ فوج اس وقت تھی اسکی قوت ان مفرورین کی شمولیت سے بڑھجاتی اور کم از کم وہ دار السلطنتہ پر آسانی اُس وقت تک قابض رہ سکتے تھے کہ پیشوا کی دکن سے بھیجی ہوئی کمک آجاتی - مگر نارو شنکر کے دہلی کو چھوڑ دینے سے ان مفرورین کے پناہ کی کوئی جگہ باقی نہین رہی اور ہزارون آدمی دہلی سے مایوس واپس ہونے کے بعد راجستھان مین سر ٹکراتے پھرے - دہلی سے لیکر متھرا تک پانی پت کے فلاکت زدہ مرہٹہ مفرورین مہینون پھرتے نظر آئے - اور سورج مل جاٹ نے بعض روایات کے بموجب اپنا دس لاکھ روپیہ پانی پت کے مفرورین کو زادِ راہ دے کر دکن کی طرف روانہ کرنے مین خرچ کیا - جس پر مرہٹے ہمیشہ اسکے احسانمند رہے - مگر اس زمانے کی ملکی سیاسات کا عجیب رنگ تھا - اور مرہٹون نے لوٹ مار کو اپنا ایک مستقل پیشہ قرار دے لیا تھا چنانچہ ملہار راؤ ہولکر اگرچہ پانی پت سے بھاگ کر خود متھرا و بھرتپور پہنچا - اور سورج مل جاٹ کا مہمان رہا - مگر تھوڑے عرصے بعد ہی اپنے محسن کے بیٹے اور جانشین جواہر مل کے قلعون پر تاخت کرنے مین کچھ تامل نہین ہوا - چنانچہ "خزانۂ عامرہ" کی روایت کے بموجب نواح اکبرآباد (آگرہ) مین دھولپور کے قریب عید کے روز ہولکر کا سولہ ہزار سوارون کی جمعیت کے ساتھ جواہر مل کی فوج سے مقابلہ ہوا اور تھوڑی سی لڑائی کے بعد ہولکر کی فوج رو بفرار لائی - جواہر مل کی فوج قتل وغارت کرتی ہوئی اُسکے تعاقب مین چلی - اور مفرورین کے ہاتھیون گھوڑون اور ساز و سامان کو چھین کر ایک بڑی تعداد کو اُنھون نے تلوار کے گھاٹ اُتارا - ہولکر کے آدمیون نے قلعۂ دھولپور مین پناہ لی - اور جواہر مل کے فوج والون نے قلعۂ مذکور کا محاصرہ کیا - اور دس روز مین محصورین پر فتح پا کر - پانچ سرداران فیل نشین کو دس ہزار آدمیون سمیت قید کر لیا - ملہار راؤ ہولکر نے جب یہ خبر ہوش ربا سنی - تو اُسکی ہمت ٹوٹ گئی - اور وہ اُس علاقے سے بھاگا - اور بقرعید سے ایک روز قبل جھانسی مین انتقال کر گیا - پیشوا بالاجی باجی راؤ کو پانی پت کی خبرین برابر ملتی تھین - اور آخری ایام مین بسواس راؤ نے اسکو ایک خط اس مضمون کا لکھا تھا کہ - یہان ہم لوگون پر وقت تنگ ہے اور اگرچہ میرے مانند لڑکے آپ کو مل جائین گے - مگر بھاؤ کا سا دلاور بھائی نہین ملیگا - لہذا آپ کو اُنکی امداد ضرور کرنی چاہیے - ان خبرون سے پیشوا پریشان ہوا - اور پہلے وہ پونا سے احمدنگر آیا اور پھر دریائے گوداوری کے کنارون تک پہنچا - یہان پہنچکر مزید تشویش انگیز اخبار اُسکے گوش زد ہوئے - اسی

وقت مین جانوجی بھونسلے دس ہزار آدمیون کی جمعیت کے ساتھ اس سے آکر ملا اور پیشوا کی فوج ہندوستان کی طرف بڑھی - اور تین ہفتے بعد جب وہ نربدا کو عبور کر رہا تھا - تو ایک قاصد اسکے پاس پہنچا - جسکو ساہوکارون نے بھیجا تھا - اور اُس نے نو دن مین پانی پت سے اورنگ آباد پہنچکر جہان پیشوا پہلے مقیم تھا - چٹھی پیشوا کے لشکر مین پہنچا دینے کا وعدہ کیا تھا - یہ قاصد پیشوا کے روبرو حاضر لیا گیا - تو اس نے اپنی چٹھی پیش کی - پیشوا نے اسکو اپنے ہاتھ سے کھولا تو یہ حال پڑھا کہ "دو موتی گھل گئے - ۲۷ - اشرفیان ضائع ہوگئین - اور چاندی اور تانبہ جس قدر ضائع ہوا اُسکی کوئی میزان نہین لگائی جاسکتی" - اس زمانے مین مہاجن اور ساہوکار ملک کے واقعات پر نظر رکھتے تھے - اور اپنی کاروباری اغراض کے لئے اہم واقعات کی جلد سے جلد اپنے گماشتون اور بیوپاریون کو اطلاع دیتے تھے - اور اپنی چٹھیون مین اکثر رموز عبارت استعمال کرتے تھے - چنانچہ مذکورہ بالا چٹھی مین بھی بظاہر مال تجارت کا ذکر تھا - اور کوئی ناواقف شخص اُس سے کوئی معنی پیدا نہین کرسکتا تھا - مگر پیشوا نے اُسکا مطلب سمجھ لیا اور اپنے نامور بھائی سداشیوراؤ بھاؤ اور عزیز فرزند بسواس راؤ اور دیگر سردارون اور فوج کی تباہی اُسکو معلوم ہوگئی - اِسکے بعد ہی فوج کے کچھ لوگ بھی پہنچے اور اُنھون نے اس خبر کی تصدیق کی - ابتدائی مفرورین مین بابو راؤ پنڈت وکیل پیشوا کا جس کی جان جھنکوجی سیندھیا کے ساتھ ضائع ہوئی - بھتیجا بالاجی جنار دھن تھا - جو بعد مین نانا فرنویس کے لقب مرہٹہ حکومت کے ایک ممتاز افسر کی حیثیت سے تاریخ مین مشہور ہوا - اسکی - ان افغانون کے ہاتھ پڑگئی - مگر بیوی بچ رہی - اور بھاؤ اور بسواس راؤ کی بیواؤن کی طرح دکن پہنچ گئی -

مہاراشٹر مین تہلکہ

پانی پت کی شکستِ عظیم کا حال جب لوگونکو معلوم ہوا تو سارے مہاراشٹر مین تہلکہ پڑگیا - کیونکہ کوئی ممتاز گھرانا ایسا نہین تھا - جسکے کچھ لوگ پانی پت کے میدان کارزار مین ضائع نہ ہوئے ہون - اکثر بڑے گھرانون کی عورتین جو اپنے مردون کے ساتھ گئی ہوئی تھین ہمیشہ کے لئے غائب ہوگئین - اور نربدا سے لیکر دریائے کرشنا تک پورے علاقے مین صف ماتم بچھ گئی - پیشوا کے قلب پر اس واقعہ سے اس قدر صدمہ پہنچا - کہ وہ اسی وقت سے اداس اور مضمحل ہوگیا اور اپنا ہندوستان کا عزم فسخ کرکے آہستہ آہستہ پونا واپس چلا گیا - جہان چند ماہ کا زمانہ اُسنے بڑی اداسی کے ساتھ گذارا - اسکے قوے مین اضمحلال پیدا ہوگیا - اور آخر واقعۂ پانی پت کے چھ ماہ کے اندر وہ اپنے مستقر مین پاربتی کے مندر کے اندر انتقال کرگیا - جہان وہ اپنی زندگی کے آخری

ایام گیان دھیان مین گذارتا تھا۔

مرہٹون کا شیرازہ قوت بکھر گیا

واقعہ پانی پت کے وقت سے مرہٹون کا عروج ختم ہونے لگا اور اُنکی قوت کا شیرازہ بکھر گیا۔ گو جسونت راؤ ہولکر اور مادھوجی و دولت راؤ سیندھیا نے اسکے بعد شمالی ہند کے علاقون مین ترکتازی کی۔ اور اول الذکر شمال مین وسط پنجاب اور مشرق مین بنگال و بہار تک پہنچا۔ اور سیندھیا نے دار السلطنتہ دہلی کے قریب کے علاقون پر متصرف ہوکر ذات شہنشاہی پر اپنا اثر قایم کیا۔ اور پیشوا کے لئے "وکیل مطلق" کے موروثی عہدے کا۔ جو سلطنت مین سب سے بڑا مقتدر منصب تھا۔ اور اپنے لئے دیوان اور وزارت کا فرمان شاہِ عالم سے حاصل کیا۔ مگر یہ فی الحقیقتہ سیندھیا کی ذاتی فتوحات تھین اور سارے مرہٹہ مورخ اسپر متفق ہین کہ مرہٹہ حکومت مرکزی قوت جو پیشوا کے ہاتھ مین تھی۔ واقعۂ پانی پت کے بعد بڑے درجہ تک زائل ہوگئی تھی اور ماتحت سردارون پر اسکا کوئی اثر باقی نہ رہا تھا۔ نانا فرنویس کا سا ہوشیار مدبر اپنی حکمت عملی سے ایک عرصے تک پیشوا کی قوت کو سنبھالے رہا۔ مگر آخر مین وہ بھی مجبور ہوگیا۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی روزافزون قوت نے اپنی حکمت عملی سے ان کو فرداً فرداً آہستہ آہستہ مغلوب کرلیا۔ اور باجی راؤ خلف رگھوبا آخری پیشوا اپنی سیندھیا۔ ہولکر۔ گائیکواڑ۔ پورندھر۔ بھونسلے وغیرہ سربرآوردہ ارکان حکومت کے انگریزون سے مل جانے پر ہر طرف سے مجبور و لاچار ہوکر سر جان مالکم مشہور اینگلو انڈین افسر سے رجوع لایا جس سے اسکی پرانی دوستی تھی۔ چنانچہ سر جان مالکم نے دوستی کو نباہا اور باوجودیکہ بعد مین اسپر اعلیٰ حکام کمپنی کی طرف سے سخت اعتراضات ہوئے۔ مگر اُسنے پیشوا سے جو وعدے کئے تھے۔ اُن کو پورا کرایا۔ اور آٹھ لاکھ روپے سالانہ کا وظیفہ خزانۂ کمپنی سے اُسکو دلایا۔ جو کانپور مین وفات پانے تک اُسکو ملتا رہا۔ پیشوا کے بڑے بھائی امرت راؤ کو بھی جسے اُسکی ولادت سے قبل رگھوبا نے متبنٰی کرکے مثل اپنی اولاد کے پرورش کیا تھا۔ اور تکوجی ہولکر نے پونا پر قابض ہوکر باجی راؤ کے بجائے اُسکو پیشوا بنا دیا تھا۔ آٹھ لاکھ کا وظیفہ دیا جا چکا تھا۔ اس نے بنارس مین قیام اختیار کیا تھا۔ باجی راؤ کی جس وقت وفات ہوئی۔ اُس وقت لارڈ ڈلہوزی برٹش انڈیا کے گورنر جنرل تھے۔ جو اپنی ہندوستانی ریاستون کو غصب کرنے کی منحوس پالیسی پر عمل کررہے تھے۔ لارڈ موصوف کی گورنمنٹ نے باجی راؤ کے پسر متبنٰی ڈھوندھو پنت عرف "نانا صاحب" کا اُسکے باپ کے وظیفہ مین کوئی حق تسلیم نہین کیا۔ حالانکہ لڑکون کا متبنٰی کرنا ہندؤن کا قدیم دستور

ہے۔ اور اُنکے مذہبی احکام کی رُو سے پسرِ متبنّٰی تمام صورتون مین صُلبی فرزند کی برابر و مانند ہوتا ہے اور اپنے والدین کی مراسم تعزیت ادا کرتا ہے۔ چنانچہ یہ حق بعد مین انگریزی حکومت نے تمام ریاستون کے لئے تسلیم کیا۔ اور اُسپر آج تک برابر عملدرآمد ہو رہا ہے "نانا صاحب"، کو اپنے باپ کا وظیفہ نہ ملنے پر سخت مایوسی ہوئی۔ اور سارے ہندوستان مین عام طور پر انگریزی حکومت کا یہ فعل بد دیانتی اور معاہدے کی خلاف ورزی سے تعبیر کیا گیا نانا صاحب اس کانٹے کو اپنے دل مین لئے رہا۔ اور تھوڑے عرصہ بعد ہی جب یورپین سپاہ نے بظاہر چربی ملے ہوئے کارتوسون کے باعث مگر فی الحقیقت دوسرے بہت گہرے اسباب کی بناء پر ایسٹ انڈیا کمپنی سے سرکشی اختیار کی۔ تو نانا صاحب کو اس امر کا۔ جسکو وہ اپنے نزدیک بدعہدی سے تعبیر کرتا تھا بدلہ لینے کا موقع مل گیا۔ اور اسنے اپنے علاقے کی سرکش فوج کی سرپرستی اختیار کرکے اپنے آبائی مرتبے کو دوبارہ حاصل کرنا چاہا۔ جسکے سلسلے مین وہ ہولناک و دردانگیز واقعہ پیش آیا۔ جو "خونریزی کانپور"، کے لقب سے مشہور ہے۔ تھوڑے عرصے کے لئے "نانا صاحب" کا اقتدار کانپور اور آس پاس کے علاقون پر قایم ہو گیا۔ اور اس نے بندیلکھنڈ اور وسطِ ہند کے سرکشون سے اتحاد عمل کرکے دکن تک پہنچنا چاہا۔ مگر اپنے رفیقون کی خود غرضی و ناتجربہ کاری۔ و عمال کمپنی کی ہوشیاری۔ اور ہندوستانی والیانِ ریاست کی وفاداری کے باعث نانا صاحب کو بھی فتنۂ ۱۸۵۷ء کے دیگر لیڈرون کی طرح آخر مین ناکام رہنا اور اپنی جان چھپا کر بھاگنا پڑا۔ برسون تک اُسکی تلاش جاری رہی۔ اور کئی بیگناہ اشخاص اُسکے دھوکے مین گرفتار کئے گئے۔ آخر مین معلوم ہوا کہ علاقۂ نیپال مین کسی مقام پر دامنِ کوہ نے اُسکا پردہ ڈھانک لیا۔ مرہٹہ اقتدار کی یادگار چند ریاستین۔ بڑودہ۔ گوالیار۔ اندور۔ دیواس۔ دتیا وغیرہ باقی ہین۔ اور کولھاپور کے مہاراجگان براہِ راست سیواجی کی نسل مین ہین۔ ستارہ مین سیواجی کے خاندان کی بڑی شاخ حکمران تھی جسکو ایسٹ انڈیا کمپنی کی افواج نے عملی نظربندی کی حالت سے۔ جو پیشواؤن نے اُسپر عائد کر رکھی تھی چھڑایا۔ مگر بعد مین کمپنی مذکور نے ایک معمولی سے بہانہ پر ستارہ کے راج کو خود ضبط کر لیا۔ آخری راجہ ستارہ کا ایک وفادار ملازم باوجود عسرت اور طرح طرح مشکلات کے اپنے آقا کے حقوق کی بحالی کے لئے کامل بتیس سال تک انگلستان مین مسلسل جدوجہد کرتا رہا اور اگرچہ اُسے کامیابی حاصل نہین ہوئی۔ مگر وفاداری اور استقلال کی ایک زبردست مثال اُسنے تاریخ کے صفحات پر ثبت کردی اور مسائلِ ہند پر انگلستان مین ایجیٹیشن کرنے کی راہ بھی اپنے ہموطنون کو دکھائی!۔

جنگ سوم پانی پت سے مغلیہ اقتدار شہنشاہی کو نقصان

پانی پت کے میدان مین مرہٹون کے شکست پانے سے اگرچہ بظاہر مسلمانون کی زوال پذیر قوت شمالی ہند مین کچھ عرصے کے لئے پھر بحال ہوگئی - مگر غور کیا جائے - تو اس جنگ کے نتیجے سے بالواسطہ مغلیہ شہنشاہی اقتدار کو بھی سخت نقصان پہنچا - کیونکہ قدیم اُمرائے سلطنت مین بعض مقتدر اشخاص نے شاہ ابدالی کے ساتھ - جو ایک بیرونی حملہ آور سے زیادہ کوئی حیثیت نہ رکھتا تھا - وفاداری برتنی ضروری سمجھی اور اسی نسبت سے دہلی کے تخت شہنشاہی کے ساتھ اُن کی وفاداری گھٹتی گئی - اور وہ مطلق العنان و خودرائے ہوتے گئے - یہ خرابی تو عہد محمد شاہ سے شروع ہوگئی تھی - کہ ایک ہی عہدۂ سلطنت اور صوبیداری و فوجداری کے دو دو تین تین عہدہ دار دربار و ملک مین موجود ہوتے تھے - اور اُن کے باہمی جوڑتوڑ اور کشمکش سے مرکزی حکومت کے اقتدار کو ضعف پہنچتا تھا - سلطنت کے دور افتادہ صوبے مثلاً بنگال بہار و اوڑیسہ مالوہ و گجرات علاوہ پورے دکن کے عملی طور پر شہنشاہ کے ہاتھ سے نکل چکے تھے - اور اپنی اندرونی کشمکش مین مبتلا تھے - اب مرکز حکومت کے قریب کے علاقون پر بھی ایسے لوگون کا قبضہ قایم ہوگیا - جو اپنے کو شہنشاہِ دہلی کی ماتحتی سے قریباً آزاد سمجھتے تھے - اور شاہ ابدالی سے اپنے علاقون کی سند حاصل کرچکے تھے - افغان مرہٹون سے کچھ کم لوٹ کے حریص نہ تھے - اور اُن سے زیادہ ظالم و خونخوار تھے اور اپنی جنگی فتوحات کے زعم مین دہلی کی شہنشاہی کی اُنکے دلون مین کوئی وقعت نہین تھی - برخلاف ازین مرہٹے مغلیہ شہنشاہی اقتدار کو برقرار رکھنا چاہتے تھے اور اُسکی آڑ مین اپنی حریصانہ اغراض پُوری کرنا چاہتے تھے - چنانچہ پونا کے باشندون کو وہ جشنِ تہنیت عرصے تک یاد رہا - جو سوم جنگِ پانی پت کے قریباً تہائی صدی بعد اس وقت منایا گیا تھا - جب کہ مادھوجی سیندھیا مغلیہ سلطنت کے سب سے بڑے عہدے "وکالتِ مطلق" کا موروثی فرمان شاہ عالم ثانی سے پیشوا کے واسطے لیکر گیا تھا - اور جسکے ساتھ ہی شہنشاہ موصوف نے سارے ہندوستان مین گاؤکشی موقوف کرنے کا فرمان بھی صادر کیا تھا - اور خود سیندھیا کو وزیر اعظم کا عہدہ اور "فرزندِ عالیجاہ" کا خطاب دیا تھا -

نانا فرنویس کی ایک اہم تحریر

اس واقعہ سے تیرہ چودہ سال پہلے جب رگھناتھ راؤ کی ہوس اقتدار نے اسکو انگریزون کا آلۂ کار بنا دیا تھا - تو اس وقت بھی مرہٹہ ارکانِ دولت اپنی ریاست کے قیام کے لئے - دہلی کے تخت شہنشاہی کی طرف امید بھری نظرون سے دیکھتے تھے - چنانچہ مرہٹہ حکومت کے سب سے بڑے کارکن نانا فرنویس نے رگھناتھ راؤ کی پیدا کردہ لڑائیون کے آخری زمانے مین

جب کہ حکام ایسٹ انڈیا کمپنی مادھو راؤ سیندھیا سے خفیہ مفاہمت کرنے مین ساعی تھے - ایک چیٹھی سیندھیا کو لکھی تھی - جو اس وقت تک بجنسہ محفوظ ہے - اِس مین مرہٹون کے اُس مدبر اعظم نے مادھو راؤ سیندھیا کو جتایا ہے کہ "ہمین ہرگز کمپنی کے علاقون کو فتح کرنے کی خواہش نہین تھی - اور ہمنے کبھی اُنکو کوئی نقصان نہین پہنچایا - بلکہ خود اُنھون نے ہمارے خلاف اعلانِ جنگ کیا - اور پُورے چھ سال تک ہمکو بھاری نقصانات پہنچاتے رہے - انھون نے ہماری ریاست کے دو ارکان گائیکواڑ اور بھونسلے کو اپنی طرف توڑ کر ہماری حکومت کے ڈھانچے کو کمزور کرنے کی کوشش کی - اگر ہم انکو انکی مَن مانی کارروائیان کرنے دینگے - تو ایک آفت و مصیبت اپنے اوپر لینگے - اور اپنے راج کو ان کا ماتحت بنائینگے - ہم ہرگز نہ اُن سے کسی رعایت کے خواستگار ہونگے نہ خود کوئی رعایت کرینگے - بلکہ نہایت ہوشیاری و احتیاط کے اُن سے عہدنامہ کرینگے - ہم کو نہ صرف اپنے نقصانات کی تلافی پر مصر ہونا چاہئیے - بلکہ بڑے سیواجی کی فتوحات کرناٹک مین سے جن حصون پر اس وقت انگریز قابض ہین - اُن کو واپس لینے کی بھی کوشش کرنی چاہیئے - ہم اپنی اغراض کو انگریزون کے ہاتھون قربان کئے بغیر اپنے مقاصد کو دہلی مین ضرور حاصل کرلینگے - اگر مرہٹے باہم متحد رہین اور قوت کے ساتھ کام کرین - تو انگریز اپنا اقتدار کبھی دہلی مین قائم نہین کرسکتے"۔

یہ خط غالبًا اوائل ۱۷۸۰ء مین لکھا گیا تھا - بیچارے نانا فرنویس کو کیا خبر تھی ؟ کہ ہندوستانی رئیسون کی یہ غفلت و عیش پسندی اور مرہٹہ سردارون کی تنگ خیالی و خودغرضی کی بدولت انگریزون کی قوت اِس قدر بڑھ جائیگی - کہ بیس سال کے بعد وہ دار السلطنتِ دہلی پر بھی متصرف ہوجائینگے - اور اندھا شہنشاہ اپنے نمک خوار ملازمین کی سازشون اور شرارتون سے تنگ آکر ایسٹ انڈیا کمپنی کی تائید و حمایت کو غنیمت سمجھنے لگیگا - مگر نانا فرنویس کی امیدین مرہٹون کے متحد رہنے اور قوت کے ساتھ کام کرنے پر مبنی تھین اور یہ دونون باتین پُوری نہین ہوسکین - حوصلہ مند مگر ناعاقبت اندیش رگھوبا نے اپنے ہم قومون کو دبانے کے لئے اغیار سے مدد لیکر مرہٹون کے اقتدار کی بنیادون مین سُرنگین لگائین اور اُسکے بیٹے نے حکومت کے شوق مین اُس دانشمند مدبّر کو ناراض و دل شکستہ کردیا - جو اِن سُرنگون کو پھٹنے سے رُوکے ہوئے تھا - جن لوگون نے اِس کام مین اسکو مدد دی - انھون نے اپنی اغراض پوری کرنی چاہین - اور دوسری طرف امیر تیمور کے آخری جانشین اگرچہ نیک دل و رعایا پرور مگر انتہا درجہ کے کاہل و سادہ لوح تھے - جو خود غرض اشخاص کے ہاتھون مین کھیلتے رہے - اِسکا نتیجہ یہ نکلا کہ پُونا مین "وکیل مطلق" (پیشوا) کی مسند خالی ہونے

کے چالیس برس کے اندر دہلی مین تختِ شہنشاہی بھی خالی ہوگیا ؎

گیا حسن خوبانِ دل خواہ کا — ہمیشہ رہے نام اللہ کا

پانی پت کی آخری خونین غذا

انگریزی عملداری کے قیام کے سلسلے مین ایسٹ انڈیا کمپنی کی افواج کی۔جو گورون سے زیادہ ہندوستانی سپاہیون پر مشتمل تھین۔ہندوستان کے رئیسون سے جو لڑائیان ہوئین ان مین پانی پت کے خون آشام میدان کو اُسکی مرغوب خونین غذا نہین ملی۔البتہ سکھون کی لڑائیون کے سلسلے مین انگریزی فوجین اس میدان کے مختلف حصون سے گذرتی رہین۔اور کرنال مین ایک عرصہ تک فوج کی مستقل چھاؤنی بھی رہی جسکی یادگار اس وقت تک "کرنال کے بوٹون" کی شہرت سے قائم ہے۔

فتنۂ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزون نے جب دہلی کو دوبارہ فتح کیا۔تو اس خون آشام میدان کے ایک سرے پر "باؤلی کی سرائے" مین انگریزی فوج کی ایک چھوٹی سی لڑائی "رانگھڑون" سے ہوئی۔اور دہلی سے نکل کر بھاگنے والون کو علاقۂ ہذا کے دیہاتیون نے لوٹا کھسوٹا اور قتل بھی کیا۔اب قریباً ستر سال سے وہ علاقہ انگریزی حکومت کی بدولت مسلسل امن وامان کی برکات سے بہرہ ور رہے جنھون نے اہلِ ملک کے قوائے کو مضمحل کردیا ہے۔اور جن گھرانون کو تہائی صدی قبل تک اپنی دلیری و شجاعت اور فنونِ سپہگری کی مہارت پر ناز تھا۔اُن کی موجودہ نسلین استعمالِ اسلحہ تو درکنار جنگی اصلاحات کو بھی فراموش کرچکی ہین۔اور قلم کو تلوار سے زیادہ طاقتور سمجھتی ہین۔جسکی ایک جنبش اُنکو اُن کی اس آبائی وراثت سے محروم کردیتی ہے جسکو اُنکے اسلاف نے اپنا خون بہا کر حاصل کیا تھا

فاعتبروا یا اولی الابصار!

پانی پت کے خونین میدان کی لڑائیون کے متعلق جدولِ سنین

(۱) مہابھارت (قدیم ہندوستان کی سب سے بڑی جنگ کوروؤن اور پانڈوؤن مین	میدان کوروکشیتر پر	کئی ہزار سال قبل ولادتِ حضرت عیسےٰ
(۲) سلوکس یونانی جرنیل کی آمد	دوآبہ مین	..
(۳) رضیہ سلطانہ کی لڑائی اُمرائے دہلی سے	-	سنہ ۱۲۳۹ء
(۴) نصرت خان بن فیروزشاہ تغلق اور شاہ محمود تغلق کی باہمی معرکہ آرائیان	پانی پت و جھجھر وغیرہ	سنہ ۷۹۸ – ۸۰۰ھ
(۵) امیر تیمور صاحبقران کی پیشقدمی	دہلی پر	سنہ ۸۰۱ھ

(۶) اول جنگ پانی پت" (مابین بابر و سلطان ابراہیم لودی)	میدان پانی پت پر	۱۵۲۶ء
(۷) "دوم جنگ پانی پت" (مابین اکبر اعظم و ہیمو بقال)	"	۱۵۵۶ء
(۸) بندا بیراگی کے ماتحت سکھون کی تاخت	سرہند پر	"
(۹) مغلیہ افسر سلطان قلی خان کے ہاتھون سکھون کی تادیب	پانی پت و سرہند پر	"
(۱۰) نادر شاہ کی چڑھائی اور فوج محمد شاہ سے لڑائی۔	میدان کرنال پر	۱۷۳۵ء
(۱۱) احمد شاہ ابدالی کی چڑھائی اور محمد شاہ سے لڑائی (مغل شہنشاہی کی آخری شاندار فتح)	سرہند پر	۱۷۴۸ء
(۱۲) عماد الملک وزیر کے بلانے سے مرہٹون کی دارالسلطنت پر آمد	قریب دہلی	۱۷۵۳ء
(۱۳) مرہٹون کی سورج مل جاٹ پر چڑھائی	بھرت پور پر	"
(۱۴) مرہٹون کی دارالسلطنت پر نجیب الدولہ کے خلاف یورش	دہلی پر	۱۷۵۷ء
(۱۵) مرہٹون کی یورش پنجاب پر پیشقدمی کے سلسلے مین	سرہند پر	۱۷۵۸ء
(۱۶) احمد شاہ ابدالی کا سرہند کو مرہٹون سے واپس لینا	سرہند پر	۱۷۶۰ء
(۱۷) شاہ ابدالی کا دتا سیندھیا کی فوج کو تباہ کرنا۔	بدراون گھاٹ قریب دہلی	۱۷۶۱ء
(۱۸) بھاؤ کی روانگی مہم ابدالی پر	پٹدور علاقہ اورنگ آباد دکن	۱۴ مارچ ۱۷۶۰ء
(۱۹) بھاؤ کا برہان پور پہنچنا	برہان پور	۴ اپریل ۱۷۶۰ء
(۲۰) بھاؤ کا دریائے نربدا پر پہنچنا	ہنڈیا پر	۱۰ اپریل ۱۷۶۰ء
(۲۱) بھاؤ کا داخلہ وسط ہند راجپوتانہ و بندیلکھنڈ مین	سیہور - بھوپال سرونج - اورچھا	۲۸ اپریل ۱۷۶۰ء
(۲۲) اہیرون کی سرکشی	مقام آرن پر	۱۴ مئی ۱۷۶۰ء
(۲۳) بھاؤ کا دریائے چمبل پر پہنچنا۔	"	۴ جون ۱۷۶۰ء
(۲۴) جنکوجی سیندھیا اور ملہار راؤ ہولکر کا معہ افواج بھاؤ کے لشکر سے آملنا	مکند تیرتھ پر	۶ جولائی ۱۷۶۰ء
(۲۵) بھاؤ کے لشکر کا جمنا پر پہنچنا۔	متھرا پر	۱۲ جولائی ۱۷۶۰ء
(۲۶) بھاؤ کے لشکر کا دارالسلطنت کے سامنے پہنچنا	دہلی	۳۰ جولائی ۱۷۶۰ء
(۲۷) دارالسلطنت مین بھاؤ کا داخلہ	"	یکم اگست ۱۷۶۰ء
(۲۸) بھاؤ کا شاہزادہ جوان بخت ولیعہد کو نیابۃً تخت شہنشاہی پر بٹھانا	"	۱۱ اکتوبر ۱۷۶۰ء

(۲۹) بھاؤ کا کنجپورہ کو چھین لینا	کنجپورہ ضلع کرنال	۱۵-اکتوبر ۱۷۶۰ء
(۳۰) شاہ ابدالی کا جمنا کو عبور کرنا۔	باغپت ضلع میرٹھ پر	۲۵-اکتوبر ۱۷۶۰ء
(۳۱) بھاؤ کا کنجپورہ سے کوچ	گنور ضلع کرنال پر	۲۸-اکتوبر ۱۷۶۰ء
(۳۲) بھاؤ کی گنور سے آمد	پانی پت پر	یکم نومبر ۱۷۶۰ء
(۳۳) مرہٹون کی شاہ ابدالی کے لشکر سے مڈھ بھیڑ	"	۲-نومبر ۱۷۶۰ء
(۳۴) جنکوجی سیندھیا کا نجیب الدولہ پر حملہ	پانی پت پر	۲۳-نومبر ۱۷۶۰ء
(۳۵) مرہٹون اور افغانون کی دوسری لڑائی	"	۷-دسمبر ۱۷۶۰ء
(۳۶) مرہٹون اور افغانون کی تیسری لڑائی	"	۲۲ دسمبر ۱۷۶۰ء
(۳۷) معرکۂ عظیم مابین لشکران مرہٹہ و افغان	"	۱۴-جنوری ۱۷۶۱ء
(۳۸) نارو شنکر کا دار السلطنت کو چھوڑ دینا	دہلی	۱۹-جنوری ۱۷۶۱ء
(۳۹) شاہ ابدالی کا داخلہ دار السلطنت مین	دہلی میں	۲۰-جنوری ۱۷۶۱ء
(۴۰) شاہ ابدالی عازم افغانستان	"	۲۲-مارچ ۱۷۶۱ء

رسید کتب

ڈالی کا جوگ-از مسٹر حامد اللہ افسر بی-اے۔ شائع کردہ (انڈین پریس الہ آباد)

پیام روح - " " " " " " "

بھگوت گیتا (اردو) شائع کردۂ منشی نول کشور پریس بک ڈپو۔ لکھنؤ

پیام محبت-از پروفیسر رام سروپ کوشل۔ قیمت عہ۔ (دیوان چند اینڈ سنس لاہور)

دیوان شوق-از حضرت شوق قدوائی مرحوم- (خان بہادر شیخ رضی الدین احمد بیرسٹر-گونڈہ)

پروازِ خیال-از خواجہ حمید لکھنوی- قیمت عہ

تاریخ حسینی-از پروفیسر آغا مہدی حسن-ایم-اے- (حسینی بک ڈپو-آگرہ)

شاہد معنی-از ماسٹر باسط بسوانی- قیمت- عہ (بسوان ضلع سیتاپور)

ٹیلس آف انڈیا- (ہندوستانی قصے) بزبانِ انگریزی-

انڈین اسٹوری ریڈرس (انگریزی) تین ہم جماعت اسکول کے لڑکے-
شائع کردۂ- میسرس میکملن اینڈ کو لمیٹڈ-

نوٹ اور رائیں

ملک کے نامور اخبار نویس اور ہمارے پرانے عنایت فرما سید جالب صاحب دہلوی کا اہم محققانہ مضمون "پانی پت کا خونین میدان" مسلم ایڈمی لکھنؤ میں ۷ و ۲۴ / دسمبر ۱۹۲۸ء کو پڑھا گیا تھا۔ ناظرین زمانہ کی خوش نصیبی سے سید صاحب نے اس مضمون کو زمانہ میں اشاعت کے لئے عنایت فرمایا ہے مگر اسکا حجم ہمارے اندازہ سے بہت زیادہ ہو گیا اس عالمانہ مضمون میں سید صاحب نے نہ صرف جنگ سوم پانی پت ہی کا مفصل تبصرہ لکھا ہے بلکہ پانی پت اور اسکے گرد و نواح کے علاقہ کی تمام لڑائیوں کا بھی مجملاً تذکرہ کر دیا ہے۔ جس سے اس مضمون کی اہمیت میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے۔ ایسی صورت میں ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ اسکو باقساط درج رسالہ کرکے چار پانچ مہینوں میں ختم کرنے کے بجائے ایک پورا پرچہ اسکے نذر کرکے بقیہ کل مضمون یکمشت شایع کر دیں۔ ہمکو امید ہے کہ اس مضمون کی اہمیت و دلچسپی کے لحاظ سے ناظرین ہمارے فیصلے کو ناپسند نہ فرمائیں گے۔ حصۂ نظم وغیرہ کے شامل نہ ہو سکنے کی وجہ سے اس مرتبہ رسالہ میں جو کمی رہ گئی ہے اسکی ہم انشاء اللہ زمانہ کے آیندہ نمبروں میں بخوبی تلافی کر دینگے۔

افسوس صد افسوس کہ ۱۲/ اپریل کو زمانہ کے خوشنویس منشی محبوب حسن صاحب وارث کا عین عالم شباب میں صرف چند دنوں کی علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ مرحوم سے پہلے زمانہ کی کتابت انکے بھائی منشی اشتیاق حسن صاحب مرحوم کے ذمہ تھی۔ محبوب حسن صاحب نے جب سے کام شروع کیا زیادہ تر دفتر زمانہ ہی میں رہے وہ اپنے متعلقہ خدمات کو ہمیشہ نہایت مستعدی و تندہی سے انجام دیا کرتے تھے۔ انکی بیوقت وفات سے تمام عملۂ دفتر کو دلی صدمہ ہوا ہے، خداوند تعالی مرحوم کو غریق رحمت کرے اور انکے بوڑھے والد اور دیگر اعزا کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

ناگری پرچارنی سبھا بنارس نے حال میں ہندی زبان کا ایک مکمل لغت شایع کیا ہے جسمیں تقریباً چار ہزار صفحات اور ۹۵۰۰۰ الفاظ ہیں۔ اسکے علاوہ ۲۵۰ صفحات میں دیباچہ لکھا گیا ہے جسمیں ہندی زبان کی واجبی تاریخ تحریر کی ہے۔ یہ لغت بیس سال کی مشقت کے بعد طیار ہوا اور اس پر ایک لاکھ دس ہزار روپیہ صرف آیا ہے۔

لوٹو لوٹو ۱۶۱ انعام لوٹو لوٹو

دولت کا خون ہے صرف نام کے لیے

درجن داد کی دوا پر اٹھ قیمتی چیزیں انعام

فیشن ایبل ٹرو وار رسٹ واچ اور پاکٹ واچ بھی انعام ہی تیس شامل ہیں انعام کی چیزوں کو دیکھتے ہی دل پھڑک اٹھیگا

کیسا ہی پرانا داد ہے خراب داد کیوں نہ ہو اس دوا کے لگاتے ہی ۲۴ گھنٹے میں بغیر کسی تکلیف کے جڑ سے مٹا تا ہے۔ داد کی ۱۲ ڈبیوں کی قیمت ۵ روپیہ ہے اور ساتھ میں ۶۱ قیمتی اکسٹھ چیزیں مفت انعام میں داد کی دوا کے ساتھ بھیجی جاتی ہیں



انعام کی چیزیں

۱۔ رسٹ یا پاکٹ واچ ۲ گھڑی کی چین ۳ انگوٹھی ۴ بڑھیا بالوں کی ۵ پھنا - ۶ سوت کا بھا، خوبصورت سیفٹی پن نگینہ کی انگوٹھی ۹ بہت بڑھیا چشمہ ۱۰ خوبصورت چل جیبی ۱۱ بڑھیا عطر کی شیشی ۱۲ خوشبودار صابن ۱۳ بہت بڑھیا تاش ۱۴ فونٹین پن ۱۵ خوبصورت رومال ۱۶ بڑھیا قینچی ۱۷ خوبصورت آئینہ ۱۸ خوبصورت کنگھا ۱۹ سندر کھلونا ۲۰ خوبصورت چاقو ۲۱ خوبصورت جیب جنتری ۲۲ سندر فوٹو ۲۳ بہت بڑھیا کٹے ہوئے کام ۲۴ خوبصورت بال ۲۵ بہت پیارا ۲۶ جرمنی ہارمونیم ۲۷ بڑھیا شیشے کی دوات ۲۸ خوبصورت پنسل ۲۹ بڑھیا پستول ۳۰ تماشہ والا بائسکوپ ۳۱ بہت بڑھیا ربڑ کی گیند ۳۲ خوبصورت منی بیگ ۳۳ بڑھیا چوڑی ۳۴ شیشی ۳۵ خوبصورت بانسری ۳۶ سندر سر میں لگانے کا کانٹا ۳۷ خوبصورت چمچہ ۳۸ چابی ۳۹ مضبوط تالا ۴۰ دودھ پاجامے چھاننے کا آلہ ۴۱ کان سے میل نکالنے کا اوزار ۴۲ خوبصورت گھونگھرو ۴۴ خوبصورت ایر رنگ ۴۵ گولی ۴۶ خوشبودار تیل کی شیشی ۴۷ سندر تماشے کی گیند ۴۸ خوبصورت ناک کا پھول ۴۹ آئینہ ۵۰ مینک سندر ۵۱ عجیب جیبی ۵۲ چابی کا رنگ ۵۳ دانت سے میل نکالنے کا اوزار ۵۴ فاؤنٹین پن قلم کا کلپ ۵۵ چھاتی پر لگانے کا سیفٹی پن ۵۶ نب ۵۷ بلیدار خوبصورت چھلا ۵۸ کلپ ۵۹ حجامت بنانے کا سیفٹی ۶۰ سندر نگینہ ۶۱ بڑھیا گھڑی رسٹ واچ

نوٹ: جن کا پتہ درج نہیں یا خالی چیزوں کا آ چکا ہے ان کو بھی انعام میں اکسٹھ چیزیں دیجائینگی

پتہ: ... ہارمینی ... سٹور روڈ۔ کلکتہ





ملک معظم شاہ جارج پنجم کے تیسرے شاہزادہ
ہز رائل ہائینس ڈیوک آف گلاسٹر

زمانہ

جلد ۵۲ — مئی سنہ ۱۹۲۹ء — نمبر ۵

ماحول اور اُسکا اثر

از مولوی عبد الحق صاحب بی-اے-ایل ایل-بی سب جج اودھ

کارساز فطرت نے اِس دنیائے فانی کو ایسے طریقہ پر مرتب فرمایا ہے کہ موجودات میں سے ہر شئے کا ایک دوسرے سے تعلق اور بیشتر کا ایک دوسرے پر انحصار ہے۔ اگر اس تعلق و انحصار کی حقیقت کی تشریح و تفہیم کی جانب توجہ کیجائے تو معلوم ہوجائیگا کہ کائنات دو حصوں پر منقسم ہے ایک عالم خیال اور دوسرا عالم جسد۔

عالم خیال خیالات کا مشاہدہ ہمارے حواس ظاہری سے بلحاظ ماہیت ایک ناممکن شے ہے۔ انکی نوعیت کا پتہ انسانی اقوال۔ حرکات و اعمال سے چلتا ہے جو انکا ظاہری لباس و نتیجہ ہیں۔ اس مسئلہ سے کسی اہل نظر کو انکار نہیں ہوسکتا کہ ہر خیال اپنے گردوپیش کے خیالات سے متاثر ہوتا ہے۔ درحقیقت خیالات کا وجود ایسے طریقہ سے ظہور پذیر ہوا ہے کہ ایک خیال کا دوسرے خیال سے تعلق لابدی ہے۔

بچہ اپنی پیدایش اور اسکے کچھ دنوں بعد تک حواس خمسہ پر قادر نہیں ہوتا اور اسکی لوح شعور خیالات کے نقوش سے مبرّا ہوتی ہے، البتہ حواس پر قادر ہونیکے بعد اسکو اُن اشیاء کا جو اسکے گردوپیش ہیں احساس ہونے لگتا ہے۔

نفس انسانی کی ترقی کے دوش بدوش قوت امتیازی میں بھی ترقی ہوتی جاتی ہے۔احساسات مختص ہوجاتے ہیں اور اُنکے نام رکھدئے جاتے ہیں۔اِس نام رکھنے کیساتھ ساتھ انکا نقش لوح شعور پر ثبت ہوجاتا ہے اور یہ نقوش خیال کے نام سے منسوب کئے جاتے ہیں۔

وقتاً فوقتاً جو احساسات بچہ کے حواس کے مقابل ہوتے ہیں اُنکا ان خیالات سے مقابلہ کیا جاتا ہے جنکا نقش صفحۂ شعور پر ثبت ہوچکا ہے۔اور چند اصول مثلاً مماثلت۔اختلاف وغیرہ کی تحت میں جانچ ہوجانے کے بعد تجربات کے ذخیرہ میں داخل ہوجاتے ہیں۔یہی عملدرآمد انسانی زندگی میں برابر جاری رہتا ہے۔اس مختصر تمہید سے یہ مسئلہ صاف ہوجاتا ہے کہ ایک خیال کی ابتدائی نوعیت اُن دیگر خیالات کے وجود اور نوعیت پر منحصر ہوتی ہے جو نفس انسانی پر پیشتر سے متمکن ہیں اور جنکی روشنی میں انکی جانچ ہوتی ہے یعنی ہر نیا خیال جو انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے اُن پُرانے خیالات کے رنگ میں رنگ جاتا ہے جو پیشتر سے دل میں جاگزیں ہیں۔یا دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ انسان کی خیالی زندگی کا دارومدار گذشتہ تجربات پر منحصر ہے جس قسم کے تجربے ایک انسان کو ہوچکے ہیں اُسی قسم کا خیال انسان کے دلمیں نئے احساس کے وقوع کے وقت پیدا ہوگا۔یعنی ہر نئے خیال کی نوعیت وتکمیل اُن خیالات کے ماحول پر منحصر ہے جو پیشتر سے انسان کے دل میں جاگزیں ہیں۔اسیطرح جس شخص کے دلمیں کسی دوسرے کی جانب سے بغض ودشمنی وبے اعتباری ہے وہ ہمیشہ اِس کے افعال وحرکات کو دشمنی پر محمول کریگا۔چاہے وہ کتنی ہی نیک نیتی وخیراندیشی سے کیوں نہ کئے جائیں۔ہماری مادر وطن کی شرر انگیز فضا اس امر کا پتہ دیتی ہے کہ گذشتہ قرن میں ہماری تعلیم ونشو ونما نے عالم خیال میں اختلاف دشمنی وبغض کے بیج بو دئے ہیں جو آجکل بار آور ہورہے ہیں اور مختلف صورتوں میں فساد اور بلوے کی شکل اختیار کرکے سرکار اور رہبرمحبان وطن نے بیحد تردد کا باعث ہیں۔ماہرین نفسیات نے شعور انسانی کو ایک تختی بساط سے تشبیہ دی ہے۔یعنی اِس بساط کے دو حصے قرار دئے ہیں،(۱) متن (۲) حاشیہ۔فطرت انسانی کا یہ اقتضا ہے کہ ہر فرد وقوم کی زندگی میں ہر زمانہ میں ایک خاص خیال کی بابت توجہ قائم ہوجاتی ہے۔اور یہ خیال استعارتاً متن شعور پہ متمکن ہوکر دیگر خیالات پر حکمرانی کرتا ہے ہر دوسرا خیال اسکا زیرنگیں ہوکر اسی کے رنگ میں رنگ جاتا ہے اور جملہ حرکات انسانی سے اِس خیال کی جھلک ارباب نظر کو دکھائی دیتی ہے۔ایک دنیادار بندۂ زر ہمیشہ اور ہر وقت پونجی کی فراہمی اور اضافہ میں دن رات مصروف رہتا ہے اور اُسکے ہر فعل سے اِس مقصد کا پتہ چلتا ہے۔ایک دیندار شخص کا مرکزی خیال ونصب العین نجات وبہبود اُخروی ہوتا ہے چنانچہ وہ اِس کے حصول میں شب وروز کوشاں رہتا ہے۔اگر کسی وجہ سے مرکزی خیال اور مقصد اصلی میں تبدیلی واقع ہوتی ہے

تو اسکا طرز عمل بھی تبدیل ہوجاتا ہے۔ اور اسکے اقوال وحرکات اِس تبدیلی کا پتہ دینے لگتے ہیں۔

یہ اصول اقوام کے خیالات اور طرز عمل پر بھی اسی قدر حاوی ہے جتنا کہ افراد پر۔ تاریخ عالم کا سرسری مطالعہ اِس حقیقت کو ثابت کردیگا۔ ملک اسپارٹا و یونان میں حُبِ وطن اور شہری ذمہ داری نے مرکزی خیال بنکر بچوں کی تعلیم و تربیت اور دیگر خیالات قومی پر معتدبہ اثر ڈالا تھا۔ تحفظ وطن کے اغراض کے لیے وہ لوگ بچوں کو انواع واقسام کی سختیاں جھیلنے پر مجبور کرتے تھے تاکہ وہ مضبوط اور جفاکش سپاہی بن سکیں اگرچہ اس کوشش میں بچوں کی کثیر تعداد ضائع ہوجاتی تھی۔ اسیطرح اہل روما کی ترقی کے زمانہ میں بھی انکے سارے خیالات وحرکات شہری ذمہ داری اور وقار قومی کے خیال سے رنگے ہوئے تھے۔

مسلمانوں نے اپنا مرکزی خیال مذہب قرار دیا چنانچہ کھانسنے، چھینکنے، اُٹھنے، بیٹھنے، سونے کھانے، پینے، وغیرہ غرض ہر امر کے واسطے دعا مقرر ہے، جو انکو معبود کی یاد دلاتی ہے۔ قرن اولی کے مسلمان دنیا میں جو کچھ کرتے تھے وہ سب خدا کے واسطے کرتے تھے اور انکا ہر قول و فعل مذہب کے خیال میں رنگا ہوا ہوتا تھا۔ آجکل دنیا کی زندہ اقوام میں ملکی خودمختاری[۵۱] کا نصب العین انکے عالم خیال پر حاوی ہے۔ اور اِن ممالک کے باشندوں کے ہر خیال سے اسکی جھلک نمایاں رہتی ہے۔

اس مختصر تذکرہ سے یہ مسئلہ ثابت ہوتا ہے کہ ہر انسانی خیال خواہ وہ انفرادی ہو یا قومی اُن دیگر خیالات کے ماحول سے جو صفحہ شعور پر متمکن ہوتے ہیں اثر پذیر ہوتا ہے۔

عالم جسد۔ اس عالم کو ہم بنظر تفہیم بحث تین حصوں پر تقسیم کریں گے یعنی۔ عالم جمادات۔ عالم نباتات عالم حیوانات۔

ماہرین علم جمادات شہادت دیتے ہیں کہ زمین اور اسمیں جو کچھ موجود ہے اسکی موجودہ صورت اسکے گذشتہ اور موجودہ ماحول کا نتیجہ ہیں۔ آیندہ بھی ماحول کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ انمیں تغیر واقع ہوتا رہیگا۔ کوئلہ ایک خاص ماحول میں رہنے کے بعد ہیرا بنجاتا ہے۔ مٹی اپنے گرد و پیش کے اثرات سے پتھر اور کنکر کی صورت اختیار کرلیتی ہے اور یہ کنکر پتھر ہی اختلاف ماحول کے ساتھ مختلف شکلوں میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ وقس علی ہذا (ISOMFRISM) اور (ALTROPISM) کے تحت میں جو تحقیقاتیں کی گئی ہیں وہ اس حقیقت کو ثابت کرتی ہیں

TERRITORIAL INDEPENDENCE. ۵۱

بہرحال جو چیزیں زمین کے نیچے ہیں انکا وجود اور صورت انکے ماحول پر منحصر ہے۔

عالم نباتات میں بھی ماحول ہی کا دور دورہ ہے۔ ہر پودا اور درخت اپنا مایحتاج زندگی اپنے گرد وپیش سے جذب کرتا ہے۔ کوئی درخت ایسی زمین و آب و ہوا میں زندہ و سرسبز نہیں رہ سکتا جسمیں اسکی نمو کا سامان نہیں ہے۔ خاص خاص پودے، خاص سرزمین و آب و ہوا میں پرورش پا سکتے ہیں، اگر انکو دوسری جگہ لگا دیجیئے تو ضائع ہوجائیں گے۔ آم انگلستان کی آب و ہوا میں سرسبز و بارآور نہیں ہوسکتا اگر پتھریلی زمین میں بو دیجیئے تو اول تو پودا ضائع ہوجائیگا اور اگر بچ بھی گیا تو اسکے پھل ناقص ہونگے اگر اسکی وجہ پر غور کیجیئے تو ثابت ہوجائیگا کہ ماحول میں اسکی نمو کا سامان نہیں ہے یہ بھی مسلم ہے، کہ ماحول میں تغیر و تبدیلی کر دینے سے پودے کی حالت اور خاصیت میں فرق پیدا ہوجاتا ہے۔ مثلاً وہ پودے جو تاریک کمرہ میں پرورش پاتے ہیں انمیں حصہ یا کلوروفائل (CHLOROPHYLE) کے مادے کی ترقی نہیں ہوتی۔ برخلاف اسکے جنکو کافی روشنی ملتی ہے انمیں یہ خلاف معمول کیفیت نہیں پیدا ہوسکتی۔ اس سے یہ نتیجہ مرتب ہوتا ہے کہ پودوں اور درختوں کی زندگی کا انحصار ماحول پر ہے عالم نباتات کی ساخت جس مادہ سے ہوئی ہے وہ بہ نسبت حجریات و جمادات کے زیادہ تر لطیف و نازک ہوتا ہے اور اسی مناسبت سے اسکا انحصار ماحول پر ہے۔ تھوڑے ہی اختلاف ماحول میں نباتاتی زندگی ضائع ہوجاتی ہے۔ سر جگدیش بوس کی تازہ ترین تحقیقاتوں نے یہ بھی ثابت کردیا ہے کہ درختوں اور پودوں میں ایک حد تک احساس بھی ہوتا ہے اور خوشگوار و تکلیف دہ تہیجات سے اثر قبول کرتے ہیں۔ تہیجات اگر ماحول نہیں تو کیا کہے جاسکتے ہیں۔ حیوانات میں مادۂ تخلیق و نمو بہ نسبت نباتات کے زیادہ لطیف و نازک ہوتا ہے۔ درحقیقت اس مادہ کی تدریجی ترقی کی انتہا حیوانی زندگی ہے، یعنی مادہ تخلیق و نمو عناصر کی آمیزش سے وجود میں آکر عالم جمادات میں اپنا جلوہ دکھاتا ہے۔ اسکے بعد عالم نباتات میں منتقل ہوکر مختلف دلآویز صورتیں اختیار کرتا ہے اور بالآخر عالم حیوانات میں پہونچکر ترقی کی آخری منزل طے کرنیکا ثبوت دیتا ہے اور ہر منزل ترقی میں اسکی صورت و حالت ماحول کے اثرات پر منحصر رہتی ہے۔ حال کے تجربات نے جو نیسی نائٹ قسم کے کیڑوں پر کیئے گئے منتظم طریقہ سے ثابت کردیا ہے کہ ماحول کا اثر انکے جسم و ساخت پر پڑتا ہے اور نوعیت تک تبدیل ہوجاتی ہے۔ تجربہ اس طرح کیا گیا کہ اس قسم کے کیڑے کے نر و مادہ پر انکے مختلف مدارج نمو و ترقی میں غیر معمولی اثرات حدت و برودت وغیرہ کی آزمائش کی گئی، کیڑوں پر بنفسہ کوئی بڑا اثر نمایاں نہوا۔ لیکن انکے بچے بلحاظ رنگ کی لطافت اور خوبصورتی کے ایسی شکلوں میں پیدا ہوئے جو اُس قسم کے کیڑوں سے بالکل جداگانہ تھے۔ اور یہ تغیر

انکی نسل میں قائم رہا۔ اس قسم کے دیگر تجربات اور آئے دن کے مشاہدات سے ثابت ہوتا ہے کہ ارثی خصائل براہ راست ورثا تک نہیں پہونچتے۔ لیکن نظام عصبی کی ترمیم و ترقی جو کسی خاص فن و علم کی ترقی سے علیحدہ ہے اپنا اثر ورثا تک پہونچاتی ہے۔ اور یہ ترمیم بیشتر اوقات مستقلاً جزو وجود بنجاتی ہے۔

ماحول کا اثر دماغ پر اُس سے زیادہ پڑتا ہے، جتنا کہ جسم پر۔ جی ویلس اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:۔

"ہمارا طرز خیال اُسی سے (یعنی ماحول سے) زیادہ متاثر ہوتا ہے بہ نسبت اُسکے جتنا کہ اُس کی اشتہا بالکل اسی طرح جس طرح کہ ہماری اشتہا ہمارے طریق کار اور سانس لینے سے متاثر ہوتی ہے"

رجحانات انسانی کی نمو اور اُن کی زندگی حوالی پر منحصر ہے جیسا کہ بھیڑیے کے بھٹ سے نکلے ہوئے بچوں کی حالت سے ثابت کیا گیا ہے۔ ناموافق حوالی میں انسانیت تک مسخ ہوجاتی ہے۔ خواہ انسان میں کتنی ہی فطری خصوصیات کیوں نہ ہوں۔ ان سب کی ترقی ماحول پر منحصر ہے۔ "جہانتک چند روزہ دورِ حیات میں مسئلہ ترمیم وجود کا تعلق ہے۔ یہ امر یقینی ہے کہ ہر فرد بشر کے واسطے اُسکے معاشرتی حالات فیصلہ کردیتے ہیں کہ اُس کی ذات کے کون سے جزو کو ترقی یا زوال نصیب ہوگا۔ کن اشارات و تحریکات سے اس کے خیالات کو امداد ملے گی۔ اُسکے جذبات کو قوت پہونچے گی۔ اور بالآخر اس کی قوت عمل میں زیادتی ہوگی"

فطرت نے انسان کے دماغ میں چند رجحانات پیدا کردئے ہیں۔ یہ رجحانات جملہ قوائے دماغی کی جڑ کہے جاسکتے ہیں۔ یہی رجحانات ترقی کرکے حواس خمسہ کی صورت اختیار کرلیتے ہیں۔ اگر ماحول میں انکی نمو اور ترقی کا سامان موجود ہے تو یہ سرسبز اور بارآور ہونگے ورنہ ضائع ہوجائیں گے۔ مثلاً قوت نطق کے رجحان کے بارآور ہونیکا وقت عموماً بچے کی عمر کا دوسرا تیسرا اور چوتھا سال ہے اگر بچہ کے گرد و پیش کے حالات میں اس قوت کی نمو کا مادہ موجود ہے تو بات چیت کرنے پر قادر ہوجائیگا اور اگر یہ مفقود ہے تو ساری عمر گونگا رہیگا۔ قوت نطق کے بارآور ہونیکے بعد یہ ممکن ہوجاتا ہے کہ جو زبان مقصود ہو بچہ کو سکھلا لیجئے۔ لیکن اگر رجحان نطق اختلاف ماحول کیوجہ سے ضائع ہوگیا ہے تو پھر نہ وہ کبھی گفتگو کرسکے گا اور نہ کوئی دوسری زبان سیکھ سکے گا۔ اس حقیقت کا ثبوت ان تجربوں سے ہوتا ہے جو بھیڑیے کے بھٹ سے نکلے ہوئے بچوں کے ساتھ مختلف اوقات میں کئے گئے ہیں۔ ۱۵۴۴ء سے اب تک یورپ میں دس بچے بھیڑیے کے بھٹ سے نکالے گئے انمیں دو لڑکیاں اور آٹھ لڑکے تھے۔ انکی تعلیم کی بہت زیادہ کوشش کی گئی لیکن بالکل بے نتیجہ ثابت ہوئی اور گفتگو کرنے سے وہ مدت العمر قاصر رہے۔ ہندوستان میں بھی بارہا تجربے کئے گئے لیکن کسی قسم کی کوشش کامیاب نہو سکی۔ ۱۸۷۲ء میں پروفیسر

ویلنٹائن ہال[1] نے سکندرہ ضلع آگرہ کے مشنری یتیم خانہ میں ایک بھیڑیئے کے پالے ہوئے بچہ کو دیکھا۔ اسکا نام سنیچار تھا۔ اسکی عمر ۱۵ سال کی تھی۔ بلند شہر کے قریب کے جنگل میں چند ہندوستانیوں نے اس کو پکڑ کر ہ۔ فروری ۱۸۶۷ء کو یتیم خانہ میں بھیجدیا تھا۔ پکڑے جانے کے ایک مدت بعد تک وہ چوپایوں کی طرح دونوں ہاتھوں اور دونوں پیروں پر چلا کیا۔ بہت دقت سے کھڑے ہو کر چلنا سیکھا اور ہمیں بھی ایک خاص قسم کی لغزش جو وقت کو ظاہر کرتی تھی نمایاں تھی۔ آنکھوں میں ایک خاص قسم کی روشنی اور وحشت قائم رہی وہ ساری عمر بات چیت نہ کر سکا اور باوجود کوشش بلیغ کے مدت العمر انسانیت سے عاری رہا آخر ۱۸۹۶ء میں مرگیا۔ بعینہ یہی حالت دیگر رجحانات دماغی اور احساسات کی ہے۔ اگر مقررہ وقت پر ماحول سے انکو نمو اور بالیدگی میں امداد نہ ملسکی تو وہ رجحان غائب ہو جائیگا۔ اس مختصر بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں انسانیت نے جو صورت اختیار کی ہے وہ محض ماحول کا نتیجہ ہے۔

اس موقع پر اس مسئلہ کی توضیح بھی بے محل نہوگی کہ انسان دنیا میں ایک فطرت لیکر پیدا ہوتا ہے ماحول اس فطرت کو مختلف صورتیں اختیار کرنے میں امداد دیتا اور ایک حد تک ایک خاص شکل قبول کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ یعنی موجودہ وجود انسانی فطرت اور ماحول کا نتیجہ ہے۔

حکما اور علما نے اس مسئلہ کی تحقیقات میں بہت وقت صرف کیا ہے کہ وجود انسانی کے واسطے ان دونوں اجزا میں سے کون جزو زیادہ ضروری ہے۔ اس تحقیقات کے سلسلہ میں دو گروہ قائم ہوگئے ہیں۔ ایک وہ جو فطرت انسانی کو بمقابلہ ماحول کے زیادہ ضروری سمجھتے ہیں اور دوسرے ماحول کو فطرت انسانی پر ترجیح دیتے ہیں۔ اوّل الذکر نقطہ خیال کے دلدادہ لیمارک (LEMARK) کو اپنا سرگروہ مانتے ہیں اس جماعت میں کارل پیرسن (KARLPEARSON) پیونٹ (PUNET) اور دیگر حکما کے نام پائے جاتے ہیں۔ آخر الذکر میں لیبنز (LIEBNETZ) اور ہلوشینس جیسے مقتدر علما شامل ہیں۔

ڈی رائز (DE VRIES) کا رسالہ موسومہ میوٹیشن تھیوری (MUTATION THEORY) اس موضوع پر قابل مطالعہ ہے اسمیں اس مسئلہ کے ثابت کرنیکی کوشش کی گئی ہے کہ ماحول کا اثر اختلافات (VARIETIES) تک محدود رہتا ہے۔ نفس وجود تبدیل نہیں کر سکتا۔

اس امر کا فیصلہ کہ متذکرہ بالا حکما میں سے کس گروہ کی رائے زیادہ وقیع ہے ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ہماری بحث کے واسطے یہ کافی ہے کہ دونوں گروہ ماحول کے اہمیت پر متفق ہیں اور انسانی زندگی کی موجودہ صورت کو ماحول کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

---

[1] VALENTINE HALL

اس دارِ فانی کے دونوں اجزا یعنی عالمِ خیال اور عالمِ جسد کی انفرادی بحث کے بعد یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں عالموں کے تعلق پر بھی سرسری نظر ڈالی جائے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ دنیا ان دونوں عالموں کے اجتماع کا نام ہے بنظر تفہیم و بحث اسکو دو اجزا میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ یہ دونوں اجزا درحقیقت مختلف النوع ہیں۔ خیال کی ماہیت کے متعلق ہمکو صرف اسقدر علم ہے کہ ماحول میں خاص قسم کی حرکت و تلاطم کا اثر ہمارے مراکز دماغی پر پڑتا ہے۔ جو عالم شعور میں منتقل ہوکر نفسِ انسان کے علم و آگاہی کا باعث ہوتا ہے اسکے یہ معنی ہیں کہ حرکت و عمل خواہ وہ ہمارے وجود میں ہو یا خارجی دنیا میں ان دونوں عالموں میں بذریعہ اتحاد و ارتباط ہے۔ اس سے کوئی اہل نظر انکار نہیں کرسکتا کہ خیالات ارادی اعمال کی جڑ ہیں۔ اور عمل خیالات پر اپنا معتد بہ اثر ڈالتا ہے درحقیقت خیالات و عمل ایک دوسرے پر لازم و ملزوم ہیں۔ اس موقع پر یہ عرض کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ تمدن کی ترقی اور طرزِ معاشرت کے اثرات کی وجہ سے خیالات اور ظاہری اعمال میں ایک قسم کا اختلاف و تبائن پیدا ہو گیا ہے۔ اور آجکل کی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے محض اعمال سے اصلی خیالات کا پتہ لگانیکی کوشش نہایت درجہ مخدوش اور بیشتر اوقات بلانتیجہ ثابت ہوگی اسکی یہ وجہ نہیں ہے کہ خیالات و عمل کے فطرتی تعلق میں کسی قسم کا فرق واقع ہو گیا ہے یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم اور عمل پیرا ہے۔ صرف فرق ہمارے سمجھنے میں ہے۔ فی زمانہ اصلی خیالات جو اعمال کی بنا ہوتے ہیں پوشیدہ رکھے جاتے ہیں اور دیگر خیالات کا اظہار کر کے عوام کو غلط تلقین دلانیکی کوشش کیجاتی ہے۔ یہ نفاق و دو رنگی ایک حد تک ہماری پستی کا باعث ہے۔ علاوہ بریں ہمارے ملک میں جو افراط و تفریط کا مسکن ہے عرصہ دراز سے یہ رائے قائم ہو گئی ہے کہ خیالات بلا عمل کی امداد کے خارجی دنیا پر اپنا اثر ڈالکر معاملات کو ایک خاص صورت اختیار کرنے پر مجبور کر سکتے ہاں سینکڑوں بلکہ ہزاروں مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں جہاں محض جھاڑ پھونک گنڈے تعویذوں سے امراض کے علاج کئے جاتے ہیں یا پیچیدہ معاملات کو سلجھانے اور مصیبتوں کو رفع کرنے کے لئے محض وظائف و دعا پر انحصار کیا جاتا ہے۔ اعتقادات و خیالات کے رسوخ کے اثر سے کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا، لیکن عمل سے کنارہ کشی کر کے محض دعا پر سراسر کا انحصار کرنا بھی لاحاصل ہے۔ ہندوستانیوں کے ہر طبقہ میں ایسے انسان کثیر تعداد میں ملیں گے جو دعا کو عملی تدابیر اور کوشش پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ یقین و اعتقاد اس حد تک پہونچ گیا ہے کہ جسپر دوسرے ملک والے بسا اوقات جائز طور پر مضحکہ اُڑاتے ہیں۔ اس موقع پر ایک واقعہ کا تذکرہ خالی از

لطف ہوگا۔ راقم الحروف نے ایک صبح ایک سن رسیدہ بزرگ کو نہایت ناراض و بیزار دیکھا۔ وہ اپنی چارپائی نہایت بیرحمی کے ساتھ زمین پر دے دے مار رہے تھے۔ انکی پریشانی اور طرز عمل نے وجہ دریافت کرنے پر مجبور کیا۔ جواب میں فرمایا۔ "کھٹملوں نے زندگی وبال کردی۔ اب ظالموں کی شورہ پشتی یہانتک بڑھ گئی ہے کہ کسی تدبیر کو خاطر میں نہیں لاتے۔ باوجودیکہ گذشتہ شب کو چارپائیوں میں تعویذ باندھ دیئے تھے کہ انکے دانت کھٹے ہوجائیں اور مجھے چین لینے دیں لیکن کمبختوں پر مطلق اثر نہوا اور مجھے ساری رات بیٹھے گذری۔"

ناظرین اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس جواب کا مجھ پر کیا اثر ہوا ہوگا۔ تہذیب نے مجھے قہقہ سے روکدیا لیکن میری خاموشی زبان حال سے کچھ کہہ رہی تھی۔ میری جانب تکنے لگے۔ اور خندہ زیر لب کا احساس کرکے برافروختہ ہوگئے۔ فرمانے لگے "میاں صاحبزادے جب ایمان میں گھن لگ جاتا ہے متبرک اسمار اور کلام کی جانب سے بےاعتقادی اور بزرگوں سے تمسخر کا شوق پیدا ہوتا ہے"۔ بحث بیکار سمجھکر میں نے زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔

اسی طرح میری طالبعلمی کے زمانہ میں ایک بزرگ پنڈت میرے یہاں اکثر تشریف لایا کرتے تھے اور کبھی کبھی میں انکی خطوط نویسی کی خدمت انجام دیدیتا تھا۔ سنسکرت کے تبحر علمی کی وجہ سے ہندوستانی سوسائٹی میں بہت قدر کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ آپکو یقین واثق تھا۔ وہ منتروں کے زور سے جب چاہیں پانی برسا سکتے ہیں۔ چنانچہ اُنھوں نے قریب قریب ہر دیسی دربار میں رجسٹری شدہ عرضداشتوں کے ذریعہ سے اطلاع دی تھی کہ وہ قحط باراں کی مصیبت کو آسانی سے رفع کرسکتے ہیں رجسٹری شدہ خطوط کی رسیدیں کم و بیش پانچسو اُنکے پاس تھیں۔ بہت سی ریاستوں نے جواب بھی دیئے تھے اور دو ایک نے امتحان کے واسطے تاریخیں بھی مقرر کی تھیں۔ دو ایک جگہ یہ بھی ہوا تھا کہ تاریخ مقررہ پر تھوڑا اثر شیح ہوگیا۔ باوجودیکہ وہاں کے لوگوں کا پنڈت جی کے دعوے کے وثوق کے متعلق اطمینان نہوا تھا لیکن پنڈت صاحب اسکو کافی ثبوت ملنتے تھے اور زمانہ کی ناقدری سے ازحد نالاں تھے۔ بالآخر گورنمنٹ ہند کی توجہ چند ہندو ممبران کے اصرار پر اس جانب مائل ہوئی۔ امتحان کے واسطے ایک ایسی تاریخ مقرر ہوئی جسکے متعلق سرکاری ماہرین فن نے مختلف آلہ جات کے ذریعہ سے اِس امر کا اطمینان کرلیا تھا کہ کرۂ ہوا میں کسی قسم کی نمی نہیں ہے۔ پنڈت جی اور انکے رفقار پوجا پاٹھ اور منتر کی جاپ کے لئے اُنھوں نے مقرر کئے تھے دو روز و شب بجد کوشاں رہے۔ لیکن پانی برسنا تو درکنار ابر تک نہ نمودار ہوا۔ اس تجربے نے انکی کوشش اور آیندہ زندگی پر ایسا شدید

اثر ڈالا کہ وہ اپنے وطن چلے گئے اور نہ معلوم ہو سکا کہ اُنکا کیا حشر ہوا۔

اس قسم کی کثیر مثالیں کم و بیش زندگی کے ہر شعبے اور ہندوستانی سوسائٹی کے ہر طبقہ میں ملیں گی ہن لقین کا مضعف اثر جو قوم کی قوت عمل پر پڑا ہے اسکا اندازہ کرنا محال ہے۔

آجکل مغربی تمدن کے اختلاط سے اوہام پرستی کسی قدر کم ہو چلی ہے لیکن یہ ہماری کسی کوشش کا نتیجہ نہیں ہے۔ ہملوگوں کو محسوس کرنا چاہئے کہ قوت عمل سے محرومی ہماری پستی و ناکامی کی ذمہ دار ہے اب بفضلہ تعلیم یافتہ حضرات کی تعداد ہم لوگوں میں کافی ہے لیکن اسمیں کتنے کام کرنے والے ہیں؟ اسکا جواب ناظرین پر چھوڑا جاتا ہے۔ کوئی قومی کام استقلال عمل کے غائب ہونیکی وجہسے پورا نہیں ہو سکتا۔ اور وہ چند نفوس جو قومی ترقی کے واسطے کوشاں ہیں آئے دن کام کرنیوالوں کے قحط کی وجہ سے پریشان رہتے ہیں۔ اگر قوت عمل کے فعل کی تشریح کیجائے تو ظاہر ہو جائیگا۔ کہ اسکا کام اُس ماحول و اسباب کو پیدا کرتا ہے کہ جن سے ایک خاص نتیجہ برآمد ہو سکے۔ اگر قوت عمل کی امداد سے ضروری ماحول پیدا کر دیا جائیگا تو نتیجہ حسب بخواہ پیدا ہونا لازمی ہے۔ اگر ابتک ہم اپنے مطالب میں ناکامیاب رہے ہیں تو اُسکے وجوہات ماحول میں تلاش کرنا چاہئے۔ اور تدابیر میں نقص معلوم کرنیکے بعد اُنکے رفع کرنے کی کوشش ہونا چاہئے۔

اِس مسئلہ کے ثابت ہو جانیکے بعد کہ جملہ موجودات دنیا عام اس سے کہ انکا تعلق عالم خیال سے ہو یا عالم جسد سے اپنی ہیئت اور وجود کے واسطے ماحول کی محتاج ہیں یہ امر قابل غور پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہم ہندوستانیوں نے عصبیت اور قومیت کا ایسا ماحول پیدا کر لیا ہے یا نہیں جسمیں سوراج وجود میں آسکے یا سرسبز و شاداب رہ سکے۔ اسکا جواب ناظرین پر چھوڑا جاتا ہے۔ خاکسار کی رائے ناقص میں سوراج اِس نوعیت کی شے نہیں ہے کہ جسکو کوئی گورنمنٹ کسی قوم کو تحفتہً دیسکے۔ فضا میں کیفیت پیدا ہو جانے کے بعد سوراج خود بخود ظہور پذیر ہو جائیگا اور کوئی گورنمنٹ چاہے وہ کتنی ہی مضبوط اور طاقتور کیوں نہو اُسکے وجود کو معدوم کرنے سے قاصر رہیگی۔ راقم الحروف کی رائے میں چند اُمور ایسے ہیں جنکے متعلق ماحول کی ترمیم نہایت ضروری ہے۔ اور بغیر اِس ترمیم کے کسی قسم کی کامیابی دشوار ہے۔ امور مذکور بغرض غور و اصلاح و عمل پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱) رائے عامہ میں اِس حقیقت کی تبلیغ ہونا چاہئے۔ کہ بہبود و فلاح وطن ہر فرد کا اعلیٰ ترین فرض ہے۔ جس پر جملہ فوائد دنیوی و اُخروی بلا حجت قربان ہونا لازمی و ضروری ہیں۔

(۲) مذہب جسکا نصب العین تزکیہ نفس شخصی و فلاح دنیوی اور اُخروی ہے اسکو قومی فلاح

کا سد راہ ہونا چاہئے۔ اور وہ جملہ مراسم جو قومی تفرقہ کا باعث ہیں انکو بکقلم بند ہو جانا چاہئے
ہر شخص کا یہ اعتقاد ہونا چاہئے کہ وہ ہندوستانی ہے۔ اور اسکے بعد ہندو مسلمان، یا
عیسائی۔ مذہبی خیالات کو قومی مفاد کے معاملہ میں ہمیشہ پس پشت ڈالنا چاہئے۔

(۳) جو حضرات مذہبی اور اعتقادی لحاظ سے نہایت سخت ہیں انکو اپنی رائے ترمیم کرنا چاہئے
اور اگر وہ اسکے ناقابل ہیں تو قومی معاملات سے انکو علیحدہ رکھنا چاہئے۔

(۴) ایک قومی مشن قائم ہونا چاہئے جو ہر شہر و قریہ میں اس خیال کی تبلیغ کرے اور اسکا نظام عمل
حقیقی اصول پر قائم کیا جائے۔

(۵) چھوت چھات سے یکقلم کنارہ کشی کیجائے اور کھانا، پینا، نشست و برخاست۔ شادی بیاہ، بلا
قیود مذہب و ملت جاری کیا جائے۔

(۶) ہر ہندوستانی کو خواہ وہ کسی ذات کا ہو مساوی حقوق کا مستحق قرار پانا چاہئے۔ بغیر اس مسئلہ
کے عملاً تسلیم کئے ہوئے ہندوستانیوں کو کوئی استحقاق گورنمنٹ سے حقوق طلبی کا پیدا نہیں ہوتا

(۷) ایک قومی زبان کی داغ بیل پڑنا چاہئے۔ جو سارے ہندوستان میں رائج ہو۔ اسکی اہمیت سے
کوئی اہل نظر انکار نہیں کرسکتا۔ قومی زبان کا مسئلہ بھی باعث نزاع ہے۔ مسلمان اردو طرز تحریر کے
حامی ہیں۔ ہندو ہندی بھاشا کے دلدادہ ہیں۔ ہر فریق اپنی رائے کی تائید میں لڑنے اور مرنے پر
طیار ہے۔ اس مسئلہ پر دونوں فریقوں کا متفق ہونا محال معلوم ہوتا ہے۔ گذشتہ صدی کے آخری
حصہ اور اس صدی کے شروع میں جو شور و شغب اس مسئلہ پر ہوا تھا اُسکو فراموش کرنا دانشمندی
سے بعید ہے۔ باوجودیکہ ایک قرن کی مدت گذر چکی ہے لیکن ہر دو فریق کا اس مسئلہ پر متفق
ہونا غیر ممکن معلوم ہوتا ہے۔ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ اختلاف کے خیالات زیادہ مستحکم ہوتے
جاتے ہیں اور چند روز کے بعد یہ بھی غیر ممکن ہو جائیگا کہ کوئی دوسرا طرز تحریر اختیار کیا جاسکے۔
اس سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ اردو، ہندی زبانیں اپنے اپنے طریقہ خیال اور اپنے
اپنے تمدن کی ترجمان ہیں۔ مختلف زبانوں کے رواج و استحکام کی کوشش درحقیقت مختلف
قسم کے تمدنوں کی ترقی کی کوشش اور مختلف فرقوں کے قیام کی سعی ہے۔ اگر ان حضرات کو اپنی
کوششوں میں خدانخواستہ کامیابی ہوئی تو قیامت تک اسکا اثر زائل نہ ہوسکیگا۔ اور جو صورت
یونانیوں اور بلغاریوں میں باوجود ہم مذہب ہونیکے قائم ہوگئی ہے، ہمارے وطن میں بھی مستحکم
ہو جائے گی۔ اور آئے دن کے جھگڑے اور مناقشے ہمیشہ جاری رہینگے۔ وطن پرستان اور قوم

سازان کا فرض ہے کہ ایک جدید طرز تحریر کے رواج دینے کی جسقدر جلد ممکن ہوسکے تدبیر کریں۔ ممکن ہے کہ رومن طرز تحریر کی مخالفت اُس شد و مد کے ساتھ نہ ہو جتنی کہ اُردو یا ہندی کے رواج دینے میں ہوگی۔

(۸) علی گڈھ مسلم یونیورسٹی اور بنارس ہندو یونیورسٹی درحقیقت اتحاد قومی کی جڑ کاٹنے اور دو مختلف النوع تمدنوں کی تبلیغ و اشاعت میں کوشاں ہیں۔ انکا موجودہ دستور العمل اور نیز طرز عمل ہندوستانی قومیت کے رونما ہونے میں سد راہ ہوگا۔ نان کواپریشن کے زمانہ میں دونوں دار العلوموں کو نقصان پہونچانیکی مُضر کوشش کیگئی تھی لیکن الحمدللہ کہ ناکامیاب رہی۔ انکو برباد کر کے نئی عمارت انکی جگہ بنانے کی اُمید ہندوستان کے لئے از حد مضر اور ناقابل عمل ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان دار العلوموں کے نصاب کو یکساں کر کے قومی اتحاد کا بیج بو دیا جائے۔ اور دونوں ایک حکمراں بورڈ کے ماتحت کر دیے جائیں۔ پروفیسروں اور طالبعلموں کا تبادلہ ایک یونیورسٹی سے دوسری یونیورسٹی میں ہوتا رہے۔ تاکہ ہندوستانی بچے ایک ہی فضا اور ماحول میں تربیت پائیں اور باہمی علیحدگی سے جو بیگانگی پیدا ہوتی ہے اُس سے محفوظ رہیں۔

(۹) پیکٹ اور صلحنامو نکے ذریعہ سے دو مختلف اقوام و افراد کے نفاق و دشمنی بیشک دور کئے جاسکتے ہیں لیکن یہ تدابیر انکی انفرادی حیثیت کو زیادہ واضح کر کے قومی تفرقہ کی بنا ڈالتی ہیں۔ قومی خیال اور قومی یکجہتی کی افزائش کو ان سے مدد نہیں ملسکتی۔ ایسے مواقع کہ جنمیں صلحناموں کے ذریعہ سے اختلافات دور کئے جائیں روز بروز زیادہ ہوتے جائیں گے۔ ضرورت اسکی ہے کہ جملہ فرقہ جات عصبیت کو مد نظر رکھ کر محبت کو نصب العین قرار دیں۔ یہ آپس کے نشست و برخاست آمد و رفت میل جول ہی سے پیدا ہوسکتی ہے۔ اِسکا دوسرا علاج محال ہے۔

راست میگویم واز گفتۂ خود دلشادم
بندۂ عشقم واز ہر دو جہاں آزادم

اسلامی سلطنتوں کا عروج وزوال

(از مولانا سعید انصاری سابق رفیق دارالمصنفین اعظم گڈھ)

فلسفۂ تاریخ کے علماء نے عروج وزوال اقوام پر جو کتابین تصنیف کی ہین، اُن سے دنیا کی تمدنی تاریخ کے تمام رازہائے سربستہ بے نقاب ہوگئے ہین، اُن کو پڑھکر معلوم ہو سکتا ہے کہ کسی خاص تمدن، خاص قوم یا خاص سلطنت کی ترقی وتنزل کے کیا اسباب ہوتے ہین؟ اور وہ کون سی اخلاقی خصوصیات ہین جو ان اسباب کے پیدا ہونے کی علت بنتی ہین؟ لیکن ان کتابون کے مطالعہ سے یہ نہین معلوم ہو سکتا کہ سلطنتین کیونکر بنتی اور بگڑتی ہین؟ اور اُنکے قیام وبقاء اور زوال وفنا کی کیا صورت ہوتی ہے؟

ہم اس مضمون مین اسی نکتہ کو بیان کرنا چاہتے ہین، عام قاعدہ یہ ہے کہ پہلے ایک سلطنت قائم ہوتی ہے، پھر رفتہ رفتہ وسعت حاصل کرتی ہے، پھر جب منتہائے عروج کو پہنچتی ہے تو خانہ جنگی شروع ہو جاتی ہے، اسی زمانے مین محکوم قومین اُسکی کمزوری سے فائدہ اُٹھاتی ہین، اور اُنکو آزادی کا خواب نظر آتا ہے چنانچہ وہ اُٹھتی ہین اور اپنی حکومتین قائم کرتی جاتی ہین جب ان چھوٹی چھوٹی طاقتون کو غلبہ حاصل ہو جاتا ہے تو وہ بڑی سلطنت فنا ہو جاتی ہے، اب ان جدید طاقتون مین کشمکش شروع ہوتی ہے، جو طاقت غالب آتی ہے وہ دوسرون کو مغلوب کرکے اُنکی حکومتون کو اپنے قلمرو مین شامل کرلیتی ہے، اور پھر آگے چل کر بڑی مستحکم سلطنت بنجاتی ہے۔ یہ سلسلہ برابر اسی طرح چلتا رہتا ہے۔ بقائے اصلح کا یہی قانون ہے جو حکومتون اور سلطنتون مین بھی جاری وساری ہے۔

اسلام مین جو سلطنتین قائم ہوئین وہ اسی قانون کا مظہر اتم تھین۔ اسلام مین خلافت وحکومت کی داغ بیل عہد رسالت مین ڈالی گئی، رسول مقبول نے عرب کی اُن اقوام کو جو بلحاظ نسل، قومیت، مذہب، عقائد، اور خیالات بالکل مختلف تھین، اتفاق واتحاد کے سر رشتہ مین منسلک کردیا، اور جب اُنکی شیرازہ بندی ہوگئی تو خلافت الٰہی کی بنیاد قائم کی، آپ کے بعد آپکے جانشینون نے ریگستان عرب سے نکل کر شام وعراق کے سبزہ زارون مین قدم رکھا، تیرہ سال کی مدت مین تائید غیبی نے

کسریٰ و قیصر کے تاج و تخت اُنکے قدمون پر لاکر ڈال دیئے۔ اور پینتیس[35] برس کے اندر اندر اُنکی فتوحات کا سیلاب کابل اور ترکستان کے پہاڑون سے بلند ہوکر بحر اوقیانوس مین جا کر ِل گیا۔

بنو امیہ کے عہد مین یہ حدود اور وسیع ہوئین، اور اُنکی فاتحانہ حوصلہ مندیون نے اسپین سے لیکر دیوار چین تک، یورپ، ایشیا، اور افریقہ کا چپہ چپہ چھان ڈالا، آلِ عباس نے گرچہ علوم و فنون کے مقابلے مین ملک گیری کی طرف زیادہ توجہ نہین کی، تاہم خلافت کی حدود کو علیٰ حالہا باقی رکھا، اور اہل عرب کی حکومت نہایت جاہ و جلال کے ساتھ قائم رہی۔ بااینہمہ خلافتِ اسلامیہ کا شیرازہ بھی اسی زمانے مین منتشر ہوا، چنانچہ سنہ ۱۳۹ھ مین بنو امیہ نے اسپین جاکر ایک حکومت قائم کی، جو خلافتِ عباسیہ کے اثر سے بالکل آزاد تھی، امیہ اسپین کے بعد سنہ ۱۷۲ھ مین مراکش مین ادارسہ نے، سنہ ۱۸۴ھ مین ٹیونس مین اغالبہ نے، سنہ ۲۰۵ھ مین خراسان مین آل طاہر نے، سنہ ۲۵۰ھ مین طبرستان مین علویہ نے، سنہ ۲۵۴ھ مین سیستان مین صفار نے، سنہ ۲۵۴ھ مین مصر مین طولون نے، سنہ ۲۶۱ھ مین ماوراء النہر مین آل سامان نے، سنہ ۲۹۶ھ مین مصر و مغرب مین فاطمیہ نے، سنہ ۳۲۳ھ مین مصر مین اخشید نے، سنہ ۳۳۰ھ مین کردستان مین حسنی اکراد نے، اور سنہ ۵۹۰ھ مین ایران مین مغلون نے بڑی عظیم الشان حکومتین قائم کین، اور خلافتِ عباسیہ، عرب، ایران، ترک اور کرد حکومتون کے قالب مین منتقل ہوگئی،

خلافتِ عباسیہ کی پہلی شاخ اسپین مین علیحدہ ہوئی تھی، جو بڑی باجبروت حکومت تھی، وہ سنہ ۴۲۲ھ تک قائم رہی، اور جب اُس پر زوال طاری ہوا تو ہر طرف طوائف الملوکی پھیل گئی، چنانچہ سنہ ۴۰۳ھ مین زیریہ، سنہ ۴۰۳ھ مین عامریہ نمبر ۱، سنہ ۴۰۷ھ مین حمودیہ، سنہ ۴۱۰ھ مین ہودیہ، سنہ ۴۱۲ھ مین عامریہ نمبر ۲، سنہ ۴۱۳ھ مین ابن افطس، سنہ ۴۲۲ھ مین جہوریہ، سنہ ۴۲۷ھ مین ذی النون کے نام سے مختلف ریاستین قائم ہوئین،

زیریہ سے سنہ ۴۱۴ھ مین عبادیہ حکومت پیدا ہوئی، ان تمام ریاستون پر موحدین نے قبضہ کیا، موحدین کے بعد سنہ ۶۲۹ھ مین نصریہ احمریہ کے نام سے سلطنت قائم ہوئی، جو آخری سلطنت تھی،

خلافتِ عباسیہ کی دوسری شاخ سامانیہ سے ایشیا کی تمام سلطنتین متفرع ہوئین، چنانچہ سنہ ۳۱۶ھ مین زیاریہ، سنہ ۳۶۶ھ مین غزنویہ، سنہ ۳۸۳ھ مین ایلکیہ حکومت کی بنیاد پڑی،

زیاریہ دیلمی حکومت تھی اِس لئے اُس سے سنہ ۳۲۱ھ مین آلِ بویہ کا سلسلہ پیدا ہوا، جو بلحاظ رقبہ کے سب سے بڑی دیلمی حکومت سمجھی جاتی ہے، آلِ بویہ سے سنہ ۳۹۸ھ مین کرزیہ، سنہ ۳۳۰ھ مین مسافریہ،

۳۳۸ھ مین شاہینیہ، ۳۱۶ھ مین مردانیہ، کے ٹکڑے علیٰحدہ ہوئے، اور ان کی علیحدگی سے آلِ بویہ کا خاتمہ ہوگیا،

غزنویہ سے جو نہایت عظیم الشان سلطنت تھی، اور افغانستان و ہندوستان تک پھیلی ہوئی تھی، دو بڑی باجبروت حکومتین پیدا ہوئین یعنی ۴۲۹ھ مین ایران مین سلجوقیہ، اور ۵۴۳ھ مین ہندوستان و افغانستان مین غوریہ،

سلجوقیہ سے ۴۷۰ھ مین سلاجقۂ روم، ۴۹۷ھ مین بوریہ، ۴۹۵ھ مین ارتقیہ، ۵۰۲ھ مین شاہات، ۵۲۱ھ مین زنگیہ، ۴۷۰ھ مین خوارزمیہ ایران کی سلطنتین قائم ہوئین،

سلاجقۂ روم سے ۶۹۹ھ مین سلطنتِ عثمانیہ پیدا ہوئی، جس نے آگے چل کر خلافت کا منصب حاصل کیا۔ اُس سے ۱۱۱۷ھ مین حسینیۂ ٹیونس، ۱۲۲۰ھ مین محمدیہ علویۂ مصر، اور ادھر چند سال کے اندر اسدیہ البانیا، شریفیہ حسینیۂ مکہ معظمہ، اور کمالیۂ انگورہ کی حکومتین علیٰحدہ ہوئین، محمدیہ علویہ سے ۱۲۹۷ھ مین درادیش سوڈان کی حکومت متفرع ہوئی، جسکا ایک مشہور فرمانروا مہدی تھا،

زنگیہ سے جو شام اور الجزیرہ مین واقع تھی، ۵۶۷ھ مین حکومتِ ایوبیہ قائم ہوئی، ایوبیہ سے ۶۴۸ھ مین ممالیک کا خاندان عالمِ وجود مین آیا،

غزنویہ کی دوسری شاخ غوریہ سے ۶۰۲ھ مین ہندوستان مین ایبکیہ سلطنت قائم ہوئی، ایبکیہ سے ۶۸۹ھ مین خلجیہ، خلجیہ سے ۷۲۰ھ مین تغلقیہ حکومت پیدا ہوئی، تغلقیہ سے متعدد حکومتون کی بنیاد پڑی، چنانچہ ۷۳۹ھ مین فخریۂ بنگال و بہار، ۷۴۸ھ مین بہمنیۂ گلبرگہ، ۷۹۶ھ مین شرقیۂ جونپور، ۷۹۹ھ مین مظفریۂ گجرات، ۸۱۷ھ مین ساداتِ دہلی، اور راجہ شاہیۂ خاندیس، ۸۰۳ھ مین غوریۂ مالویہ کا سنگِ بنیاد رکھا گیا،

بہمنیہ سے جو دکن مین قائم تھی، پانچ ریاستین متفرع ہوئین۔ ۸۹۰ھ مین عماد شاہیۂ برار، ۸۹۵ھ مین عادل شاہیۂ بیجاپور، ۸۹۶ھ مین نظام شاہیۂ احمدنگر، ۸۹۷ھ مین برید شاہیۂ بدر، اور ۹۱۸ھ مین قطب شاہیۂ گولکنڈہ،

سادات سے ۸۵۵ھ مین دہلی مین لودھیہ حکومت کی بنیاد پڑی، لودھیہ سے ۹۴۷ھ مین سوریہ خاندان پیدا ہوا، سوریہ سے ۹۶۲ھ مین مغلیہ حکومت قائم ہوئی، جو ہندوستان مین مسلمانون کی سب سے بڑی اور سب سے آخری سلطنت تھی، مغلیہ سے حسب ذیل ٹکڑے علیٰحدہ ہوئے۔

۱۱۱۵ھ مین الہ وردیۂ بنگال، ۱۱۲۵ھ مین مرازیۂ بھوپال، ۱۱۳۱ھ مین روہیلۂ رامپور، ۱۱۳۲ھ مین

نظامیہ آصفیہ حیدرآباد، سنہ ۱۱۴۳ھ مین عباسیۂ بہاولپور، سنہ ۱۱۶۵ھ مین برہانیۂ اودھ، سنہ ۱۱۹۵ھ مین افغانیہ ممدوٹ، (پنجاب) ان مین ایک کے سواے سب آج بھی موجود ہین،

خلافت عباسیہ کی تیسری شاخ یعنی فاطمیہ سے سنہ ۳۱۱ھ مین کناسیہ مراکش، سنہ ۳۲۲ھ مین ادارسہ (مراکش کے دوسرے حصے مین) سنہ ۳۳۶ھ مین کلبیۂ سسلی، سنہ ۳۶۲ھ مین صنہاجیہ ٹیونس، سنہ ۴۱۴ھ مین مرداسیہ حلب کی مستقل حکومتین قائم ہوئین، اور سلطنت فاطمیہ ان ہی مین جذب ہوکر فنا ہوگئی،

صنہاجیہ سے سنہ ۴۰۵ھ مین مغراویہ، اور سنہ ۴۴۸ھ مین مرابطین کی سلطنت پیدا ہوئی، مرابطین سے سنہ ۵۲۴ھ مین موحدین عالم وجود مین آئے، موحدین سے تین سلطنتین علیحدہ ہوئین سنہ ۶۲۵ھ مین حفصیہ، سنہ ۶۶۸ھ مین مرینیہ، اور سنہ ۶۳۳ھ مین زیانیہ، مرینیہ سے سنہ ۸۶۹ھ مین وطاسیہ اور سنہ ۹۱۵ھ مین سعدیہ کی حکومتین قائم ہوئین، سعدیہ سے سنہ ۱۰۵۰ھ مین حکومت علالیہ پیدا ہوئی۔

خلافت عباسیہ کی چوتھی شاخ مغلیہ ایران سے سنہ ۹۰۶ھ مین صفویہ حکومت قائم ہوئی، صفویہ سے سنہ ۱۱۳۶ھ مین افغانی حکومت غلجائیہ، اور سنہ ۱۱۴۹ھ مین ایرانی حکومت نادرشاہیہ ظہور مین آئین، غلجائیہ سے سنہ ۱۱۶۰ھ مین ابدالیہ، ابدالیہ سے سنہ ۱۲۵۵ھ مین بارکزئیہ حکومت وجود مین آئی، جسکی موجودہ حکومت جانشین ہے،

نادرشاہیہ سے سنہ ۱۱۶۳ھ مین زندیہ، زندیہ سے سنہ ۱۲۰۰ھ مین قاچاریہ حکومت پیدا ہوئی،

خلافت عثمانیہ کی کمزوری کے بعد دنیائے اسلام مین جو بیداری پیدا ہوئی اُس سے دنیا کے مختلف حصون مین اسلامی حکومتین قائم ہوئین، چنانچہ تاتاریۂ چینی ترکستان، جمہوریۂ آذربائجان، جمہوریۂ ترکستان، اور کریمیۂ ریف (مراکو) کو بھی اس سلسلے مین پیش کیا جا سکتا ہے۔

اسلامی حکومتون کا یہی وہ ممتد سلسلہ ہے، جو یورپ، ایشیا، اور آفریقہ مین پھیلا ہوا تھا، اور یہی تمام تاریخ اسلام کا ماحصل ہے،

رسید کتب

نیشنل پریس اُردو ریڈرز۔ ہزار داستان۔ علی بابا اور چالیس چور۔ گروسو سیاح۔ وینس کا سیاح۔ اوتارون کے قصے۔ راجہ ہریش چندر،

شائع کردہ۔ مسٹر رام نراین لال بُک سیلر۔ الہ آباد

وضع اصطلاحات

(از خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت۔ لکھنوی)

خدا کا شکر ہے کہ آجکل ہندوستان میں اردو کی خدمت میں بہت سی انجمنیں مصروف کار ہیں بہت سے ماہانہ رسالے کوشاں ہیں بہت سے مصنف بلا کسی خیال معاوضہ کے کام کر رہے ہیں۔ لیکن ایک سخت غلط فہمی کے سبب سے کام بے اصول ہو رہا ہے یعنی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اردو تمام ہندوستان کی مادری زبان ہے اور ہم سب کو یہ حق حاصل ہے کہ جو کچھ چاہیں اس میں ترمیم اور اضافہ کریں۔

اس بنیادی خیال کو مرکوز خاطر رکھتے ہوئے مغرب۔ مشرق۔ جنوب، اور شمال ہند سب طرف کے لوگ اپنے اپنے حسب دلخواہ لفظیں محاورے استعمال کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جو قوانین وہ رائج کریں انکی پابندی تمام ہندوستان کرے۔ حالانکہ کیفیت یہ ہے کہ پنجاب کے لوگوں کی مادری زبان پنجابی ہے، بنگالیوں کی مادری زبان بنگالی ہے، اور مدراسیوں کی تامل، دکن کی مادری زبان تیلیگو، مہاراشٹر کی مرہٹی لہذا ان اطراف و جوانب کے باشندوں کو اُردو کی جو خدمت کرنا ہو اسے ان مقامات کے جنکو اُردو کا مرکز ہونیکا دعویٰ اور صحیح دعویٰ ہے، اساتذہ کی تقلید و تتبع میں کرنا چاہئے،

ہم مانتے ہیں کہ فی زمانہ پنجاب اور دکن سے جو اُردو کی خدمت ہو رہی ہے وہ ہر طرح قابل تحسین ہے اہل پنجاب اُردو کی جو خدمت کر رہے ہیں انکا احسان ہے، اور حضور نظام جسقدر دولت کثیر اس کام میں صرف کر رہے ہیں اور اردو زبان سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں وہ بھی قدر دانان اُردو کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں لیکن ہماری گذارش یہ ہے کہ اگر کام با اصول کیا جائے تو اُردو کو دہنی فائدہ کثیر پہونچے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ احباب اُردو کو اپنی مشترکہ اور مملوکہ زبان سمجھ کر بغیر تحقیق و تدقیق کے اسمیں کچھ ایسا تصرف بیجا کر رہے ہیں کہ ہمکو ادبی فائدہ کے بجائے نقصان پہونچنے کا پورا اندیشہ ہو رہا ہے۔

یہاں پر میں مثال کے طور پر وضع اصطلاحات کے نام سے انجمن ترقی اُردو کی ایک کتاب کا ذکر

کرتا ہوں جسکی شان نزول یہ ہو کہ جب اعلیٰ حضرت فرمانروائے دکن خلد اللہ ملکہ نے حیدر آباد میں عثمانیہ یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی جسکی نسبت اعلان کیا گیا کہ وہ ہر علم کی تعلیم اُردو زبان میں دیگی تو اسکے ساتھ ایک محکمہ دارالترجمہ کا بھی قائم ہوا جسمیں اطراف ملک کے لوگ معمور ہے۔ بہرحال آشناہ کارین عثمانیہ یونیورسٹی کی جنرل کمیٹی نے یہ اہم اور مہتم بالشان مسئلہ بھی فیصل کر دیا کہ انگریزی زبان کی اصطلاحیں بجنسہ یا کسی تغیر کے ساتھ اردو میں ہرگز ہرگز نہ لی جائیں بلکہ انکے مقابلے میں اُردو اصطلاحیں وضع کی جائیں اس امر کے طے ہونے کے بعد ایک بحث اور قائم کی کہ آخر اصطلاحیں کس زبان سے بنائی جائیں ایک جماعت کہتی تھی کہ اصطلاحیں عربی سے بنائی جائیں دوسری جماعت نے کہا کہ اصطلاح بنانے میں ان تمام زبانوں کے الفاظ کام دے سکتے ہیں جو اردو میں رائج ہیں۔ بہرحال جو لوگ یہ سمجھتے رہے کہ انگریزی اصطلاحات نے کیا خطا کی ہے جو انکو نکالکر دوسری اصطلاحیں بنانا چاہتے ہو انکی سماعت نہوئی اور جماعت ثانی کی بات بالا رہی یعنی یہ امر طے پایا کہ وضع اصطلاحات میں وہی الفاظ لئے جائیں جو اُردو میں رائج ہیں۔

آخر دور بین نگاہوں نے مولوی وحید الدین صاحب سلیم کو اس خدمت کی انجام دہی پر انتخاب کیا، مولوی صاحب مرحوم کو پہلے ہی سے وضع اصطلاحات کا شوق تھا چنانچہ آپنے اپنی مشہور تصنیف جسکا اوپر ذکر ہو چکا ہے مرتب مکمل کی اور اس کارنامہ پر آپ کو آخر دم تک بہت فخر تھا لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ زبان کے بارے میں انکی روشنی طبع نے بلا کا کام کیا مصنف مرحوم توسیع معلومات اور ارتقائے خیالات کے ساتھ زبان کے انقلاب کو بھی ضروری جانتے تھے چنانچہ آپنے اصطلاحوں کو تو بالائے طاق رکھدیا اور زبان پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا۔ اس کوشش میں اصل مدعا یعنی انگریزی اصطلاحوں کے بجائے اُردو اصطلاح بنانے کا کام تو نظرانداز ہو گیا اور کتاب بھر میں اصطلاح کی کہیں کوئی تعریف بھی بیان نہیں کی گئی ہے جس سے یہ معلوم ہوتا کہ مصنف کے خیال میں اصطلاح کس چیز کا نام ہے۔

اس کتاب میں اصطلاحات کا تو کہیں ذکر نہیں ہے البتہ اس لفظوں کی تصریف دکھائی ہے امالہ دکھایا ہے ترخیم دکھائی ہے تحریف دکھائی ہے، تعلیل دکھائی ہے جو تمام صرفی نحوی کتابوں میں عام طور سے موجود ہیں اسکے بعد اُردو سابقے کے نام لفظوں پر جو حرف روابط آتے ہیں انکا ذکر شروع کر دیا ہے اور فرہنگ آصفیہ کے تمام لغت اُٹھاکر الف سے یے تک لکھدئے اور اسکے جمع کرنے میں بھی معمولی معمولی غلطیاں وقوع میں آئیں۔

لفظ بُل کے نسبت لکھا ہے کہ یہ فارسی لفظ ہے اسکے معنی بہت کے ہیں، حالانکہ فارسی کے کسی لغت میں بُل کا کوئی لفظ نہیں ہے۔ مصنف وضع اصطلاحات نے اسکی مثال میں بُلہوس کو پیش کیا، مگر کون کہے کہ یہ بُل نہیں ہے بُو ہے عربی ہے اُسکے معنی "صاحب" کے ہیں۔ اسے بوالہوس لکھتے ایسے بہت سے لفظ ہیں جیسے بوالفضول بوالحکما وغیرہ۔

لاچار اور لاپروا اُصول زبان کے خلاف ہیں 'لا' حرف عربی ہے اسکو فارسی لفظ پہ نہیں لاتے آجکل ناچار اور بے پروا بولتے ہیں مگر علامہ مصنف نے اسکو بھی جائز رکھا ہے مصدر کی علامتوں میں عجب عجب گلفشانی کی ہے، تمام دنیا کے صرفی اس بات پر متفق ہیں کہ مصدر کی علامت اُردو میں صرف نا ہے مگر مصنف مغفور نے فرمایا ہے کہ مصدر کی علامتیں پانچ ہیں۔ نا۔ آنا۔ یانا۔ کنا۔ سنا۔ چمکنا میں۔ کنا علامت مصدر ہے۔ چم کو الگ کرو تو کنا باقی رہتا ہے اور یہی علامت مصدر ہے کھانسنا میں سنا علامت مصدر ہے۔ پہچان کا طریقہ یہ ہے کھان کو الگ کر دو سنا علامت مصدر باقی رہجاتی ہے اسیطرح آنا اور یانا بھی ہیں جنکی تفصیل ہم یہاں فضول سمجھتے ہیں۔

اب دوسری قسم کی اصطلاحات کا ذکر سُنیے۔ مصنف نے کچھ اپنی ایجاد کے مصدر بقلید قواعد دکن تصنیف فرمائے ہیں جن سے ثابت کیا ہے کہ حقیقت میں اُردو زبان کا مرکز صرف دکن کو ہونا چاہیے تھا لوگ غلطی سے لکھنؤ اور دہلی کا نام لیتے ہیں۔

"غلیفنا" ایک نیا مصدر قرار دیا گیا ہے اور اسکو غلاف سے بنایا گیا ہے۔ "آسکتانا" آسکت سے حاصل کیا گیا ہے۔ تمیزنا تمیز سے پیدا کیا ہے۔

انھیں اصولوں کو مد نظر رکھ کر مصنف مرحوم نے جدید فارسی کے مصدر بھی ایجاد کیے ہیں مثلاً پاسیدن۔ پاسی سے بنایا ہے بمعنی پہرہ دینا۔ مشتن مشت سے نکالا ہے اسکے معنی مٹھی مارنا لکھے ہیں خدا جانے مٹھی مارنا سے مصنف مغفور کی کیا مُراد ہے۔ اب وضع اصطلاحات لفظی [illegible]

نقش ایک معروف لفظ ہے جسکے معنی بھی عام ہیں مگر مصنف نے اسکے جدید معنی بیان فرمائے ہیں یعنی۔ صبح وشام کی نوبت جو رئیسوں کے دروازوں پر بجائی جاتی ہے۔

مصنف مغفور نے دکن کی اصطلاحات کی ڈکشنری سے انتخاب فرماکر بعض الفاظ کی ایجاد کا سہرا اپنے سر باندھا ہے۔ مثلاً پھلکاری بجائے گلکاری۔ کٹا بمعنی قصاب۔ داتن بمعنی مسواک۔ [illegible] بمعنی کتے نچانے والا۔ سیٹی باز۔ غائب باز۔ ہنسی باز۔ غزل باف۔ یعنی غزل گو شاعر۔ تلہ [illegible] بمعنی جو شخص کسی چیز یا کسی شخص کا پابند ہو۔ گردن بند ایک زیور کا نام ہے جیسے [illegible]

سے گاؤبند کہتے ہیں۔ چراغچی بمعنی لالٹین۔ موسیقچی بمعنی موسیقی داں۔ سرخانہ ہر چیز کا آخری حصہ۔ نقاب خانہ۔ زمیں دوز مکان۔ جسے بعض ناواقف اُردو تہ خانہ کہتے ہیں۔ چلم چٹ۔ اس لفظ کے معنی نہیں لکھے۔ عرق خانہ بمعنی حمام کا کٹورہ دان۔ آب دان پانی کا برتن۔ آبدست دان لوٹا بوسہ دان دہن۔ جیب کترا۔ نفس ربا دو کلام جسکا لفظ آسانی سے معلوم ہوسکے۔ آتش زن روشنی کا مہتمم ابریشم زن بمعنی مطرب۔

حضرت سلیم نے مصادر کی طرف بھی توجہ فرمائی ہے اور ایسے ایسے مصادر ایجاد فرمائے ہیں۔ جو آجتک پردۂ غیب سے میدان شہود میں نہ آئے تھے اور جنسے دنیا کے کان آشنا نہ تھے انمیں سے چند اس جگہ درج کرکے دنیائے ادب کو ممنون کیا جاتا ہے۔

برگانا۔ برگ یعنی پتا سے یہ مصدر بنایا ہے	حسنانا۔ حسن سے یہ مصدر بنایا ہے۔
آشکانا۔ اشک سے یہ مصدر بنایا ہے۔	درسانا۔ درس سے یہ مصدر بنایا ہے۔
بسملانا۔ بسمل سے یہ مصدر بنایا ہے۔	ذوقانا۔ ذوق سے یہ مصدر بنایا ہے۔
جسمانا۔ جسم سے یہ مصدر بنایا ہے۔	ربطانا۔ ربط سے یہ مصدر بنایا ہے۔
جلسانا۔ جلسہ سے یہ مصدر بنایا ہے۔	رعشانا۔ رعشہ سے یہ مصدر بنایا ہے۔
جوفانا۔ جوف سے یہ مصدر بنایا ہے۔	عکسانا۔ عکس سے یہ مصدر بنایا ہے۔
حرفانا۔ حرف سے یہ مصدر بنایا ہے۔	دکنانا۔ دکن سے یہ مصدر بنایا ہے۔

اب اسکی تصریف میں کچھ تکلف نہیں ہے دکنایا۔ دکناتا ہے۔ دکنایا ہے دکنایا تھا دکنایا ہوا۔ دکناتا ہے دکنائیگا دکنا نہ دکنا۔ غرض ایسے ایسے ہزاروں مصدر بنا ڈالے گئے۔ اور انجمن ترقی اردو کے ممبروں کو غالباً اس سے بہت فیض پہونچا ہوگا۔ ہاں ایک کمی رہ گئی ہے یعنی یہ کہ ان مصادر کی تصریف کے معنی صرف صغیر اور صرف کبیر کے الگ الگ لکھدئے جاتے تو عام لوگ بھی فائدہ اُٹھاتے۔ ہماری رائے میں جب تک عثمانیہ یونیورسٹی کی جنرل کمیٹی اسکی شرح شائع نہ کرے اردو زبان میں ایک بہت بڑی کمی رہجائیگی۔ اُمید ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے ارکان اعظم اس کتاب کی شرح کیطرف جلد از جلد توجہ فرمائیں گے کہ ہندوستان کے عام لوگ بھی اس کتاب سے فائدہ اُٹھاکر حضور نظام کو دعائیں دیں۔ حقیقت میں اس قسم کی خدمت دکن ہی میں انجام دیجاسکتی تھی اسلئے کہ اردو تو دکن میں پیدا ہوئی ہی اور اس لحاظ سے بہتر یہی ہے کہ وہیں سے اسکا جنازہ بھی اُٹھے اور وہیں دفن ہوجانے تاکہ دوسرے لوگوں کو اسکی پرورش کا حق حاصل نہو۔

سلاستِ زبان

(از جناب محمد عبد الغنی بی - اے - منشی فاضل)

یہ فیصلہ کرنا کہ سلاستِ زبان واقعی کیا چیز ہے بہت ہی دشوار ہے - سلاست کے لغوی معنی کو مدِ نظر رکھکر ماہرینِ فن نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ جن مطالب کے ادا کرنے مین ایسے الفاظ استعمال ہوئے ہون جنکے تلفظ مین دقت نہو وہی عبارت سلیس ہے - لیکن انکا یہ معیار خود ساختہ ہے کیونکہ الفاظ کا زبان پر بآسانی روان ہونا یا نہونا عادت پر منحصر ہے اور عادت اپنے ماحول اور تربیت کے تابع ہے - اکثر دیکھنے مین آیا ہے کہ ایک مولوی صاحب جو عربی کی عبارت صحیح صحیح مخرجون کے ساتھ بے تکلف پڑھتے چلے جاتے اور اسکی شیرینی اور لوچ پر سر دھنتے ہین انگریزی اور سنسکرت پر اعتراض کرتے ہوئے ذرا نہین جھجھکتے - پنڈت جی کا عربی اور انگریزی کی نسبت یہی خیال ہے - اور ایک انگریز عربی و سنسکرت دونون زبانون کی ثقالت کا نوحہ خوان نظر آتا ہے - آپ لاکھ کوشش کیجیے "خط" اور "ज्ञान" کا صحیح تلفظ اُسے نہین سکھا سکتے حالانکہ وہ SLOW کا تلفظ آسانی سے کرتا اور ہم پر ہنستا ہے کہ ایسا سیدھا سادہ لفظ بھی ہمارے مُنہ سے نہین نکل سکتا اِن اعتراضون کی حقیقت اسکے سوا کچھ نہین کہ ممارستِ زبان نے جو وصف ان لوگون مین سے ہر ایک کی طبیعت مین پیدا کر دیا ہے - جب اسکے خلاف کوئی بات ظہور پذیر ہوتی ہے تو وہ وصف زبان بن کر بے تکلف یہ فیصلہ صادر کر دیتا ہے کہ یہ بات مجھے گران معلوم ہوتی ہے اور مین اِسکا متحمل نہین ہو سکتا یعنی ان الفاظ کے علاوہ جو روزمرّہ وہ سُنتا اور بولتا ہے اور جن سے اُسکے کان اور زبان آشنا ہے جب کوئی جدید لغت سُنتا ہے تو وہ اُسکو ثقیل و ناگوار معلوم ہوتا ہے -

لیکن سلاستِ زبان کے معنی صرف یہی نہین ہین کہ الفاظ ایسے حروف کا مجموعہ ہون جو آسانی سے مُنہ سے نکل سکین - ہر زبان مین ایسے بے انتہا الفاظ پائے جاتے ہین جنکا بولنا دشوار نہین مگر اُنکے معنی سمجھنا دشوار ہے - مثلاً فرض کیجیے کہ عربی مین سنیئہ و اصلیہ کا تلفظ آسان تصور کیا گیا ہے لیکن ایک عرب جو تعلیم و تجربہ کی کمی کے سبب سے "تراب" و "صلصال" کے فرق سے واقف نہین اور جسکی معلومات کا دائرہ محض "تراب" تک محدود ہے اگر اُسکے سامنے کوئی واقف کار محل و موقع کے لحاظ سے "صلصال" بولیگا تو وہ یہی کہے گا کہ متکلم نے ایک ثقیل لفظ استعمال کیا، پس

سلاست کا ایک معیار علمیت سامع بھی ہے اور یہ بھی پہلے معیار کی طرح محدود و مقصور ہے۔

سلاست کا تیسرا معیار طرز ادائے خیال ہے۔ اگر متکلم اپنے خیال کو ایسے پیرایہ مین بیان کرتا ہے کہ سامع فوراً اُسے سمجھ لے تو ایسے کلام کو سلاست کا ہر دل عزیز خطاب مل جاتا ہے اور اگر سامع کو عقل پر زور دینا پڑا تو کلام ادق و مغلق ٹھہرتا ہے۔ اگرچہ شاعری مین تفصیل و تشریح کو دخل نہین اور ایک ہندی شاعر کے قول کے مطابق "شعر کے الفاظ کو صرف خیالات کی طرف اشارہ ہی کرنا چاہئے" اور لطف شعر بھی یہی ہے تاہم جب ایک مضمون کو دو شاعر بیان کرتے ہین تو ایک سہل طریقۂ ادا کو کام مین لاکر اُسے سلیس اور دوسرا اپنے طرز بیان کے باعث اُسکو ادق و مغلق بنا دیتا ہے۔ مثلاً فلسفیون کا ایک مسئلہ ہے کہ "ہر فاسد کائن اور ہر کائن فاسد ہے"۔ یہ خیال جب مرزا غالب مرحوم و مغفور کے دماغ سے صفحۂ قرطاس پر جلوہ گر ہوا تو عربی کا گران بار لباس پہنے اور فہم سامع کے لئے ایک ثبوت یا مثال اپنے ساتھ لئے ہوئے آیا ؎

مری تعمیر مین مضمر ہے اک صورت خرابی کی ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقان کا

مگر خان بہادر افتخار الشعرا حضرت مضطر خیرآبادی غفر اللہ ذنوبہ کی رنگین طبع نے چارہ گرو سعی بے حاصل سے باز رکھنے کے لئے یہ مسئلہ ان الفاظ مین بتایا ؎

مین بنا اسی لئے ہون کہ خدا مجھے بگاڑے یہ محال ہے مسیحا کہ مجھے اجل نہ آئے

اب اگر تلفظ الفاظ، علمیت سامع اور طرز ادائے خیال ہی کو سلاست کی کسوٹی مانا جائے تو حضرت مضطر بازی لے جائینگے اور یہ ماننا پڑیگا کہ وہ غالب مرحوم سے بلند تر رتبہ رکھتے ہین۔ لیکن اگرچہ حضرت مضطر اعلیٰ درجے کے غزل گو تھے اور انکے کلام مین تغزل کے تمام اوصاف پائے جاتے ہین مگر انکے یہان غالب علی کُل غالب کی جدت خیال اور بلند پروازی نہین ہے۔

خیال کی نوعیت بھی ایک اہم عنصر ہے جو مانع سلاست یا ممد سلاست ہو سکتی ہے۔ جو خیال پست و عام ہوگا اُسکے اظہار کے لئے ہمیشہ معمولی و فرسودہ الفاظ استعمال کئے جائینگے کیونکہ پست و عام خیالات کا منبع اکثر ایسے لوگون کے دماغ ہوتے ہین جنکا مبلغ علم کم اور دماغی قوت ناتربیت یافتہ ہوتی ہے۔ انکی تگ و دو کا میدان محض اُنکے ادنےٰ محسوسات اور روزمرہ کی ضروریات ہوتی ہین اور ان کے لئے صدیون سے ایسے الفاظ بولے جا رہے ہین جو رواج و روایت کے طفیل مین اپنی غرابت و تنافر کھو چکے ہین۔ بلند خیالات کا یہ خاصہ ہے کہ فرسودہ الفاظ اُنھین ظاہر نہین کر سکتے۔ انکی اور عام خیالات کی نوعیت مین فرق ہے۔ اور اسی فرق کا یہ تقاضہ ہوتا ہے کہ اُنکے لئے

یا تو نئے الفاظ تراشے جائین یا پرانے لفظون مین سے کسی لفظ کے معنی کو وسعت دیکر کام مین لایا جائے۔ یہ دونون صورتین سامع کے سامنے غیر مانوس لفظ پیش کرتی ہین۔ ادھر ایک جدید لفظ ہوتا ہے۔ اُدھر اُسکے معنی سے ناواقفیت ہوتی ہے۔ ایسی حالت مین ایک اوسط درجے کی قابلیت کا آدمی بیساختہ یہ کہہ دیتا ہے کہ یہ الفاظ بہت ثقیل وغیر مانوس ہے مگر وہ یہ نہین دیکھتا کہ خود اُسکی علمی قابلیت کیا ہے؟

آجکل یہ شکایت عام ہے کہ اُردو اور ہندی سے سلاست مفقود ہوتی جارہی ہے۔ یہ شکایت بجا ہے لیکن اسکے معنی اس سے زیادہ کچھ نہین کہ وہ الفاظ جن سے گوش آشنا اور جن کے مفہوم قریب الفہم تھے تحریرون سے خارج ہورہے ہین اور اُنکی جگہ وہ الفاظ استعمال ہورہے ہین جو اجنبی اور بعید الفہم ہین۔ شکایت کرنے سے پہلے اس امر پر بھی غور کرنا چاہئے کہ اس تغیر کے اسباب کیا ہین اور آیا ان اسباب کے اثرون کا زائل کرنا طبعی اور ممکن ہے؟

کسی ملک مین جب اس قسم کی شکایت پیدا ہوتی ہے تو اسکی زبان اس وقت دورِ تغیر سے گذر رہی ہوتی ہے۔ تغیر کے اسباب مین اہم سبب یہ ہوا کرتا ہے کہ حکومت وسیاست رنگ بدلتی ہے اور عنانِ سلطنت اغیار کے ہاتھون مین ہوتی ہے صرف اس وجہ سے معاشرت تجارت اور تعلیم پر اتنا اثر پڑتا ہے کہ زبان کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ اجنبی قوم ملک مین قدم رکھتے ہی اپنے مفاد کے تحفظ کی جویا ہوتی ہے مگر اس کا حصول اسی صورت مین ممکن ہوتا ہے کہ محکومین کے خیالات اور حرکات وسکنات سے وہ باخبر رہے۔ انتظام وانصرام سلطنت اُسکی منشاء کے مطابق ہو۔ یہ کام محکومین کی زبان مین بھی ہوسکتا ہے اور حکمران قوم کے افراد اگر چاہین تو اُسکی زبان سیکھ سکتے ہین مگر ان کا فخر قومی انھین ایسا کرنے کی اجازت نہین دیتا علاوہ اسکے اس صورت مین محکومین کا پلہ گران رہتا ہے اور مادری زبان ہونے کے باعث جو قدرت انھین اپنی تادیل معنی پر حاصل ہوتی ہے وہ زبان دانون کو نصیب نہین ہوسکتی۔ پس مصلحت کا اقتضاء ہوتا ہے کہ وہ اپنی زبان کو رواج دین۔ محکومین کے مفاد کا بھی یہ تقاضہ ہوتا ہے کہ وہ حصول اغراض کے لئے اپنے حاکمون کو اپنا مطلب بخوبی سمجھا دین۔ پس اجنبی حکومت اپنی زبان کو عام کرنے کے لئے اُسکے حاصل کرنے مین آسانی پیدا کردیتی ہے اور رعایا شوق وذوق سے اُسکی زبان سیکھتی ہے۔ اس طرح نئے خیالات اور نئی طرز ادا کے داخلہ کا دروازہ کھل جاتا ہے اور رفتہ رفتہ اجنبی علم وادب سے شغف اور اپنے علوم سے بیخبری ہوجاتی ہے۔ یہان سے وہ سرحد شروع ہوتی ہے جو تغیر کی بنیاد اور شکایت کا باعث ہے۔ یعنی اہلِ ملک کو اپنی زبان کا دائرہ تنگ محدود نظر آنے لگتا ہے اور مجبورًا

یا تو پرانے لفظوں کو نئے معنی میں بولنا یا حکومت کی زبان کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے اگر اسکے خزانہ میں کوئی ایسا گوہر بیش بہا ہے جو مقصد برآری کرسکتا ہے تو بے دریغ مانگ کر زیب دستار کلام کرلیا جاتا ہے حکمران قوم کی ہر ادا دلکش نظر آتی ہے - اور اپنے ادب کو انکے ادب کی سطح پر لیجانے کی کوششین رفتہ رفتہ نئی اور پرانی زبان مین ایک فرق پیدا کردیتی ہین جو آخرکار ستم ظریفی نظر آنے لگتا ہے - ادنے طبقہ اس کوشش مین شریک نہین ہوتا کیونکہ اسکی معلومات کا دائرہ صرف اسکی ضروریات پر محیط ہوتا ہے اس وجہ سے تعلیم یافتہ افراد کی زبان اسکی نظر مین ترکی بنجاتی ہے جس سے وہ واقف نہین ہوتا اجنبی معاشرت و تجارت اپنے ساتھ صرف نئی چیزین لاتی ہین یہ چیزین اگر ملک مین کسی شکل مین پہلے سے موجود نہین ہوتین تو انکے اجنبی نام ہی کچھ گھٹا بڑھا کر اختیار کرلئے جاتے ہین - مثلاً لالٹین کہ اصل مین لنٹرن ہے مگر یہ کام تعلیم یافتہ کم کرتے ہین اور جاہل زیادہ - کیونکہ وہ صحت تلفظ کی اہمیت کا کبھی بھولکر بھی خیال نہین کرتے - با این ہمہ اجنبی معاشرت و تجارت کا اثر بھی زبان کی سلاست پر حملہ نہین کرتا اور نہ تعلیم یافتہ افراد اس سے متاثر ہوتے ہین - اسکا ذکر صرف اس واسطے کیا گیا ہے کہ ایک طرف تو یہ فلاح زبان کا باعث ہوتا ہے اور دوسری طرف اسکی سرسبزی و شگفتگی کو زائل کرتا ہے اور اس طرح زبان مین نیا اسلوب پیدا ہوجاتا ہے -

آجکل کے ادیبون کے رشحات قلم میٹھ کی پھوار نہین بلکہ ژالہ و تگرگ ہین - اسکا سبب یہ ہے کہ مصنف، مؤلف، مدیران اخبار و رسائل حتےٰ کہ نامہ نگار بھی زیادہ تر یونیورسٹیون کے سندیافتہ ہین اور بعض تو ولایت تک کی ہوا کھا آئے اور وہان سے سند تکمیل علم لائے ہین - انکی عمر کا کافی حصہ انگریزی زبان کی تحصیل مین گذرا ہے - انکے دماغ و خیال مین اس قدر انگریزیت سماگئی ہے اور اسکے محاسن و عیوب کا انھون نے اتنا بغور مطالعہ کیا ہے کہ جب وہ کسی موضوع پر اظہار خیال کرتے ہین تو انکا شبدیز قلم خود بخود دلی کی گلیان چھوڑکر لندن کی فلیٹ اسٹریٹ مین جا نکلتا ہے - کہین کسی محاورے کا ترجمہ کرنا ہوتا ہے کہین تشبیہ و استعارے کو اپنی زبان مین منتقل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور اس صورت مین جب اپنی مادری زبان دستگیری نہین کرتی تو مجبوراً عربی یا فارسی یا سنسکرت کی مدد سے اس عقدۂ لاینحل کو حل کرنا پڑتا ہے - لہذا طرز تحریر مین خود بخود ایک قسم کی غرابت پیدا ہوجاتی ہے جو عوام کی نظرون مین کھٹکتی ہے - لیکن یہ حالت صرف اس وقت تک ہے جب تک تعلیم عام نہین ہوتی - جب تعلیم عام ہوجائیگی - اور معیار تعلیم بلند ہوجائیگا تو وہی عبارت جو آجکل ثقیل و غیرفصیح سمجھی جاتی ہے سلیس فصیح سمجھی جانے لگے گی -

عفو

(از منشی پریم چند۔ بی۔اے)

(۱)

مسلمانوں کو اسپین پر حکومت کرتے کئی صدیاں گذر چکی تھیں۔ کلیساؤں کی جگہ مسجدیں بنتی جاتی تھیں۔ گھنٹوں کی خوش آیند مگر بےجان صداؤں کی جگہ موذن کی کرخت پر روحانی صدائیں سُنائی دیتی تھیں۔ غرناطہ اور الحمرہ میں زمانہ کی کج رفتاری پر ہنسنے والے محلات بن چکے تھے جن کے کھنڈر اب تک تماشائیوں کو اپنی شان ماضیہ کی جھلک دکھاتے ہیں معزز عیسائی مرد و عورت حضرت مسیح کا دامن چھوڑکر اسلامی اخوت کے سایہ میں کھنچے چلے آتے تھے اور مورخوں کے لئے آج تک یہ امر باعث حیرت ہے کہ عیسائیوں کا نام و نشان وہاں کیونکر باقی رہ گیا۔ اُن عیسائی سرداروں میں جنھوں نے ابتک اسلام کی دعوت نہ قبول کی تھی اور اسلامی جبروت کا لوہا نہ مانا تھا جو اب بھی اپنے ملک میں سوراجیہ قائم کرنیکا خواب دیکھ رہے تھے ایک سوداگر داؤد بھی تھا۔ داؤد عالم اور دلیر تھا۔ بلا کا خوددار، وہ اپنے علاقہ میں اسلام کو قدم نہ جمانے دیتا تھا۔ اسکا گھر مصیبت زدہ عیسائی فدائیوں کے لئے واحد جائے امن تھا۔ اُسکا سب کچھ اُنپر نثار تھا۔ مسلمان لوگ داؤد سے خائف رہتے تھے اور مذہبی قوت سے اسپر فتح نہ پاکر اُسے زور شمشیر سے مغلوب کرنا چاہتے تھے۔ مگر داؤد موقع و محل سمجھتا تھا کُھلے میدان میں کبھی اُنکا مقابلہ نہ کرتا۔ ہاں جہاں کہیں عیسائیوں کو اسلام کے آگے سر جھکاتے دیکھتا بیخوف و خطر جا پہونچتا اور بحث یا التجا سے اُنھیں اپنے مذہب پر ثابت قدم رہنے کی ترغیب دیتا۔

بالآخر مسلمانوں نے چاروں طرف سے گھیر کر اُسکو گرفتار کرنیکا ارادہ کیا۔ اسلامی فوجوں نے اُسکے علاقہ کو محصور کر لیا۔ اور اسکا سامان رسد بند کر دیا۔ داؤد کچھ دنوں تک تو اپنے مضبوط قلعہ میں بند رہا مگر جب قلعہ میں پانی بھی نہ رہا تو اُسے مجبوراً جانبری کے لئے اپنے متعلقین کے ساتھ بھاگنا پڑا۔ ایک دن موقع پاکر وہ رات کو قلعہ سے نکلا اور اسلامی دارالخلافہ غرناطہ میں آکر روپوش ہوگیا۔ اُسکی جانبازیوں نے نومسلم عیسائیوں میں بھی اسکے معتقد پیدا کر دئے تھے۔ دنیا پروری آن پر چاہے قائم نہ رہ سکے۔ حمیت سے بے بہرہ نہیں ہوتی۔ ایسے ہی ہمدردوں کے درمیان داؤد بھلے دنوں کے انتظار میں زندگی بسر کرنے لگا۔ مسلمانوں کے مخبر اُسکا سراغ لگانے کے لئے بہت سر مارتے تھے اُسکی گرفتاری کے لئے انعامات کثیر مشتہر کئے جاتے تھے، مگر داؤد کا پتہ نہ چلتا تھا۔

(۲)

ایکروز تنہائی سے اکتا کر داؤد غرناطہ کے ایک باغ میں سیر کرنے چلا گیا۔ شام ہو گئی تھی۔ مسلمان لمبی عبائیں پہنے۔ بڑے بڑے عمامے سر پر باندھے کمر میں تلوار لٹکائے۔ روشوں پر ٹہل رہے تھے عورتیں سفید برقع ڈالے۔ زری کی جوتیاں پہنے بنچوں اور کرسیوں پر تمکن تھیں داؤد سب سے الگ ہری بھری گھاس پر لیٹا ہوا سوچ رہا تھا کہ وہ مبارک دن کب آئے گا جب ہمارا وطن ان ظالموں کے پنجے سے چھٹکارا پا جاوے گا۔ گذرے ہوئے زمانہ کا خیال کر رہا تھا جب عیسائی عورت مرد ان روشوں پر ٹہلتے ہوں گے۔ جب یہ مقام عیسائیوں کے شیریں نغموں سے گونجتا ہوگا۔

دفعتاً ایک مسلمان نوجوان آکر داؤد کے پاس بیٹھ گیا اور اسکو سر سے پیر تک حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھکر بولا۔ کیا ابھی تک تمہارا دل اسلامی نور سے منور نہیں ہوا؟ داؤد نے متانت سے کہا۔ اسلام کا نور پہاڑ کی چوٹیوں کو منور کرسکتا ہے۔ تاریک گھاٹیوں میں اسکا گذر نہیں ہو سکتا۔

اس مسلمان عرب کا نام جمال تھا۔ یہ بات سنکر تیز لہجہ میں بولا۔ اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟

داؤد۔ اس سے میرا مطلب یہی ہے کہ عیسائیوں میں اونچے طبقہ کے لوگ جاگیر اور اقتدار کے لالچ اور سزا کے خوف سے اسلام کی پناہ لے سکتے ہیں مگر کمزور اور غریب عیسائیوں کے لئے اسلام میں وہ آسمان کی بادشاہت کہاں ہے جو انھیں حضرت مسیح کے دامن میں نصیب ہوگی۔ اسلام کی اشاعت تلوار کے زور سے ہوئی ہے، خدمت خلق کے سہارے نہیں۔

جمال اپنے مذہب کی توہین سنکر تلملا اٹھا۔ گرم ہوکر بولا۔ یہ بالکل جھوٹ ہے۔ اسلام کی طاقت اسکی اندرونی اخوت اور مساوات ہے تلوار نہیں۔

داؤد۔ اسلام نے مذہب کے نام پر جتنا خون بہایا ہے اسمیں اسکی ساری مسجدیں غرق ہو جائینگی۔

جمال۔ "تلوار نے ہمیشہ سچائی کی حفاظت کی ہے۔

داؤد نے اسی استقلال کے لہجہ میں کہا۔ جسکو تلوار کا سہارا لینا پڑے وہ سچائی ہی نہیں۔

جمال قومی غرور سے دیوانہ ہوکر بولا۔ جبتک جھوٹ کے ماننے والے رہیں گے۔ اسوقت تک تلوار کی ضرورت بھی رہے گی۔

داؤد۔ تلوار کا منھ تکنے والی سچائی ہی جھوٹی ہے۔

عرب نے تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ خدا کی قسم اگر تم بلا ہتھیار کے ہوتے تو تمھیں اسلام کی توہین کرنیکا مزہ چکھا دیتا۔

داؤد نے اپنے سینہ میں چھپی ہوئی کٹار کو نکال کر کہا۔ نہیں میں غیر مسلح نہیں ہوں۔ مسلمانوں کا جس روز تنا اعتبار کرونگا اُس روز عیسائی نہ ہونگا۔ تم اپنے دل کے حوصلے نکال لو۔ دونوں نے تلواریں کھینچ لیں۔ ایک دوسرے پہ ٹوٹ پڑا۔ عرب کی بھاری تلوار عیسائی کی ہلکی کٹار کے سامنے سست پڑ گئی۔ ایک سانپ کیطرح پھن سے چوٹ کرتی تھی تو دوسری ناگن کی طرح اُڑتی تھی۔ ایک لہر کیطرح لپکتی تھی دوسری پانی کی مچھلیوں کی طرح چمکتی تھی۔ دونوں بہادروں میں کچھ دیر تک وار ہوتے رہے۔ دفعتاً ایک بار ناگن اوچھل کر عرب کے کلیجے میں جا پہونچی۔ وہ زمین پر گر پڑا۔

(۲)

جمال کے گرتے ہی لوگ چاروں طرف سے دوڑے اور داؤد کو گھیرنے کی کوشش کرنے لگے۔ داؤد نے دیکھا کہ لوگ تلواریں لئے دوڑے چلے آرہے ہیں۔ جان لیکر بھاگا۔ مگر جدھر جاتا تھا سامنے باغ کی دیوار راستہ میں حائل ہو جاتی تھی۔ دیوار بلند تھی۔ اُسے پھاندنا مشکل تھا یہ زندگی اور موت کی لڑائی تھی۔ کہیں پناہ کی اُمید نہیں۔ کہیں چھپنے کی جگہ نہیں۔ اِدھر عربوں کی خون کی پیاس لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جاتی تھی۔ یہ صرف ایک مجرم کو سزا دینے کی کوشش نہ تھی۔ قومی ہتک کا انتقام مقصود تھا۔ ایک مفتوح عیسائی کی یہ ہمت کہ عرب پر ہاتھ اُٹھائے۔ ایسا اندھیر!

جس طرح تعاقب کرنیوالے کتوں کے سامنے گلہری اِدھر اُدھر دوڑتی ہے۔ کسی درخت پر چڑھنے کی بار بار کوشش کرتی ہے۔ مگر ہاتھ پیر پھول جانیکے سبب بار بار گر پڑتی ہے وہی حالت داؤد کی بھی تھی۔

دوڑتے دوڑتے اس کا دم پھول گیا۔ پیر من من بھر کے ہوگئے۔ کئی بار دلمیں آیا کہ ان سب پر ٹوٹ پڑے اور جان جتنی مہنگی فروخت ہو سکے اتنی مہنگی فروخت کرے۔ مگر دشمنوں کی تعداد دیکھکر حوصلہ پست ہو جاتا تھا۔

لینا! دوڑنا! پکڑنا! کا شور برپا تھا۔ کبھی کبھی پیچھا کرنیوالے اتنے قریب آجاتے تھے۔ کہ معلوم ہوتا تھا' اب لڑائی کا خاتمہ ہوا۔ وہ تلوار پڑی۔ مگر پیروں کی ایک حرکت، ایک ہی گردش، اُسے خون کی پیاسی تلواروں سے بال بال بچا لیتی تھی۔

داؤد کو اب اس لڑائی میں کھلاڑیوں کا سا لطف آنے لگا۔ یہ یقینی تھا کہ اسکی جان نہیں بچ سکتی۔ مسلمان رحم کرنا نہیں جانتے۔ اسلئے اُسکو اپنے داؤں پیچوں میں مزہ آرہا تھا۔ کسی وار سے بچکر اب اُسے یہ خوشی نہ ہوتی تھی کہ اسکی جان بچ گئی بلکہ یہ خیال مسرت بخش تھا کہ اُسنے قاتل

کو کیسا زِچ کیا۔

دفعتًا اسکو اپنے داہنی جانب باغ کی دیوار کچھ نیچی نظر آئی۔ اسکے پیروں میں ایک نئی طاقت عود کر آئی، رگوں میں نیا خون دوڑنے لگا وہ ہرن کی طرح اُسطرف دوڑا اور ایک جست میں باغ کے اس پار پہونچ گیا۔ زندگی اور موت میں صرف ایک قدم کا فاصلہ تھا، پیچھے موت تھی اور آگے زندگی کی وسیع فضا۔ جہانتک نظر جاتی تھی جھاڑیاں نظر آتی تھیں۔ زمین پتھریلی تھی، کہیں اونچی، کہیں نیچی، جگہ جگہ پتھر کی سلیں پڑی ہوئی تھیں۔ داؤد ایک سل کے نیچے چھپکر بیٹھ رہا۔

دم بھر میں تعاقب کرنیوالے بھی وہاں آپہونچے اور ادھر اُدھر جھاڑیوں میں گڈھوں میں سِلوں کے نیچے تلاش کرنے لگے۔ ایک عرب اُسی چٹان پر آکر کھڑا ہوگیا جسکے نیچے داؤد چھپا ہوا تھا۔ داؤد کا دل دھڑک رہا تھا کہ اب جان گئی، عرب نے ذرا نیچے کو جھانکا اور زندگی کا خاتمہ ہوا۔ اتفاق، صرف اتفاق پر اسکی زندگی کا انحصار تھا! داؤد نے سانس روک لی۔ بالکل ساکت ہوگیا۔ ایک نگاہ پر اسکی زندگی کا فیصلہ تھا۔ زندگی اور موت میں کتنی قربت ہے۔

مگر عربوں کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ ہوشیاری سے سِلوں کے نیچے دیکھتے۔ وہاں تو قاتل کے پکڑنے کی عجلت تھی۔ داؤد کے سر سے آئی بلا ٹل گئی۔ وہ ادھر اُدھر دیکھ بھال کر آگے بڑھ گئے۔

(۴)

اندھیرا ہوگیا۔ آسمان پر تارے نکل آئے اور ستاروں کے ساتھ داؤد بھی چٹان کے نیچے سے نکلا۔ لیکن دیکھا تو اُسوقت بھی چاروں طرف ہل چل مچی ہوئی ہے۔ دشمنوں کی جماعت مشعلیں لئے جھاڑیوں میں گھوم رہی ہے۔ ناکہ ناکہ پر پہرا ہے۔ کہیں سے نکل بھاگنے کا راستہ نہیں۔ داؤد ایک درخت کے نیچے کھڑا ہوکر سوچنے لگا اب کیونکر جان بچے۔ اُسے اپنی جان کی ایسی پرواہ نہ تھی۔ وہ زندگی کے سکھ سب اُٹھا چکا تھا۔ اگر اسے زندگی کی تمنا تھی تو صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ لڑائی کا انجام کیا ہوگا، میرے ہموطن پست ہمت ہو جائینگے یا مستقل ارادہ کے ساتھ میدان جنگ میں اڑے رہینگے۔

جب رات زیادہ گذر گئی اور دشمنوں کی کوشش انتقام میں کچھ کمی نہ نظر آئی تو داؤد خدا کا نام لیکر جھاڑیوں سے نکلا۔ اور دبے پاؤں درختوں کی آڑ میں، آدمیوں کی نظر بچاتا ہوا، ایک طرف کو روانہ ہوا۔ وہ ان جھاڑیوں سے نکلکر آبادی میں پہونچ جانا چاہتا تھا۔ ویرانی کسی کی آڑ نہیں کرسکتی۔ بستی کی گھنی آبادی خود ہی ایک آڑ ہے۔

کچھ دور تک تو داؤد کے راستہ میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا ہوئی۔ جنگلی درختوں نے اسکی حفاظت کی۔

مگر جب وہ ناہموار زمین سے نکلکر ہموار زمین پر آیا تو ایک عرب کی نگاہ اس پر پڑگئی - اس نے للکارا - داؤد بھاگا - قاتل بھاگا جاتا ہے - !! یہ آواز ہوا میں ایک ہی بار گونجی اور ایک لمحہ میں عربوں نے چاروں طرف سے اسکا تعاقب کیا - سامنے بہت دور تک آبادی کا نام و نشان نہ تھا - بہت فاصلہ پر ایک دھندلا سا چراغ ٹمٹما رہا تھا - کسی طرح وہاں پہونچ جاؤں ! وہ اس چراغ کی طرف اتنی تیزی سے دوڑ رہا تھا گویا وہاں پہونچتے ہی امان پا جائیگا - اُمید اُسے اُڑائے لئے جاتی تھی - عربوں کا گروہ پیچھے رہ گیا - مشعلوں کی روشنی ماند پڑگئی - صرف ستارے اسکے ساتھ دوڑے چلے آتے تھے - بالآخر وہ پُر اُمید چراغ سامنے آگیا - ایک چھوٹا سا پھوس کا جھونپڑا تھا - ایک بڑھا عرب زمین پر بیٹھا ہوا - رحل پہ قرآن رکھے اسی چراغ کی دھندلی روشنی میں پڑھ رہا تھا - داؤد آگے نہ جا سکا - اسکی ہمت نے جواب دیدیا - وہ وہیں بیدم ہوکر گر پڑا - راستہ کا تکان گھر پہونچنے پر محسوس ہوتا ہے -

عرب نے اُٹھکر پوچھا تو کون ہے ؟

داؤد - ایک غریب عیسائی - مصیبت میں مبتلا ہوگیا ہوں - اب آپ ہی پناہ دیں تو میری جان بچ سکتی ہے -

عرب - خدائے پاک تیری مدد کرے گا - تجھ پر کیا مصیبت پڑی ہے ؟

داؤد - خوف ہے کہ کہدوں تو کہیں آپ بھی میرے خون کے پیاسے نہو جائیں -

عرب - جب تو نے میری پناہ لی تو تجھکو مجھ سے خوف زدہ نہونا چاہیئے - ہم مسلمان ہیں جسے ایکبار اپنے سایہ میں لے لیتے ہیں اسکی تمام عمر حفاظت کرتے ہیں -

داؤد - میں نے ایک مسلمان نوجوان کا خون کرڈالا ہے -

بوڑھے عرب کا چہرہ غصے سے تمتما اُٹھا - بولا اس کا نام ؟

داؤد - اس کا نام جمال تھا -

عرب سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا - اسکی آنکھیں سُرخ ہوگئیں - گردن کی رگیں تن گئیں - چہرہ پر صفا کانہ برہمی کی جھلک نظر آئی - نتھنے پھڑکنے لگے - ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسکے دلمیں سخت جدوجہد ہو رہی ہے اور وہ ارادے کی انتہائی قوت سے کام لیکر اپنے جذبات کو دبانے کی کوشش کر رہا ہے - دو تین منٹ تک وہ اسی اضطراب کی حالت میں بیٹھا ہوا زمین کی طرف تاکتا رہا - آخر اسکے اونٹھ ہوئے حلق سے یہ الفاظ نکلے - نہیں نہیں ! پناہ لینے والے کی حفاظت کرنی ہی پڑے گی - آہ ظالم ! تو جانتا ہے کہ میں کون ہوں ؟ میں اُسی نوجوان کا بدنصیب باپ ہوں - جسے آج تو نے اپنی شمشیر سے قتل کیا

سے۔ تو جانتا ہے تو نے مجھپر کتنا بڑا ظلم کیا ہے۔ تو نے میرے خاندان کا نشان مٹا دیا۔ میرا چراغ گل کر دیا۔ آہ! جمال میرا اکلوتا بیٹا تھا۔ میری ساری تمناؤں کا مدار میری آنکھوں کا نور مجھ اندھے کی لاٹھی میری زندگی کا سہارا، میرے نحیف جسم کی جان تھا۔ ابھی ابھی اسے قبر کی گود میں لٹا کر آیا ہوں۔ آہ! میرا شیر آج خاک کے نیچے سو رہا ہے۔ ایسا دلیر، ایسا دیندار، ایسا شہ زور جوان میری قوم میں دوسرا نہ تھا ظالم تجھے اسپر تلوار چلاتے ذرا بھی رحم نہ آیا۔ تیرا پتھر کا دل ذرا بھی نہ پسیجا، تو جانتا ہے، کہ مجھے اسوقت تجھ پر کتنا غصہ آ رہا ہے۔؟ میرا جی چاہتا ہے کہ اپنے دونوں ہاتھوں سے تیری گردن پکڑ کر اسطرح دباؤں، کہ تیری زبان باہر نکل پڑے، تیری آنکھیں کوڑیوں کی طرح نکلکر گر پڑیں، مگر نہیں تو نے میری پناہ لی ہے۔ فرض میرے ہاتھوں کو باندھے ہوئے ہے کیونکہ ہمارے رسول پاک نے ہدایت کی ہے کہ جو اپنی پناہ میں آوے اس پر ہاتھ نہ اٹھانا۔ میں نہیں چاہتا کہ نبی کے حکم کے خلاف چلکر دنیا کے ساتھ اپنی عاقبت بھی بگاڑوں۔ دنیا تو نے بگاڑ دی، دین اپنے ہاتھوں بگاڑوں۔ نہیں ضبط مشکل ہے مگر ضبط کرونگا، تاکہ نبی کے سامنے آنکھیں نیچی کرنی پڑیں۔ آ۔ گھر میں آ۔ تیرا پیچھا کرنیوالے وہ دوڑے آ رہے ہیں تجھے دیکھ لیں گے تو پھر میری ساری منت وسماجت تیری جان نہ بچا سکے گی۔ تو نہیں جانتا کہ عرب لوگ خون کبھی معاف نہیں کرتے۔"

یہ کہکر عرب نے داؤد کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے گھر میں لیجا کر ایک کوٹھری میں چھپا دیا۔ وہ گھر سے باہر نکلا ہی تھا کہ عربوں کی ایک جماعت اسکے دروازہ پر آ پہونچی، ایک شخص نے پوچھا کیوں شیخ حسن تم نے ادھر سے کسی کو بھاگتے دیکھا ہے؟

"ہاں دیکھا ہے۔"

"اسے پکڑ کیوں نہ لیا وہی تو جمال کا قاتل ہے۔"

"یہ جانکر بھی میں نے اسکو چھوڑ دیا۔"

"ایں! غضب خدا کا یہ تم نے کیا کیا؟ جمال حشر کے روز ہمارا دامن پکڑیگا تو ہم کیا جواب دینگے۔"

"تم کہدینا کہ تیرے باپ نے تیرے قاتل کو معاف کر دیا۔"

"عرب نے کبھی قاتل کو معاف نہیں کیا۔"

"یہ تمھاری ذمہ داری ہے۔ میں اسے اپنے سر کیوں لوں؟"

عربوں نے شیخ حسن سے زیادہ حجت نہ کی وہ قاتل کی تلاش میں دوڑے۔ شیخ حسن پھر چٹائی پر بیٹھکر قرآن پڑھنے لگا۔ لیکن اسکا دل پڑھنے میں نہ لگتا تھا۔ دشمن سے بدلہ لینے کی خواہش عربوں کی

جبلی خاصیت تھی۔ خون کا بدلہ خون تھا۔ اسکے لئے خون کی ندیاں بہہ جاتی تھیں، قبیلے کے قبیلے کٹ جاتے تھے، شہر کے شہر ویران ہو جاتے تھے۔ اُس بدلہ کی خواہش پر فتح پانا شیخ حسن کے لئے ناممکن سا معلوم ہوتا تھا۔ بار بار پیارے بیٹے کی صورت اسکی آنکھوں میں پھر جاتی تھی۔ بار بار اس کے دل میں زبردست تحریک ہوتی تھی کہ داؤد کے خون سے غصہ کی آگ کو ٹھنڈا کر دں، عرب بہادر ہوتے تھے۔ کٹنا مرنا اُن کے لئے کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ مرنیوالے کے لئے وہ آنسوؤں کے چند قطرے بہا کر پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتے تھے وہ مرنیوالے کی یاد کو صرف اُسی حالت میں تازہ رکھتے تھے جب اسکے خون کا بدلہ لینا ہوتا تھا۔ آخر شیخ حسن بیقرار ہوگیا اُٹھا۔ اسے اندیشہ ہوا کہ اب میں اپنے اوپر قابو نہیں رکھ سکتا۔ اس نے تلوار نیام سے باہر کرلی اور دبے پاؤں اس کوٹھری کے دروازہ پر جاکر کھڑا ہوگیا جسمیں داؤد چھپا ہوا تھا۔ تلوار کو دامن میں چھپاکر اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ داؤد ٹہل رہا تھا، بوڑھے عرب کا غضبناک چہرہ دیکھکر داؤد اسکے ارادہ کو تاڑ گیا۔ اسے بوڑھے سے ہمدردی ہوگئی۔ اس نے سوچا یہ مذہب کا قصور نہیں، قوم کا قصور نہیں۔ میرے لڑکے کو کسی نے قتل کردیا ہوتا تو شاید میں بھی اسکے خون کا پیاسا ہوجاتا۔ یہی انسانی خاصہ ہے،

عرب نے کہا۔ داؤد تمھیں معلوم ہے کہ بیٹے کی موت کا کتنا غم ہوتا ہے؟

داؤد۔ اس کا تجربہ تو نہیں ہے۔ مگر اندازہ کرسکتا ہوں۔ اگر میری جان سے آپکے اُس غم کا ایک حصہ بھی کم ہوسکے تو لیجئے یہ سر حاضر ہے۔ میں اسے شوق سے آپکی نذر کرتا ہوں۔ آپ نے داؤد کا نام سُنا ہوگا؟

عرب۔ کیا پیٹر کا بیٹا۔!

داؤد۔ جی ہاں۔ میں وہی بدنصیب داؤد ہوں میں صرف آپکے بیٹے کا قاتل نہیں بلکہ اسلام کا دشمن ہوں۔ مجھے قتل کرکے آپ جمال کے خون کا انتقام ہی نہ لینگے بلکہ قوم و مذہب کی سچی خدمت بھی انجام دینگے۔

شیخ حسن ایک لمحہ تک سکوت میں کھڑا رہا۔ پھر بولا، داؤد میں نے تمھیں معاف کیا۔ میں جانتا ہوں کہ مسلمانوں کے ہاتھوں عیسائیوں کو کافی اذیتیں پہونچی ہیں مسلمانوں نے ان پر بڑے بڑے مظالم کئے ہیں۔ اُن کی آزادی چھین لی ہے۔ لیکن یہ اسلام کا نہیں بلکہ مسلمانوں کا قصور ہے فتح کے غرور نے مسلمانوں کو دیوانہ بنادیا ہے۔ ہمارے پاک نبی نے وہ تعلیم نہیں دی تھی جس پر ہم آج عمل کررہے ہیں۔ وہ خود عفو و رحم کے بلند ترین معیار تھے۔ میں اسلام کے نام کو بٹا

نہ لگاؤں گا۔ میری اونٹنی لے لو اور راتوں رات جہاں تک بھاگ سکو، بھاگ جاؤ، کہیں ایک لمحہ کے لئے بھی نہ ٹھہرنا۔ عربوں کو تمھاری بو بھی مل گئی تو تمھاری خیریت نہیں ہے۔ جاؤ تمھیں خدا شہر پاک بخیر و عافیت گھر پہونچا دے۔ بوڑھے شیخ حسن اور اسکے بیٹے جمال کے لئے خدا سے دعا کیا کرنا۔

داؤد بخیریت گھر پہونچ گیا۔ مگر اب وہ داؤد نہ تھا۔ جو اسلام کی بیخ کنی کرنا چاہتا تھا۔ اسکے خیالات میں گونہ تغیر ہو گیا تھا۔ اب وہ مسلمانوں کی قدر کرتا اور اسلام کا نام عزت سے لیتا تھا۔

مبصر ۔ انجمن "معراج الادب" لکھنؤ کی جانب سے جنوری ۱۹۲۹ء سے ایک ماہوار علمی ادبی رسالہ موسومہ "مبصر" جاری کیا گیا ہے جسکی عنان ادارت ہمارے قدیم دوست حکیم ابو العلا حضرت ناطق صاحب لکھنوی کے مشاق و تجربہ کار ہاتھوں میں ہے۔ اسوقت تک اسکے دو نمبر ہماری نظر سے گذرے ہیں جنکو دیکھکر "مبصر" کے مستقبل کے متعلق بہترین امید قائم کی جاسکتی ہے۔ اعلیٰ درجہ کے علمی و ادبی محققانہ مضامین کے علاوہ اسکے تنقیدی مضامین خصوصیت سے لائق مطالعہ ہیں۔ "بصائر" کے عنوان سے لائق ایڈیٹر کے نوٹس معلومات کا خزانہ ہیں۔

سب سے زیادہ قابل تعریف و قابل مطالعہ ناطق صاحب کا وہ مفید و پُر از معلومات تبصرہ ہے جو "اصلاح سخن" مؤلفہ حضرت شوق سندیلوی پر کیا گیا ہے اور باقساط "مبصر" میں شائع ہو رہا ہے۔ نظم کا حصہ اگرچہ کم ہے مگر جسقدر ہے منتخب ہے۔ انجمن "معراج الادب" کے مشاعروں کا انتخاب بھی ہر ماہ شائع ہوتا ہے۔ اور ہم یہ دیکھ کر خوش ہیں کہ انتخاب بہت سختی کے ساتھ کیا جاتا ہے یعنی غزلوں سے صرف وہ اشعار انتخاب کئے جاتے ہیں جن میں کوئی خاص خوبی اور لطف ہوتا ہے۔

اگر ناطق صاحب نے استقلال سے فرائض ادارت انجام دیئے تو آگے چلکر "مبصر" ملک کے دوسرے مشہور رسائل کی صف اول میں نمایاں جگہ حاصل کر سکیگا، تقطیع ۲۰×۳۰/۸ ۔ صفحات ۴۸ صفحات۔

قیمت ۔ سالانہ چار روپیہ ؏ ۔ پتہ :۔ دفتر "مبصر" وکٹوریا اسٹریٹ، لکھنؤ

ڈاک کا ٹکٹ

(از مسٹر حامد اللہ افسر میرٹھی - بی - اے)

پہلے زمانے میں وسائل خبر رسانی قریب قریب معدوم تھے غریب آدمیوں کا تو ذکر ہی کیا ہے بادشاہ اور اُمرا تک کے خطوط ایک جگہ سے دوسری جگہ مہینوں میں پہنچتے تھے۔ دہلی سے دکن تک خط بھیجنے اور وہاں سے جواب آنے میں کئی مہینے صرف ہو جاتے تھے۔ برعکس اسکے آجکل وسائل خبر رسانی میں اسقدر آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں کہ قلیل سے قلیل صرف اور کم سے کم وقت میں صدہا کوس خبریں بھیجی جا سکتی ہیں۔

ڈاک کا ٹکٹ سب سے پہلے انگلستان میں ۱۸۴۵ء میں رائج ہوا۔ اس سے پہلے وہاں بھی خط و کتابت کا رواج بہت محدود تھا۔ انگلستان میں اُسوقت دستور یہ تھا کہ جب ہرکارہ خط لاکر مکتوب الیہ کو دیتا اُسوقت خط کا محصول اُس سے وصول کیا جاتا تھا اور محصول اسقدر زیادہ ہوتا تھا کہ اکثر عام لوگ خط وصول نہ کر سکتے تھے اور انھیں خط لینے سے انکار کرنا پڑتا تھا۔ پہلے پہل ایک شخص سر رالینڈ ہل نامی کو اسطرف توجہ ہوئی جو ۱۷۹۵ء میں پیدا ہوا تھا۔ ہل کے باپ ٹامس رائٹ ہل ایک اسکول میں ماسٹر تھے۔ رالینڈ ہل کو بچپن ہی سے اس امر کا احساس پیدا ہو گیا تھا کہ خطوں کا محصول ناقابل برداشت ہے۔ اور غریب و نادار لوگوں کو محصول سے بچنے اور خط و کتابت کے سلسلہ کو جاری رکھنے کے لئے بہت سی خلاف قانون اور نامناسب حرکات کے ارتکاب پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ خود اسکی ماں اس خیال سے گھبرایا کرتی تھی کہ اگر کوئی خط آ گیا تو کس طرح وصول کیا جائے گا۔

رالینڈ ہل کے زمانے میں کیفیت یہ تھی کہ اگر لندن سے اڈنبرا کو خط بھیجا جائے۔ تو ایک شلنگ ساڑھے چار پنس محصول دینا پڑتا تھا۔ اور خط میں جسقدر کاغذ شامل ہوتے تھے ان سب کا الگ الگ محصول لگایا جاتا تھا۔ ایک اور ستم یہ تھا کہ دارالعوام اور دارالخواص کے ارکین اس محصول سے مستثنیٰ تھے۔ جن خطوط پر ان کے دستخط ہوتے ان پر محصول نہ لگایا جاتا۔ گویا خوشحال اور فارغ البال لوگوں پر عموماً اس محصول کا بار نہ تھا۔

اسی سلسلے میں رالینڈ ہل کی بابت ایک روایت جس کا کسی مستند کتاب میں ثبوت نہ...

ل ہل کا یہ مشہور ہے کہ ایک دن وہ ایک غریب بوڑھی عورت کے گھر کی طرف سے گذر رہا تھا۔ اتفاق سے اسی وقت ڈاکیہ اس عورت کے نام ایک خط لایا۔ عورت نے خط ہاتھ میں لیا۔ اُسے آنکھوں سے لگایا اور ڈاکیہ کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ میرے پاس محصول کے لئے دام نہیں ہیں۔ رالینڈ ہل نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ یہ خط اس کے بیٹے کے پاس سے آیا ہے جو امریکہ میں ہے۔ رالینڈ ہل کو غریب ماں پر بے حد رحم آیا اور ڈاکیہ سے کہا۔ "ٹھہرو میں اس خط کا محصول ادا کئے دیتا ہوں۔" عورت بولی آپ اس کا خیال نہ کیجئے۔ خط لینے اور محصول ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب میرے بیٹے کے پاس سے خط آتا ہے تو گو میں خط وصول نہیں کر سکتی لیکن سمجھ لیتی ہوں کہ بفضل خدا وہ خیریت سے ہے۔ میں نے اسی لئے اس سے کہہ دیا ہے کہ تم خط برابر لکھتے رہنا۔ میں اس کے پاس سے آیا ہوا لفافہ دیکھ لیتی ہوں۔ یہی میرے لئے کافی ہے۔"

غرض رالینڈ ہل ایک مدت تک اس ادھیڑ بُن میں لگے رہے کہ کسی طرح خطوط کے محصول میں اسقدر تخفیف ہو جائے کہ غریب لوگوں پر بار نہ ہو اور وہ اپنے اعزا و اقربا اور دوست و احباب سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھ سکیں۔

سب سے پہلے ان کی توجہ رسائل خبر رسانی کی دو اہم خامیوں کی طرف مبذول ہوئی۔ ایک تو یہ کہ خطوط کا محصول مختلف مقامات کے لئے جداگانہ تھا کیونکہ محصول ان مقامات کے فصل کی بنا پر وصول کیا جاتا تھا۔ دوسرے یہ کہ محصول خط دیتے وقت مکتوب الیہ سے وصول کیا جاتا تھا۔ محصول کی زیادتی کا سبب یہی دو باتیں تھیں کیونکہ حکومت کو اس محکمہ کے انتظام کے لئے ایک بہت بڑی رقم صرف کرنی پڑتی تھی۔

ایک مدت کی تحقیق و تفتیش کے بعد سر رالینڈ ہل نے معلوم کیا کہ محصول کی زیادتی کے باوجود پچھلے بیس سال کے اندر محصول کے ذریعے جو روپیہ وصول ہوا تھا وہ اخراجات کے مقابلے میں بہت کم تھا اور اخراجات میں اضافہ کا اور محصول کے روپے میں کمی کا سلسلہ برابر جاری تھا حالانکہ اس عرصے میں ملک کی آبادی اور دولت میں کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ لوگ اوّل تو خط بھیجتے ہی نہ تھے اور اگر بھیجتے تھے تو کوئی نہ کوئی ایسی صورت نکال لیتے تھے کہ محصول سے بچ جائیں۔ اسکے برخلاف فرانس میں جہاں محصول کم تھا ڈاک کے ذریعے حکومت کی آمدنی میں بہت اضافہ ہوا تھا۔

اسکے بعد انہوں نے اس امر کی تحقیقات کی کہ خطوں کے ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجانے

اور تقسیم کرنے میں حکومت کو جو روپیہ صرف کرنا پڑتا ہے اسمیں مقامات کے فصل سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا فاصلہ زیادہ ہو یا کم خرچ قریب قریب یکساں ہوتا ہے۔ اس سے رالینڈ ہل نے یہ نتیجہ نکالا کہ ملک کے اندر سب مقامات کے لئے یکساں محصول مقرر کرنا زیادہ ترین انصاف ہے بغرض محکمہ ڈاک کی اصلاح کے لیے اُن کی اہم ترین تجویزیں دو تھیں۔ ایک تمام مقامات کے لیے ایک مقررہ محصول اور دوسرے محصول کی پیشگی وصول یابی۔

چنانچہ جنوری ۱۸۳۷ء میں سر رالینڈ ہل نے لارڈ ملبورن کی حکومت کے سامنے نجی طور پر ایک رپورٹ پیش کی لیکن اس کا کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اسکے بعد اُنھوں نے "ڈاکخانہ کی اصلاح" کے نام سے ایک مختصر رسالہ شایع کیا اس رسالے کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ ڈاکخانہ کے متعلق ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر ہوئی۔ اس کمیٹی کے روبرو شہادت دیتے ہوئے ۱۳ فروری ۱۸۳۷ء کو سر رالینڈ ہل نے بیان کیا کہ اصلاح کی بہتر صورت یہ ہے کہ ڈاک کے ٹکٹ رائج کئے جائیں۔ اُنھوں نے کہا "ڈاک کے ٹکٹ سے میرا مطلب کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہیں جو صرف اتنے بڑے ہوں کہ اُن پر مہر لگائی جا سکے اور اُن کی پشت پر گوند لگا دیا جائے۔"

مجوزہ اصلاح کو پبلک نے بہت پسند کیا گو ارباب حل و عقد برابر اس کا مضحکہ اُڑاتے رہے ۲۳ نومبر ۱۸۳۷ء کو رالینڈ ہل کی اسکیم پر غور کرنے کے لئے ایک پارلیمنٹری کمیٹی مقرر کی گئی اور ۱۷ جولائی ۱۸۳۹ء کو اس کمیٹی نے تمام مقامات کے لئے یکساں طور پر ایک مقررہ محصول کی تجویز جو دو پنس سے زیادہ نہ ہو منظور کر لی۔ لیکن حکومت نے اب بھی توجہ نہ کی۔ بالآخر عوام کا مطالبہ ڈاکخانہ کی اصلاح کے لیے بہت زور پکڑ گیا اور دارالعوام کو ڈاک کے ٹکٹ کی تجویز بجٹ میں شامل کرنی پڑی۔ ۲۱۵ رائیں موافق تھیں اور ۱۳ خلاف۔ اس تجویز کے مطابق ۱۰ جولائی ۱۸۴۰ء کو انگلستان میں ڈاک کے ٹکٹ جاری کر دئے گئے۔

یہ تھی ابتدا ڈاک کے ٹکٹ کی جس نے ہزارہا کوس کے فاصلہ پر رہنے والے انسانوں کو ایک دوسرے سے قریب تر کر دیا۔ اس امر کا اندازہ کرنا آسان نہیں کہ اس چھوٹے سے کاغذ کے ٹکڑے نے خلق خدا کے درمیان محبت و یگانگت پیدا کرنے میں کیا کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں۔ رالینڈ ہل نے ۱۸۷۹ء میں عالم فانی سے عالم جاودانی کو رحلت فرمائی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسے لوگ جنھوں نے ابنائے جنس کی بہبود اور نفع رسانی میں اپنی عمریں صرف کی ہیں

ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ جب ہزارہا کوس کے فاصلہ پر بیٹھے ہوئے دو شخص اس حقیقت کا مذے کرشمے کی بدولت زبان قلم سے گفتگو کرتے ہیں تو اُن کے دل سے رالینڈ ہل کے لئے خاموش دعائیں نکلتی ہیں اور اس ہمدردِ بنی نوع انسان کی یاد کو تازہ کر دیتی ہیں۔

رسید کتب

گورکل (ہندی) از مہاشہ متیعلی شرن گپت۔ قیمت عہ	شائع کردہ۔ ساتھ سدن چرگاؤں (جھانسی)
گیتا رس (ہندی) از مہاشہ کرشن نند گپت۔ قیمت ۸ر	
بیلاستا (ہندی) از منشی اجمیری۔ قیمت ۸ر	
چتر انگد (ہندی) 〃 〃 〃 〃 ار	
بکٹ بھٹ (ہندی) از مہاشہ متیعلی شرن گپت۔ قیمت ار	

سیر المصنفین (جلد دوم) از مولوی محمد یحییٰ تنہا بی۔ اے۔ ایل ایل بی۔ قیمت ہے	شائع کردہ جامعہ ملیہ اسلامیہ قرول باغ دہلی
قوم پرست طالب علم۔ از مولوی محمد عبدالغفار۔ قیمت ۴ر	
جمال الدین افغانی۔ .... قیمت ۸ر	
کلیات وفا۔ از مولوی حکیم عبدالہادی خاں وفا مرحوم۔ قیمت عہ	
عربوں کا تمدن۔ از سید نذیر نیازی۔ بی۔ اے۔ قیمت عہ	
ذکر نبی۔ از خواجہ محمد عبدالحی فاروقی۔ قیمت عہ	
تاریخ الامت (حصہ ۲) از مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری قیمت عہ	

ارتھ شاستر۔ مترجمہ حضرات تمکین و سعیدی۔ قیمت ۸ر (مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن)

عدالت خداوندی، مرتبہ پروفیسر ظفر تاباں۔ قیمت ۸ر (دائرۂ شرقیہ للاشاعت دریا گنج دہلی)

جدید زبانی حساب۔ (تین حصے) از منشی خدا بخش مڈل اسکول محمود کوٹ۔ قیمت مجموعی ۱۲ر

شہرت کا راز

مترجمۂ مسٹر عندلیب شادانی - ایم - اے

شمس الدین نخاس، دوپہر کا کھانا کھا کر، ریل میں سوار ہو گیا۔ فرسٹ کلاس میں ایک
پچپن سالہ بوڑھے کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ شمس الدین السّلام علیکم کہکر مقابل کی نشست پر بیٹھ گیا۔
شمس الدین نخاس- (اپنا سگار جلاتے ہوئے) ہر چند کہ ہم ایک دوسرے کے شناسا نہیں، پھر بھی میرا
خیال ہے کہ باہمی گفتگو میں ہم ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ استفادہ کر سکتے ہیں۔
شخص مجہول- یہ تو آپنے میرے دل کی بات کہی
شمس الدین نخاس- ذرا اس نوجوان کو دیکھئے جو اپنے ہمراہی کو مبارکباد دے رہا ہے۔ غالباً یہ دونوں
نئے ادیب ہیں۔ اور ان میں سے ایک کو جو شہرت حاصل ہوئی ہے اسکی بناء پر دوسرا اُسے
مبارکباد دے رہا ہے یہ شے کچھ ایسی اہم نہیں میری مراد شہرت سے ہے جس کیلئے ساری دنیا کام
کرتی ہے۔ مگر اسکی حقیقت کسی کو بھی معلوم نہیں۔ اگر آپ دس آدمیوں سے شہرت کی تعریف پوچھیں
تو ہر شخص دوسرے کے برعکس جواب دیگا۔ ہمارے ادیبوں میں سے ایک صاحب نے شہرت کو ایسے
پیوند سے تشبیہ دی ہے جو پرانے ملبوس میں لگایا گیا ہو۔ اوروں نے کچھ اور کہا ہے۔ مگر ان میں سے
ایک تعریف بھی واقعہ کے مطابق نہیں۔
شخص مجہول- مگر آپ اس مسئلہ کو اس قدر اہمیت کیوں دیتے ہیں؟
شمس الدین نخاس- یہ مسئلہ ہی نہایت اہم ہے۔ نہ صرف میرے یا آپکے لئے۔ بلکہ ہر فرد بشر کے لئے
اہم ہے۔ اس لئے کہ جب انسان کو شہرت کی حقیقت معلوم ہوگی، تو وہ سمجھ سکتا ہے کہ اُسے کس
طرح سے حاصل کرنا چاہیئے۔ میں خود ایک زمانہ میں شہرت کا طالب تھا۔ محض شہرت کی خاطر
تعلیم حاصل کی۔ اور بھی جو کام کیا شہرت کے لئے۔ بندہ انجینیر ہے۔ متعدد کتابیں اس فن میں تالیف
کیں۔ بہت سے مضامین اخبارات و رسائل میں لکھے۔ اس مُلک کے بہت سے مشہور پُل اور عمارتیں
بنائیں۔ علاوہ ازیں اپنے فن کے متعلق بہت کچھ تحقیقات کی ہے۔ سرکاری ملازمت میں بھی داخل
ہوا۔ بڑے بڑے اعزازات اور تمغے بھی حاصل کیئے۔ اور اب جیسا کہ آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں، بوڑھا ہوگیا

ہوں۔ لیکن یہ کالا کتا جو سامنے جا رہا ہے اسکے برابر بھی میرا معاملہ نہ ہوا۔

شخص مجہول۔ مگر یہ آپ نے کیسے کہہ دیا کہ ان تمام وسائل کے باوجود جو شہرت آپ کے مدنظر تھی وہ آپکو حاصل نہیں ہوئی۔

شمس الدین نخاس۔ امتحان کر لیجئے۔ ابھی معلوم ہو جائیگا۔ آپ شمس الدین نخاس نامی شخص کو جانتے ہیں؟

شخص مجہول (تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد) نہیں۔ میں نے یہ نام کبھی نہیں سنا

شمس الدین نخاس۔ قبلہ آپ اس ملک کے نہایت تعلیم یافتہ اور باخبر لوگوں میں سے ہیں۔ اور میرے خیال میں بہن شریف بھی سانڈ کے گاؤں بھاگ سے پھر بھی آپ نے میرا نام کبھی نہیں سنا۔ بات یہ ہے کہ میں نے اندھا دھند شہرت کا پیچھا کیا۔ اسکا صحیح راستہ کبھی اختیار نہیں کیا

شخص مجہول۔ اور اسکا صحیح راستہ کونسا ہے؟

شمس الدین نخاس۔ بخدا مجھے معلوم نہیں۔ آپ ہمیں کے علم و دانش۔ قابلیت و استعداد عقل و منہ موقع شناسی۔ حسن معاشرت بڑے بڑے ہوٹلوں میں ٹھہرنا۔ عالیشان عمارتوں میں رہنا۔ مگر واللہ ان میں سے ایک بھی نہیں ہمارے بعض ساتھی جو نہ بڑے عقلمند تھے نہ اہل علم۔ نہایت سست قدم سے آگے بڑھے لیکن آج وہ دنیا کے بڑے سے بڑے آدمیوں میں شمار ہوتے ہیں، اور انکا اسم مبارک اخباروں، رسالوں اور کتابوں کی زینت بنتا ہے۔ ایک واقعہ جو خود مجھ پر گذرا، وہ سناتا ہوں،

کئی برس ہوئے کہ اسی شہر میں جہاں آپ ہم چل رہے ہیں میں ایک پل بنانے پر مامور کیا گیا تو وحشت تنہائی سے تنگ آکر میں نے چاہا کہ وہاں کی خوش جمالوں میں سے اپنے لئے ایک مونس انتخاب کروں خوبی قسمت کہ ایک ایکٹرس سے شناسائی ہوگئی۔ یہ عورت انتہا درجہ کی بیوقوف جاہل اور لالچی تھی۔ اکیلی چار آدمیوں کا کھانا، اور چھ آدمیوں کی شراب ڈکار جاتی۔ نہایت مبتذل ناچ اسے آتے تھے۔ لیکن گلا غضب کا پایا تھا۔ لوگ اسکی خوش آوازی اور خوش حرکاتی پر مٹے ہوئے تھے۔ اور سب پر قیامت اسکا کوتاہ لباس تھا کہ جو تھا وہ دل بدست و دست بر دل، نیازمندوں کی فہرست میں نام لکھانے کے لئے چلا آتا تھا۔ اسی لئے اسے "ادیب ایکٹرس"، کہتے تھے۔ قصہ مختصر میرے اور اسکے درمیان روابط و مراسم اس درجہ بڑھ گئے کہ وہ میری "باضابطہ دوست" ہوگئی۔ جب پل بن چکا تو حکومت نے اسکی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک جلسہ کیا۔ جس میں ملک کے اکابر و اعیان کو دعوت شرکت دیگئی۔ اس جلسے میں وزرا۔ امرا۔ علما۔ ادیب۔ پروفیسر۔ اخبار نویس، غرض ہر معزز طبقہ کے لوگ بلائے گئے۔ لوگوں نے تقریریں کیں۔ قصیدے پڑھے۔ ہر طرف سے مبارکباد کے تار آئے۔ میں پہلے ایک گوشہ میں

بیٹھا ہوا خود بخود شرما رہا تھا کیونکہ میرا خیال تھا کہ سب کی نظریں مجھ پر پڑ رہی ہیں۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ مجھے دھوکا ہوا۔ گورنمنٹ کے چند عہدہ داروں کے سوا کوئی مجھے پہچانتا بھی نہ تھا۔ سب کے سب پل کی خوبصورتی اور مضبوطی پر تحسین و آفریں کر رہے تھے مگر کسی نامراد نے یہ نہ سوچا کہ یہ عمارت از خود وجود میں نہیں آگئی، آخر اسکا بنانے والا بھی کوئی ہے! میں اس واقعہ سے اس درجہ متاثر ہوا کہ جی میں کہتا تھا "کاش میں ایک جاہل مزدور ہوتا! کاش کوئی راستہ مل جائے تو ان کمبخت جاہل احمقوں میں سے بھاگ جاؤں"۔ اسی اثنا میں لوگوں میں ایک حرکت پیدا ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ گردنیں دراز ہو گئیں اور لوگ کسی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ دیکھتا کیا ہوں کہ وہی ہماری ایکٹرس صاحبہ تشریف لا رہی ہیں اور اسکی مبتذل حرکات کے شیدائیوں کا ایک ہجوم پیچھے پیچھے ہے۔ اسکے بعد موضوع گفتگو فقط یہ رقاصہ تھی۔ پل کو سب بھول گئے۔ میں نے اپنے کانوں سے سنا کہ ایک شخص نے میری طرف اشارہ کرکے اپنے ہمراہی سے کہا:- "سنا ہے یہ شخص اسکا بڑا دوست ہے۔ اسکے لئے پانی کی طرح روپیہ بہاتا ہے"۔ ایک اور صاحب میرے قریب آکر فرمانے لگے:- "آپ کو معلوم ہے یہ قتالۂ عالم کون ہے؟ واللہ- آرٹ کی روح ہے۔ اسٹیج کا آفتاب ہے"۔ میں نے پوچھا "آپ کو معلوم ہے یہ پل کس نے بنایا ہے"؟ بولے "کسی انجنیر نے بنایا ہوگا"۔ میں نے پوچھا "یہ شہر کا ہسپتال۔ یہ یونیورسٹی ہال اور یہ عظیم الشان مسجدیں کس نے تعمیر کی ہیں"؟ کہا:- "مجھے کیا خبر"۔ پھر میں نے پوچھا:- "کیا قابل ترین پروفیسروں، جید فاضلوں اور بہترین ادیبوں سے آپ واقف ہیں؟" جواب دیا "نہیں"۔ میں نے کہا "اچھا اس حسینہ کے ساتھی کو جانتے ہو؟" کہا "جی ہاں سنا ہے اسکا نام شمس الدین نحاس ہے"۔ اس گفتگو کا مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ شدید بخار چڑھ آیا اور میں نے فوراً گھر کی راہ لی۔

جب بخار سے نجات ملی تو میں نے اپنے جی میں سوچا کہ یہ واقعہ ہمیشہ میرے نام کے ساتھ مشہور رہیگا جب تک یہ پل باقی ہے میرا نام بھی باقی ہے۔ گویا اب میرے لئے بقاے دوام کا سامان ہو گیا۔ سب اخبارات جلسہ کے ذکر کے ضمن میں میرا نام بھی عزت سے لینگے اور اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ میں کل ہی سے نامورانِ ملک میں شمار ہونے لگونگا۔ اگلے دن صبح اٹھتے ہی ہر اخبار کا ایک ایک پرچہ خریدا اور بڑے غور سے پڑھنا شروع کیا۔ کل جلسہ کا ذکر سبھی میں درج تھا۔ "اسٹیج کے آفتاب" کی تشریف آوری اور اسکی خوش حرکاتی سے شروع کرکے اُسکے خط و خال اور حسن و جمال کی تعریف میں کئی کئی کالم سیاہ کر ڈالے تھے۔ جس شے کا کہیں نشان نہ تھا وہ صرف اس حقیر کا نام تھا۔ میں نے اپنے جی میں کہا، خیر کیا مضائقہ ہے۔ حصولِ شہرت کے لئے دوسرا راستہ میرے لئے کھلا ہوا ہے۔ کیونکہ میونسپل کارپوریشن نے اعلان کیا تھا کہ کارپوریشن ایک نہایت عظیم الشان عمارت بنانا

چاہتی ہے۔ انجینیر صاحبان اپنے اپنے نظریہ کے مطابق نقشہ بنا کر بھیجیں جس کا نقشہ پسند کیا جائیگا اسے نہایت معقول صلہ دیا جائیگا۔ جس طرح اور انجینیروں نے نقشے بھیجے تھے میں نے بھی بھیجدیا۔ مجھے پہلے سے یقین تھا کہ یہ گران بہا صلہ توانشاء اللہ میرے ہی حصے میں آئیگا۔ چنانچہ جب ان نقشوں پر غور لئے جانے کا وقت قریب آیا تو میں پائے تخت کی جانب روانہ ہوگیا۔ حسن اتفاق کہوں یا سوء اتفاق اس سفر میں بھی "ادیب ایکٹرس" کا ساتھ ہوگیا۔ راستہ بھر سوائے کھانے اور شامپین اڑانے کے ہم نے کچھ نہ کیا۔ حتے کہ پائے تخت میں پہونچ گئے اور ایک بہترین ہوٹل میں قیام کیا۔ اگلے دن میری توقع کے مطابق کارپوریشن نے وہ صلہ مجھ ہی کو عنایت فرمایا۔ اس واقعہ سے میں اس درجہ مسرور ہوا بیان نہیں کرسکتا۔ بیتاب تھا کہ کسی طرح صبح ہوجائے تو دیکھوں کہ اخبارات نے اسکے متعلق کیا لکھا غرض وہ دن تمام ہوا صبح ہوتے ہی تمام اخبارات خریدکر اپنے ہوٹل پہونچا۔ ایک اخبار کھولا لکھا تھا آرٹ کی روح۔ اسٹیج کا آفتاب" ادیب ایکٹرس کل پائے تخت میں وارد ہوئیں۔ اس دفتر کے جملہ رکن انکے ورود مسعود پر خوش آمدید کہتے ہیں اور آرزومند ہیں کہ موصوفہ محترمہ یہاں زیادہ سے زیادہ زمانہ تک قیام فرمائیں تاکہ اہالی پائے تخت بہترین نمائش فن اور خوشترین نغمات موسیقی سے لطف اندوز ہوسکیں"۔ دوسرا، تیسرا، چوتھا اور پانچواں بھی انھیں خرافات سے پر تھا۔ البتہ پانچویں نے موصوفہ کی تعریف و تمجید مبالغہ کی آخری حد تک پہونچادی تھی۔ مگر میرا نام کسی ایک میں بھی نہ تھا۔ ہاں ایک اخبار میں جو نسبتاً غیر معروف تھا صرف یہ ناقص و دم بریدہ عبارت درج تھی "میونسپل کارپوریشن نے نقشۂ عمارت کا صلہ . . . . . کو عنایت کیا ہے" لیکن شمس الدین نحاس کے بجائے قمرالدین نقاش لکھا تھا۔ میں نے جھنجھلا کر اخبارات ایک طرف پھینک دئیے۔ میز پر سے شامپین کی بوتل اٹھا کر ڈاٹ کھولی اور آخری قطرہ تک غٹ غٹ چڑھا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گہری نیند مجھ پر طاری ہوگئی۔

پائے تخت سے ہماری واپسی کے وقت اخبارات نے ہمارے روز ورود کی طرح پھر کالم کے کالم "ادیب ایکٹرس" کی مدح و ثنا میں رنگ ڈالے۔ مگر اس دفعہ مسرت و شادمانی کے بجائے رنج و افسوس کا اظہار تھا۔ اسکے بعد "موصوفہ محترمہ" کو طول حیات اور دوام عافیت کی دعائیں دی تھیں۔

اس واقعہ کے ایک مہینے بعد دوبارہ ایک مرکزی شہر میں وہاں کے عجائب خانے کے ملاحظہ کے لئے دعوت دی گئی۔ وہاں میں اپنے فرائض منصبی کو نہایت حسن و خوبی سے انجام دیکر روزانہ اس موضوع پر مفید اور دلچسپ تقریر کیا کرتا تھا۔ اخبارات، جیسا کہ انکا قاعدہ ہے، ہر روز وفات۔ شادی خانہ آبادی وغیرہ کے متعلق خبریں چھاپتے۔ اور چور۔ ڈاکو۔ بدمعاش۔ عیار۔ گویئے۔ شعبدہ باز۔ تماشا والے

پیر۔ فقیر۔ مجذوب۔ دنیا بھر کے لوگوں کا ذکر کرتے۔ مگر کسی کمبخت نے میری مفید تقریروں۔ اور اصلاحات کے متعلق کبھی ایک لفظ بھی نہ لکھا۔ ہاں صاحب ہمارے قومی اخبارات مہمل اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور بڑی تشریح و تفصیل کے ساتھ انکا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن اہم مسائل اور مفید موضوعات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے بلکہ انکی جانب متوجہ ہی نہیں ہوتے۔ ایک دن میں ٹرام میں سوار ہوا۔ اتفاق سے ٹرام ہر طبقہ کے مرد و زن سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ اتنی آواز سے کہ سب سن سکیں۔ میں نے ایک شخص سے جو میرے پاس بیٹھا ہوا تھا پوچھا کہ "میں نے سنا ہے کہ میونسپل بورڈ نے شہر کے عجائب خانہ کی اصلاح کے لئے ایک انجینیر بلایا ہے۔ آپ اس انجینیر کا نام جانتے ہیں" کہا "نہیں" دوسروں کی صورت سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی یہی جواب دینگے۔ میں نے کہا "سنا ہے وہ بڑے مفید اور پُرازمعلومات لکچر دے رہا ہے" سب نے شانے ہلا کر کہا "ہمیں کیا" میں بھی خاموش ہو گیا اور کچھ نہ کہا۔ یکایک میں نے دیکھا کہ جو شخص میرے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے میرا بازو ہلا کر کہا "دیکھنا! دیکھنا! یہ آدمی جو فٹ پر سوار ہوا۔ جانتے ہو یہ کون ہے؟" میں نے کہا "نہیں تو" بولے "واہ۔ شہرۂ آفاق کُشتی گیر، پہلوان رضا کو نہیں جانتے" ابھی اس نے اپنی بات ختم نہیں کی تھی کہ تمام لوگ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور اُچک اُچک کر ایک دوسرے کے پیچھے سے پہلوان رضا کو دیکھنے لگے۔ اسکے بعد ٹرام میں کشتی اور پہلوانوں کے ذکر کے سوا اور کوئی ذکر ہی نہ تھا۔

مجھے ڈر ہے کہ مبادا آپ اُکتا جائیں۔ ورنہ بہت سے ایسے واقعات آپ کو سناتا کہ جن سے آپ کو معلوم ہو جاتا کہ ہماری قوم کیسی جاہل و احمق ہے۔ کیا قیامت ہے کہ علما و فضلا تو گوشۂ گمنامی میں پڑے زندگی بسر کریں اور گمنامی ہی میں مر جائیں اور ہر جاہل جس نے چار باتیں کہدیں اور کچھ بے معنی اور لغو چیزیں شائع کر دیں بس وہ ادیب و مقرر سمجھا جائے اور ہر عیارہ و آبرو باختہ مغنیات روزگار ہیں سے شمار ہو۔ ابھی نحاس نے گفتگو ختم نہ کی تھی کہ گاڑی اسٹیشن پر پہونچ گئی۔ لوگوں نے عجلت اور گھبراہٹ کے ساتھ گاڑی میں سے نکلنا شروع کیا۔ کچھ لوگ کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر ایک شخص کو دیکھنے لگے جو گاڑی ہی میں بیٹھا ہوا تھا۔ پھر اور لوگ بھی آگئے کھڑکی کے آگے ہجوم ہو گیا اور ہر شخص اُچک اُچک کر اور گردن بڑھا کر اسکو بڑے اشتیاق سے دیکھنے لگا۔ شمس الدین نے ایک آدمی سے پوچھا "کون ہے"؟ بولا "خوب۔ ارے تم اتنے مشہور ڈاکو عباس مشہدی کو نہیں جانتے؟ اسی نے تو......" نحاس نے اسکی باقی گفتگو پر اعتنا نہ کرکے اپنے ہمراہی سے کہا "سبحان اللہ! دنیا بھر کے چوروں، ڈاکوؤں کو تو سب جانتے ہیں مگر ملک کے ایک بزرگ دانشمند اور ریفارمر ت

کوئی بھی واقف نہیں، کیا یہ بدبختی نہیں ہے؟"

شخص مجہول۔(مسکراکر) میں نے آپ کی تمام گفتگو نہایت توجہ اور لطف کے ساتھ سنی۔ اب مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ سے ایک سوال کروں۔ آپ علی عباس نامی کسی شخص سے واقف ہیں؟۔

نخاس۔ جی نہیں۔!

شخص مجہول۔ یہ میرا نام ہے۔ بندہ پینتیس برس تک پائے تخت کے دارالفنون میں طبیعیات کا پروفیسر اور دیگر مقامات میں بھی علمی سوسائٹیوں کا ممبر رہا ہے۔

نخاس نے طیش میں آکر اپنا ہونٹ کاٹ لیا۔ اسکے بعد دونوں ایک دوسرے کو دیکھکر قہقہے لگانے لگے۔

زمانہ تو کبھی کسی کے لئے بھی یکساں نہیں رہتا لیکن زمانۂ سابقہ و زمانۂ حالیہ میں بین فرق یہ ہے کہ اگر گذشتہ صدی کا زمانہ دوڑتا تھا تو اس صدی کا زمانہ اُڑتا ہے (واللہ اعلم آیندہ صدی کا زمانہ کیسا گذرے گا؟) جب زمانہ میں ٹیلیفون اور موٹر کار نہ تھے ہر شخص اپنا کام خوب سوچ سمجھکر اطمینان سے کرتا تھا مگر اس زمانہ میں جبکہ وائرلیس اور ایروپلین ہیں۔ ہر شخص اپنے کام کے سوچنے سمجھنے میں زیادہ وقت صرف نہیں کرسکتا بلکہ جلد جلد اپنے کام کرنے پڑتے ہیں ورنہ نقصان اُٹھانا پڑتا ہے۔ لہذا جس قدر انسان کی ذات اور بات سریع السیر ہوتی ہے اسی قدر اس کی خواہشات بھی نہ صرف وسیع بلکہ تعداد زیادہ ہوتی جاتی ہیں۔ اور ان میں سے جتنی خواہشات پوری ہوسکتی ہیں ان کی تعداد کم ہوتی جاتی ہے کیونکہ ہر دس سال میں ہر مہذب ملک کی مردم شماری کے اعداد بالعموم زیادہ ہوتے جاتے ہیں اور ذرائع قوت بشری کی تعداد نسبتاً کم ہوتی نظر آتی ہے۔ لہذا مقیاس راحت جہاں پہلے بیس بٹے سو تھا وہاں پچیس بٹے دو سو ہوتا ہوا پایا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں انسانوں کے لئے اس سے بہتر کیا طریقۂ عمل ہوسکتا ہے کہ سادہ زندگی اور بلند خیالی اختیار کریں۔ تاریخ و اقتصادیات کے دفتر اسکے فوائد پر شاہد ہیں جن کی صراحت اس وقت باعث طوالت او تکمیل حاصل ہوگی۔

نواب امین جنگ بہادر

تنقید کتب

لالہ لاجپت رائے مرحوم کے تاریخی تصنیفات

(از پنڈت لکشمی کانت ترپاٹھی صاحب - ایم - اے)

لالہ لاجپت رائے مرحوم کے دل ؛ دماغ کی قابلیتون اور اُنکی حب الوطنی و اولوالعزمی کی تعریف قریب قریب سبھی اخبارون نے کی ہے اور ہرشخص اُنکی مُلکی خدمات کا معترف ہے - عام طور پر اُنکی زبردست علمی لیاقت سے بھی مُلک آگاہ ہے - لیکن لالہ جی کی قابلیت کے ایک خاص پہلو پر بہت کم روشنی ڈالی گئی ہے - لالہ جی تاریخ کے ایک زبردست عالم تھے - آپ کو صرف اپنے مُلک کی تاریخ پڑھنے ہی کا شوق نہ تھا - بلکہ زندگی بھر آپ اُسکی تحقیقات و جستجو مین مشغول رہے - امریکہ - جاپان - انگلینڈ وغیرہ غیر ممالک مین بھی جاکر آپ نے مختلف قومون کی معاشرت و تاریخی حالات کا مطالعہ و مشاہدہ کیا اُن سے اپنے ہندوستانی تمدن کا مقابلہ کیا جس سے آپ کا نقطۂ خیال بہت وسیع و رفیع ہو گیا - غرض جو اوصاف ایک مورخ مین ہونا چاہیے وہ سب آپ مین موجود ہو گئے تھے - گو آپ کو اتنا وقت نہین ملا کہ فرصت و اطمینان سے کسی یونیورسٹی پروفیسر کی طرح تاریخ کو بطور فن پڑھتے اور اُسکی اہم گتھیون کو سُلجھاتے تاہم آپ نے اپنی زندگی مین جس قدر باقاعدہ تاریخ کا مطالعہ کیا تھا اُتنا بہت کم رہنمایانِ مُلک نے کیا ہوگا - آپ کا اعتقاد تھا کہ مُلک کی قدیم تاریخ ہی کی امداد سے آیندہ زمانے کی تاریخ بنائی جاسکتی ہے - اور قدیم کارنامون کی واقفیت زمانۂ حال کے ہندوستان مین بھی حیات تازہ پیدا کر سکتی ہے - اشوک - ہرش - شیواجی اور رانا پرتاب کی مثالین بہت سی سیاسی گتھیان سُلجھا سکتی ہین - کبیر اور تلسی داس زمانۂ موجودہ کے شعراء کی رہنمائی کر سکتے ہین - پُرانی تہذیب آج کل بھی قومی ترقی کے راستے مین ہماری مُعین و مددگار ثابت ہو سکتی ہے - اسکے ساتھ ہی لالہ جی کا یہ خیال ہرگز نہین تھا کہ ہمارے قدیم دلاور اور حکمران - شاعر اور مذہبی رفارمر عیب یا نقص سے بالکل بچے تھے - وہ اپنے زمانے کی رفتار کے مطابق تھے - اور اپنے وقت مین اُن سے بھی بعض اُمور مین غلطیان سرزد ہوئی ہین - عموماً وہ بھی اپنے زمانے کے خیالات سے اونچے نہ اُٹھ سکے - مگر اُن نقائص کے ہوتے ہوئے

لہ ۱ - تاریخ ہند حصہ اوّل - (پراچین آرین تہذیب کا حال)

۲ - مہاراجہ اشوک - قیمت ۱۲/

۳ - شیواجی (جدید ایڈیشن) قیمت ۱۲/

پبلیشرز لاجپت رائے - پرتھوی راج ساہنی - لاہور

بھی اُنھون نے جو کچھ کیا وہ ہمارے لیے بہت کچھ سبق آموز ہے۔

لالہ جی نے تاریخ ہند کے متعلق بہت سی کتابین لکھی ہین۔ اُن مین سے اس وقت تین ہمارے سامنے ہین۔ پہلی کتاب تاریخ ہند کا پہلا حصہ ہے۔ جس مین ابتدا سے لے کر تقریباً سنہ ۱۲۰۰ء تک کا حال قلمبند کیا گیا ہے۔ لالہ جی خود قبول کرتے ہین کہ مین نے اس زمانے کے انگریزون اور ہندوستانی مصنفون کی لکھی ہوئی کتابون ہی کی مدد سے یہ تاریخ مرتب کی ہے۔ آپ نے واقعات کا سلسلہ ڈاکٹر ونسنٹ اسمتھ مرحوم کی مشہور کتاب (EARLY HISTORY OF INDIA) کے مطابق رکھا ہے۔ مگر آپ نے اُن کی ہر ایک بات مین نقل نہین کی ہے۔ تاریخ کے پڑھنے والون کو معلوم ہے کہ اسمتھ اپنی لیاقت اور استعداد کے باوجود اکثر اپنے انگریزی نقطۂ خیال سے قدیم ہندوستانی تہذیب کو دیکھنے سے باز نہین آتے۔ ایسے موقعون پر لالہ جی نے ہندوستانی مورخون کے نقطۂ نظر کے مطابق اسمتھ کی غلطیان درست کرنے کی کوشش کی ہے اور اہین بہت کچھ کامیاب بھی ہوئے ہین۔ آپ نے اس زمانے کی نہ صرف سیاسی بلکہ معاشرتی اور اقتصادی تاریخ بڑی خوبی سے لکھی ہے۔ کئی نقشے اور تصویرین بھی کتاب مین شامل ہین جن سے اسکی قیمت اور رونق بہت بڑھ گئی ہے۔ کتاب کے آخر مین پروفیسر جے چند ودیالنکار کی تیار کی ہوئی اس زمانے سے تعلق رکھنے والی کتابون کی مکمل فہرست بھی دی گئی ہے۔ بہرحال اُردو مین یہ کتاب اپنے طرز کی ایک نئی اور قابلِ قدر کتاب ہے۔

لالہ لاجپت رائے کی دوسری تصنیف مہاراجہ اشوک نامی بھی زیادہ تر اسمتھ کی کتاب اشوک پر مبنی ہے۔ اس کتاب مین ہندوستانی ہی نہین بلکہ دنیا کے سب سے بڑے بادشاہ مہاراج اشوک کے مفصل حالات درج ہین۔ اسکے پڑھنے سے موریہ تہذیب کا صحیح صحیح نقشہ آنکھون کے سامنے پیش ہو جاتا ہے۔ بدھ مذہب کس طرح تمام ممالکِ ہند مین پھیلا۔ مہاراج اشوک نے کس جانفشانی سے اتنی بڑی سلطنت پر چالیس سال تک حکومت کی۔ اسکا مفصل ذکر اس کتاب مین موجود ہے۔ لائق مصنف نے حسبِ موقعہ اشوک کے متعلق مختلف نامور مورخون کی رایون کا بھی مقابلہ کیا ہے جو نہایت مفید ہے۔

۳ - مہاراج چھترپتی سیواجی کی سوانح عمری لکھنے مین بھی لالہ جی کو پوری کامیابی ہوئی ہے۔ آپ نے پروفیسر جادو ناتھ سرکار کنکیڈ گرینٹ ڈف۔ راناڈے۔ سر رمیش چندر دت۔ سین گپتا۔ تاکاکھاو رانسن وغیرہ تمام جدید مورخون کی انگریزی کتابون سے اسمین مدد لی ہے۔ اور سیواجی کی عظمت

کی مکمل تصویر کھینچ کر رکھدی ہے۔ سیواجی کی بلند ہمتی و الوالعزمی، جوانمردی و دلیری اور قابل قدر ہوشیاری اور سیاسی استعداد کا آپ نے نہایت دلچسپ پیرائے مین ذکر کیا ہے۔ جا بجا آپ نے سیواجی کے کارنامون کا اس اثرانداز طریقے سے بیان کیا ہے جس سے پڑھنے والے کے دل مین ایک جوش سا پیدا ہو جاتا ہے۔ اسکے ساتھ ہی لطف یہ ہے کہ مورخ کے فرائض سے چشم پوشی نہین کی ہے اور سیواجی کی کمزوریان دکھانے مین بھی کمی نہین کی ہے۔ بعض قابل دید تصاویر اور نقشے بھی اس کتاب مین دئے گئے ہین جنکی بدولت اسکی عام دلچسپی مین کافی اضافہ ہوگیا ہے۔

الغرض یہ تینون کتابین اس قابل ہین کہ ہر ہندوستانی کو انکا مطالعہ کرنا چاہیے۔

اقبال کی خامیان

از حضرت جرّاح سیدولی تقطیع - حجم ۶۰ صفحات - قیمت ۹ر
ملنے کا پتہ - بابو نوہر یا رام دردد - دفتر اخبار "ریش" لاہور

ڈاکٹر اقبال کے کلام مین بعض زبان کی خامیان پائی جاتی ہین، لیکن ان خامیون کے باوجود انکا کلام اردو شاعری کے ارتقائی دور کی ایک زندہ مثال ہے۔ کچھ مدت ہوئی کہ حضرت جرّاح نے کلامِ اقبال کی خامیون پر اپنا نشتر تیز کیا تھا اور اخبار "پارس" لاہور مین ایک سلسلۂ مضمون شائع کرا کے داد نکتہ سنجی دی تھی۔ زیر نظر رسالے مین وہی مضمون کتابی صورت مین پیش کیا گیا ہے۔

اقبال کے یہان زبان کی جو لغزشین پائی جاتی ہین اسپر اب سے پہلے ملک کے بعض اہل نظر حضرات اور نقادانِ فن بہت کچھ لکھ چکے ہین۔ حضرت جرّاح کو یہ دیکھکر یقیناً مایوسی ہوئی ہوگی کہ اقبال کے کلام مین جو محاسن ہین اُن کے مقابلے مین چند خامیان کوئی وقعت نہین رکھ سکتین۔ اور ان خامیون کے نمایان کرنے سے اقبال کی شہرت و عزت پر کوئی اثر نہین پڑ سکتا۔ اس لئے حضرت جرّاح کی نشتر زنی سعی مشکور نہین کہی جا سکتی۔

وقارِ حیات

مرتبہ مولوی محمد اکرام اللہ خان ندوی شاہجہانپوری۔ کتابت و طباعت عمدہ حجم ۵۴۰ صفحات
قیمت فی جلد پانچ روپیہ - ملنے کا پتہ معتمد دفتر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سلطان جہان منزل علی گڈھ

نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین خان بہادر ان برگزیدہ افراد مین سے تھے جو محنت و جانفشانی اور استبازی و دیانت داری کے ساتھ بے غرضانہ اپنے ملک و قوم کی خدمت کرتے ہین۔ اور آنے والی نسلون کے واسطے ایک ایسا جادۂ عمل

بنا دئیے ہین جس پر چل کروہ بھی نیکنامی اور عزت حاصل کرسکتے ہین۔ نواب صاحب مرحوم نے سرکاری ملازمت کے بعد جس قدر ملکی و قومی خدمت کی اور جس نیک نیتی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دئے اُن سے تعلیم یافتہ طبقہ خصوصیت سے واقف ہے اور عوام بھی اُن کے نام سے کسی نہ کسی حد تک ضرور آگاہ ہین۔

نواب صاحب موصوف کی ذات درحقیقت مجمع الصفات تھی محنت وجفاکشی اور صداقت و راستبازی انکے وہ اخلاقی جوہر تھے جنکی بدولت انھون نے اس قدر عزت و شہرت حاصل کی پہلے سرکاری ملازمت مین رہے پھر درجہ بدرجہ ترقی کرنے کے بعد ریاست حیدرآباد دکن مین ریونیو سکریٹری کے عہدے پر ممتاز ہوئے اور نواب وقارالدولہ وقارالملک انتصار جنگ بہادر خطاب پایا حیدرآباد کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ایم۔ اے۔ او کالج علی گڈھ کے آنریری سکریٹری کے فرائض انجام دئے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے آنریری سکریٹری بھی رہے غرض ملکی و قومی تحریکات مین حتی الامکان زیادہ سے زیادہ حصہ لیا۔ اور اپنے فرائض کو نہایت عمدہ طریقے سے انجام دیا۔

اس مبسوط کتاب مین نواب صاحب موصوف کے ذاتی حالات، سرکاری ملازمت، ریاست حیدرآباد سے تعلق، ملکی اور قومی خدمات، غرض انکی زندگی کے ہر پہلو پر ایک مفصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ مختلف کتب، اخبار، نجی خط وکتابت، مقدمات کی روداد وغیرہ سے حالات و واقعات نہایت محنت سے اخذ کئے گئے ہین اور محض جو کچھ مواد ہاتھ آیا اسکو بجنسہ نقل نہین کرلیا گیا بلکہ تحقیق کے بعد مستند واقعات کو لیا گیا ہے۔ یہ ایک عام بات ہے کہ ہر آدمی مین خوبیون کے ساتھ کچھ نہ کچھ کمزوریان بھی ہوتی ہین جو فطرتِ انسانی کا مقتضاء ہے۔ نواب صاحب مین بھی کچھ کمزوریان تھین اور مؤلف نے محاسنِ اخلاق کے ساتھ اخلاقی کمزوریون کا بھی ایک باب قائم کرکے ان پر تبصرہ کیا ہے۔

یہ کتاب اگرچہ بظاہر نواب صاحب موصوف کی سوانحعمری ہے لیکن حقیقت مین مسلم لیگ و علی گڈھ کالج کے متعلق بہت سی قابلِ قدر باتین ضمناً بیان کی گئی ہین جن سے اس ملکی و قومی تحریک پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت پر ہندوستانی اکاڈمی صوبۂ متحدہ الہ آباد کی جانب سے مبلغ پانچ سو روپیہ انعام دیا گیا ہے۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے اس کتاب کو شائع کرکے اپنا ایک قومی فرض انجام دیا ہے اور ہر اُس شخص کے لئے جو ملکی و قومی کام کرنے والون کے حالات معلوم کرنے اور اُن سے سبق حاصل کرنے کی خواہش رکھتا ہو اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

تاریخ ہند

ازمنۂ وسطیٰ کے معاشرتی و اقتصادی حالات[1]

از پنڈت لکشمی کانت ترپاٹھی صاحب ایم - اے

ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد اُردو اور ہندی زبانوں کی ترویج و اشاعت مین ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔ نئی تصانیف و تراجم اور مطبوعات کی قدر دانی کے علاوہ مفید و دلچسپ موضوعات پر قابل اصحاب سے لیکچرز دلانے کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ علمی مطالب پر تقریرون کے واسطے اکاڈمی کے ہر دلعزیز لائق صدر ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرُو نے گزشتہ دو سال سے متواتر بیش قرار رقوم عطا فرمائی ہین - اور انھین عطیات کے بدولت آج ہمکو بعض ضروری تاریخی عنوانون پر قابل قدر لیکچرز میسر ہین - یہ کتاب جو اس وقت ہمارے سامنے ہے اُن لیکچرز کا مجموعہ ہے جو علامہ عبد اللہ یوسف علی صاحب نے ۲ - ۳ - اور ۴ - مارچ ۱۹۲۸ء کو ہندوستانی اکاڈمی کی سرپرستی اور صدر موصوف کی صدارت مین الہ آباد مین دئے تھے -

عبد اللہ یوسف علی صاحب اس صوبے مین کئی ضلعون مین آئی سی - ایس - کے اعلےٰ افسر رہ چکے ہین اور آپ کی تاریخی استعداد کا ثبوت ہمیشہ تاریخ پڑھنے والون کو ملتا رہا ہے - ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ کے متعلق آپ کی قابلیت خصوصًا بہت زیادہ ہے - ہندوستانی اکاڈمی مستحق مبارکباد ہے - کہ ایسے قابل شخص کو ازمنۂ وسطیٰ کی تہذیب پر تقریر کرنے کی دعوت دی - ابھی تک زیادہ تر تاریخ کے سیاسی پہلو پر ہی زور دیا جاتا ہے اگرچہ اس مین کوئی شک نہین کہ تاریخ سیاسی حالات ہی پر زیادہ مبنی ہے - مگر صرف پولیٹکل ہسٹری خواہ وہ کتنی سچی کیون نہ ہو - کبھی تاریخ کے کامل فرض کو ادا نہین کر سکتی - ایک بات اور بھی ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ کی معاشرتی اور تہذیبی تاریخ ابھی تک اُردو اور ہندی زبانون مین کسی نے نہین لکھی - عہد مغلیہ پر کچھ مسالہ ضرور موجود ہے - مگر راجپوتون کی تہذیب کا نقشہ ابھی تک کسی لایق مورخ نے اردو مین نہین کھینچا البتہ ہندی مین اس زمانے پر کافی مسالہ موجود ہے - لائق مصنف نے ان تقریرون مین مہاراج ہرش وردھن کے دور سلطنت سے لیکر چودھوین صدی عیسوی یعنی تیمور کے حملے تک کا حال لکھا ہے - اگرچہ اس بات پر بحث ہو سکتی ہے کہ تاریخ ہند کے ازمنۂ وسطیٰ کا دور صرف انھین آٹھ نوسو برسون تک محدود رکھا جائے یا تمام عہد مغلیہ بھی

---

[1] از علامہ عبد اللہ یوسف علی ایم - اے - ایل ایل - ایم - سی - ای - آئی - حجم ۱۴۴ صفحات - قیمت عہ مطبوعہ ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد

شامل کرلیا جائے۔ یا صرف ۱۲۰۰ء سے ہی اسکا آغاز ہونا چاہئے۔ ہماری رائے مین اگرچہ عبداللہ یوسف علی صاحب نے مہاراج ہرش کے دورِ سلطنت سے ازمنۂ وسطیٰ کا آغاز درست کیا ہے۔ مگر اسے زبردستی اور بلا کسی قابل اطمینان وجوہات کے بتائے چودھوین صدی کے اختتام پر ختم کردینے مین کچھ زیادتی کی ہے۔ یہ کہنے کی کون جرأت کرسکتا ہے کہ تیمور کے حملے کے بعد ہندوستان مین اتنے تغیرات ہوئے کہ ایک نیا زمانہ آگیا اور پرانا ایکدم ختم ہوگیا۔ یہ سچ ہے کہ تیمور کے حملے سے تختِ دہلی کی بنیاد پوری طرح سے ہل گئی۔ مگر یہ کون کہہ سکتا ہے کہ اُسکی بنیاد پہلے ہی سے کمزور نہین ہوگئی تھی۔ تیمور کا حملہ دراصل اُسکی کمزوری کا ثبوت اور نتیجہ تھا نہ کہ سبب۔ اگر سلطنت مضبوط ہوتی تو جیسے علاءالدین خلجی اور دوسرے سلاطین نے مغلون کو ہندوستان مین قدم نہین جمانے دیئے۔ اسی طرح تیمور بھی شاید اتنی آزادی سے ہندوستان مین قتل۔ آگ اور وبا نہ پھیلا سکتا۔ ہماری رائے مین عبداللہ یوسف علی صاحب نے تیمور کے حملے پر اپنے قصے کو ختم کرنے مین ایک بہت وسیع اور طویل مضمون سے چشم پوشی کی ہے۔ مگر مین بلا توقف یہ کہہ سکتا ہون کہ مصنف ممدوح نے جس قدر زمانے کا ذکر کیا ہے وہ نہایت پُرمغز اور بیش قیمت ہے۔ آپ نے اس زمانے سے تعلق رکھنے والی بہت سی کتابون کا حوالہ دیا ہے اور بہت سا نیا مواد جمع کیا ہے۔ ہونسانگ کی کتاب۔ بان بھٹ کے ہرش چرتر۔ اور مہاراج ہرش کے ناٹکون سے لیکر اس زمانے کے اکثر کتبون اور سکون کی شہادت سے بھی مدد لی ہے۔ نہایت خوشی اور فخر کی بات ہے کہ کئی صدیون کے بعد اب پھر مسلمانِ عالم اس طرف متوجہ ہوئے ہین۔ اس مین شک نہین کہ اگر ہندو او مسلمان باہم ایک دوسرے کی تہذیب کا مطالعہ کرین تو اُن کی نگاہ زیادہ وسیع اور اُنکا دماغ تعصب سے پاک ہوجائے۔ اگر ہندوستانی اکاڈمی ہندوؤن اور مسلمانون اور ہندی اور اُردو کو ایک ہی پلیٹ فارم پر لا کر دونون مین کشادہ دلی اور باہمی عزت کے خیال کی نشو ونما کرسکے تو یہ ایک بڑی قومی خدمت ہوگی۔ کیونکہ ہندی اور اُردو کو ایک دوسرے کے نزدیک لانے کی کوشش کرنا اہلِ ہند کو حب الوطنی کا سبق دینا ہے۔ اس کتاب مین قابل مصنف نے نہایت عام فہم اور سلیس زبان استعمال کی ہے جو فائدے سے خالی نہین۔ الغرض عبداللہ یوسف علی صاحب کے یہ لکچر نہایت فصیح ہین۔ انکے پڑھنے سے مہاراج ہرش اور اُنکا دربار۔ سلطان بلبن و علاءالدین کا عہدِ حکومت اور اس زمانے کا عام منظر ہماری آنکھون کے سامنے آجاتا ہے۔ تصور تاریخ کی جان ہے۔ اور مصنف کو اُسکی تصویر کشی مین پوری کامیابی ہوئی ہے۔

لطیفیات ازجناب لطیفی بی۔ اے۔ چھوٹی تقطیع۔ حجم ۶۰ صفحات۔ کتابت وطباعت عمدہ۔ قیمت ۱۲ر ملنے کا پتہ۔ محمد علی عارف صاحب۔ ساکھی ہاؤس لدھیانہ

یہ مختصر کتاب جناب شیخ محمد حسن صاحب لطیفی بی۔ اے لدھیانوی کے شاعرانہ جذبات ومضامین کا

مجموعہ ہے۔ شروع مین حضرت نظیر لدھیانوی کا پنج صفحی مقدمہ اور مصنف کی تصویر بھی ہے۔

لطیفی صاحب ایک نوجوان طالب علم ہین جو ہنوز ایم۔ اے مین تعلیم پارہے ہین مگر شعر وسخن سے طبیعت کو لگاؤ ہے۔ اِس لیئے تعلیم کے ساتھ ساتھ مشقِ سخن بھی جاری ہے۔ انکے مقدمہ نگار صاحب لکھتے ہین کہ۔

انکی شاعری کی عمر سات آٹھ سال سے زیادہ نہین۔ مگر مذاقِ شعر شستہ اور لطیف ہے۔ ندرتِ خیال اور شکوہِ الفاظ کی بھی کمی نہین کیونکہ لطیفی صاحب الفاظ کے استعمال مین بہت کاوش کرتے ہین بعض اوقات انکے اشعار شگفتہ الفاظ اور نئی نئی تراکیب کی تلاش مین کئی کئی روز تک نامکمل رہتے ہین اور اس لیئے حضرت جوش ملیح آبادی و مرزا غالب مغفور دونون کے رنگِ سخن کا بلوہ مرتب لطیفی صاحب کے کلام مین موجود ہے"۔

اگر ہم یہ مان بھی لین کہ لطیفی صاحب کا مذاقِ سخن شستہ اور تخیل بلند ہے مگر جوش کا اندازِ بیان و اثر اور غالب کی معنی آفرینی و لطافتِ تخیل، نیز ہر دو کی شُستگیِ زبان، لطیفی صاحب کے یہان کہان آسکتی ہے! آج کل یہ دستور عام ہوگیا ہے کہ جہان کسی حضرت نے چند مشکل و مغلق الفاظ کو نظم کر دیا تو بس لوگ اسکو غالب ثانی کا خطاب عطا کرنے مین تحمل سے کام نہین لیتے۔ حالانکہ غالب کے طائرِ فکر کی پرواز تک رسائی تو کجا اُسکی بلندی کا صحیح اندازہ بھی اُن کو نہین ہوتا۔ یہی تو وہ حضرات ہین جنھون نے اردو کو ترکی تباہ دیا ہے اور اسکی سلاست و روانی اور جذب و اثر کو خاک مین ملادیا ہے۔ مندرجۂ ذیل اشعار ملاحظہ فرمایئے اور خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجیئے تو معلوم ہوگا کہ صرف الفاظ کا طلسم باندھنے سے غالب کی برابری نہین ہوسکتی۔

رُخ سے پردہ ماہ سیمانے ہے سرکایا ہوا
قلزمِ تنشیط ہے ہیجان مین آیا ہوا

ژرف تر تہ مین مگر رُوحِ سکوت آسودہ ہے
نشۂ خوابِ گران تر سے خمار آلودہ ہے

کاسۂ دریوزہ ہے تیرے مقابل جامِ جم
ننگِ آشامیدنِ مے ہے جے گلفامِ جم

جسمال جیدہ ہے ہر دیدۂ تماشائی
کہ توسنِ حسن کا دیدارِ عام آیا ہے

پہلے شعر کا مصرعۂ اولی اور آخری شعر کا مصرعۂ ثانی خالص پنجابی محاورہ ہے۔

مضامین نثر عموماً انگریزی سے ترجمہ کیئے گئے ہین جو تمام و کمال انگریزی طرزِ تحریر کے آئینہ دار ہین۔ مثلاً۔

"زندگی کے درمیان ہوتے ہوئے ہم موت کے مُنہ مین ہین"۔ مین نے کہا "کتنا سچ ہے"

"تمھارا کیا معاملہ ہے؟ کیا تم بیمار ہو؟" میری بیوی نے پوچھا۔

"نہاین مین بالکل تنگ دست ہون"۔ مین نے جواب دیا۔ لیکن مین ابھی ......"

غرض یہی اندازِ بیان ہے۔

اِن ہر تطیفات مین بعض لطیف و نفیس شعار بھی ہین اور اگر اس نوجوان شاعر کو کوئی شفیق اُستاد مل گیا تو امید کیجا سکتی ہے کہ آگے چل کر اُردو کے خوشگو شعرا مین اسکا شمار ہوگا۔

اِضطرابِ رُوح

ازجناب آنند نرائن مُلّا صاحب بی اے ایل ایل بی

(۱)

اِک زمانہ وہ بھی آتا ہے کہ ہر فردِ بشر
شاہ ہو یا بندۂ بیکس۔ غنی ہو یا فقیر
دہر کو اور اُس کی چیزوں کو سمجھتا ہے حقیر
جلوۂ موہوم کی مشتاق رہتی ہے نظر

(۲)

اک زمانہ وہ بھی آتا ہے کہ انساں کی ہوس
لذّتِ کون و مکاں سے سیر ہوتی ہی نہیں
چاہتی ہے چھوڑ کر دنیا کو اُڑ جائے کہیں
طائرِ دل کو جہاں معلوم ہوتا ہے قفس

(۳)

اِک زمانہ وہ بھی آتا ہے۔ کہ عز و جاہ و مال
سب میسّر ہیں مگر تسکینِ جاں ہوتی نہیں
آرزو جو دل میں ہے۔ دل پر عیاں ہوتی نہیں
شوق دکھلاتا ہے اک دھندلی سی تصویرِ خیال

(۴)

اِک زمانہ وہ بھی آتا ہے کہ ساماں عیش کے
سب بہم ہیں۔ صحبتِ یاراں مگر بھاتی نہیں

شکلِ راحت بھی جمالِ شوق دکھلاتی نہیں
دل ترستا ہے نہ جانے کس تجلی کے لئے

(۵)

اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی دلیل اس بات کی
خواب ہستی کے لئے بیداری فردا بھی ہے
اپنی دنیا کے علاوہ اور اک دنیا بھی ہے
چشم بینا دیکھ لیتی ہے جھلک جسکی کبھی،

(۶)

دل میں انساں کے جو اک کیفیتِ سیماب ہے
کوئی جلوہ اور دامانِ عدم میں ہے نہاں
ختم دنیا پر نہیں ہے زندگی کی داستاں
روح کیا اپنے وطن کی یاد میں بیتاب ہے

تعریف صوم

حضرت ریاض خیرآبادی

روزے نہیں ہیں سخت، یہ سب باتیں ہیں
ہاں لطف فزا شب کی ملاقاتیں ہیں
یاروں میں مہِ صوم کی تعریف یہ ہے
کچھ ہجر کے دن، وصل کی کچھ راتیں ہیں

حقیقت نگاری

از مولوی ابوالکمال سید عبدالودود صاحب آرزو بریلوی

شاعروں کا اور ادیبوں کا یہ فرضِ اولیں ہے
ہے کہ لکھنے میں نہ ہٹ جائیں حقیقت سے کہیں
جو بھی ہو موضوع، گو وہ عام ہو یا خاص ہو
رہنما تحریر میں اس کے فقط اخلاص ہو
ہو حکایت یا روایت یا ہو کوئی فلسفہ
دیکھ کر منظر کوئی پیدا ہو دل میں ولولہ
یا کہ ابنائے زمانہ کی شکایت ہو کوئی
یا کہ اپنی قوم کے حق میں ہدایت ہو کوئی
یا کہ کوئی واقعہ جو کچھ سبق آموز ہو
یا کہ حکمت کا کوئی نکتہ جو عقل افروز ہو
کارگر دل پر ہوا ہو یا کوئی حسنِ مجاز
قلب پر یا واقعتاً کچھ ہو گیا ہو کشف راز
یا کسی اندوہ و غم سے دل میں پیدا ہو گداز
مل گیا ہو یا کسی محمود کو کوئی ایاز
وار دل پر ہو گیا ہو یا نگاہِ ناز کا
فیض ہو خیام کا یا حافظِ شیراز کا
الغرض اس قسم کا کوئی بھی سچا جذبہ
ضبط میں لانا ادیبوں کا ہے اصلی مشغلہ

جو صدا دل سے اٹھے اسکا فقط اظہار ہو
خامۂ شاعر حقایق کا نگارش کار ہو

بہار

از پروفیسر طالب کاشمیری

واہ وا کس شان سے پھر اب کے آتی ہے بہار
اک نیا انداز گلشن میں دکھاتی ہے بہار
نوجوانانِ چمن سرشار ہیں اس دور میں
میکشوں کو مژدۂ راحت سناتی ہے بہار
غنچۂ سربستہ کہنے کو ہے اپنا حالِ دل
راز کلیوں کی چٹک سے کہہ سناتی ہے بہار
غازۂ خوشرنگ سے کرتی ہے تازہ روئے گل
اور کفِ محبوب پر مہندی رچاتی ہے بہار
کر نہیں سکتا بیاں کچھ طالب کج مج زباں
دیدۂ بینا میں رنگ اپنا جماتی ہے بہار

فیضانِ ابوسعید ابوالخیر

(از مولانا حامد حسن قادری صاحب لیکچرار سینٹ جانسن کالج آگرہ)

حضرت مولانا شاہ ابوسعید ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ کا پایہ شعرائے رباعی میں نہایت بلند ہے، انکی چند رباعیوں کا ترجمہ اردو رباعیوں میں حاضر ہے۔ کہیں لفظی ترجمہ ہے، کہیں صرف خیال لے لیا گیا ہے۔ ترجمہ اصل سے بہتر کیا برابر ہونا بھی مشکل ہے۔ اسلئے اصل کو ترجمہ کے ساتھ لکھنا ترجمہ کا بھرم کھونا ہے لیکن اعترافِ ماخذ بھی ضروری ہے۔ میر انیس کی سی قدرت کہاں سے آئے کہ حضرت ابوسعید ابوالخیر کی ایک رباعی سے کیا خوب رباعی نکال لی۔

رباعی ابوسعید ابوالخیر

عصیانِ خلائق ارچہ صحرا صحراست — در پیشِ عنایتِ تو یک برگِ گیاست
ہر چند گناہِ ماست کشتی کشتی — غم نیست کہ رحمتِ تو دریا دریاست

رباعی میر انیس لکھنوی

جود و کرم و عطا ہے عادت تیری — ماں باپ سے بھی سوا ہے شفقت تیری
صحرا صحرا ہیں اگرچہ عصیاں میرے — دریا دریا مگر ہے رحمت تیری

(حامد حسن قادری)

رباعیات حضرت ابوسعید ابوالخیر

(۱)

وصلِ تو کجا و منِ مہجور کجا
دُردانہ کجا حوصلۂ مور کجا
ہر چند ز سوختن ندارم باکے
پروانہ کجا و آتشِ طور کجا

ترجمہ از حامد حسن قادری

(۱)

وصل اسکا کہاں اور یہ مہجور کہاں
یہ خاک کہاں وہ منبعِ نور کہاں
ہر چند کہ جلنے سے مجھے باک نہیں
پروانہ کہاں اور آتشِ طور کہاں

(۲)

گہ میگردم بر آتش ہجر کباب
گہ سر گردان بحرِ غم ہمچو حباب
القصہ چو خار و خس دریں بزم خراب
گہ بر سرِ آتشم گہے بر سرِ آب

(۲)

ہوں آتشِ ہجر میں کبھی جل کے کباب
سرگشتہ بحرِ غم کبھی مثلِ حباب
القصہ مثالِ خار و خس دنیا میں
یا بر سرِ آتش رہوں یا بر سرِ آب

(۳)

زاں مے خوردم کہ روح پیمانۂ اوست
زاں مست شدم کہ عقل دیوانۂ اوست
دودے بمن آمد آتشے با من زد
زاں شمع کہ آفتاب پروانۂ اوست

(۳)

روح اسکی شراب غم کا پیمانہ ہے
عاشق ہشیار ہے جو دیوانہ ہے
اس شمع کی لَو سے دلمیں ہے آگ لگی
جس شمع کا آفتاب پروانہ ہے

(۴)

در کشورِ عشق جائے آسایش نیست
آنجا ہمہ کاہش است افزایش نیست
بے درد و الم توقعِ درماں نہ
بے جرم و گنہ امید بخشایش نیست

(۴)

عاشق ہو تو آرزوئے آسایش کیا
بیتاب رہو شکوں کی فرمایش کیا
بے درد و الم توقعِ درماں کیوں
بے جرم و گنہ امید بخشایش کیا

(۵)

بر من در وصل بستہ میدارد دوست
دل را بفراق خستہ میدارد دوست
من بعد من و شکستگی و در دوست
چوں دوست دل شکستہ میدارد دوست

(۵)

مجھ پر درِ وصل بستہ ہے اسکو پسند
دل فرقت و غم سے خستہ ہے اسکو پسند
اب میں ہوں شکستگی ہے اور یار کا در
آخر تو دل شکستہ ہے اسکو پسند

(۶)

ناکامیم اے دوست زخود کامی تست
ویں سوختگی ہائے من از خامی تست
مگذار کہ در عشق تو رسوا گردم
رسوائی من باعثِ بدنامی تست

(۶)

ناکام ہوں میں یہ تری خود کامی ہے
تو مجھکو جلاتا ہے یہ کیسا خامی ہے
رسوا نہ کر اپنے عشق میں اے ظالم
رسوائی عاشق تری بدنامی ہے

(۷)

عشق تو بلائے جانِ درویش من است
بیگانہ نمی شود مگر خویش من است
گفتم سفرے کنم ۔ ز غم بگریزم
منزل منزل غم تو در پیش من است

(۷)

ہے غم سے ترے قطع تعلق مشکل
رکھتا ہے اسے عزیز تر جان سے دل
چاہوں بھی اگر کہ غم سے بچکر بھاگوں
رہتا ہے غم آگے آگے منزل منزل

جذباتِ فراق

از جناب رگھوپت سہائے فراق بی اے ۔ گورکھپوری

الٰہی خوابِ اُلفت کی بھی کیا تعبیر ہوتی ہے
کھلیں آنکھیں تو دنیا درد کی تصویر ہوتی ہے

مہک گل کی قضائے عاشقِ دلگیر ہوتی ہے
کہ ہر موج ہوا اک خوں بھری شمشیر ہوتی ہے

نہ ہو جب ساز و نغمہ بزمِ مے دلگیر ہوتی ہے
کہ موجِ بادہ اُٹھکر درد کی تصویر ہوتی ہے

اُمیدیں ٹوٹ جائیں اور پھر جیتا رہے کوئی
نہ پوچھ اے دوست کیا بگڑی ہوئی تقدیر ہوتی ہے

اُبھر آتی ہیں دل کی چوٹیں زنداں یاد آتا ہے
ہوا کی موج لہرائی ہوئی زنجیر ہوتی ہے

شرابی لڑکھڑاتے ہیں تو ساغر ٹکڑے ٹکری ہیں
نگاہِ مست ساقی تیری کیا تاثیر ہوتی ہے

سراپا درد ہوکر جو یہاں جیتا رہا ای دل
اسی کی خاکِ ناداں غیرتِ اکسیر ہوتی ہے

اُسی اک لفظ کی دل کہتے ہیں جسکو زمانے میں
بہارِ گل کی خونیں داستاں تفسیر ہوتی ہے

بہار آئی کوئی دیکھے ترے دیوانے کے تیور
نظر سوئے چمن وحشت گریباں گیر ہوتی ہے

فراقؔ اک شمع سر دھنتی ہے جلتی شب جو تربت پر
مری جاتی ہوئی دنیا کی اک تصویر ہوتی ہے

نمائشِ خیر آباد[1]

از حضرت وسیم خیر آبادی مرحوم

کیا کہوں تم سے مری آنکھوں نے کیا کیا دیکھا؟ — قدرتِ حق کا نمائش میں تماشا دیکھا
صورت ایسی تھی کہ سنسان یہ میداں ہوتا — شکر صد شکر کہ پھر آنکھوں نے میلا دیکھا
آپ کہتے ہوئے ہوائے کہاں تھی یہ امید؟ — ہم نے ڈوبی ہوئی کشتی کا ابھرنا دیکھا
ہاتھ حکام نے کھینچا، تو بڑھایا ہم نے — کام جو آ کے وہ اپنا ہی سہارا دیکھا
حاکمِ وقت نے خود وعدۂ امداد دیا — مستعد ہم ہوئے اُسکا جو اشارا دیکھا
ملک کے واسطے آثارِ ترقی ہیں یہی — ایسی ہی صورتوں کو فائدہ افزا دیکھا
"خیر آباد" سی ہے تیرہ جگہ اب روشن — للہ الحمد اندھیرے میں اُجالا دیکھا
یہ جگہ وہ ہے کہ ادبار برستا ہے یہاں — نہ چمکتے کبھی اقبال کا تارا دیکھا
وہ بھی دن تھے کہ یہ سرکار کہا جاتا تھا — اِس نے شاہی میں نظامت کا زمانا دیکھا
قربتِ صدر نے بھی دی نہ ترقی اِسکو — دلِ ویراں کی طرح اس کا اُجڑنا دیکھا
جتنا آباد تھا برباد ہوا اُس سے سوا — ٹکس سے پہلے بھی افلاس کا رونا دیکھا
نہ اُٹھی گرد صفائی نے جو پھیری جھاڑو — بے سبب ہم نے یہاں خاک کا اڑنا دیکھا
بنتے دیکھی نہ کبھی ہم نے کوئی بات اِسکی — اور دیکھا تو بنے گھر کا بگڑنا دیکھا
سچ مثل ہے "کبھی گھورے کے بھی دن پھرتے ہیں" — خوش نصیبی سے دنوں کا یہی پھرنا دیکھا
آئے تقریب میں میلے کی قدم کس کس کے — نقشِ پا میں مہ و خورشید کا جلوا دیکھا
رنگ پر خوب ہے ہندو و مسلماں کا ملاپ — آج ہم نے سحر و شام کا ملنا دیکھا
کیسے کیسے رؤسا لائے ہیں تشریف یہاں — اِن میں ہر ایک کو بافیض سراپا دیکھا
کسی ذی عقل کو اشفاق کا پُتلا پایا — کسی ذی ہوش کو اخلاق کا شیدا دیکھا

---

[1] یہ نظم ۱۹۱۶ء میں بتقریب مشاعرہ خیر آباد کے میلے میں پڑھی گئی تھی۔ مگر ابھی تک کہیں طبع نہیں ہوئی حضرت وسیم کی یادگار رہے طور پر ہم اسکو شائع کرتے ہیں۔ (زمانہ)

ساتھ یاروں کے جو کی سیر نمائش ہم نے — شاہدِ خوبی و زینت کا سراپا دیکھا
چلتے پھرتے "نظرے خوش گزرے" کی ٹھہری — چلتی پھرتی ہوئی شکلوں کا تماشا دیکھا
کہیں تاجر، کہیں بزاز، کہیں میوہ فروش — کہیں نانبائی، کہیں بسکٹ، کہیں حلوا دیکھا
ہم نے گھوڑ دوڑ کے گھوڑوں کو جھیلا دیا پایا — دیکھنے والوں کے پھر ہوش کا اُڑنا دیکھا

فتحِ سرکار کی مانگی جو دعا ہم نے وسیم
دل نے آمین کہی، بابِ اثر وا دیکھا

رباعیاتِ اثر

از مرزا جعفر علی خاں بی۔ اے اثر لکھنوی

جو راہ چلے ہم وہی تقدیر چلی — کشتی سوئے ساحل صفتِ تیر چلی
ناگاہ وہ طوفانِ حوادث اُٹھا — تقدیر چلی اور نہ تدبیر چلی

گزرے ہوئے وقت کا یہ ماتم کیسا — ملنا کفِ افسوس کا ہر دم کیسا
ماضی کی شکست فتحِ مستقبل ہے — لہراتا ہے وہ ہوا میں پرچم کیسا

خوبی کوئی آپ میں نہیں پاتا ہوں — غیرت سے زمین میں گڑا جاتا ہوں
صد شکر کہ تلبیس سے ہے پاک ضمیر — جیسا ہوں میں ویسا ہی نظر آتا ہوں

بانگ سفر

(از جناب اثیمؔ خلف حضرت وسیمؔ خیرآبادی لکھنؤ)

منزل میں نہ اے رہروِ خستہ ٹھہر، چل — اُٹھ، باندھ کمر، چل
چلنے کی سکت بھی نہ ہو گو تجھ میں، مگر چل — اُٹھ، باندھ کمر، چل

وہ دیکھ ستارے — ایک ایک سدھارے
او نیند مارے — چل اُن کے سہارے
چلنا ہے تو ہوئی ہے سحر، دیر نہ کر، چل
اُٹھ، باندھ کمر، چل

رہرو کو ضروری — ہر وقت ہے چستی
سستی نہیں اچھی — اُٹھ، دیر یہ کیسی
کیوں دیکھ رہا ہے تو اِدھر اور اُدھر، چل
اُٹھ، باندھ کمر، چل

ہمت کے مقابل — مشکل نہیں مشکل
ہے جذب جو کامل — کھنچ آئے گی منزل
منزل جو نہ معلوم ہو تا حدِ نظر، چل — اُٹھ، باندھ کمر، چل
رکنے کا کبھی نام نہ لے شام و سحر، چل — اُٹھ، باندھ کمر، چل

لطفِ سخن

حضرت محشر لکھنوی

غمِ عشق میں کہاں اب جو تھا اختیار اپنا
گیا وہ زمانہ جب تھا دل بے قرار اپنا

ارے آسماں ادھر بھی ہو کوئی نگاہ جھک کے
ترے ظلم کا ہے نقشہ یہ نہیں مزار اپنا

ترے نام پر تصدق جو ہوا تو ہم یہ سمجھے
اسی دن کے واسطے تھا دل بیقرار اپنا

اب شوق پر دعائیں ہوں بجائے شکوہ سنجی
کبھی جھوٹوں وہ جو کہہ دے مجھے جاں نثار اپنا

کسی بزم میں اجازت جو ملی ہے بیٹھنے کی
تو خدائی بھر یہ جیسے ہوا اختیار اپنا

اب اٹھائیں ناز کتنے کوئی انتہا ہے اے دل
یہ برا کیا بنایا تجھے رازدار اپنا

وہ کسی سے بزمِ امکاں میں نظر ملائے کیونکر
جسے دوست نے بنایا ہو امیدوار اپنا

تپشِ دردِ دل کی شدت گئی جان لیکے آخر
ہوا فرطِ بیقراری سے عیاں قرار اپنا

کبھی بزمِ وعظ میں ہے کبھی میکدے میں مسکن
ہمیں ڈر ہے اٹھ نہ جائے کہیں اعتبار اپنا

ترے مسکن پر مرے ہم تو حیاتِ خضر پائی
وہ کیا جو دورِ ہستی میں تھا اختیار اپنا

غمِ عاشقی کے عالم میں ہے کیا ہی کس مپرسی
جسے دیکھتے ہیں محشرؔ وہ ہے سوگوار اپنا

جناب ساغرؔ دیال بامنی

عشق ہی کیا جو دل گداز نہیں
سوز کس کام کا جو ساز نہیں

پارسائی میں اب دھرا کیا ہے
سجدے ہی سجدے ہیں نماز نہیں

اس زمانے میں حیف شاہ و گدا
کوئی دنیا سے بے نیاز نہیں

آج کل صورت اور معنی میں
مرد و عورت میں امتیاز نہیں

ساقیا اس جہاں میں تیرے
کوئی ساغرؔ کا کارساز نہیں

جناب فرخ بنارسی

اپنے مطلب کے لئے عشق میں کیا کیا نہ بنے
کبھی ہشیار بنے ہم کبھی دیوانہ بنے

مستِ فطرت کو ہر اک پھول ہو جامِ صہبا
جنبشِ موجِ صبا لغزشِ مستانہ بنے

ہے غرض سوزِ محبت سے کسی جام میں ہو
دل اگر بن نہ سکے شمع تو پروانہ بنے

قصۂ دارورسن چھیڑتے جی ڈرتا ہے
بات منہ سے نہ نکل کر کہیں افسانہ بنے

ہوش اتنے تو بجا رہنے دے اے حیرتِ حسن
تیرے جلوے کا تماشائی تماشا نہ بنے

لے تری شان! کہ بتخانہ تو کعبہ بن جائے
دل جو کعبہ سے بھی افضل ہے وہ بتخانہ بنے

دل کو اس رنگ سے برباد کر اے وسعتِ شوق
دو جہاں جس میں سما جائیں وہ ویرانہ بنے

کھینچنا چاہتا ہوں حسنِ ازل کا نقشہ
دل کے آئینے میں تصویر بنے یا نہ بنے

دشتِ پُرخار جنوں اور تلاشِ لیلےٰ
قیس سے کوئی یہ کہہ دے کہ دیوانہ بنے

نہیں ممکن کہ مئے عشق سے خالی رہے دل
یہ وہ شیشہ ہے جو ٹوٹے بھی تو پیمانہ بنے

حسن اور عشق میں اک ربط نہاں ہے فرخ
ہم سے ظاہر میں کوئی کتنا ہی بیگانہ بنے

ماسٹر باسط بسوانی

ہمیں جب دردِ دل میں کچھ کمی معلوم ہوتی ہے
تو پھر بے لطف اپنی زندگی معلوم ہوتی ہے

جو آنکھیں بند کر کے دیکھتا ہوں محفلِ دل کو
تو ہر سو روشنی ہی روشنی معلوم ہوتی ہے

مصیبت میں کوئی جس شخص کا پرساں نہیں ہوتا
اسی کو خوب قدرِ بیکسی معلوم ہوتی ہے

مرے بالیں سے اٹھے وہ مجھے یہ آسرا دیکر
ابھی کچھ اور تیری زندگی معلوم ہوتی ہے

دلِ دردآشنا واقف ہے نیرنگِ زمانہ سے
اسے ہر غم کے پردے میں خوشی معلوم ہوتی ہے

مرے دل پر گرائیں بجلیاں یہ کہہ کے ظالم نے
ابھی شاخِ تمنا کچھ ہری معلوم ہوتی ہے

ہماری داستانِ غم پر وہ منہ پھیر کر بولے
بس اب بس بھی کرو بیہودگی معلوم ہوتی ہے

تری چوکھٹ پہ جب میں عاجزی سے سر جھکاتا ہوں
مجھے اس وقت شانِ بندگی معلوم ہوتی ہے

وہی ہنسنے کے موقع پر رلاتے ہیں ہمیں باسط
جنہیں رونے کے موقع پر ہنسی معلوم ہوتی ہے

مرزا محمود نظامی

پھر گم شدوں کی خاک تزلزل پذیر ہے — فتنہ چھپا ہوا کوئی زیرِ زمیں نہو
کہتے ہیں انکو میری وفا کا یقیں نہیں — مجھکو یقیں نہیں ہے کہ اُن کو یقیں نہو
اے دل نہ بھول پردۂ لطفِ نگاہ پر — ہنگامہ کوئی تازہ کہیں درکمیں نہو

دامن کا اعتبار بھی محمودؔ اٹھ گیا
ڈرتا ہوں کوئی سانپ تہِ آستیں نہو

مسٹر سکھدیو پرشاد سنہا بسملؔ الٰہ آبادی

تم کو یہ ہے اگر یقیں دل میں وہ جلوہ گر نہیں — ڈھونڈھا کرو تمام عمر ملنے کا عمر بھر نہیں
آئے نہ آئے بے خبر کیا تجھے یہ خبر نہیں — سانس کا اعتبار کیا شام ہے تو سحر نہیں
دیر ہو، کعبہ ہو، کہ دل کس میں وہ جلوہ گر نہیں — دیکھ سکوں مگر اُسے اتنی مری نظر نہیں
کنجِ قفس میں عندلیب مضطر و بیکس و غریب — کہنے کو بال و پر تو ہیں اُڑنے کو بال و پر نہیں
پردے میں آپ بیٹھکر رکھتے ہیں سب طرف نظر — اور زبان پر یہ ہے شوخ مری نظر نہیں
اب یہ ہے نعرۂ الست جھوم رہا ہے کوئی مست — چھائی ہے ایسی بیخودی اپنی اُسے خبر نہیں
اُف یہ مرا نصیب بد جا کے بنی کہاں لحد — سب کی ہے رہگذر جہاں آپ کی رہگذر نہیں

بات یہ تم نے سچ کہی بسملؔ بے ہنر سہی
یہ بھی ہے اک بڑا ہنر اس میں کوئی ہنر نہیں

(از جناب فانیؔ بدایونی۔ بی۔ اے، ایل ایل، بی)

اُن کو شباب کا نہ مجھے دل کا ہوش تھا — اک جوشش تھا کہ محوِ تماشائے جوش تھا
ہر مژدۂ نگاہ غلط جلوہ خود فریب — عالم دلیلِ گمرہیٔ چشم و گوش تھا
تجلیاتِ وہم ہیں مشاہداتِ آب و گل — کرشمۂ حیات ہے خیال وہ بھی خواب کا
اپنے کمالِ شوق پر حشر کا دن ہے منحصر — وعدۂ دید چاہیئے زحمتِ انتظار کیا
لکھ چکے ہم، جا چکا خط، گر یہی حالت رہی — ہاتھ میں آیا قلم، اور شوق کا دفتر کھلا
کیوں اہلِ حشر! ہے کوئی نقادِ سوزِ دل — لایا ہوں دل کے داغ نمایاں کئے ہوئے

علمی خبریں اور نوٹ

مہامہوپادھیا ڈاکٹر گنگا ناتھ جھا صاحب بالقابہ - وائس چانسلر الٰہ آباد یونیورسٹی نے اس نامور یونیورسٹی کی امداد کے لئے ایک اپیل پبلک میں پیش کی ہے - جسکی تائید ہز ایکسلنسی گورنر صوبہ نے بھی بحیثیت چانسلر یونیورسٹی کی ہے - حقیقت میں الٰہ آباد یونیورسٹی نے ملک و صوبہ کی جو نمایاں علمی خدمات انجام دی ہیں اور اب بھی جس قدر خدمت کر رہی ہے اسکو دیکھتے ہوئے تعلیمی معاملات سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کا اولین فرض یہ ہے کہ اس اپیل پر غور کرکے یونیورسٹی کو دامے درمے جس طرح ہو امداد دینے میں دریغ نہ کریں تاکہ اس نیکنام دارالعلوم کا فیض نہ صرف برابر جاری ہے بلکہ روز بروز وسعت پذیر ہوتا جائے ہمیں امید ہے کہ اہل نظر و اہل دول اس اپیل پر توجہ فرمائینگے اور قابل قدر عطیات دیکر ارکان الٰہ آباد یونیورسٹی کی امداد فرمائینگے -

ہمارے مکرم دوست حکیم سید شمس اللہ قادری صاحب ماہر آثار قدیمہ حیدر آباد دکن نے شروع سال رواں سے ایک سہ ماہی رسالہ "تاریخ" کے نام سے جاری کیا ہے - جس کا واحد مقصد تاریخی واقعات اور آثار قدیمہ پر تبصرہ و تنقید کرکے صحیح و مستند حالات پبلک کے روبرو پیش کرنا ہے - اس رسالہ کا پہلا پرچہ شائع ہو چکا ہے جسمیں مملکت آصفیہ، کتب خانۂ اسکندریہ اور قنوج وغیرہ کے متعلق نہایت تحقیقی و مفید مضامین درج ہیں - ہم اس رسالہ کے اجراء پر حکیم صاحب کو مبارکباد دیتے ہیں اور ناظرین "زمانہ" سے اسکی خریداری کی سفارش کرتے ہیں - تاریخ کی سالانہ قیمت پانچ روپیہ ہے - ملنے کا پتہ - دفتر تاریخ کوٹلہ اکبر جاہ - حیدر آباد - دکن -

حضرت امیر خسرو دہلویؒ جس پایہ کے شاعر تھے اس سے اہل نظر بخوبی واقف ہیں - خوشی کا مقام ہے کہ کئی سال سے مولوی محمد مقتدیٰ خاں صاحب شروانی نے ایک باقاعدہ فنڈ قائم کرکے تصانیف خسرو کے شائع کرنے کا انتظام کر رکھا ہے اور اب تک اس سلسلہ کی آٹھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن کو نہایت غور و تحقیق کے بعد مستند و مکمل طور پر مع ضروری حواشی و تبصرہ کے طبع کیا گیا ہے - اہل ذوق کیلئے عام

ہے کہ وہ اس مفید سلسلہ کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے میں شروانی صاحب کی مدد کریں۔ ان کتابوں کو خرید کر خود مستفید ہوں اور اپنے علم دوست احباب سے انکی خریداری کی سفارش کرکے پبلیشر کی حوصلہ افزائی کریں۔ مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے مسلم یونیورسٹی بک ڈپو علی گڈھ سے خط و کتابت کرنی چاہئے۔

اس ششماہی کے ادبی حادثات میں دو اندوہناک واقعات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ۲۳ جنوری ۱۹۲۹ء کو ہمارے پرانے دوست اور مشہور انشا پرداز حکیم برہم صاحب ایڈیٹر "مشرق" گورکھپور کا بعارضہ نمونیہ انتقال ہوا۔ برہم صاحب نہایت وضعدار و مستقل مزاج بزرگ تھے۔ آپ نے چالیس سال تک اردو اخبار نویسی کی اہم خدمات انجام دیں۔ پہلے عرصہ تک آپ ریاض الاخبار کے ایڈیٹر رہے اور اسی سلسلہ میں "فتنہ" نامی ایک ننھا سا پرچہ شائع کیا۔ بعدہٗ "مشرق" کے نام سے اپنی ملکیت و ایڈیٹری میں ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا۔

حکیم صاحب مرحوم اصل میں خیرآباد کے باشندے تھے مگر ایک مدت سے "مشرق" اور "جاج ڈسپنسری" کے سلسلہ سے مستقلاً گورکھپور میں مقیم تھے۔ آپکی وضعداری کا بین ثبوت یہ ہے کہ "مشرق" جس طریقہ سے نکلا تھا اسی روش پر آخر تک قائم رہا افسوس! ایسے باوضع لوگ آجکل عنقا ہیں۔

مرحوم سلیس اردو کے زبردست حامی اور رسالہ "زمانہ" کے خاص قدر دانوں میں تھے۔ آپ نے اسکی ابتدائی جلدوں کے لئے کئی خاص مضامین بھی لکھے تھے۔ ناول "کرشن کماری" اور کئی دیگر تصانیف آپ کے یادگار باقی ہیں۔

دوسرا افسوسناک واقعہ حضرت وسیم خیرآبادی کا انتقال پُرملال ہے مارچ گذشتہ میں آپ عرصہ کی علالت کے بعد اپنے وطن خیرآباد میں رحلت گرائے عالم جاودانی ہوگئے۔ وسیم صاحب کو نامور استادِ سخن حضرت امیر مینائی سے شرفِ تلمذ تھا۔ آپ کو مدت تک استاد کے ساتھ رہنے اور کسب کمال کرنے کا موقعہ ملا تھا۔ آپ نے امیراللغات کی جلد اول کی ترتیب میں بھی استاد کو مدد دی تھی جسکے صلے میں منشی صاحب نے آپکے نام کے ساتھ ایک مرتبہ خود اپنے قلم سے "شاگرد رشید" لکھکر آپکی عزت افزائی فرمائی تھی مرحوم عرصہ تک مہاراجہ صاحب جونپور کے یہاں ملازم رہے۔ مدت تک رسالہ گلچیں کی ادارت کے فرائض انجام دئے اور آخر عمر میں "تحفۂ خوشتر" کے نام سے شعر و شاعری کے ایک مختصر سے رسالہ کے ایڈیٹر رہے۔

وسیم صاحب ایک خوش فکر و پُرگو سخنور تھے غزلوں کے علاوہ دوسری اصنافِ سخن میں بھی داد سخن دیتے تھے

تاریخ گوئی میں بھی خاص ملکہ تھا اور اکثر تاریخیں بہت عمدہ کہی ہیں تحقیق الفاظ و صحت محاورہ کا بہت خیال رکھتے تھے۔ لسان الملک حضرت ریاض خیرآبادی کے ماموں زاد بھائی اور انکے ہم خیال و ہم مذاق بھی تھے انکے شاگردوں کی فہرست بھی بہت طویل ہے۔ رنگِ سخن اگرچہ قدیم تھا مگر لطف سے خالی نہیں۔ دراصل مرحوم اگلے زمانہ کے بزرگوں کی ایک یادگار تھے اور اس لحاظ سے انکا بزمِ فن سے اُٹھ جانا خصوصیت سے قابلِ افسوس ہے۔ انکے فرزند حضرات اثیم و شمیم بھی فنِ شعر میں کافی مہارت حاصل کر چکے ہیں۔ خدا کرے سخنور باپ کے ہونہار بیٹے کی حیثیت سے وہ وسیم صاحب کا نام اور بھی بلند کریں۔

وسیم صاحب کے کلام کا کوئی مجموعہ ہنوز شائع نہیں ہوا۔ زمانہ میں کبھی کبھی انکا کلام شائع ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ اس پرچے میں بھی ہم آپ کی ایک غیر مطبوعہ نظم ہدیہ ناظرین کرتے ہیں اور کچھ منتخب اشعار بھی ناظرین کے تفننِ طبع کے لئے درج ذیل کرتے ہیں۔

دیا سر تیغ کو، دم تیر کو، دل اسکے پیکاں کو قیامت ہے دو بُت اب بھی زمانے میرے احساں کو
یہ کھیڑیں حسرتوں کی ہیں، یہ ارمانوں کا مجمع ہے کہ رستہ دل میں آنے کا نہیں ملتا ہے پیکاں کو

وسیم اُس در پہ جب جاتا ہے درباں ٹوک دیتا ہے
الٰہی جلد جھٹلا دے قضا آوازِ درباں کو

تیر آئیں دل میں اِک دن کے لئے حسرتیں بیتاب ہیں اِن کے لئے
ہائے کیا آئی جوانی کیا گئی کر گئی بدنام دو دن کے لئے
وہ گھٹا اُٹھی ہے پی لو واعظو ورنہ پھر ترسوگے اِس دن کے لئے
غش ہوئے موسیٰ تو آئی یہ صدا پردہ کرتے تھے اِس دن کے لئے

جب کہا چتون نے اُسکی میں ستمگاروں میں ہوں بول اُٹھی چینِ جبیں میں بھی جفا کاروں میں ہوں
دل ہے کیا شے؟ جس حسیں کے پاس لیجاتا ہوں میں وہ یہی کہتا ہے میں اسکے خریداروں میں ہوں
خلد ہی میں دی جگہ رحمت نے اُسکی حشر میں لاکھ میں نے یہ کہا، میں تو گنہگاروں میں ہوں

جب کوئی گاہک نہ ٹھیرا جنسِ عصیاں کا وسیم
اُسکی رحمت بول اُٹھی میں خریداروں میں ہوں

"مخزن" لاہور اردو زبان کے آن صحائف میں سے ہے جو اپنے ابتدائی دور میں ہمارے مکرم دوست

شیخ عبد القادر صاحب بیرسٹر بالقابہ کے علمی و ادبی ذوق کی بدولت برسوں ادب اُردو کی نمایاں خدمات انجام دینے کے بعد بند ہوگیا تھا۔ اب چند سال سے اسکا دَور جدید شروع ہوا ہے اور ابو الاثر حضرت حفیظ جالندھری کی ادارت میں نہایت کامیابی کے ساتھ اپنی قدیم روایات کی نشر و اشاعت کر رہا ہے۔ چند ماہ ہوئے "مخزن" کا سالگرہ نمبر شائع ہوا تھا۔ یہ ۱۴۴ صفحات کا ایک دلکش مرقع ہے۔ مضامین مفید اور لائق مطالعہ ہیں۔ اس نمبر میں چار تصاویر بھی ہیں جن سے اسکی دلچسپی میں قابلِ قدر اضافہ ہوگیا ہے۔ اس نمبر کی قیمت صرف ایک روپیہ ہے۔

چینی زبان کی انسائیکلو پیڈیا کا شمار دنیا کے عجائبات میں کیا جا سکتا ہے۔ اسکی پانچ ہزار جلدیں طبع ہوئی ہیں۔ جنکا مجموعی وزن ایک ٹن پندرہ ہنڈرڈ ویٹ اور اتنی پونڈ ہے۔ اگر ان سب کے اوراق کو جوڑ کر پھیلایا جائے تو تمام ملکِ چین اسکے احاطہ میں آجائے۔ یہ انسائیکلو پیڈیا ۱۷۲۶ء میں مرتب کی گئی تھی اور اسکے صرف دو نسخے چین سے باہر نکلے تھے۔ جن میں سے ایک برٹش میوزیم کے کتبخانہ میں ہے اور دوسرا اگسٹ چینی لائبریری موگال یونیورسٹی میں۔

"نیرنگِ خیال" لاہور نے حسبِ معمول امسال بھی ایک خاص نمبر "عید نمبر" کے نام سے شائع کیا ہے جس میں معمولی تقطیع کے ۲۰۰ صفحات ہیں۔ متعدد سادہ و رنگین تصاویر سے رسالہ کی ظاہری صورت کو بوجہ احسن آراستہ کیا گیا ہے۔ مضامین۔ عید، مطائبات، مقالات اور افسانہ وغیرہ پر مشتمل ہیں جو اگر ایک طرف تفریح طبع کا بہترین ذریعہ ہیں تو دوسری جانب کارآمد معلومات بھی ان سے حاصل ہوتی ہیں۔ غرض عید نمبر ہر حیثیت سے ایک کامیاب نمبر ہے اور ہم اپنے دوست حکیم محمد یوسف حسن صاحب کو اسکی اشاعت پر مستحق مبارکباد سمجھتے ہیں۔ عید نمبر کی قیمت صرف ایک روپیہ ہے۔

اس ماہ میں مندرجہ ذیل تصاویر ہدیۂ ناظرین ہیں، امید ہے کہ انکی دلچسپی کا باعث ہونگی:۔

(۱) شاہزادی الزبتھ آف یارک جو ملک معظم کے دوسرے شاہزادہ ڈیوک آف یارک کی بڑی صاحبزادی ہیں۔ ممکن ہے کسی وقت آپ تختِ انگلستان کی جلوہ افروز ہوں۔

(۲) ہز رائل ہائنس ڈیوک آف گلاسٹر یعنی ملک معظم کے تیسرے شاہزادہ جو پچھلے دنوں شہنشاہ جاپان کو مبارکباد دینے تشریف لیگئے تھے۔

(۳) آنریبل مسٹر نرائن پرشاد استھانہ۔ وائس چانسلر آگرہ یونیورسٹی۔ آپ پہلے ہندوستانی ہیں۔ جو اس عہدے پر ممتاز ہوئے ہیں۔

(۴) آنریبل مسٹر وی۔ ایس۔ شاستری صدر انجمن خادمانِ ہند جو ہندوستانیوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے مشرقی افریقہ تشریف لے گئے ہیں۔

اردو ادبی ذخیرے میں ایک جدید کتاب کا اضافہ

بیداری ہند

یعنی

ینگ انڈیا کا سلیس اردو ترجمہ

اور تحریک عدم تعاون کی مکمل تاریخ

یہ اس مایۂ ناز ہستی کا کارنامہ ہے۔ جس نے ہزارہا سال کے سوئے ہوئے بتیس کروڑ ہندوستانیوں کو ایک آواز میں بیدار کر دیا تھا۔ اور ان کے سینوں میں حب وطنی کی آگ روشن کر دی تھی۔

آج دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ افسوس ہے کہ اردو لٹریچر میں اس کا کوئی ترجمہ موجود نہ تھا۔ اس کمی کو محسوس کر کے مہاتما گاندھی کی ان ہنگامہ خیز اور معرکۃ الآرا تقریروں اور تحریروں کو جن کی اشاعت سے اس قائد اعظم نے تمام دنیا میں تہلکہ ڈال دیا تھا۔ اور ہندوستان میں قصر حکومت کی بنیادوں کو ہلا دیا تھا۔ اردو علم ادب کے گوہر معانی سے مزین کیا گیا ہے۔

دیباچہ اٹھاون صفحات پر ختم ہوا ہے۔ جس میں دنیا کے اکابرین اور مشہور اہل قلم حضرات کے وہ خیالات بھی درج کئے گئے ہیں۔ جو انہوں نے اس تحریک اور اسکے بانی کے متعلق ظاہر فرمائے ہیں۔

یہ اس تاریخ کا اک زریں باب ہے

تقطیع ۲۰×۲۶ ضخامت چار سو صفحے کاغذ و طباعت نہایت اعلیٰ

چونکہ مہاتما جی کی تعلیمات کی اشاعت اس کتاب کا مقصد ہے اس لئے اصل قیمت بہت کم اخراجات کے مطابق رکھی گئی ہے تاکہ عوام الناس اس کے مطالعہ سے روحانی فیض حاصل کریں۔ ملک و قوم کی بہتری کے لئے اسکو مشعل ہدایت بنائیں۔ قیمت دو روپیہ ۸ محصول ڈاک ۸

زمانہ

جلد ۵۲ جون سنہ ۱۹۲۹ء نمبر ۶

کلام میر

از بابو شیام موہن لال جگر بریلوی بی۔اے

کلیاتِ میر ہر قسم کے کلام سے بھرا پڑا ہے۔ اعلےٰ درجہ کے مذاقِ سخن کی مثالیں بھی ہیں اور انتہائی پست مذاق کے نمونے بھی اس میں موجود ہیں۔ لیکن اُن پر مذاق جدید کے نقطۂ نگاہ سے رائے زنی کرنا اصولی غلطی ہے کیونکہ اُس وقت اُردو شاعری راہ ترقی کی ابتدائی منازل طے کر رہی تھی۔ اِن اوراق میں میر کا وہ کلام مطمح نظر ہے جو ادبِ اُردو کی حیات تک رنگِ تغزل کا اعلیٰ نمونہ سمجھا جائیگا۔

تمام اصنافِ سخن میں غزل نہایت دلکش صنف ہے۔ میر نے غزل کو جتنا فروغ دیا وہ محتاجِ بیان نہیں۔ اِس خصوصیت میں آنکے مرتبہ کی عظمت و رفعت مسلّمہ ہے۔ مرزا غالب جیسا دشوار پسند اور بالغ نظر شاعر بھی ان پر ایمان لائے ہوئے تھا ؎

غالب اپنا تو عقیدہ ہے بقولِ ناسخ ۔۔۔ آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

کلامِ میر میں وہ ایسی کون سی بات ہے جس سے اُنکو یہ مرتبہ حاصل ہوا؟ وہ بات صرف تاثیر ہے۔ جو اہلِ نظر شاعری کو ترجمانِ عاشقی اور تاثیر کو شاعری سمجھتے ہیں میر کو تمام شعرائے اُردو کا سرتاج مانتے ہیں۔ تاثیر ایک وسیع لفظ ہے جس کے مختلف و متعدد پہلو ہو سکتے ہیں۔ اِس مقام پر

ہمکو یہ دکھانا ہے کہ کلام میر کی تاثیر کے کون کون سے پہلو ہیں - اس کے لئے ہمکو اول سیرت میر کا مطالعہ کرنا لازمی ہے - کیونکہ شاعر کا کلام اُسکی سیرت کا پرتو ہوتا ہے -

انسان میں دل و دماغ ہی ایسی ذو قوتیں ہیں جنکی نشو ونما پر ہر قسم کی ترقی کا انحصار ہے خواہ وہ ترقی مادی ہو یا روحانی - دماغ کا عمل و تصرف مادی دنیا تک محدود ہے - دل کی حکومت وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں عقل و خرد کی انتہا ہو جاتی ہے - دل ہی مادہ اور رُوح کے درمیان رشتۂ اتصال قائم کرتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں رُوح منعکس ہوتی ہے - کلام میر کا مطالعہ اس حقیقت کو بخوبی ذہن نشین کر دیتا ہے کہ تاثیر خستگئ دل سے پیدا ہوتی ہے نہ کہ دماغی سعی و کاوش سے - ساتھ ہی ساتھ یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ خوشی کو اثر میں وہ درجہ حاصل نہیں جو غم کو ہے - بزم سُرور ایک سامان مسرت ضرور ہے لیکن اس مسرت کا اثر اتنا گہرا اور رسندہ نہیں ہوتا جتنا کسی دلگداز سانحہ کا - کسی شخص کو بیٹے کی ولادت پر اتنی مسرت نہیں ہوتی جتنا غم اُس کی وفات پر ہوتا ہے - ؎

شادی و غم میں جہاں کے ایک سے دس کا ہے فرق عید کے دن ہیے تو دس دن محترم رہئے

غم میں یہ اثر اس لئے ہے کہ کارساز عالم نے تہذیب نفس و تزکیۂ باطن کی مصلحتیں اس میں پوشیدہ رکھی ہیں - میر کی رگ رگ میں زہر غم ساری تھا بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ سوز و گداز نے میر کے قالب میں جنم لیا تھا تو زیادہ مبالغہ نہیں - ؎

کیا کروں شرح خستہ جانی کی میں نے مرمر کے زندگانی کی

مجھکو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے درد و غم کتنے کئے جمع کہ دیوان کیا

یہی باعث ہے کہ میر کے نشتر بے پناہ ہیں - میر کے علاوہ بھی بہت سے شعراء نے درد و کرب کے مضامین نظم کئے ہیں لیکن میر کو کوئی نہیں پہونچا ذوق تو آخر عاجز آ کر کہہ اُٹھے - ؎

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

حقیقت یہ ہے کہ یہ "زور مارنا" ہی رنگ میر کے منافی ہے محض دماغ کے زور مارنے سے رنگ تغزل میں درد انگیزی پیدا ہونے کے بجائے تصنع اور بے کیفی پیدا ہو جاتی ہے - میر دماغی زور کا کمال صداقت نگاری میں دکھاتے ہیں یعنی اپنی قوت تخیل کو جذبات دل کے صحیح نقشے بنانے میں صرف

کرتے ہیں۔ اُنکے یہاں پہلی شے تاثرات قلب و مشاہداتِ زندگی، اور کیفیاتِ عرفاں ہیں جن میں شدتِ محبت نے وہ چلگونگی اور درد پیدا کردیا ہے جو اُنکے کلام کا مابہ الامتیاز تسلیم کیا گیا ہے۔ اُنکی محبت وہ محبت تھی جسکو حُسن پرستی نے تمام نفسانی آلودگیوں سے پاک کردیا تھا۔ ان کی حُسن پرستی کی یہ شان تھی ؎

ہائے غیوری جسکو دیکھے جی ہی نکلتا ہے اپنا | دیکھتے اُسکی اور نہیں پھر عشق کی یہ بھی غیرت ہے

حسن پرستی کی یہی شان عشقِ حقیقی ہے اسکے سوا کفر ہے۔ میر کی غیرت و حیا انکو یہیں مقام نہیں کرنے دیتی بلکہ اور آگے بڑھاتی ہے ؎

محو دعا تھے اکثر غیرت سے لیک گا ہے | آیا نہ نام اُس کا میری زباں سے ادبہ

محبت آپ اپنی منزل مقصود ہے۔ غیرت محبت کا وہ ثمرہ ہے جو محبت کے لئے سرمایۂ صدوقار ہے۔ پرستارانِ محبت کے لئے محبوب بھی نامحرم ہے۔ میر جس طرح مجسمۂ محبت تھے۔ اسی طرح مجسمہ غیرت بھی تھے۔ انھوں نے غیرت و حیا کی انتہا کردی تھی۔ ہر عاشق کو یہ بات کہاں نصیب وہ عشق جو ہرِ انسانیت کے لئے سرمایۂ افتخار ہے جس کی حیا کی یہ شان ہو ؎

محروم سجدہ آخر جانا پڑا جہاں سے | جوشِ حیا سے ہم نے وہ آستاں نہ پایا

مرزا غالب کا ایک شعر یاد آگیا ؎

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم | اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

خود بینی و حیا میں بہت فرق ہے حیا دل میں محبت کو بجلی بنا دیتی ہے۔ غرور محبت کی نفی کرتا ہے۔
اس محبت میں جو میر کی سرشت کا خمیر تھی عبرت نے بلا کا درد بھر دیا تھا۔ محبت بھرے دل میں عبرت کا اثر قیامت ڈھا دیتا ہے۔ بننے بگڑنے میں عجب عبرت انگیز شاعری ہے۔ پھر دلی کا بگڑنا تو ایک دلگداز مرثیہ تھا جس کا رقت انگیز عالم میر کی آنکھوں میں چھایا ہوا تھا۔ ذیل کا قطعہ ہمیشہ یادگار رہے گا ؎

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو | ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب | رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اُسکو فلک نے لوٹ کے ویران کردیا | ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

میر نے جا بجا اپنے کلام میں عبرت کی مکمل تصویریں کھینچی ہیں۔ اس موقعہ پر صرف ایک قطعہ مثیلاً پیش کیا جاتا ہے۔ ؎

شب اس دلِ گرفتہ کو وا کر بزورِ مے ۔۔۔ بیٹھے تھے شیرہ خانہ میں ہم کتنے ہرزہ کوش
آئی صدا کہ یاد کرو دورِ رفتہ کو ۔۔۔ عبرت بھی ہے ضرور ٹک اے جمع تیز ہوش
جمشید جم نے وضع کیا جام کیا ہوا ۔۔۔ وے صحبتیں کہاں گئیں کیدھر وے ناو نوش
جز لالہ اُسکے جام سے پاتے نہیں نشاں ۔۔۔ ہے کوکنار اُس کی جگہ اب سبو بدوش
جھومے ہیں بید جائے جوانانِ میگسار ۔۔۔ بالائے خم ہے خشت سر پیر مے فروش

اس عبرت نے میر کے دل میں وہ رقت پیدا کردی ہے جسکے متعلق خود وہ فرماتے ہیں ؎

دل جو پانی ہو تو آئینہ ہے روئے یار کا ۔۔۔ خانہ آبادی سمجھ اس خانہ ویرانی کے تئیں

محبت ماسوائے محبت سے بیگانہ بنا دینے کے لئے خود ہی کیا کم ہے چہ جائیکہ اُسکے ساتھ عبرت بھی شامل ہو۔ عبرت اور محبت انسان کو اپنی حقیقت سے رُوشناس کراکے اُسکے وہ جوہر نمایاں کردیتی ہے جنکے مجموعہ کا نام انسانیت ہے۔ میر پر عبرت کا کیا اثر تھا اُنھیں کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے ؎

یہ عیش گہ نہیں ہے یاں رنگ اور کچھ ہے ۔۔۔ ہر گل ہے اس چمن میں ساغر بھرا لہو کا

پہلا قدم ہے انساں پامالِ مرگ ہونا ۔۔۔ کیا جانے رفتہ رفتہ کیا ہو مآل تیرا

دیکھا ماتم خانۂ عالم کو ہم مانندِ ابر ۔۔۔ ہر جگہ پر جی میں یوں آیا دمادم روئیے

حوادثِ دہر، بے مہریٔ ابنائے زماں، بے ثباتیٔ عالم، کسی وقت میر کو ترکِ دنیا کے عزم پر بھی آمادہ کردیتے ہیں اور وہ بے اختیار ماتم خانۂ عالم سے مفر ڈھونڈھنے لگتے ہیں اور ایسا مفر جو اس غم و اندوہ سے اِک دم نجات دیدے ؎

کیا سیر اس خرابے کا بہت اب چل کے سو رہیئے ۔۔۔ کسی دیوار کے سایہ میں منھ پر لیکے داماں کو

حوادث و مصائب کا تواتر و تسلسل یاس و تنفر ہی کے جذبات پیدا نہیں کرتا بلکہ بسا اوقات عقل کو گمراہ کرکے آدمی کو الحاد کی طرف مائل کردیتا ہے۔ دیکھئے مرزا غالب گھبراکر کیا کہہ گئے ہیں ؎

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب ۔۔۔ ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے

محبت ہی وہ شے ہے جو شدتِ غم میں دل کو الحاد کے جذبات سے بچائے رکھتی ہے بلکہ یوں کہئے کہ جس قدر عاشق پر مظالم ٹوٹتے ہیں اُسی قدر اُسکی وابستگی اپنے محبوب سے والہانہ ہوتی جاتی ہے۔ انجام کار اُسکا دل محبت سے ایسا سرشار ہوجاتا ہے کہ کسی دوسری چیز کا احساس ہی

باقی نہیں رہتا اور قلب پر ایک سکون چھا جاتا ہے۔ میر بھی مصائب و آلام سے گھبرائے۔ سونے کے لئے بیتاب ہوئے۔ لیکن کہاں سونا چاہتے ہیں اور کس طرح؟ کسی خنخانہ یا عشرت کدہ میں نہیں بلکہ کسی دیوار کے سایہ میں اپنی محبت کی وہ میٹھی نیند جس میں تمام آلام و مصائب غرق ہو جائیں اور منھ پر داماں کو لیکے۔ انتہائے یاس و رنج میں جب انسان کہیں پڑ رہنا چاہتا ہے تو قاعدہ ہے کہ اضطراری طور سے اُسکے دل میں منھ ڈھانکنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے اس فعل کے محرک دو جذبات ہوتے ہیں۔ ایک تو عملدۂ عالم کے ناخوشگوار مناظر کی طرف سے آنکھیں بند کرلینے کی خواہش، دوسرے ناواقف اشخاص کے خندہ و استہزا سے بچنے کے لئے اپنے غم و غصہ کے اخفا کی کوشش۔ یہ ہیں وہ تمام کیفیتیں جن سے یہ شعر لبریز ہے پھر انداز بیان ایسا ہے جس سے یہ تمام کیفیتیں پڑھنے والے کے دل پر چھا جاتی ہیں سچ کہا ہے۔ ؎

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنئے گا پڑھتے کسی کو سنئے گا تو دیر تلک سر دھنئے گا

جب محبت کے سمندر میں رنج و الم کے پہاڑ غرق ہو گئے۔ سکون و سرور قلب پر چھا گیا، آنکھیں کھل گئیں، اور حقیقت آشکار ہو گئی ؎

مستی میں شراب کی جو دیکھا عالم یہ تمام خواب نکلا

یہ توہم کا کارخانہ ہے یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

کچھ نہیں اور دیکھتے ہیں کیا کیا خواب کا سا ہے یاں کا عالم بھی

ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں اپنے سوائے کس کو موجود جانتے ہیں

عجز و نیاز اپنا اپنی طرف ہے سارا اس مشتِ خاک کو ہم مسجود جانتے ہیں ؎

جو عارف ہو عاشق ہو وہ دنیاوی جاہ و ثروت کی طرف کب رُخ کرسکتا ہے۔ محبت و عرفاں نے میر کو جمیع دنیاوی آسائش و آرام سے بے نیاز کر دیا تھا۔ اُنھوں نے تمام عمر عسرت میں بسر کی سختیوں پر سختیاں جھیلیں۔ لیکن گلہ و شکوہ کیسا، اور سعئ اصلاحِ حال کیا معنی، اِن باتوں کی طرف شاید اُن کا خیال بھی کبھی نہیں گزرا۔ وہ خاموشی کے ساتھ تمام مصائب و آلام برداشت کرتے رہے۔ انھوں نے فاقے کئے لیکن دستِ سوال کسی کے آگے نہیں پھیلایا۔ ؎

ہم جو فقیر ہوئے تو ہم نے پہلے ترک سوال کیا   خوب کیا جو اہلِ کرم کا تم نے کچھ نہ خیال کیا

وہ بات سُو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے   آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز

حقیقت یہ ہے کہ خودداری و علو ہمتی کی میر نے حد کر دی تھی۔ ؎

ہمیں تو شرم دامنگیر ہوتی ہے خدا ہوتے   الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنھیں ہے بندگی خواہش

خاک سے ہمنے بھرا وہ چشمہ یہ بھی ہماری ہمت تھی   آبِ حیات وہی نہ جس پر خضر و سکندر مرتے تھے

اُنھوں نے فاقے کر کر کے اپنی سیرت کا وقار قائم رکھا اور انسانیت کے جوہروں کو جلا دی۔ اب یہ ناممکن ہے کہ دُنیائے ادب اُس سیرت و انسانیت کے نقش و نگار کا یعنی کلامِ میر کا وقار قائم نہ رکھے۔ انھوں نے اپنے متعلق بالکل صحیح پیشینگوئی کی تھی ؎

رہے گا دیر تک ماتم ہمارا   پڑھیں گے شعر رو رو لوگ بیٹھے

خواہش اگر دل میں مقیم ہے رقیبِ محبت ہے اگر حرفِ سوال بنکر لب پر آئے تو معصیتِ عظیم ہے محبت آپ اپنا ثمرہ ہے۔ میر کا دل اس ثمرہ سے لذت یاب تھا۔ حضورِ قلب اُن کو وہ وقت بھی دکھاتا ہے جب دعا کے لئے بابِ اجابت وا ہوتا ہے۔ لیکن اُنکے یہاں تو مدعا ہی کچھ نہیں۔ دعا کس بات کے لئے کریں۔ وہ اس شاد کام موقعہ پر ایک نعرۂ مستانہ بلند کرتے ہیں اور عاشقِ صادق یہی کر سکتا ہے اور بس ؎

اک نعرہ تو بھی پیشکشِ صبحگاہ کر   اس وقت ہے دعا و اجابت کا وصل میر

عاشق و عابد کو محویت و عبادت کے عالم میں کہ یہ اکثر نور کے تڑکے کا وقت ہوتا ہے کبھی وہ گھڑی بھی نصیب ہو جاتی ہے جب اُسکے احساسِ باطنی کی لطافت قربِ محبوب یا معبود کے ہم رنگ ہو جاتی ہے۔ اس کیفیتِ حیات آفریں میں وہ بے اختیار اک نعرہ مارنا چاہتا ہے کہ یہی اُس کا پیشکش ہو سکتا ہے "پیشکشِ صبحگاہ" کتنی کیف آفریں ترکیب ہے اور کس عالمِ جمیل کی خبر دیتی ہے۔ میر کا اکیلا یہی شعر اُنکی عابدانہ و عاشقانہ عظمت و رفعت دلوں میں بٹھانے کے لئے کافی ہے۔

میر ایسے بلند مرتبہ شخص کے پائے ثبات کو سخت سے سخت آزمائش میں بھی لغزش ہونا ناممکن تھا۔ وہ آزمائش میں سُرخروئی روحانی محسوس کرتے تھے بمصداق اسکے کہ ع دوست بہ پہلوئے دوست می آید۔ وہ تا دمِ آخر اپنی راہ میں ترقی کرتے رہے۔ انجامِ کار رضا و تسلیم، خاموشی و ضبط، خودداری

وبلند ہمتی، صبر و قناعت، نرم دلی و مسکینی، پرہیزگاری و طہارت نے اُن کو اُس منزل پر پہونچا دیا جہاں شبہات مٹ جاتے ہیں۔ جہاں بیداری ہے، سکون ہے، کیف ہے، ؎

اب پست و بلند ایک ہے جوں نقشِ قدم یاں   پامال ہوا خوب تو ہموار ہوا میں

ہمیں عشق میں میرؔ چپ لگ گئی ہے   نہ شکر و شکایت نہ حرف و حکایت

اس شعر نے میرؔ کی تمام سیرت کی یک قلم نقاشی کردی ''چپ لگ گئی ہے'' اس ''چپ'' میں کتنا زور ہے کتنا کیف ہے، اور کتنے جذبات موجزن ہیں۔ دوسرا مصرع اس چپ کی تفسیر ہے۔

احساسِ عبودیت سلوک کی جان اور عشق کا ایمان ہے۔ اس احساس نے میرؔ کو سراپا مسکینیت و خستگی بنا دیا تھا۔ ضبط خاموش و سعیٔ تسلیم نے اُن کی ہستی کو گھلا دیا تھا۔ وہ راہ محبت میں خستہ و خراب ہوتے ہوتے بالکل مٹ چکے تھے۔ اُنھوں نے اپنی تصویر اس شعر میں بالکل صحیح کھینچی ہے ؎

نہ دیکھا میرؔ آوارہ کو لیکن   غبار اک ناتواں سا کو بکو تھا

اس حالت پر جو میرؔ نے ایک طویل عمر پائی یہ احساس باطنی کی اُس رمزِ نفس کی کرامات تھی جسکو انھوں نے ذیل کے شعر میں منکشف کیا ہے ؎

بات احتیاط سے کر ضائع نہ کر نفس کو   بالیدگی دل ہے مانند شیشہ دم سے

سطور بالا میں میرؔ کی سیرت کے اجزائے ترکیبی دکھانے کی حتی الوسع کوشش کی گئی اب اس امر پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائیگی کہ اُنھوں نے اپنے کلام میں اپنی سیرت کی مصوری کیونکر کی

''اسمیں کلام نہیں کہ بھاشا کی شاعری جذبات اور اثرات سے مالا مال ہے اور جس قدر ترنم اور موسیقی اس زبان میں ہے کسی دوسری زبان کو میسر نہیں۔ اور اسکی وجہ یہ ہے کہ جیسا عاشق اس زبان کی شاعری کو ملا کسی اور زبان کو نصیب نہیں ہوا کیونکہ جنس قوی کے ہلاک کرنے کے لئے اس سے زیادہ سریع الاثر کوئی چیز نہیں کہ جنسِ لطیف کی طرف سے اظہار تعشق ہو'' (نیاز فتحپوری جذبات بھاشا صفحہ ۲۵)

اس عاشق میں کیا بات ہے جس نے بھاشا کی شاعری کو جذبات اور اثرات میں اس درجہ ممتاز بنا دیا۔ یہ عاشق اپنے محبوب ہی کو معبود جانتا ہے۔ اُسپر قربان ہونا اپنی تخلیق کی غایت سمجھتا ہے اور اسکی بندگی اپنا ایمان۔ وہ محبت کی راہ میں اپنی ہستی کا احساس مٹا کر مسکینیت، محبت اور بندگی کا ایک مجسمہ بن جاتا ہے۔ یہی مسکینیت، محبت اور شانِ بندگی بھاشا کی عاشقانہ شاعری کی جان ہے جس کو زبان کے رسیلے پن اور گھلاوٹ نے بجلی بنا دیا ہے ؎

دُوے نیناں مت کھائیو پیا ملن کی آس　　کاگا سب تن کھائیو چُن چُن کھیئو ماس

ربدھنا ایسی رین کر کہ بھور کبھو نا ہوئے　　سجن سکارے جائینگے اور نین مرینگے رُوئے

گوڑ دکاگج ہات دے تکھ ہی کہسیئو بین　　ارکا نپت پتیاں لکھت جل بھر آوت نین

میر کے عشق کی بھی وہی شان تھی جو بھاشا کی شاعری کے عاشق کی ہے۔ اُن کی غیرت وحیا کی بھی وہی شان تھی جو اُس عاشق کی ہے۔ سرُور سرور جہان آبادی نے اس عاشق کے حیا پروری کا خوب نقشہ کھینچا ہے ؎

دل ملتے ہیں دل ملنے کی راہیں نہیں ملتیں　　خلوت میں نگاہوں سے نگاہیں نہیں ملتیں

میر کہتے ہیں ؎

نہ سمجھے میر کا کچھ مدعا ہم　　مُوا جسکے لئے اُس کو نہ دیکھا

یہ عاشق کبھی خلوت میں بھی اپنے معشوق کا نام نہیں لیتا۔ میر صاحب اپنے متعلق فرماتے ہیں ؎

آیا نہ نام اُسکا میری زباں سے کے اوپر　　محو دعا تھے اکثر غیرت سے لیک گا ہے

میر کی طہارت کی بھی وہی شان تھی جو اس عاشق کی ہے۔ یہ تو رہی میر کے محاسنِ کلام کی بنیاد معنوی۔ صوری حیثیت سے بھی اُنھوں نے اپنے کلام میں وہی طرز پیدا کی جو بھاشا کی عاشقانہ شاعری کی جان ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ میر کی سی محبت، میر کی سی سکینیت وخستگی کہ یہ احساسِ عبودیت کا انعام ہے۔ میر کی غیرت وطہارت پر دوسری طرز پیدا ہونا ناممکن تھا۔ ان کی سیرت اسی کی متقاضی تھی۔

وہ الفاظ کے لئے خیال نہیں پیدا کرتے بلکہ جذبات وتاثرات کے لئے الفاظ چُنتے ہیں اور ترتیب وترکیب میں وہ اسلوب پیدا کرتے ہیں جو ایک طرف شعر کو مصوّری اور دوسری طرف موسیقی کی تصویر بنا دیتا ہے۔ ردیف وقافیہ کو اس خوبی سے مربوط کرتے ہیں کہ اُن میں فرق ہی نہیں معلوم ہوتا۔ انتخابِ الفاظ وحُسنِ بندش کا یہ عالم ہے کہ جو لفظ رکھدیا ہے بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائے زبان سے گویا اسی موقعہ کے لئے وضع ہوا تھا۔ جو بندش ہے شگفتہ و کیف آگیں جو لفظ ہے لطیف اور شیریں۔ حرف حرف سے کیفیت وسرور ٹپکتا ہے جو "نغمۂ موزوں" کے قالب میں ڈھل کر برقِ مضطرب بن جاتا ہے۔ وہ اپنی کیفیاتِ قلب میں ڈوب ڈوب کے

مزے لے لے کے شعر کہتے ہیں۔ خود اُن میں غرق ہو جاتے ہیں اور دوسروں کو بھی غرق کر دیتے ہیں ؎

قتل کئے پہ غصہ کیا ہے لاش مری اُٹھوانے دو — جان سے ہم بھی جاتے رہے ہیں تم بھی آؤ جانے دو
اب کے بہت ہے شورِ بہاراں ہمکو مت زنجیر کرو — دل کی ہوس ٹک ہم بھی نکالیں دھومیں ہمکو مچانے دو
ضعف بہت ہے میر تمہیں کچھ اُسکی گلی میں مت جاؤ — صبر کرو ٹک اور بھی صاحب طاقت جی میں آنے دو

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا — دیکھا اِس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا
عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند — یعنی رات بہت تھے جاگے، صبح ہوئی آرام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی — چاہتے ہیں سو آپ کرے ہیں ہمکو عبث بدنام کیا

اِس اندازِ بیان اور لطافتِ زبان کے صدقے۔ یہ شعر کیا ہیں جذبات کے آئینے ہیں۔ میر دماغ کو دل کے اشاروں پر چلاتے چلاتے بالکل ہم رنگِ دل بنا لیتے ہیں۔ زبان اِسکی ترجمانی کرتی ہے اور دل کا سارا درد شعروں میں بھر دیتی ہے۔ سچ کہا ہے ؎

ایک ہو دیں جب بیانِ دل تو کچھ نکلے بھی کام — یوں اثر اے میر کیا ہو گریہ و زاری کے بیچ

اس مقام پر ذرا یہ بھی دیکھ لیں کہ میر کے دل کا کیا مرتبہ تھا۔ وہ اپنے انداز میں اسکو مختصراً یوں بیان کرتے ہیں ؎

طریقِ عشق میں ہے رہنما دل — پیمبر دل ہے، قبلہ دل، خدا دل

اِسی دل کی میر نے عمر بھر پرستش کی اور اپنے دماغ کو اُسکا بندہ بنا لیا۔ جب دماغ اپنے جوش و خروش سے ٹھنڈا پڑ کر تابعِ دل ہو جاتا ہے تو اُس میں حیرت انگیز قدرت و وسعت پیدا ہو جاتی ہے اور دل و دماغ میں ایک مکمل نظام قائم ہو جاتا ہے جو بالکل اسی طرح عمل کرتا ہے جس طرح دیگر نظامِ فطرت۔ مشکل سے مشکل مضامین، نازک سے نازک جذبات، عمیق سے عمیق تاثرات سازِ دل سے ہم آہنگ ہو کر زبان پر اِس طرح رواں ہوتے ہیں جس طرح گلبنوں میں پھول کھلتے ہیں۔ میر کے نشتروں کا یہی ایک راز ہے اور بس۔ ملاحظہ ہو ؎

شب کوفت سے ہجراں کے جہاں دل پہ رکھا ہات — جو درد و الم تھا سو کہے تو کہ وہیں تھا

"وہیں" سے اِس شعر کا سارا درد سُننے والے کے دل میں منتقل ہو جاتا ہے۔ ؎

ٹک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے — کیا یار بھروسہ ہے چراغِ سحری کا

ہر لحاظ سے یہ شعر نہایت مکمل ہے۔ درد سے لبریز ہے۔ طرزِ ادا پُر کیف ہے۔ تشبیہ نے اشتیاق و بے ثباتی

کی تصویر کھینچدی ہے۔ اسی طرح ذیل کے اشعار ہیں ؎

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے — دل ہوا ہے چراغ مفلس کا
تاب کس کو جو حالِ میر سنے — رنگ ہی اور کچھ ہے مجلس کا

مر رہتے جو گل بن سارا یہ خلل جاتا — نکلا ہی نہ جی ورنہ کانٹا سا نکل جاتا

دوسرے مصرع میں ایک بجلی کی لہر ہے ؎

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا — دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

تھوڑا سا ساری رات جو بکتا رہیگا دل — تو صبح تک تو ہاتھ لگایا نہ جائیگا
یاد اُسکی اتنی خوب نہیں میر باز آ — نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائیگا

لیتے نہ تھے میر مت کڑھا کر — دل ہو نہ گیا گداز تیرا

محنت ہے یا کوئی جی کا ہے روگ — سدا میں تو رہتا ہوں بیمار سا

اس شعر کی جان لفظ "بیمار سا" ہے۔ ؎

رکھے رہتے ہیں دل پر ہاتھ اے میر — یہیں شاید کہ ہے سب غم ہمارا

چمکے ہے جب سے برق سحر گلستاں کی اور — جی لگ رہا ہے خار و خسِ آشیاں کی اور

خار و خسِ آشیاں بنہایت پُر درد و دلکش ہے۔ اسی طرح ذیل کے شعر میں خاشاکِ آشیاں ہے ؎

دل دھڑکے ہے جو بجلی چمکے ہے سُوئے گلشن — پہونچے مبادا میرے خاشاکِ آشیاں تک

بیکلی بے خودی کچھ آج نہیں — ایک مدّت سے وہ مزاج نہیں
درد اگر یہ ہے تو مجھے بس ہے — اب دوا کی کچھ احتیاج نہیں
ہم نے اپنی سی کی بہت لیکن — مرضِ عشق کا علاج نہیں

خوش نہ آئی تمھاری چال ہمیں   یوں نہ کرنا تھا پائمال ہمیں

وقتِ خوش اُنکا جو ہم بزم ہیں تیرے ہم تو   در و دیوار کو احوال سُنا جاتے ہیں
متصل رُوتے ہی رہئے تو بجھے آتشِ دل   ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں

مت تربتِ میرؔ کو مٹاؤ   رہنے دو غریب کا نشاں تو

ہوگا کسی دیوار کے سایہ کے تلے میرؔ   کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

"کیا خوب شعر ہے۔ عشق اور آرام طلبی باہم متناقض ہیں بلکہ یوں کہو کہ آرام طلبی ننگِ عاشقی ہے۔ اندازِ بیان کی شوخی اور ندرت ملاحظہ فرمائیے۔ حالانکہ عاشق جذبۂ عشق سے سرشار ہے۔ اور اُسکو دُنیا میں پڑے رہنے کے سوا کچھ کام نہیں دنیائے عشق میں اس درجہ عالی مرتبت ہونے کے باوجود اُسکو آرام طلبی کا ملزم قرار دیا گیا ہے۔ دیوارِ محبوب کا سایہ عاشق نے جذبۂ محبت سے مجبور ہو کر اختیار کیا ہے نہ کہ کسی تکلیف و محنت سے بچنے کے خیال سے لیکن ع عشق ازیں بسیار کردست و کند + عوام اِسکو منتہائے عشق سمجھیں تو سمجھیں عاشقوں کے نزدیک یہ تو منزلِ اول بلکہ ہنسی کھیل ہے" (منشی منوہن لال ماتھر بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ بریلی)

اُس کی طرزِ نگاہ مت پوچھو   جی ہی جانے ہے آہ مت پوچھو

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے   اِس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

شمعِ اخیرِ شب ہوں سُن سرگزشت میری   پھر صبح ہونے تک تو قصہ ہی مختصر ہے
اب رحم پر اُسی کے موقوف ہے کہ یاں تو   نے اشک میں سرایت نے آہ میں اثر ہے

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ   اُن سے بھی تو پوچھئے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے

بہت سعی کرئیے تو مر رہئے میرؔ   بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

نہیں وسواس جی گنوانے کے — ہائے رے ذوق دل لگانے کے
میرے تغئیر حال پر مت جا — اتفاقات ہیں زمانے کے

بھڑکے ہے آتشِ گل اے ابرِ تر ترحّم — گوشے میں گلستاں کے میرا بھی آشیاں ہے

مصائب اور تھے پر دل کا جانا — عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے

"سانحہ سا ہوگیا ہے" کیا قیامت ڈھا رہا ہے

سرہانے میر کے آہستہ بولو — ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

اس شعر کے لفظ لفظ سے خستگی، مسکینی، اور حسرت و یاس ٹپکتی ہے اور اندازِ بیان درد سے لبریز ہے

دل جانے ہے جل رو کر شبنم نے کہا گل سے — اب ہم تو چلے یاں سے تو رہ جو رہا جا ہے

کتنا درد انگیز شعر ہے

ہم طورِ عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن — سینے میں جیسے دل کو کوئی ملا کرے ہے

مقدور بھر تو ضبط کروں ہوں پہ کیا کروں — منہ سے نکل ہی جاتی ہے اک بات پیار کی

یہ شعر ضبط اور مجبوریٔ عشق کا دلکش نمونہ ہے

جب کوندتی ہے بجلی تب جانبِ گلستاں — رکھتی ہے چھیڑ میرے خاشاکِ آشیاں سے

خوب شعر ہے۔ خاشاکِ آشیاں سے بجلی چھیڑ رکھتی ہے یعنی اُسکو آشیاں پر گرنا منظور نہیں ہے کیونکہ ایسی صورت میں ایک سانحہ کے ساتھ تمام رنج والم کا خاتمہ ہو جائیگا اور چھیڑ رکھنے سے دل کو دھڑکے لگے چلے جائینگے۔ بجلی کے کوندنے کو گو وہ کہیں کوندے جانبِ گلستاں تصوّر کر لینا عاشقانہ "حسنِ ظن" کی مثال ہے

اُڑنے کی اک ہوس ہے ہمکو قفس سے ورنہ — شائستۂ پریدن بازو میں پر کہاں ہے

اس شعر کے دیگر محاسن کے علاوہ "شائستۂ پریدن" نہایت ہی دلکش ہے

وہ نہیں سرگذشت سنتا میر — یوں کہانی سی کیا کہا کرئے

بال و پر بھی گئے بہار کے ساتھ　　اب توقع نہیں رہائی کی

بس نہ لگ چل نسیم مجھ سے کہ میں　　رہ گیا ہوں چراغ سا بجھ کر

مندرجہ بالا اشعار سے واضح ہے کہ میر کے کلام کی ممتاز خصوصیتیں درد، سادگی، صفائی، لوچ اور گھلاوٹ ہیں۔ درد محبت کا، سادگی مسکینیت و احساسِ عبودیت کا، صفائی لوچ اور گھلاوٹ، موسیقیت کا کرشمہ ہیں۔ سادگی سے محض الفاظ کی سادگی مراد نہیں بلکہ خیالات بھی پیچیدہ نہیں جنکے سمجھنے میں ذہن کو تکلف و تکلیف ہو۔ یہ اُنکے سکونِ دماغی کا فیض تھا کہ وہ اپنے عمیق سے عمیق اور نازک سے نازک جذبات و تاثرات آسانی سے سمجھ لیتے تھے اور بغایت سادہ و صاف پیرایہ میں اُنکو بیان کردیتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ ادھر شعرِ میر سُنا نہیں کہ اُدھر دل میں نشتر چبھا نہیں۔ میر کے کلام میں شکوہ کا نمونہ ذیل کا شعر ہے ؎

ہنگامہ گرم کُن جو دلِ ناصبور تھا　　پیدا ہر ایک نالہ سے شورِ نشور تھا

یہ شعر اور اسکے مثل چند اشعار اور جو میر کے یہاں ہیں وہ میری رائے ناقص میں اُس زمانے کے ہیں جب میر کے دل میں جوش و خروش تھا، اضطراب تھا، ہیجان تھا، یہ منزل ہر عاشق کو پیش آتی ہے۔ مگر میر کا کمال دیکھیے کہ آشوبِ عشق کے زمانہ میں بھی کیا شعر کہا ہے جو لفظاً ہر اتنا صاف اور سادہ ہے جس سے سادہ ہونا مشکل اور بباطن جذبات کا ایک چشمۂ پُرخروش ہے ؎

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا　　آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

اِس منزل سے گزر جانے کے بعد میر کے رنگِ عشق میں استقلال پیدا ہوگیا۔ ضبط و حیا نے جوش و خروش کو قلب سے رُوح کی طرف پھیر دیا جس سے باطن میں کشایش پیدا ہوگئی اور جذبات میں وسعت و رفعت پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ وہ رنگِ حقیقت بھر گیا جسکا نام رُوحانی سرور و سکون ہے۔ اِدراک میں صحت اور اظہار میں صفائی اسکا لازمی نتیجہ تھیں، یہی وجہ ہے کہ میر کے کلام میں وہ شکوہ جو غیر حقیقی جوش کا مظہر ہے نہونے کے برابر ہے۔

اوپر کہا گیا ہے کہ صفائی، لوچ، اور گھلاوٹ موسیقیت کا کرشمہ ہیں۔ یوں تو موسیقیت وزنِ شعر کی صورت میں شاعری کا جزو ہے لیکن بعض شعراء میں موسیقیت شاعری کے مثل ایک جداگانہ ملکہ ہوتی ہے اور یہ بالکل خداداد ہے۔ میر میں موسیقیت خداداد تھی جسکو عشق و سلوک نے بہت لطیف اور دلگداز بنا دیا تھا۔ اِس شان کی موسیقیت معراجِ شاعری ہے۔ میر فرماتے ہیں ؎

ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر　　اُس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا

اگر میر میں موسیقیت محض وزن شعری واقفیت تک محدود ہوتی تو وہ سپہر کا لفظ یہاں ہرگز لکھتے بلکہ اسکی جگہ فلک کا لفظ لکھتے - لیکن فلک سے ترنم شعر خاک میں مل جاتا - فلک کا کاف آواز کو دفعتہً روک دیتا ہے جس سے حس سامعہ پر چوٹ سی لگتی ہے - برخلاف اسکے سپہر کی تے کے ساتھ آواز آہستہ آہستہ کم ہوتی ہوئی گویا نشتر کی سی نوک پیدا کرتی ہوئی سامع کے دل میں اتر کر یکدم جذبات کو برانگیختہ کردیتی ہے - میر نے اپنے کلام میں غضب کی صحت ترنم سے کام لیا ہے - اور یہی باعث ہے کہ اُن کا کلام بغایت لطیف اور شیریں ہے - تمثیلاً دو ایک شعروں پر اور یہاں روشنی ڈالی جاتی ہے - میر کے بہت سے شعر ایسے ہیں جن میں "اُن" بجائے "اس" کے استعمال کیا گیا ہے - جو محض اسی لئے نہیں استعمال کیا گیا ہے کہ اُس زمانہ میں رائج تھا - بلکہ بالقصد صحت ترنم کے لئے لایا گیا ہے اور اس لئے کہ اظہار سکینیت کرتا ہے جہاں "اُن" ہے وہاں "اس" پڑھکر دیکھئے فوراً وہ سکینیت اور لوچ جاتا رہتا ہے ؎

غیر کے کہنے سے مارا اُن نے ہمکو بے گناہ　　یہ نہ سمجھا وہ کہ واقعہ میں بھی کچھ تھا یا نہ تھا

اسی طرح ذیل کا شعر ؎

اُن نے کھینچا ہے مرے ہاتھ سے داماں اپنا　　کیا کروں گر نہ کروں چاک گریباں اپنا

اسی طرح ذیل کے شعر میں لفظ 'شام' کے بجائے 'سانجھ' کا لفظ استعمال ہوا ہے ؎

کہہ سانجھ کے مُوئے کو اے میر روئیں کب تک　　جیسے چراغ مفلس اک دم میں جل بجھا ئیں

اگر یہاں 'سانجھ' کی جگہ 'شام' پڑھا جائے تو لوچ کی جگہ ثقل پیدا ہو جاتا ہے اگرچہ لفظ 'شام' بجائے خود ثقیل نہیں - اور شعر کی دردانگیزی میں بھی کمی آجاتی ہے یہ ہیں وہ نکات موسیقیت جنکے باعث میر کا کلام لطافت اور گھلاوٹ کا نمونہ بن گیا ہے - درد اور سودا ئی تو کسی حد تک دوسرے شعراء میں بھی پائی جاتی ہے لیکن یہ گھلاوٹ تو اور کسی کے یہاں نظر نہیں آتی - اور نہ آئندہ یہ امید ہے کہ نظر آئے کیونکہ اُردو ہندی کے قضیئے نے دونوں زبانوں میں رقابت پیدا کردی ہے - ہندی لطافت اور گھلاوٹ میں اپنا نظیر نہیں رکھتی - اُردو اب اُسکو اپنا رقیب سمجھ رہی ہے پھر دونوں میں کیونکر موانست و مجانست پیدا ہو - میر کے زمانہ میں یہ بات نہیں تھی - اُنھوں نے جس زبان میں غزل خوانی شروع کی اُسکو حرز جان بنایا، اُسی کو فروغ دیا اور اُسی پر تا دم آخر نازاں رہے - اُنکے کلام کی گھلاوٹ بھاشا کے اُن بیشمار الفاظ کی بہت کچھ

رہینِ منت ہے جن پر اُردو اب متروکیت کا فتویٰ نافذ کر چکی ہے۔
یہی نہیں بلکہ طرزِ ادا میں بھی میر کے یہاں اس لطافت کے نمونے ہیں جو اُردو فخر کے ساتھ ہندی کے سامنے پیش کر سکتی ہے اور جنکی نظیر اُردو میں دوسری جگہ نہیں ملتی ملاحظہ ہو ؎

ان گلرخوں کی قامت لہکے ہے یوں ہوا میں جس رنگ سے لچکتی پھولوں کی ڈالیاں ہیں

بڑھتی نہیں پلک سے تا ہم تلک بھی پہونچیں پھرتی ہیں وہ نگاہیں پلکوں کے سائے سائے

شوقِ قامت میں ترے اے نونہال گُل کی شاخیں لیتی ہیں انگڑائیاں

دیکھئے میر کے تخیل پر ہندی شاعری کا اثر کس حد تک چھایا ہوا تھا ؎

گوندھ کے گویا پتی گُل کی وہ ترکیب بنائی ہے رنگ بدن کا جب دیکھو جب چولی بھیگے پسینے میں

صبح چمن کا جلوہ ہندی بتوں میں دیکھا صندل بھری جبیں پر ہونٹوں کی لالیاں ہیں

ذیل کے شعر میں تشبیہ ہندی سے مستعار ہے ؎

ٹک چشم میں بھی سرمہ کا دنبالہ کھینچئے اِس مست کے بھی ہات میں تلوار ایک دو

ہندی دوہا ہے ؎

ایک تو نیناں مدھ بھرے دُوجے انجن سار ارے باؤرے کو دیت ہے ستوارن ہتیار

کلامِ میر نرم، سبک اور شگفتہ الفاظ و تراکیب سے جس قدر مترنم و لطیف ہے اسی قدر مخصوص اسلوبِ بیان سے دل آویز و رُوح پرور ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اسلوبِ بیان ہی شاعری میں خاص چیز ہے۔ نفسِ شاعری کے اعتبار سے یہ نہیں دیکھنا چاہئے کہ شاعر کیا کہتا ہے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ کس انداز سے کہتا ہے۔ میر کہیں سلیس و سادہ الفاظ کی انوکھی طرز ترتیب سے رنگِ معنی میں بجید چکونگی، اور اندازِ بیان میں بجید دلکشی پیدا کر دیتے ہیں۔ کہیں وہ یہی کام ایجاز سے لیتے ہیں۔ اور جہاں تفصیل پر آجاتے ہیں وہاں محاکات کے نمونے بنا دیتے ہیں۔ بہت سے اشعار اوپر درج ہو چکے۔ چند ذیل میں اور پیش کئے جاتے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک اپنی مخصوص طرز ادا کی خوبیوں کی تشریح طلب کرتا ہے۔ جس سے بخوفِ طوالت گریز کیا جاتا ہے۔ اہلِ نظر خود ہی بنظرِ تامل ملاحظہ فرمائیں۔ الفاظ خط کشیدہ خاص طور پر غور طلب ہیں ؎

کل شبِ ہجراں بھی لب پر نالہ بیمارانہ تھا — شام سے تا صبح دم بالیں پہ سر یک جا نہ تھا
بعد خونریزی کے مدت بے حنا رنگیں رہا — ہات اُسکا جو مرے لوہو میں گستاخانہ تھا

جس نے سر کھینچا دیارِ عشق میں اے بوالہوس — وہ سراپا آرزو آخر جواں مارا گیا

اے ہم صفیرِ بے گُل کس کو دماغِ نالہ — مُدت ہوئی ہماری منقار زیرِ پر ہے

پھر نہ دیکھا کچھ بجز اک شعلۂ پُر پیچ و تاب — شمع تک تو ہم نے دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

یہ جو مہلت جسے کہے ہیں عُمر — دیکھو تو انتظار سا ہے کچھ

صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی — کیا پتنگے نے التماس کیا

جو اِس شور سے میر روتا رہے گا — تو ہمسایہ کا ہے کو سوتا رہے گا

کہا میں نے کتنا ہے گُل کا ثبات — کلی نے یہ سُن کر تبسم کیا

کیا جانوں میں چمن کو ولیکن قفس پہ میر — آتا ہے برگِ گُل کبھو کوئی صبا کے ساتھ

کس گنہ کا ہے پس از مرگ یہ عذرِ جاں سوز — پاؤں پر شمع کے پاتے ہیں سرِ پروانہ

اے شبِ ہجر راست کہہ کہ مجھے — بات کچھ صبح کی بھی آتی ہے

ملے برسوں وہی بیگانگی تھی — ہمارے زعم میں وہ آشنا تھا

سرسری تم جہان سے گزرے ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

اِن دو مصرعوں میں کتنے معنی ہیں۔

اب چند نمونے محاکات کے ملاحظہ ہوں ؎

صبحِ چمن کا جلوہ مہندی بتوں میں دیکھا صندل بھری جبیں پہ ہونٹوں کی لالیاں ہیں
ان گلرخوں کی قامت لہکے ہے یوں ہوا میں جس رنگ سے لچکتی پھولوں کی ڈالیاں ہیں

چلتے ہو تو چمن کو چلیے سُنتے ہیں کہ بہاراں ہے پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم باد و باراں ہے

چشمِ انجم سپہر جھپکے ہے صدقے اِن انکھڑیاں لڑانے کے

فتنہ در سر بتانِ حشر خرام ہائے رے کس ٹھسک سے چلتے ہیں

ساعدِ سیمیں دونوں اسکے ہات میں لا کر چھوڑ دیئے بھولے اُسکے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا

نظر اُٹھتی نہیں کہ جب خوباں اُٹھکے سوتے سے آنکھیں ملتے ہیں

لیتے کروٹ ہل گئے جو کان کے موتی ترے شرم سے سر در گریباں صبح کے تارے ہوئے

آخر میں تشبیہ و استعارہ پر بھی ایک اجمالی نظر ڈالنا ضروری ہے اس لئے کہ یہ بھی شاعرانہ کمال کا معیار ہے۔ میرؔ نے نہایت جامع، مکمل اور پاکیزہ تشبیہات و استعارات صرف کئے ہیں جنکو اُنکے خاص اندازِ بیان نے عجب دلکشی کا نمونہ بنا دیا ہے ؎

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

ٹک میرِ جگر سوختہ کی جلد خبر لے کیا یار بھروسہ ہے چراغِ سحری کا

دیکھے ہے مجھے دیدۂ پرخشم سے اے میرؔ میرے ہی نصیبوں میں تھا یہ زہر کا پیالا

تھی بجلی کی سی لہر کہ آئی چلی گئی   پہونچی ہے اُس ہر سے مری طبعِ رواں کی بات

پڑتے نگہ اُس شوخ کی ہوتا ہے یہ احوال   رہجاوے ہے جیسے کہ کوئی بجلی سے ڈر کر

کہہ سا بجھ کے موئے کو اسے میرؔ مُدّتیں تک   جیسے چراغِ مفلس اک دم میں جل بجھا تو

یک بیاباں برنگِ صوتِ جرس   مجھ پہ ہے بکیسی و تنہائی

ترے فراق میں جیسے خیال مفلس کا   گئی ہے فکرِ پریشاں کہاں کہاں میری

ہر ہر قدم کو اپنے رکھ احتیاط سے یاں   یہ کارگاہ ساری دکانِ شیشہ گر ہے

بوئے گُل یا نوائے بلبل تھی   عمر افسوس کیا شتاب گئی

اشعار مندرجۂ بالا میں یوں تو ہر تشبیہ و استعارہ بغایت پُرلطف و جامع ہے لیکن خط کشیدہ الفاظ تو ایسے ہیں کہ اُن پر جتنا غور کیا جائے اُتنی ہی اُن کی لطافت اور دلکشی بڑھتی جاتی ہے

میرؔ کی سیرت سے ہم آگاہ ہو چکے، اُنکے کلام کی شاعرانہ لطافتیں اور نزاکتیں بھی ہم نے دیکھیں۔ اب کچھ رنگِ مضامین بھی دیکھنا چاہئے۔ میرؔ کی شاعری بہمہ وجوہ اِس امر واقعہ کو ذہن نشین کرتی ہے کہ شاعری حقیقت نگاری اور سیرت آرائی مترادف صفات ہیں میرؔ کی زندگی شاعری سے کوئی جداگانہ وجود نہیں رکھتی تھی۔ شاعرانہ کیفیتیں اُنکے اجزائے ہستی بن گئی تھیں۔ وہی ان کا ماحول زندگی بھی تھیں۔ اُنھیں میں وہ چلتے پھرتے تھے، سانس لیتے تھے، بلکہ جذب ہو گئے تھے، اُنھوں نے طویل عمر پائی تھی، اُنکے مشاہدات اُنکے تجربات اور تاثرات کے تنوع کی حد نہیں ہے، اُنکا کلام بالاستیعاب مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے بے شمار پہلوؤں پر اُنھوں نے روشنی ڈالی ہے۔ اگر ایک ایک شعر بھی تمثیلاً پیش کیا جائے تو ورق کے ورق سیاہ ہو جائیں۔ لہٰذا دیگر تمام پہلوؤں کو نظر انداز کرکے اِس موقعہ پر چند نمونے صرف رموزِ اخلاق، اسرارِ حکمیہ، اور معارفِ الٰہیہ کے پیش کئے جاتے ہیں۔ کہ یہ شاعری کی آخری

منزل ہے۔ اہلِ نظر ملاحظہ فرمائیں اور لطف اُٹھائیں ؎

اور جو چاہے کیجیو پیارے — ایک ہو جو نہ درپئے آزار

یہی ہر اہلِ دل کا مسلک اور ہر مذہب کی جان ہے۔ میر نے بار بار اس حقیقت پر زور دیا ہے ؎

مت رنجہ کر کسی کو کہ اپنے تو اعتقاد — دل ڈھائے کر جو کعبہ بنایا تو کیا ہوا

معیشت ہم فقیروں کی سی ابنائے زماں سے کر — کوئی گالی بھی دے تو کہہ بھلا بھائی بھلا ہوگا

تھا مستعار حسن سے اُسکے جو نور تھا — خورشید میں بھی اُس ہی کا ذرہ ظہور تھا
پہونچا جو آپ کو تو میں پہونچا خدا کے تئیں — معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا
آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم — یک شعلہ برق خرمنِ صد کوہ طور تھا
تھا وہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میر — سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

سب سے مل جُل کہ حادثہ ہے پھر — کہیں ڈھونڈھا بھی تو نہ پائے گا

بسانِ خاک ہو پامالِ راہِ خلق اے میر — رکھے ہے دل میں اگر قصد سرفرازی کا

جز مرتبۂ کل حاصل کرے ہے آخر — یک قطرہ نہ دیکھا جو دریا نہ ہوا ہوگا

گُل و آئینہ کیا خورشید و مہ کیا — جدھر دیکھا اُدھر تیرا ہی رو تھا

جہاں جلوے سے اُس محبوب کے یکسر لبالب ہے — نظر پیدا کر اوّل پھر تماشا دیکھ قدرت کا

کچھ عشق و ہوس میں فرق بھی کر — کیدھر ہے وہ امتیاز تیرا

دل نے ہم کو مثالِ آئینہ — ایک عالم کا روشناس کیا

یہ دو ہی صورتیں ہیں یا منعکس ہے عالم — لم آئنہ ہے اُس یار خود نما کا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام — آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

ہوتا ہے یاں جہاں میں ہر روز و شب تماشا — دیکھو جو خوب تو ہے دنیا عجب تماشا

حقیقت نہ میر اپنی سمجھی گئی — شب و روز ہم نے تامل کیا

یاں کے سفید و سیہ میں ہمکو دخل جو ہے سو اتنا ہے — رات کو رو رو صبح کیا اور دن کو جوں توں شام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی — چاہتے ہیں سو آپ کرے ہیں ہمکو عبث بدنام کیا

غلط تھا آپ سے غافل گزرنا — نہ سمجھے ہم کہ اس قالب میں تو تھا

ہر قدم پر تھی اُسکی منزل لیک — سر سے سودائے جستجو نہ گیا

بیخودی لے گئی کہاں ہمکو — دیر سے انتظار ہے اپنا

مستی میں شراب کی جو دیکھا — عالم یہ تمام خواب نکلا

جسمِ خاکی کا جہاں پردہ اُٹھا — ہم ہوئے وہ میر سب وہ ہم ہُوا

دیکھا ہو کچھ اس آمد و شد میں تو کچھ کہوں — خود گم ہُوا ہوں بات کی جو تہ کو پا گیا

مربوط ہیں تجھ سے بھی یہی ناکس و نااہل — اس باغ میں ہمنے گُلِ بے خار نہ پایا

مُوند رکھنا چشم کا ہستی میں عینِ دید ہے — کچھ نہیں آتا نظر جب آنکھ کھولے ہے حباب

ہیں عناصر کی یہ صورت بازیاں — شعبدے کیا کیا ہیں ان چاروں کے بیچ

سرسری مت جہاں سے جا غافل — پانوں تیرا پڑے جہاں ٹک سوچ
گل و رنگ و بہار پردے ہیں — ہر عیاں میں ہے وہ نہاں ٹک سوچ
ہونٹھ اپنا ہلا نہ سمجھے بن — یعنی جب کھولے تو زباں ٹک سوچ

سہل مت بوجھ یہ طلسم جہاں — ہر جگہ یاں خیال ہے کچھ اور

گہ گل ہے گاہ رنگ گہے باغ کی ہے بو — آتا نہیں نظر وہ طرحدار اک طرح
نیرنگ حسن دوست سے کر آنکھیں آشنا — ممکن نہیں وگرنہ ہو دیدار اک طرح

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے — یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

محو دعا تھا اکثر غیرت سے لیک گاہے — آیا نہ نام اسکا پھر بھی مری زباں پر

اس وقت ہے دعا و اجابت کا وصل میر — اک نعرہ تو بھی پیشکش صبحگاہ کر

عرش و دل دونوں کا ہے پایہ بلند — سیر ہستی ہے ان مکانوں پر

چار دن کا ہے یہ جھمیلا سب — سب سے رکھئے سلوک ہی ناچار

لبریز جلوہ اسکا سارا جہاں ہے یعنی — ساری ہے وہ حقیقت جاوے نظر جہاں تک

طریق عشق میں ہے رہنما دل — پیمبر دل ہے، قبلہ دل، خدا دل

ہے تہِ دل بتوں کا کیا معلوم　　نکلے پردے سے کیا خدا معلوم
یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے　　سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم

اس بزم خوش کے محرم نا آشنا ہیں سارے　　کس کو کہوں کہ واں تک میری خبر کرو تم

وقفۂ مرگ اب ضروری ہے　　راہ طے کرتے تھک رہے ہیں ہم

وجہ بیگانگی نہیں معلوم　　تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

کیا کہئے آہ جی کو قیامت ہے انتظار　　آتا نہ کاش وعدۂ دیدار درمیاں

عام ہے یار کی تجلی میر　　خاص موسیٰ و کوہِ طور نہیں

ہستی اپنی ہے بیچ میں پردہ　　ہم نہ ہوویں تو پھر حجاب کہاں

اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے　　اس رمز کو ولیکن معدود جانتے ہیں

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر　　میں ورنہ وہی خلوتیِ رازِ نہاں ہوں
دیکھا ہے مجھے جن نے سو دیوانہ ہے میرا　　میں باعثِ آشفتگیِ طبعِ جہاں ہوں

دل جو پانی ہو تو آئینہ ہے روئے یار کا　　خانہ آبادی سمجھ اس خانہ ویرانی کے تئیں

عرش تک تو خیال پہونچے میر　　وہم ہے پھر کہیں قیاس کہیں

بارے دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو　　ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

کیا جانئے کہ کیا کچھ پردے سے ہووے ظاہر — رہتے ہیں دیکھتے ہم ہر صبح آسماں کو

شاید کہ سربلندی ہووے نصیب تیرے — جوں گردِ راہ سب کے پاؤں سے تو لگا رہ
ہر خشت خاک یاں کی چاہے ہے کچھ تامّل — بن سوچے راہ مت چل ہر گام پر ٹھہرا رہ

واعظ نہ ہو معترض نیک و بد جہاں سے — جو ہو سکے تو غافل اپنی ہی فکر کر کچھ

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہمکو — وگرنہ ہم خدا تھے گر دلِ بے مدعا ہوتا

فلک اے کاش ہمکو خاک ہی رکھتا کہ اسمیں ہم — غبارِ راہ ہوتے یا کسی کی خاک پا ہوتے

عشق کے آثار ہیں اے بوالہوس — داغ بدل دست بسر چپ ہے

اپنے ہی دل کا گنہ ہے جو جلاتا ہے مجھے — کس کو لے مریئے میاں اور کس کو تہمت دیجئے

جو سوچے کچھ تو وہ مطلوب ہم ہی نکلے میرؔ — خراب پھرتے تھے جسکی طلب میں مدت سے

گھر گھر پھرے ہے جھانکتی ہر صبح جو نسیم — پردے میں کوئی ہے کہ یہ اسکا سراغ ہے

ہمیں جس جائے کل غش آگیا تھا — وہیں شاید کہ اس کا آستاں ہے

نہیں کھلتیں آنکھیں تمہاری ٹک کہ مآل پر بھی نظر کرو — یہ جو وہم کی سی نمود ہے اسے خوب دیکھو تو خواب ہے
گئے وقت آتے ہیں ہاتھ کب ہوئے انکو کھوکے خراب سب — تجھے کرنا ہووے سو کر تو اب کہ یہ عمر برق شتاب ہے
تو جہاں کے بحر عمیق میں سرِ پُر ہوا نہ بلند کر — کہ یہ پنج روزہ جو بود ہے کسی موج پر کا حباب ہے

ڈر ظلم سے کہ اسکی جزا بس شتاب ہے
آیا عمل میں یاں کہ مکافات ہو گئی

ہو واصل جہاں خورشید داں ہے
تردد کیا ہے ہستی میں جدائی

تری آہ کس سے خبر پایئے
وہی بے خبر ہے جو آگاہ ہے

کوئی ہو محرم شوخی ترا تو میں پوچھوں
کہ بزم عیش جہاں کیا سمجھ کے برہم کی

دل سے نزدیک اور اتنا دور
کس سے اسکو کچھ آشنائی ہے

ہم آپ سے گئے تو الٰہی کہاں گئے
مدت ہوئی کہ اپنا ہمیں انتظار ہے

کوئی ہیگا نہ گر نہیں موجود
منھ چھپانا یہ کیا ہے پھر ہم سے

نایاب اس گہر کی کیا ہے تلاش یاں
جی ڈوبتا ہے اسکا جو تہ سے آشنا ہے

آن میں کچھ ہیں آن میں کچھ ہیں
تحفۂ روزگار ہیں ہم بھی

راہ سب کو ہے خدا سے جان اگر پہونچا ہے تو
ہوں طریقے مختلف کیسے ہی منزل ایک ہے

حرم سے دیر اٹھ جانا نہیں عیب
اگر یاں ہے خدا واں بھی خدا ہے

کعبے گئے کیا کوئی مقصد کو پہونچتا ہے
کیا سعی سے ہوتا ہے جب تک نہ خدا چاہے

کلام میر کے متعلق اتنے اوراق لکھے گئے لیکن پھر بھی بہت سے ایسے نکات رہ گئے جو بیان کرنے کے قابل تھے اور جنکو نظر انداز کرتے ہوئے دل دکھتا تھا مگر بخوف طوالت نظر انداز کئے گئے اور جو کچھ بھی بیان کیا گیا ہے مختصر بیان کیا گیا ہے ورنہ میر کے بے شمار اشعار ایسے ہیں جن میں سے ہر ایک اپنی شرح کے لئے جداگانہ موضوع چاہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس شعر پر نظر کیجئے اپنے عالم دلکشی و نیرنگی میں گم کر دیتا ہے ؎

جس جائے سراپا میں نظر جاتی ہے اسکے
آتا ہے مرے جی میں یہیں عمر بسر کر

تاریخِ عالم

(از جناب محمد امیر بی اے ۔ بی ۔ ٹی اورنگ آبادی

ہم دیکھ رہے ہیں کہ آجکل تاریخ کے مطالعہ کا شوق روز بروز ترقی پذیر ہو رہا ہے ۔ انس
کوشش و تخیل سے کام لیکر ارتقائی تاریخ کے لئے مواد فراہم کرتا جا رہا ہے ۔ آئے دن کا
تحقیقاتیں ہو رہی ہیں اور ایسی چیزیں برآمد ہو رہی ہیں جن سے قبل تاریخ کا عہد زندہ ہو
یہی وجہ ہے کہ علمِ تاریخ کا معیار بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا ہے ۔

تاریخِ عالم لکھنے کا خیال نیا نہیں ہے ۔ بلکہ اس قسم کی تاریخ لکھنے کی کوشش تہ
نے اُس وقت کی تھی جب یورپ کے باشندوں کو تہذیب کا معمولی سبق بھی یاد نہو
اُن پر وحشت و جہالت چھائی ہوئی تھی ۔ اٹھارھویں صدی عیسوی میں کانٹ
کے دیگر فلسفیوں نے اِس نظریہ کو دوبارہ دنیا کے سامنے پیش کیا کانٹ کے خیال
عالمگیر تاریخ عالمگیر قومیت کی تاریخ ہے ۔ وہ افراد اور حکومتوں کو متحد الخیال بنا
مقصد کی تکمیل میں لگانا چاہتا ہے تاکہ سائنس کی قوتوں کی بدولت زمین کی طر
کھنچ جائیں اور اقتصادی ، سیاسی اور علمی تحریکات ایک دوسرے میں پیوست ہو
حقیقت میں تاریخِ عالم نوعِ انسان کے جسمانی ، ذہنی اور رُوحانی ارتقاء کے دلچسپ
کا نام ہے اور مورخ کا بھی یہی کام ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ اولادِ آدم کو موجودہ تہذیب
کی بلندی پر پہنچنے تک کن کن منزلوں سے گذرنا پڑا اور کون کون گھاٹیاں عبور کرنی

عالمگیر تاریخ نوع انسان کے تمام فرقوں اور گروہوں کو اپنی وسعت دامن میں
اور بکھرے ہوئے دلوں اور برگشتہ روحوں کو ایک دوسرے سے اِس طرح ملا دیگی کہ اُنکی
کہانیاں اور سرگذشتیں مل کر ایک مکمل افسانہ کی صورت اختیار کر سکیں ۔ ایسی جا
نہ صرف بڑی اور تہذیب یافتہ قوموں کے کارنامے محفوظ کریگی بلکہ چھوٹی اور وحش

له اِس مختصر مضمون کی ترتیب میں ماروِن اور دیگر کے خیالات سے استفادہ کیا گیا ہے ۔ امیر

افعال بھی دُہرائیگی - یعنی دورِ حرکت و ترقی کے واقعات، عہدِ جمود کی بے رنگ تصویریں اور دنیا اور انسانیت کے ہر خطہ اور ہر فرقہ کی مجموعی ترقی کے حالات اُنہیں اُسمیں نظر آئینگے - کیونکہ یہ امر اب تسلیم کیا جا چکا ہے کہ تہذیب و تمدن کی عمارت استوار کرنے میں ہر مُلک اور ہر قوم نے ایک دوسرے کا ہاتھ بٹایا ہے -

تاریخ عالم وسیع خانوادۂ انسانی کی ایک ہی داستان ہے - ہر نسل اور ہر حکومت نے اپنی زندگی سے دوسری نسلوں اور حکومتوں کو متاثر کیا ہے اور اُنکے باہمی عمل نے ایک مشترکہ تہذیب کے پیدا کرنے میں بہت بڑی حد تک حصہ لیا ہے - ایک ذہین مُورخ کے لئے جسکا رجحانِ طبع تعمیری ہو، اس قسم کے واقعات کے باہمی تعلق کو دکھانا کوئی مشکل امر نہیں ہے - اُسے صرف نظریۂ ارتقاء پر ایمان لاکر یہ جاننا پڑیگا کہ انسان کا علم بہت وسیع ہو گیا ہے اور اُس نے قدرت کی اطاعت کرکے اُس پر فتح حاصل کرلی ہے - علوم و فنون کے خزانے اُسکے ہاتھ آگئے ہیں اور جو کمال اُس نے ادبیات و فنونِ لطیفہ میں اِس وقت حاصل کیا ہے وہ اُسکی اگلی وحشت اور موجودہ شائستگی میں ایک امتیاز پیدا کر رہا ہے -

اِسی مرکزی رشتہ کو پکڑنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ تاریخ میں کس قدر تسلسل اور یکسانیت ہے - کیا اسکے خلاف کوئی دلیل ایسی ہے جس سے ثابت ہو جائے کہ زمانہ ترقی کے دریا کے بہاؤ کا ساتھ نہیں دے رہا ہے ؟

دوسری بات مُورخ کو یہ جاننی چاہئے کہ انسان نے قدرت پر غلبہ پاکر بحر و بر کے ڈانڈے ملادئے ہیں اور ساری دنیا ایک مسلسل آبادی کے مختلف حصوں اور محلّوں کے مانند معلوم ہوتی ہے - زمان و مکان کا تفرقہ کاروبار اور معاملات کی سہولت کی خاطر دور کر دیا گیا ہے غرضکہ دُنیا سکڑ کر چھوٹی ہو گئی ہے مگر حقیقی فاصلہ وہی ہے جو پہلے تھا - اَب مُورخ کو یہ دیکھنا ہے کہ اِس ترقی کا اثر دنیا پر کیا پڑا ؟ ہم دیکھتے ہیں کہ ذرائع آمد و رفت کی وسعت سے تمام قومیں آپس میں گھُل مِل جا رہی ہیں - بین الاقوامی کانفرنسیں نہایت مستعدی کے ساتھ غور کر رہی ہیں کہ کس طرح مختلف مذاہب، ادبیات اور تمدن ایک ہی رشتے میں پروئے جا سکتے ہیں - ضروریات زندگی کے حصول میں سہولت پیدا ہو گئی ہے اور بہت سی چیزیں جو پہلے تعیشات میں داخل تھیں اَب ضروریاتِ حیات بن گئی ہیں - سائنس، معاشرتی اتحاد و تنظیم کے سبب سے عالم کا نقشہ ہی بدلتا جا رہا ہے - علم اپنے عملی کرشمے دکھا رہا ہے - اجسامِ سادی کو توڑنا، پہاڑوں کو حرکت دینا، کرۂ ہوا -

میں اڑنا، سمندر میں غوطہ لگانا، انسان کے لئے آسان ہوگیا ہے۔ سائنس کے طفیل لاعلاج بیماریوں کی بھی دوائیں پیدا ہوگئی ہیں اور ایسے عجیب و غریب طریقے علاج کے سوچے گئے ہیں کہ عقل انسانی دنگ ہے۔ عمر کا اوسط بڑھایا جا رہا ہے اور کوشش کی جا رہی ہے کہ انسان صرف بڑھاپے کی کمزوری ہی سے ہلاک ہو اور خوفناک امراض کا شکار نہ بنے۔ جہاں صحت الناس کی حفاظت کا اتنا خیال ہے وہاں تعلیم و تربیت کا انتظام بھی جدید اصولوں پر کیا گیا ہے تاکہ تھوڑے وقت میں علم کی دولت بھی مل جائے اور انسان عملی زندگی بسر کرنے کی قابلیت بھی حاصل کرے۔

مزدوروں کے لئے کانگریسیں قائم ہیں تاکہ اُنکے حقوق کی حفاظت کی جائے اور اُنکو سرمایہ داروں کے ظلم و تعدی سے بچایا جائے۔ بچوں کے ساتھ پوری ہمدردی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اُنکی نگہداشت و تربیت کی ہزاروں تدبیریں سوچی گئی ہیں اور اُن پر کاربند ہونے کی کوشش کی جا رہی ہے جنگ عظیم کی ہولناک تباہیوں کے باوجود سارے دماغ انسانی آلام کا سمندر پاٹنے میں لگے ہوئے ہیں سماجی اور انسانی اتحاد کی تحریک زور پکڑ رہی ہے اور مجبور و کمزور کی بقاء کی فکر کی جا رہی ہے۔

یہ کہا جاتا ہے کہ قومیت اور اقتصادی رقابت کی وجہ سے جنگِ عظیم کا سانحہ پیش آیا تھا۔ مگر اب یہی اسباب امن کا باعث بن گئے ہیں۔ ہالینڈ، سوئٹزرلینڈ اور ترکی نے تلوار سے اپنی قومی زندگی کو حاصل کیا، لیکن اب سب سے زیادہ صلح جویی قوتیں نظر آ رہی ہیں۔ بڑی قومیں چھوٹی قوموں کو اپنی حفاظت میں لے رہی ہیں۔ کیونکہ دنیا کے امن کا دار و مدار کمزوروں کو قوت بخشنے اور اُنکی حفاظت کرنے پر ہے عام حقوق اور بین الاقوامی انصاف کے سب مستحق ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ تجارت کی آتش حسد نے عالم کے چہرے کو جھلس دیا ہے لیکن اُسکے مفید اثرات بھی نہایت سُرعت اور تیزی کے ساتھ اپنا کام کر رہے ہیں۔ تجارت خلوص، نیک نیتی اور اعتماد باہم کا نام ہے۔ کُرہ ارض دخانی جہازوں، ریل، برق اور لاسلکی سے متحد کر دیا گیا ہے۔ اب کلکتہ اور نیویارک کے بازاروں کی کڑیاں لندن اور جاپان کے بازاروں سے ملی ہوئی نظر آتی ہیں۔

پہلے موسیقی کو جگت بھاشا کہا جاتا تھا مگر موسیقی کی جگہ سائنس نے لے لی ہے اور اب سائنس ہی کو جگت بھاشا یا ذریعۂ اتحاد کہنا چاہئے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ سائنس کی ہر ایجاد کو بین الاقوامی بنایا جا رہا ہے تاکہ بنی نوعِ انسان کو راحت اور خوشی پہنچے اور اقوام عالم ایک دوسرے کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں۔

عصر حاضرہ کی ترقی [illegible]

ترقی کریگی ؟ اس سوال کا جواب دینا مشکل نہیں - ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ تمام حکومتوں اور انسانوں نے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ "بچہ" کی حفاظت اور عمدہ تربیت میں عالم کی ترقی کا راز ہے - بچہ ماضی کو حال سے ملاتا ہے اور مستقبل کو شاندار بنانے کی امید دلاتا ہے - اسکی پیدائش انسان کی اصلیت کا پتہ دیتی ہے - اسکی نشو و نما گذشتہ تاریخ کی غمازی کرتی ہے - اُسکی صلاحیتیں آیندہ ترقیوں کی بشارت دیتی ہیں، غرضکہ وہ تمام ارتقائی قوانین کا خلاصہ ہے اور ساری گذری ہوئی نسلوں کے ترکہ کا تنہا وارث - اس لئے رنگ و ملت کے امتیازات کو اُٹھا کر "بچہ" سے محبت کرنا اور اُسکی تعلیم و تربیت کا بہترین انتظام کرنا اُس منزل کی طرف قدم بڑھانا ہے جسے ہم کبھی نہ پاسکیں گے مگر جسکی تلاش و جستجو میں ہمیشہ سرگرم رہیں گے - اگر ہم غور و توجہ سے کام لیں تو "بچہ" ایک ہی وقت میں ایک اچھا مزدور، اچھا صناع، اچھا شہری، اور سب سے بڑھکر یہ کہ نوعِ انسان کا اچھا خادم بن سکتا ہے -

ہم ایک خوشگوار بے چینی کے ساتھ اُس مبارک گھڑی کا انتظار کر رہے ہیں جب اسلام کی عالمگیر اخوت کا خواب پورا ہوگا - نسل، وطن اور رنگت کے تفرقے دُور ہو جائینگے - بہت کم زبانیں سمجھی اور بولی جائینگی - سارا کرۂ ارضی انسان کا وطن ہو جائیگا - سرمایہ داری اور شہنشاہیت کے خاتمہ سے جنگ کا امکان باقی نہ رہے گا اور دنیا کی ساری قومیں صرف ایک خدا کی بادشاہی کو تسلیم کرلینگی -

---

رسید کتب

آئینۂ قواعد - سفینۂ قواعد - خزینۂ قواعد - از مولوی محمد طاہر فاروقی - آگرہ -

گوہر اُردو - اختر اُردو - پیکر اُردو - جوہر اُردو - منظر اُردو - } از مولوی عابد حسین فریدی و مولوی حامد حسن قادری - آگرہ

نانک کتھا - از نور آسی و محمد عمر صاحبان - قیمت - ۸؍

مخزنِ نکات - از حضرت قائم چاندپوری - شائع کردہ انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد - قیمت ۱۲؍

بھگوان بُودھ کی تعلیم

از جناب گنگا چرن لال کوشا

کسی ایسے مذہب کے متعلق غلط فہمی کا پیدا ہونا جو کہ مُلک سے معدوم ہوگیا ہو بہت آسان ہے - ایک زمانہ تھا جب کہ یہ مُلک بھگوان بُودھ کی رُوحانی سلطنت کی راجدھانی تھا، مگر آج اُس بادشاہت کا پتہ پُرانے کھنڈرات ہی بتاتے ہیں -

ہندوستان میں اور خاصکر ہندو قوم میں عام طور سے یہ غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ ہندو قوم کی بہت سی اخلاقی - اور تمدّنی کمزوریوں کے باعث بھگوان بُودھ اور اُنکی تعلیم ہے - مجھکو اکثر ایسے مضامین پڑھنے اور لیکچر سُننے کا اتفاق ہوا ہے جن میں یہ بتایا گیا کہ بُودھ مذہب کے "اہنسا پرمودھما" کی تعلیم آریہ قوم کی غلامی کا سبب بنی اور بُودھ بھگوان کی اِس تلقین نے کہ "دُنیا میں انسان کو بہت سی مصیبتوں اور رنج و غم کا سامنا کرنا پڑتا ہے" آریہ قوم کے نوجوانوں کا دل دنیا کی دلچسپیوں سے ہٹا دیا اور قوم کو گداگری کا سبق پڑھا دیا -

کسی مصیبت زدہ سے اگر کوئی انسان یہ کہدیتا ہے کہ وہ بذاتِ خود اپنی مصیبتوں کا ذمہ دار ہے تو اُسکو ایسے ہمدرد کی گفتگو نہایت تلخ معلوم ہوتی برخلاف اسکے اگر کوئی شخص بنظر ہمدردی اُس سے یہ کہے کہ وہ بذاتِ خود بے قصور ہے اور اُسکی مصیبتیں کسی دوسرے شخص یا بیرونی اسباب کا نتیجہ ہیں تو اُسکو خوشی حاصل ہوگی اور ایسے ہمدرد کی بات اُسکو بھلی معلوم ہوگی بالکل یہی حال ہندو قوم کا ہے وہ یہ بات سُننے کے واسطے تیار نہیں ہے کہ اُسکی یہ سب مصیبتیں جو اُسکے اوپر نازل ہو رہی ہیں اُسی کے اعمال کا نتیجہ ہیں - لیکن وہ اُس ہمدرد کی باتیں بخوشی سُن لیگی جو اُس سے یہ کہے کہ اُسکی مصیبتوں کا سبب بُودھ مذہب کی تعلیم ہے -

اگر ذرا نظرِ عمیق سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہندو قوم کی موجودہ حالت کی ذمہ دار اُنکے دن کی خانہ جنگیاں اور ذات پات کی تفریق اور چھوت چھات ہے - نہ کہ بُودھ مذہب کی تعلیم، جو اُسکے سراسر برخلاف ہے - بُودھ بھگوان کی کوئی تعلیم ایسی نہیں ہے جو کسی قوم کو غلام یا کمزور بنائے یا اُسکی آزادی و ترقی کے راستہ میں مانع ہو عوام کا یہ خیال کہ بُودھ بھگوان نے اِس امر کی تلقین

کی ہے کہ اُن لوگوں کے ساتھ جو ہمارے گھروں اور ملک کو برباد کریں "اہنسا" کا برتاؤ کیا جائے یا ہر ایک انسان دُنیا کے کاروبار سے الگ ہو کر گدا بنجائے بالکل غلط اور بے بنیاد ہے اور ذیل کی دو کہانیاں اِس امر کا روشن ثبوت ہیں۔

بھگوان بُودھ جب راج گڑھ میں مقیم تھے تو اُنکے پاس ایک شخص انا تھ پنڈیکا آیا۔ یہ شخص بڑا متموّل اور سخی تھا اور لوگ اُسکو بے سہاروں کا سہارا اور غریب پرور کہتے تھے۔ اس نے بھگوان کے پاس آکر کہا۔

"بھگوان مَیں ایک متموّل شخص ہوں اور میرے پیچھے بہت سے تفکرات لگے ہوئے ہیں مگر مَیں اپنی زندگی کو کارآمد بناتا ہوں اور حتی الوسع ہر ایک مصیبت زدہ کی مدد کرتا ہوں۔ مَیں ایک کاروباری انسان ہوں اور میرے کاروبار سے بہت سے آدمیوں کا گذارہ ہوتا ہے۔ بھگوان میں نے سُنا ہے کہ آپکے مُرید اس قسم کی زندگی بسر کرنے کے خلاف ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ دنیا کو چھوڑ کر ہی نجات حاصل ہو سکتی ہے جسکی مثال خود آپ نے اپنی زندگی میں قائم کر دی ہے۔ بھگوان مَیں بھی اِس بات کا خواہشمند ہوں کہ میں ٹھیک راہ پر چلوں اور دنیا کے واسطے اپنی ہستی کو باعث خوشی بناؤں۔ مجھکو بتائیے کہ کیا میرے واسطے یہ لازمی ہے کہ مَیں اپنا سب کاروبار چھوڑ کر فقیرانہ زندگی بسر کروں"۔

بھگوان نے جواب دیا کہ "ایک سچی مذہبی زندگی کے بسر کرنے کی خوشی ان سب کو حاصل ہو سکتی ہے جو کہ میرے آٹھ پاک اُصولوں کے پابند ہیں۔ اُس شخص کے لئے جو دولت جمع کرنے کے لالچ میں پھنسا ہوا ہے یہ بہتر ہے کہ وہ دولت کو چھوڑ دے تاکہ لالچ کا بُرا اثر اسکے اندر سرایت نہ کر جائے مگر جس شخص کے دل میں دولت کا لالچ نہیں ہے۔ جو دولتمند ہے اور دولت کا جائز استعمال کرتا ہے اُسکی ہستی دنیا کے واسطے باعث خوشی ہے۔ اس لئے مَیں تم کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ تم جس قسم کی زندگی بسر کر رہے ہو اُسی زندگی کو بسر کئے جاؤ اور اپنے کاروبار میں محنت اور جانفشانی سے کام لو۔ زندگی یا دولت وحشمت آدمی کو اپنے پنجہ میں گرفتار کرنے کی طاقت نہیں رکھتیں بلکہ ان چیزوں کی خواہش انسان کو اپنے دام میں گرفتار کر لیتی ہے۔ جو بھکشو دُنیا کو اس خیال سے چھوڑتا ہے کہ اب وہ ایک بے فکر اور آزاد زندگی بسر کرے گا اُسکو نجات حاصل ہونی مشکل ہے کیونکہ کاہلی ایک گناہ اور اپنے قواء اور عقل کا جائز استعمال نہ کرنا غلطی ہے۔ میری یہ تعلیم نہیں ہے کہ لوگ گھر بار چھوڑ کر فقیر ہو جائیں۔ کسی انسان کو ایسا کرنے کی ضرورت نہیں ہے جب تک اسکا دل اُسکو اس امر کے لئے مجبور نہ کر دے۔

مگر میں اِس بات کی تلقین ضرور کرتا ہوں کہ ہر ایک انسان پر یہ لازم ہے کہ وہ خودی کے پنجہ سے آزاد ہو اپنے دل کو صاف رکھے اور خواہشاتِ نفسانی کا غلام نہ بنے اور دُنیا میں رہکر ایک پاکیزہ زندگی بسر کرے۔ کسی شخص کے واسطے یہ لازمی نہیں ہے کہ وہ اپنے پیشہ کو چھوڑ کر فقیرانہ زندگی بسر کرنے لگے۔ بلکہ ہر ایک انسان پر یہ واجب ہے کہ وہ اپنے پیشہ کو ہوشیاری، محنت اور دیانت داری کے ساتھ ترقی دینے کی کوشش کرے۔ مگر انسان کو اُس کنول کی مانند زندگی بسر کرنی چاہئے کہ جو پانی میں رہتا ہوا بھی اُس سے علیحدہ رہتا ہے۔ جو انسان دنیا کی دادودہش میں مبتلا رہکر کسی سے نفرت یا حسد نہیں رکھتا۔ اور خود پرستی کے بجائے سچائی کی زندگی بسر کرتا ہے تو وہ حقیقتاً خوشی، آنند اور امن کو حاصل کرتا ہے"۔

سمبھا ایک سپہ سالار تھا وہ بھگوان کے پاس آکر کہنے لگا۔

"بھگوان آپ کی تعلیم کے متعلق ابھی تک میرے دل میں ایک شبہ باقی ہے۔ اِس شبہ کو میرے دل سے دُور کیجئے تاکہ میں آپکی اعلیٰ تعلیم کو سمجھ سکوں۔ بھگوان میں ایک سپاہی ہوں اور راجا کی طرف سے اِس خدمت پر مامور ہوں کہ اُنکے قانون کو توڑنے والوں کو سزا دوں، اور مُلک کے دشمنوں سے جنگ کروں۔ آپ لاانتہا محبت اور رحم کی تعلیم دیتے ہیں۔ کیا آپ اِس امر کی اجازت دیتے ہیں کہ مجرموں کو سزا دیجا دے؟ کیا آپ اُس جنگ کے خلاف ہیں جو مُلک، گھر بار اور بیوی بچوں کے لئے کی جائے؟ کیا آپ کی یہ تلقین ہے کہ اُن شخصوں کا مقابلہ نہ کیا جائے جو ہمارے مُلک و مال و اسباب کو لوٹیں؟"

بھگوان نے جواب دیا کہ "جو سزا کا مُستحق ہے اُسکو سزا ملنی لازمی ہے اور جو انعام کا مُستحق ہے اُسکو انعام ملنا ضروری ہے مگر اُسکے ساتھ ساتھ میری یہ تعلیم ہے کہ کسی شخص کو نقصان یا تکلیف نہ پہنچائی جائے بلکہ ہر ایک انسان سے محبت اور مہربانی کا برتاؤ کرنا چاہئے۔ یہ اصول میری تعلیم کے خلاف نہیں ہے کیونکہ جس کو سزا ملتی ہے وہ اُسکے افعال کی وجہ سے ملتی ہے۔ مُلزم اپنے اعمال کی سزا پاتا ہے نہ کہ عدالت کی بدنیتی کی۔ جس وقت کسی مُلزم کو سزا دیجائے تو یہ لازمی ہے کہ عدالت کے دل میں اُسکی طرف سے کوئی نفرت یا غصہ نہو اور مُلزم کو بھی یہ لازمی ہے کہ وہ اس امر کو سمجھ لے کہ یہ سزا خود اُسکے جرم کا نتیجہ ہے ایسا کرنے سے اُسکو سکون حاصل ہوگا۔

"میں اِس بات کی تعلیم دیتا ہوں کہ ہر قسم کی خونریزی جس میں ایک انسان دوسرے کو قتل کرتا ہے افسوسناک ہے، مگر میں یہ نہیں کہتا کہ جب صلح کی سب کوششیں بے سود ثابت ہوں تو سچائی کے حق

میں جنگ نہ کیجائے۔ اصلی گنہگار وہ ہے جو لڑائی کا سبب بنتا ہے۔ میں اس امر کی ضرور تعلیم دیتا ہوں کہ خودی کو چھوڑنا چاہئے مگر میں ہرگز یہ تعلیم نہیں دیتا کہ بُرے انسانوں کے ہاتھوں میں حقوق چھوڑ دئے جائیں۔ انسان کی زندگی کے واسطے کسی نہ کسی قسم کی جنگ لازمی ہے کیونکہ تمام زندگی کسی نہ کسی جنگ کا ظہور ہے۔ اگر سپاہی کو یہ دیکھنا لازمی ہے کہ وہ خودی کے بس میں ہو کر سچائی کے خلاف جنگ نہ کرے۔ جو خودی کے حق میں جنگ کرتا ہے تاکہ وہ خود طاقتور اور مالدار ہو جائے وہ کوئی فتحیابی حاصل نہیں کرتا بلکہ جو سچائی اور حق کے واسطے جنگ کرتا ہے اسکی شکست بھی فتح میں شمار ہوگی"

"خودی کا برتن اس قدر چھوٹا ہے کہ اس میں کوئی بڑی چیز نہیں سما سکتی۔ یہ برتن اتنا کمزور ہے کہ ذرا سی ٹھیس لگنے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ مگر سچائی کا برتن بہت بڑا ہے اور اسکے اندر اونچے سے اونچا خیال اور بلند سے بلند خواہش سما سکتی ہے۔ خودی پانی کے بلبلے کی طرح غائب ہو جاتی ہے تو سچائی قائم رہتی ہے۔ جو کوئی جنگ کے واسطے میدان میں آتا ہے اسکے میدان میں شہید ہونے کا خطرہ ہے۔ یہ سوال دوسرا ہے کہ وہ سچائی کے حق میں جنگ کر رہا ہو۔ اس واسطے سپاہی کی شہادت پر شکایت کرنا بیکار ہے۔ سپاہی کی تقدیر ہی ایسی ہوتی ہے۔ مگر فاتح کو اس بات کا خیال رکھنا لازمی ہے کہ ساری دنیاوی فتوحات عارضی ہوتی ہیں کیسی ہی زبردست فتح کیوں نہ حاصل ہوئی ہو دنیا کا چکر ہر وقت اُس فتح کو خاک میں ملا سکتا ہے۔ اس لئے اگر فاتح اعتدال سے کام لے اور اپنے دل سے نفرت نکال کر مفتوح سے برادرانہ سلوک کرے تو واقعی اُسکو دائمی فتح حاصل ہوگی"۔

رسید کتب

مسلمانوں کی بربادی
صنعت و تجارت کی بربادی } از سید طفیل احمد علیگ ایم ایل سی ولایت منزل علی گڑھ۔ قیمت ۴

باغ و بہار - از میر امن دہلوی - قیمت ۸/
توبۃ النصوح - از ڈاکٹر نذیر احمد دہلوی - قیمت ۱۲/
گل بکاؤلی - از منشی نہال چند لاہوری قیمت ۸/
مثنوی میر حسن - از میر حسن دہلوی - قیمت ۸/

شائع کردہ
مسٹر رام نرائن لال
بکسیلر
الہ آباد

کایا پلٹ

مشہور بنگالی افسانہ نگار بنکم چٹرجی کا ایک مختصر افسانہ

(مترجمہ ڈاکٹر اعظم کریوی)

کیلاش پربت پر ایک سرسبز و شاداب دیودار کے پیڑ کے نیچے شیر کی کھال پر بیٹھے ہوئے شیوجی دیوی پاروتی کے ساتھ چوسر کھیل رہے تھے۔ بازی ایک سونے کے پانسہ کی تھی۔ مہادیوجی میں یہی ایک نقص ہے کہ وہ کھیلنے میں کبھی بازی نہیں جیتتے۔ اگر جیت سکتے تو سمندر متھنے میں زہر اُن کے حصہ میں کیوں آتا۔ ماتا پاروتی ہی ہمیشہ جیتتی ہیں اسی سے دنیا میں انکی تین دن تک پوجا ہوتی ہے۔ وہ چاہے کھیلنا نہ جانتی ہوں لیکن رونا خوب جانتی ہیں اور اسی میں انکی کامیابی کا راز پوشیدہ ہے۔ مہادیوجی کی جیت سے وہ رونے لگتی ہیں، مگر جب اپنے پانچ۔ دو۔ سات پڑتے ہیں تو پھر پو بارہ ہی پو بارہ ہے۔ وہ مہادیو جی کی طرف ترچھی نظروں سے دیکھنے لگتی ہیں جس سے دنیا میں ہل چل مچ جاتی ہے۔ اس کا اثر مہادیوجی پر یہ ہوتا ہے کہ داؤں آنے پر بھی وہ کچھ نہیں کرتے اسی وجہ سے انکی ہمیشہ ہار ہوتی ہے۔ مہادیوجی نے ہار کر سونے کا پانسہ پاروتی جی کو دیدیا اور اُنھوں نے اسکو لیتے ہی زمین پر پھینک دیا۔ یہ دیکھکر مہادیوجی نے تیوری چڑھا کر کہا۔ "میرا دیا ہوا پانسہ تم نے کیوں پھینکدیا" پاروتی جی نے جواب دیا "ناتھ! آپ کے پانسے میں کوئی نہ کوئی عجیب و غریب طاقت ہوگی جس سے دنیا کی بھلائی ہوگی۔ انسان کی بھلائی ہی کے لئے میں نے اسکو پھینک دیا ہے۔"

مہادیوجی نے کہا "وشنو اور ہم ہمیشہ دنیا کی بھلائی ہی کے لئے کام کرتے ہیں۔ تم اسکی کچھ فکر نہ کرو سونے کے پانسہ کی ضرورت نہیں ہے اگر اسمیں کچھ اچھائی بھی ہوگی تو وہ باقاعدہ استعمال نہ کرنے سے تکلیف کا باعث ہوگا۔ میں تمھارے اصرار سے اس کا ایک تماشہ دکھاتا ہوں۔ یہیں سے بیٹھے بیٹھے اس کا تماشا دیکھو۔"

کالی کانت بابو بڑے آدمی ہیں، پینتیس برس کی عمر ہوگی دیکھنے میں خوبصورت ہیں تھوڑے دن ہوئے

انکا دوسرا بیاہ ہوا ہے۔ ان کی بیوی کا نام سندری کی عمر اٹھارہ برس کی تھی وہ اپنے میکے میں تھی۔ اسی سے ملنے کے لئے کالی کانت بابو سسرال جا رہے ہیں ان کے خسر مالدار آدمی ہیں۔ بابو صاحب کے ساتھ انکا نوکر راما سر پر ہینڈ بیگ رکھے چلا جا رہا ہے۔ راہ میں کالی کانت بابو نے دیکھا کہ ایک سونے کا پانسہ پڑا ہے فوراً اسکو اٹھا لیا خوش ہوکر نوکر کے ہاتھ میں دیکر بولے "دیکھو یہ سونے کا ہے شاید کسی کا کھو گیا ہے اگر مجھے اس کا مالک مل گیا تو دے دونگا ورنہ اپنے قبضہ میں کرلونگا اس کو تو اپنے پاس رکھ لے۔"

راما نے ہینڈ بیگ کو اپنے ہاتھ سے نیچے رکھدیا اور مالک سے پانسہ لیکر اپنے کپڑے میں باندھ لیا اس کے بعد اس نے پھر ہینڈ بیگ کو نہ اٹھایا اس کے بجائے کالی کانت بابو نے خود اسکو اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیا اور چلنے لگے۔ راما آگے آگے چل رہا تھا اور بابو اس کے پیچھے پیچھے چلتے تھے۔

راما نے کہا۔ "او راما!"

بابو نے کہا۔ "کیا حکم ہے؟"

راما۔ تو بڑا بے ادب ہے۔ سسرال پہنچکر کوئی بے ادبی نہ کرنا۔ سمجھ لیا!

بابو۔ بھلا میں کہیں ایسا کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں کیا اپنے مالک کے ساتھ کوئی بے ادبی کر سکتا ہے۔

کیلاش پر پاربتی جی نے دریافت کیا۔ "پربھو! میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ آپ کے سونے کے پانسہ میں یہ کیسا گن ہے۔"

مہادیو جی نے جواب دیا۔ "پانسہ میں یہ صفت ہے کہ اگر میں اسکو نندی کو دیدوں تو وہ اپنے کو مہادیو سمجھنے لگا اور میں اپنے کو نندی۔ اسی طرح چونکہ بابو نے پانسہ راما کو دیدیا ہے راما خود کو بابو سمجھتا ہے اور بابو اپنے کو راما۔"

کالی کانت بابو جب اپنی سسرال پہنچے تو اسوقت ان کے خسر گھر کے اندر تھے دروازہ پر عجب تماشہ ہوا رام موہن پانڈے نامی دربان نے راما سے کہا۔ "خانساماں جی! ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو۔"

راما نے غصہ میں آکر کہا۔ "بیوقوف تو اپنا کام کر یہ کیا بیہودہ بکتا ہے۔"

دربان نے ہینڈ بیگ کو بابو صاحب کے سر پر سے اتار لیا۔ کالی کانت بولے "دربان جی بابو سے ایسی گستاخی کی باتیں نہ کرو۔ ورنہ خفا ہو کر چلے جائیں گے۔"

دربان بابو صاحب کو تو پہچانتا تھا لیکن راما کو وہ نہیں جانتا تھا۔ کالی کانت کی بات سنکر اس نے دلمیں سوچا کہ جب داماد جی اسے بابو کہکر پکارتے ہیں تو اسمیں کوئی شک نہیں کہ وہ بھیس بدلے ہوئے کوئی بڑا ہی آدمی ہوگا۔ یہ سوچ کر دربان نے ہاتھ جوڑ کر راما کو پرنام کیا اور کہا ہمارا قصور معاف کیجئے۔

راما نے کہا - "اچھا فوراً حقہ بھر لاؤ"

اودھو پرانا نوکر تھا حکم پاتے ہی حقہ بھر لایا اور راما مسند سے ٹیک لگا کر حقہ پینے لگا اور کالی کانت نوکروں کے کمرہ میں جاکر کالکا کی چلم پینے لگے۔ اودھو نے حیرت سے پوچھا "بابو! یہ آپ کیا کر رہے ہیں"

کالی کانت بولے "میں ان کے سامنے تمباکو نہیں پی سکتا"

اودھو نے اندر جاکر مالک سے سب حال کہا "داماد جی آئے ہیں انکے ہمراہ بھیس بدلے ہوئے ایک بڑے آدمی بھی ہیں۔ داماد جی ان کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ انکے سامنے تمباکو بھی نہیں پیتے"

کالی کانت بابو کے خسر نیل رتن بابو فوراً گھر سے باہر آئے۔ کالی کانت انکو دور ہی سے پرنام کرکے ایک طرف ہٹ گئے اور راما ان کے پاؤں چھو کر گلے ملا۔ نیل رتن نے سوچا کہ یہ آدمی اچھا تو معلوم ہوتا ہے لیکن کالی کانت بابو کا آج کیسا رنگ بدلا ہوا ہے۔

نیل رتن بابو راما کی آؤ بھگت کرنے کے لئے بیٹھ گئے لیکن اسکی بات چیت بالکل نہ سمجھ سکے۔ ادھر اندر سے خادمہ ناشتہ کے لئے بابو کالی کانت کو بلانے آئی۔ کالی کانت نے کہا "توبہ! توبہ! بھلا میں بابو جی کے سامنے ناشتہ کر سکتا ہوں۔ پہلے بابو جی کو کھلاؤ میری کیا فکر ہے میں بعد میں کھاؤنگا ماں جی! میں تو آپ ہی لوگوں کا دیا ہوا کھاتا ہوں"

"ماں جی" کہتے سنکر خادمہ نے سوچا کہ داماد جی مجھ کو اپنی ساس سمجھتے ہیں۔ سمجھیں گے کیوں نہیں؟ میں کوئی نیچ ذات کی تو معلوم نہیں پڑتی ہوں۔ میں نے بھی بہت سے شہر دیکھے ہیں آدمی پہچانتے ہیں صرف یہاں کے آدمی نہیں پہچانتے۔ یہ سوچتی ہوئی خادمہ گھر کے اندر گئی اور بولی "بابو کا خیال صحیح ہے، بغیر ساتھی کے وہ کیسے کھانا کھا سکتے ہیں"

مالکن نے سوچا کہ ساتھی تو باہر کا آدمی ہے اسے اندر کس طرح بلایا جا سکتا ہے اور داماد کو باہر کھلانا برا ہے۔ یہ سوچ کر مالکن نے یہ انتظام کیا کہ راما کو کھانا باہر بھیجدیا مگر وہ غصہ سے بولا "یہ کیسی بات ہے؟"

ادھر جب کالی کانت بابو کو خادمہ بلا کر اندر لے گئی تو وہ آنگن میں جاکر کھڑے ہو گئے اور بولے "مجھے گھر کے اندر کیوں بلایا ہے۔ مجھے یہیں پر تھوڑا چنا اور گڑ دے دو میں کھا کر پانی پی لونگا"

یہ سنکر سالیاں بولیں۔ "بابو جی اس مرتبہ بہت مذاق کرنا سیکھ آئے ہیں"

کالی کانت بولے۔ "مجھ سے آپ مذاق کیوں کرتی ہیں کیا میں آپکے لائق ہوں"

ایک بوڑھی سالی بول اٹھی "میرے لائق کیوں ہو جسکے لائق ہو اسی کے پاس چلو" یہ کہکر سب کالی کانت

کو کمرہ میں لے گئیں وہاں پر کالی کانت کی بیوی کام سندری کھڑی تھی کالی کانت نے اسکو مالکن سمجھ کر پرنام کیا۔ کالی کانت کو کمرہ میں پہنچا کر سب عورتیں باہر آگئیں۔

کام سندری نے ہنسکر کہا "یہ کیسی دل لگی ہے۔ یہ سب کہاں سے سیکھ آئے"

کالی کانت نے ڈرتے ہوئے جواب دیا۔ "میرے ساتھ ایسی باتیں کیوں کرتی ہو میں تو آپ کا خادم ہوں"

خوش مزاج کام سندری بولی۔ "اس میں کیا شک ہے لیکن جب تک جوانی ہے ایسی ہی چاپلوسی کروگے اچھا بیٹھو اب مذاق ہو چکا ناشتہ کرلو"

کالی کانت نے دلمیں سوچا۔ "اس عورت کا رنگ ڈھنگ مجھے کچھ بیڈھب نظر آتا ہے میرا تو خیال ہے کہ بابوجی کی شادی اچھی جگہ نہیں ہوئی اب میرا یہاں سے بھاگ جانا ہی اچھا ہے" یہ سوچکر کالی کانت نے ایک مرتبہ پھر کام سندری کو بڑے ادب سے پرنام کیا اور بھاگنے کا ارادہ کیا یہ دیکھتے ہی کام سندری نے آگے بڑھکر ان کا دامن تھام لیا اور بولی "میرے جیون ادھار! میرے سوامی! آپ مجھسے بھاگ کیوں رہے ہیں" اتنا کہکر کام سندری نے کالی کانت کو پلنگ پر بٹھانے کی کوشش کی۔

کالی کانت گھبرا گئے ڈر کے مارے اُنھوں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "دوہائی بہوجی کی! میں ہاتھ جوڑتا ہوں مجھے چھوڑ دیں میں کوئی ایسا ویسا آدمی نہیں ہوں میرا چال چلن خراب نہیں ہے"

کام سندری۔ "جیسا آپ کا چال چلن ہے میں خوب اچھی طرح سے جانتی ہوں بس اب مذاق کی حد ہو چکی چلو کچھ ناشتہ کرلو"

کالی کانت "اگر کسی نے آپسے میرے چال چلن کے متعلق کوئی بات کہی ہو تو اُسنے آپکو دھوکا دیا ہے آپ میری مالکن ہیں مجھے چھوڑ دیجئے"

کام سندری بڑی بامذاق عورت تھی اس نے اس بات کو بھی مذاق ہی سمجھا اور بولی "اچھا سرکار یہ تو بتاؤ آپ نے ایسا مذاق کہاں سیکھا ہے میں اسکی خوب کسر نکالونگی ذرا موقع تو آنے دو" یہ کہکر کام سندری نے کالی کانت کو پکڑکر اپنی طرف کھینچا۔ کالی کانت نے سمجھا کہ بس اب ستیاناس ہوا گھبراہٹ میں چلا اُٹھا۔ "باپ رے باپ! مار ڈالا رے! دوڑو۔ مجھے بچاؤ——"

شور سنکر گھر کی عورتیں کمرہ میں دوڑکر گھس آئیں۔ ماں۔ بہن اور بڑی بوڑھیوں کو دیکھکر کام سندری نے کالی کانت کو چھوڑ دیا اور وہ موقع پاتے ہی وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

مالکن نے سندری سے پوچھا "کیوں ری! داماد جی کیوں بھاگ گئے۔ کیا تو نے ان کو مارا" شرم اور رنج سے کام سندری نے بڑی مشکل سے جواب دیا۔ "میں ایسی بے ادبی کیسے کرسکتی ہوں؟"

معلوم ہوتا ہے میں بڑی بدقسمت ہوں اور سوامی جی پر کسی نے جادو کردیا" یہ کہکر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

کسی نے اسکا یقین نہ کیا اور کہا۔ "تو نے ضرور مارا ہوگا ورنہ اُنھوں نے شور کیوں مچایا" سب عورتوں کو لعنت ملامت کرتے دیکھکر کام سندری نے ایک کمرہ میں گھس کر اندر سے دروازہ بند کرلیا، اور چپ چاپ لیٹ کر رونے لگی۔

باہر آکر کالی کانت بابو نے دیکھا کہ نیل رتن بابو۔ دربان اودھو سب ملکر راما کو پیٹ رہے ہیں راما چلا چلا کر کہتا جاتا ہے "چھوڑدو نہیں تو غضب ہوجائے گا۔ میں نے تو ایسا کہیں بھی نہیں دیکھا کہ خسر داماد کو پیٹے، میرا کیا ہوگا۔ تمہاری لڑکی ہی رانڈ ہوجائے گی" اس کے قریب ہی گھر کی ایک پرانی خادمہ شیاما کھڑی ہوئی ہنس رہی تھی۔ وہ اکثر کالی کانت بابو کے یہاں جایا کرتی تھی اور راما کو خوب اچھی طرح سے پہچانتی تھی اسی نے نیل رتن بابو سے کہدیا تھا کہ راما بابو کالی کانت کا نوکر ہے۔ قریب جاکر کالی کانت بابو نے کہا۔ کیسا غضب ہے میرے بابو کو سب لوگ مارے ڈالتے ہیں"

یہ سنکر نیل رتن بابو کو اور بھی غصہ آیا اور اُنھوں نے راما کو مارتے ہوئے کہا۔ "پاجی کہیں کا، تو نے ہی میرے داماد کو کچھ کھلا پلا کر پاگل بنا دیا ہے" جس طرح برسات میں موسلا دھار پانی برستا ہے اسی طرح راما کے سر پر جوتے پڑنے لگے۔ مار پیٹ کی کشمکش میں راما کے کپڑے سے چھپا ہوا سونے کا پانسہ گر پڑا، شیاما خادمہ نے اُٹھا کر نیل رتن بابو کے ہاتھ میں دیدیا اور بولی۔ "یہ تو چور ہے کہیں سے پانسا چرالایا ہے"

پانسہ کو ہاتھ میں لیتے ہی نیل رتن بابو نے دھوتی کے ایک سرے کو اپنے سر پر ڈال کر گھونگھٹ نکال لیا۔ اور ادھر شیاما نے لانگ کس لی اور راما کو ٹھونکنا شروع کردیا۔

اودھو نوکر نے شیاما سے کہا۔ "تو عورت ہوکر مردوں کے کام میں کیوں دخل دیتی ہے"

شیاما نے تنک کر کہا "بے ادب تو عورت کسکو کہتا ہے"

اودھو۔ "تجھے اور کس کو"

"کمبخت تو مجھ سے ہنسی کرتا ہے" یہ کہکر جوش غضب میں آکر شیاما نے اودھو کے سر پر ایک جوتا رسید کیا۔ اودھو نے عورت سے لڑنا جھگڑنا مناسب نہ سمجھکر عورت کی طرف دیکھکر کہا "مالک دیکھئے عورت کی یہ مجال کہ میرے جوتا مارے" یہ سنکر نیل رتن نے اپنے گھونگھٹ کو ذرا اور لمبا کرلیا اور مسکرا کر بولے۔ "مارا تو کیا ہوا غصہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ مالک نے مارا ہے تو کوئی پروا نہ کرو" یہ سنکر اودھو کو بڑا غصہ آیا اور کہنے لگا۔ "اب میں نوکری نہ کرونگا وہ میری مالک کس طرح ہوئی۔ جس طرح وہ نوکر ہے اسی طرح میں

بھی ہوں۔ آپ آج کیسی باتیں کرتے ہیں، میں ایسی نوکری سے باز آیا"

یہ سنکر مالک نے ہنسکر کہا۔ "چل دور ہو۔ بڑھاپے میں ہنسی کرتا ہے شرم نہیں آتی۔ میرا نوکر تو کیوں ہونیلگا"
ادھو کو بڑی حیرت ہوئی اسنے دلمیں سوچا۔ "آج یہ کیسی کایا پلٹ ہوگئی وہ راما کو چھوڑکر الگ کھڑا ہوگیا۔
ٹھیک اسیوقت شیاما کا شوہر گھوش وہاں پر آگیا اور شیاما کی حالت دیکھکر متحیر ہوگیا شیاما اسکو دیکھکر ٹس سے مس نہ ہوئی
ادھر مالک یعنی نیل رتن بابو گھوش کو دیکھکر اور لمبا گھونگھٹ نکال کر الگ جا کھڑے ہوئے اور آہستہ سے بولے!
"اس بات میں خلل نہ دو"۔ گھوش کو مالک کی یہ بات نہ سُنائی دی اور وہ شیاما سے خفا ہوکر کہنے لگا۔ کمبخت،
بے حیا۔ تجھے شرم نہیں آتی"۔
شیاما نے جواب دیا۔ "تو پاگل تو نہیں ہوگیا جا گائے کو چارہ دے"۔ یہ سُنکر گھوش نے آگے بڑھکر شیاما کے
جھونٹے پکڑکر اسکو مارنا شروع کردیا۔ یہ دیکھکر نیل رتن بابو نے کہا۔ "ارے کمبخت تجھے آج کیا ہوگیا ہے مالک
کو پیٹتا ہے کیا خون کرنیکا ارادہ ہے"
شیاما نے بھی بگڑکر کہا۔ "میرے بدن کو ہاتھ لگاتا ہے۔ نالائق۔ سوٗر۔ پاجی کہیں کا"۔ یہ کہتے ہوئے شیاما نے
بھی جوتا سنبھالا اور خوب شور وغل مچا جسکو سنکر پڑوس کے لوگ چٹرجی۔ مکرجی وغیرہ اپنے اپنے گھروں سے
نکلکر وہاں آگئے۔ مکرجی نے زمین پر ایک سونیکا پانسہ گرا ہوا دیکھکر اُٹھایا اور چٹرجی کے ہاتھ میں دیکر کہا۔ "دیکھئے
مہاشے یہ کیا ہے؟

کیلاش پر پاربتی جی نے مہادیو جی سے کہا۔ "پربھو! اپنا پانسہ واپس لیجئے۔ چٹرجی بوڑھے مکرجی کے گھر میں
گھُسکر اسکی بوڑھی عورت کو اپنی بیوی سمجھکر ہنسی کر رہا ہے اور مکرجی کی خادمہ چٹرجی کی گستاخی دیکھکر اسکو
جھاڑو سے مار رہی ہے۔ اُدھر مکرجی خود کو چٹرجی سمجھکر اسکی نوجوان بیوی سے چھیڑ چھاڑ کر رہا ہے اگر آپکا
یہ پانسہ اور تھوڑی دیر رہا تو ستیاناس ہوجائیگا اس لئے کرپا کرکے اسکو واپس لیجئے"۔
مہادیو جی بولے۔ "اے پاربتی جی! میرے پانسہ کا کیا قصور ہے کیا یہ معاملہ دُنیا میں پہلی مرتبہ ہو رہا ہے
کیا تم یہی حال روز نہیں دیکھتیں کہ بوڑھے جوان بنتے ہیں جوان بوڑھے ہوتے جا رہے ہیں، مالک
نوکر ہیں اور نوکر مالک بن بیٹھے ہیں کیا تم نہیں دیکھتی ہو کہ مرد عورتوں کی تقلید کرتے ہیں اور عورتیں مرد
بنتی جا رہی ہیں، دنیا میں یہی روز ہوتا ہے لیکن انسان اسکو ہنسی مذاق سمجھتا ہے وہ دیکھکر بھی نہیں
دیکھتے میں سب کو ایک مرتبہ ہوشیار کرتا ہوں کہ اب بھی وہ اپنی حالت کو سنبھال لیں اگر میں چاہونگا
تو جو جس رنگ میں ہے اسی رنگ میں ہو جائیگا اور کسی کو کچھ یاد نہ رہیگا۔

مکافاتِ عمل

از رائے بہادر پنڈت شیو نرائن صاحب شمیم ایڈوکیٹ

ایک مرتبہ ایک دوست نے مجھ سے پوچھا:-

"شمیم صاحب فرمائیے تو۔ ہندوستان کی حالت دن بدن ابتر ہوتی ہے۔ آخر اسکا کیا انجام ہوگا۔ آپ تو تاریخ داں ہیں"؟

میں نے جواب دیا کہ "میاں لیڈروں سے پوچھو، نجومیوں سے دریافت کرو یا کسی کتاب میں فال دیکھو، مجھے پالٹکس سے سروکار نہیں میں تو اپنے ہی فانوسِ خیال میں رہتا ہوں اپنی ہی دھن میں مگن ہوں"

دوست نے بہت اصرار کیا کہ کچھ تو فرمائیے، دل لگی ہی سہی۔ کبھی کبھی تو آپ پتہ کی کہہ جاتے ہیں۔

میں نے کہا اچھا جو میری سمجھ میں آتا ہے وہ عرض کرتا ہوں:-

بندہ نواز! قوانینِ قدرت کسی کے طرفدار نہیں، وہ اپنا کام کئے جاتے ہیں بقولِ حالی ؎

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

قانونِ کرم یعنی مکافاتِ عمل کا قانون نہ رنگ سے متعلق ہے نہ قوم سے تعلق رکھتا ہے۔ اسمیں رحم کی گنجائش نہیں۔ نیز ایک عمل کا نتیجہ ضرور نکلتا ہے۔ خواہ فوراً یا دیر میں۔

مسلمانوں کی بابت تو میں کچھ کہنا نہیں چاہتا کیونکہ انکی طبیعتیں بہت بھڑکی ہوئی ہیں ہندوؤں کے متعلق یہ کہنا ہے کہ حالانکہ انکے یہاں اخلاق کا دارومدار بالکل کرم پر ہے لیکن وہ اپنے کرموں پر نگاہ نہیں ڈالتے، نہ تجربہ سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ خیال کیجئے کہ کتّے تو پلید سمجھے ہی جاتے ہیں مگر انکے یہاں انسان سے انسان بھی چھوکر پلید ہو جاتا ہے۔ علمِ ہندسہ کے یہ موجد ہیں لیکن جمع اور ضرب سے انھیں سروکار نہیں صدیوں سے تفریق اور تقسیم میں معروف ہیں۔ پھر روتے ہیں کہ ہماری آبادی کم ہوگئی، ہم میں سے ہزاروں دوسرے مذہبوں میں داخل ہوگئے۔ اگر کوئی انکے عیب بتلائے تو اصلاح کے بجائے اُسکے پیچھے ایسے پڑتے ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ آپ اوّل زوال کے اسباب دُور کیجئے پھر شاہراہ ترقی پر گامزن ہوجیے۔ ہندوستان کو چھوڑئے۔ ساری دنیا میں

کونسا امن ہے۔ گذشتہ جنگ کے نتیجے آنکھوں کے سامنے ہیں۔ اور ایک اور جنگ کے لیئے سب آمادہ نظر آتے ہیں۔

میرے دوست فرمانے لگے کہ۔ یہ سب ہم بھی جانتے ہیں مگر یہ کہئے کہ امن کس طرح سے حاصل ہوگا؟

میں نے کہا کہ مجھکو اگر آپ فانوسِ خیال نہ سمجھئے تو میں کہونگا کہ امن اُس وقت ہوگا:۔

(۱) جب دنیا الہامی کتابوں کے مخمصہ چھوڑ دیگی۔ قانونِ اخلاق کی پیروی کریگی۔

(۲) جب دنیوی معاملات کو دنیوی قاعدہ پر طے کیا جائیگا۔

(۳) جب ایک دوسرے کے ملک، دولت اور ثمرۂ محنت پر غاصبانہ قبضہ نہ کیا جائیگا۔

(۴) جب ایک انسان دوسرے انسان کو برابری کا رتبہ دیگا۔

جس قوم نے سمجھ لیا کہ مسئلۂ مکافاتِ عمل اٹل ہے وہ گذشتہ مضرت رساں اعمال سے باز آجاتی ہے آئندہ راہ راست پر گامزن ہوتی ہے۔ اور باطل اوہام چھوڑ کر کامیابی حاصل کرتی ہے۔ عقیدے کبھی ایک نقطہ پر نہیں رہتے۔ پروفیسر لکی کی تاریخ پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ کس طرح رفتہ رفتہ صحیح اصول آخر فتح پاتے ہیں۔ ہندوستان کے لوگ آنکھیں رکھتے ہیں مگر دیکھتے نہیں۔ دماغ رکھتے ہیں مگر اُس سے کام نہیں لیتے اپنی ترقی کی فکر کم کرتے ہیں، دوسروں کے زوال کے خواہشمند بلکہ منتظر رہتے ہیں۔ مثلاً مس میو داناکہ اُس نے نیک نیتی سے عیب جوئی نہیں کی، ایسی موردِ عتاب ہورہی ہے کہ اُسکی کتاب کی تردید میں ہمارا کتنا قیمتی وقت ضائع ہو رہا ہے۔ اگر دہلی جانے والا پشاور کی سڑک پر روانہ ہو تو ظاہر ہے کہ وہ دہلی نہیں پہنچ سکتا۔ ہندوستان کے لوگ دن بدن اپنی انتظامی قابلیت گھٹا رہے ہیں مگر سوراج کے طلبگار ہیں۔ اور غالب کا یہ شعر بھول گئے ہیں کہ ؎

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل ہے تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

لہ ریشنلزم (RATIONALSIM)

غالب اور ڈاکٹر سید عبداللطیف

(از سید علی عباس حسینی ایم۔ اے جوبلی کالج لکھنؤ)

ڈاکٹر سید عبداللطیف پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن) اُردو ادب کے اُن جدید محسنوں میں سے ہیں جنھوں نے شاید اسکا حتمی طور پر ارادہ کرلیا ہے کہ وہ معائب کے سوائے اس زبان کی خوبیوں پر نظر ہی نہ ڈالینگے۔ چنانچہ آپ نے لندن سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری جس مضمون پر حاصل کی وہ بھی اُردو شاعری سے متعلق تھا اور اس میں انگریزی سے مقابلہ کرکے اس نادار زبان کا خوب خوب مضحکہ اُڑایا گیا ہے۔ جب یہ مضمون کتاب کی صورت میں شائع ہوا تو بعض نقادان فن نے اس سرمایۂ تحقیق کی بے مائگی ظاہر فرما دی۔ مگر ان مخالفانہ تنقیدوں کا آپ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ چنانچہ حال میں آپ نے انگریزی میں ایک پوری کتاب غالب کی شاعری پر تصنیف فرما ڈالی ہے اور اسے پھر اپنے مغربی معیار سے پرکھکر اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ غالب ہرگز کوئی بڑا شاعر نہ تھا۔ اس تصنیف میں ڈاکٹر صاحب نے غالب کے نظریۂ زندگی پر بصیرت افروز تبصرہ فرمایا ہے اور قدردانان اُردو کو اس مایۂ ناز شاعر کے متعلق غلط فہمیوں میں گرفتار ہونے سے بچنے کی ہدایت کی ہے۔ اس کتاب کو دیکھکر صاف طور پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو غالب سے کوئی خاص کاوش ہے اور وہ دنیائے ادب سے اُنکا نام حرف غلط کی طرح مٹا دینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس مختصر سی تصنیف مین غالب پر بہت سے الزامات عائد کئے ہین۔ جن میں سے بعض یہ ہیں:-

(۱) کہ غالب ملا عبدالصمد ایرانی کے شاگرد تھے لیکن وہ نہایت دیدہ دلیری سے فرماتے ہیں کہ "مجھکو مبداء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے۔ اور عبدالصمد ایک فرضی نام ہے۔ چونکہ لوگ بے اُستادا کہتے ہیں اُن کا مُنھ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی نام گڑھ لیا"

(۲) وہ دنیا اور اہل دنیا سے نفرت کرتے تھے اور غم و ہم کو انھوں نے طبیعت ثانیہ بنا لیا تھا۔ نہ زندہ دلی انکے کلام میں ہے۔ اور نہ کہیں خوشی کا نام و نشان ہی ملتا ہے۔

(۳) وہ حریص تھے اور حصول زر کے لئے سو جتن کرتے تھے۔ اسی غرض سے تعریفیں بھی کرتے تھے۔ اور قصیدے بھی گزرانتے تھے۔

(۴) مذہب جیسے اہم معاملے میں وہ مذبذب تھے اور آج تک یہ پتہ نہ چلا کہ وہ کس مذہب کے پیرو تھے۔

(۵) جب تک بہادر شاہ کی رہی سہی حالت باقی رہی غالب اُنکی خوشامد میں لگے رہے۔ جب وہ رنگون بھیج دیئے گئے تو انگریزوں کی خوشامد کرنے لگے۔ اور خلعت و پنشن کے حاصل کرنے کے لئے سینکڑوں تدبیریں کر ڈالیں۔

(۶) صوفی بھی وہ محض برائے نام تھے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں "آرائش مضامین شعر کے واسطے کچھ تصوف کچھ نجوم لگا رکھا ہے ورنہ سوائے موزونی طبع کے یہاں کیا رکھا ہے۔"

ان الزامات پر غور کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ گو مبداء فیاض سے غالب کو بہت کچھ ملا تھا لیکن انھوں نے حصول زر کی فکر میں سب کھو دیا۔ اور جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ "دولت اور خدا ساتھ ساتھ نہیں ملتے" انھیں نہ تو اطمینان قلب حاصل ہوا اور نہ قابلیت کے مطابق شہرت و امتیاز۔ انھوں نے ایک پریشان نظریہ کے ماتحت ایک پریشان زندگی بسر کی۔ اور اس لئے انکی شاعری یکسانیت اور باہمی تطابق سے محروم ہے۔ انکا شمار بڑے شعراء میں نہیں کیا جاسکتا۔

الزامات کی اس طویل فہرست کو اگر غور سے دیکھا جائے اور ان واقعات پر نظر ڈالی جائے جو ڈاکٹر صاحب نے بطور شہادت پیش فرمائے ہیں تو یہ صاف ظاہر ہوجائیگا کہ موصوف کے پورے مضمون میں اس علمی دادئی تحقیق کا کہیں پتہ نہیں چلتا جسکی امید ہمیں ایک مغربی تعلیم یافتہ محقق سے ہونا چاہئے۔ اب میں ایشیائی تحقیق کے اصول سے انکا جائزہ لیتا ہوں۔

الزام نمبر ۱۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت جسارت سے یہ تو تحریر فرما دیا کہ عبدالصمد غالب کے فن شعر گوئی میں اُستاد تھے لیکن انھوں نے اُن اُستاد کا حوالہ نہیں دیا جنکے بھروسے پر انکو ایسا فرمانے کا حق حاصل ہوا۔ مثلاً

(الف) عبدالصمد کو کن کن لوگوں نے دیکھا ہے؟ (ب) عبدالصمد نے غالب کو کون کون سے علوم کی تعلیم دی؟ (ج) ان علوم میں فن شعر گوئی بھی شامل ہے یا نہیں؟ (د) اور اگر ہے تو غالب نے کس زمانے سے کس زمانے تک ان سے اصلاح لی؟ (ہ) عبدالصمد کے کلام کا کچھ نمونہ بھی کہیں دستیاب ہو سکتا ہے یا نہیں؟ (و) شاگرد و اُستاد کے کلام کی کون سی خصوصیات ایسی ہیں جو دونوں میں پائی جاتی ہیں؟ (ز) عبدالصمد کے اور کون کون شاگرد ہیں؟

جب تک مندرجہ بالا امور کے متعلق تحقیق کرکے یہ ثابت نہ کردیا جائے کہ واقعی عبدالصمد نے غالب کے کلام پر اصلاح دی ہے اُس وقت تک غالب کا قول فیصلہ کن مانا جائیگا۔ اور محض ڈاکٹر صاحب

کے فرمانے سے غالب پر کاذب ہونے کا الزام نہیں عائد کیا جا سکتا۔

الزام نمبر ۲ - دنیا سے نفرت کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں "عدم قناعت ایک خاص شکل ہے "ربانی" جسکی وجہ سے انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ اسکے گرد و پیش کی دنیا ویسی نہیں جیسا اُسے ہونا چاہیئے اور جس سے کہ انسان میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ ایسے اعلیٰ اور برتر خیالات سے دنیا کو آباد دیکھے جو انسان میں ربانی مقاصد کی تکمیل کرتے ہوں۔ عدم قناعت کی دوسری شکل اور ہے جسکی وجہ سے انسان اپنے ماحول اور اپنے حالات زندگی سے بے اطمینانی کا اظہار کرتا ہے۔ یہ وہ عدم قناعت ہے جو کسی واقعی یا خیالی نقصان یا بے قدری کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور یہی عدم قناعت کی وہ صورت ہے جو انسان کو اپنی نوع سے نفرت کرنے والا اور دنیوی لذتوں سے محروم بنا دیتی ہے۔ عدم قناعت کی یہی شکل تھی جو غالب کی روح پر پورے طور پر مسلط تھی"۔

غالب پر یہ الزام کہ وہ اپنی نوع سے نفرت کرنے والے اور دنیاوی لذتوں سے محروم تھے اس طرح کی عجیب بات ہے جس پر بحث کرنا ہی فضول سا معلوم ہوتا ہے۔ ایک ایسا شخص جسکی ساری زندگی دوست احباب کی خدمت میں گذری ہو، اور جس نے تمام عمر "مرنجاں و مرنج" کے طور پر بسر کی ہو۔ جسکے احباب اور شیدائیوں میں ہندو، مسلمان، عیسائی، شیعہ، سنی، وہابی سب داخل ہوں اسکے متعلق یہ کہنا کہ وہ اپنی نوع سے متنفر تھا ایک نئی تحقیق ہے۔ رہی یہ بات کہ وہ دنیوی لذتوں سے محروم تھے تو اسکے متعلق بھی انکا کلام اور انکی زندگی دونوں ڈاکٹر صاحب کے ارشاد کے خلاف شہادت دے رہے ہیں۔ چوسر، پچیسی، شطرنج، گنجفہ، شراب و کباب، تصنیف و تالیف غرض کون سی لذتِ حیات تھی جس سے غالب محروم رہا ہے۔ کلام میں خوشی کی جھلک دیکھنا مقصود ہو تو مختصر سا دیوان اُلٹئے دو چار سو شعر نکل آئینگے میں مشتے نمونہ از خروارے ڈاکٹر صاحب کی تسکین کے لئے پیش کئے دیتا ہوں۔

گو ہاتھوں میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے　　رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

نشۂ رنگ سے ہے واشد گل　　مست کب بند قبا باندھتے ہیں

پھر اس انداز سے بہار آئی　　کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک　　اسکو کہتے ہیں عالم آرائی

کہ زمیں ہوگئی ہے سر تا سر　　روکشِ سطحِ چرخِ مینائی

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی　　بن گیا روئے آب پر کائی

سبزہ و گل کے دیکھنے کے لئے چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر بادہ نوشی ہے بادپیمائی

ہر ہر لفظ اسکا داعی ہے کہ شاعر پر ایک خاص کیفیت طاری ہے اور خوشی و انبساط حرف حرف سے ظاہر ہے- اچھا پوری غزل صاف صاف رندانہ انداز میں سن لیجئے-

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب
پوچھ مت وجہ سیہ مستیِ اربابِ چمن سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب
جو ہوا غرقۂ مے بختِ رسا رکھتا ہے سر سے گزرے پہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب
ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب ہی کیا ہے موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب
چار موج اٹھتی ہیں طوفانِ طرب سے ہر سو موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا موجِ شراب
بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر شہپرِ رنگ سے ہے بال کشا موجِ شراب
موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال ہے تصور میں ز بس جلوہ نما موجِ شراب
ایک عالم پہ ہیں طوفانیِ کیفیتِ فصل موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب
شرحِ ہنگامۂ مستی ہے زہے موسمِ گل رہبرِ قطرہ بہ دریا ہے خوشا موجِ شراب

ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسد
پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

اب بھی کیفیتِ سرور نہ پیدا ہوئی ہو تو اور لیجئے ؎

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا
حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریِ ساحل جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا
نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ
شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گل

کہاں تک مثالیں پیش کروں- اچھا پھر وہی شعر سن لیجئے جس میں غالب نے اس بحث کے متعلق خود ہی فیصلہ کیا ہے- فرماتے ہیں ؎

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو غیر از یک نفس برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

الزام نمبر ۳- ڈاکٹر صاحب کے نزدیک غالب کے غم و ہم کی زندگی کا سبب محض انکی حرص ہے نہ انکا پیٹ بھرتا تھا- اور نہ ان کا دستِ سوال آگے بڑھنے سے رکتا تھا- وہ جھوٹی تعریفیں

کرتے تھے اور ممدوح کی تعریف میں قصیدے کے قصیدے کہہ ڈالتے تھے۔

واقعی آجکل کی دنیا میں اب پرانی طرز کی باتوں کے سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔ پہلے شاعروں کا دستور تھا کہ "جسکا کھاتے تھے اسکا گاتے بھی تھے"۔ اب یہ دستور نہیں رہا۔ عرفی۔ ظہوری نظیری سب کے سب اسی مرض میں گرفتار تھے ڈاکٹر صاحب کو کون سمجھائے۔ اچھا شاید یوں سمجھیں کہ حصول زر کی خواہش عام ہے اور اسکی کوشش اس وقت تک عقلاء کے نزدیک مذموم نہیں جب تک کہ اس سعی میں اتنی خودغرضی نہ شامل ہو جائے کہ ذاتی فائدہ کے آگے دوسروں کے نقصان کا خیال نہ رہے۔ غالب کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ نظر نہیں آتا جہاں انہوں نے کسی دوسرے کو نقصان پہونچا کر اپنا فائدہ کیا ہو۔ یا روپیہ حاصل کرکے اس سے خلق اللہ کی خدمت۔ خاندان کی خدمت اور احباب کی خدمت نہ کی ہو۔ پھر بھلا ایسے آدمی کو حریص اور حصول زر کو اسکا نظریۂ زندگی قرار دینا ڈاکٹر صاحب کے سوا اور کس کی مجال ہو سکتی ہے۔ یہ امر بھی غور طلب ہے کہ جب شاعری پیشہ اور معاش کی صورت ہو تو اس وقت آخر مربی و محسن کی مدح جائز ہے یا نہیں؟ میں کہتا ہوں کہ بفرض محال ناجائز بھی سہی تو اس سے کسی شاعر کے کمال میں کیا بٹہ لگتا ہے۔ انیس و دبیر نے روپیہ لے کر مجلسیں پڑھیں اور کلام سنایا تو کیا اس سے انکی قادر الکلامی مشکوک ہو گئی۔ شیکسپیر نے حصول زر کے لئے ڈرامے لکھے اور اپنے مربیوں کی بھی تعریفیں کیں تو کیا اسکی وجہ سے اسکے کمال شاعری میں نقص آگیا؟ مصنف پیراڈائز لوسٹ "ملٹن" سا پیورٹین بھی کرامول کی تعریف میں مضامین لکھتا تھا۔ اور گورنر آئرلینڈ سے جلب منفعت کی امید میں "کومس" سا "ماسک" تیار کر سکتا تھا تو کیا اسکی شاعری ہمہ گیر نہیں رہی اور کیا وہ بڑے شاعروں کی صف سے نکال دئے جانے کا مستحق ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو بیچارے غالب پر ڈاکٹر صاحب کا غصہ محض بیجا ہی نہیں بلکہ طفلانہ ہے۔

الزام نمبر ۵۔ بہتر ہوگا کہ اسی سلسلے میں الزام نمبر ۵ سے بھی نبٹتا چلوں۔ اور وہ یہ ہے کہ غالب زمانہ پرست تھے۔ بہادر شاہ کی نوکری کے زمانے میں انکی مدح سرائی کرتے رہے۔ اور پھر غدر کے بعد نئے آقاؤں کے ہاں قصیدے گزراننے لگے۔ یہاں پر ڈاکٹر صاحب نے ایک بات جو انکے مطلب کے خلاف تھی حذف کر دی۔ یعنی یہ کہ غالب صرف بہادر شاہ کے نوکر ہی نہ تھے بلکہ وہ انگریزی کمپنی کے درباری امراء میں سے تھے اور اس سرکار سے پنشن بھی پاتے تھے اور خلعتیں بھی۔ انکا طریقہ تھا کہ جب کوئی نیا گورنر جنرل آتا تو وہ اسکی مدح میں قصیدہ لکھکر ضرور

بھیجتے اور دہلی کے قریب جو دربار ہوتا اسمیں شریک دربار بنائے جاتے - غدر کے بعد جب بہادر شاہ رنگون بھیجدیئے گئے تو غالب کی پنشن اور خلعت دونوں چیزیں بند ہوگئیں - اس زمانے میں ان پر عتاب تھا - جب انھوں نے اپنی بے گناہی ثابت کردی تو پنشن پھر سے جاری ہوگئی -

عتاب کے زمانے میں یوسف مرزا صاحب کو یوں رقم طراز ہیں -

"۷۵۰ برس کا پنشن - تقرر آنکا بتجویز لارڈ لیک و منظوری گورنمنٹ اور پھر نہ ملا ہے نہ ملیگا خیر احتمال ہے ملنے کا .."

اور جب مل گیا ہے تو علاءالدین خاں کو اطلاع دیتے ہیں کہ :-

"صاحب میری داستان سنئے - پنشن بے کم و کاست جاری ہوا - زر مجتمعہ سہ سالہ یکمشت مل گیا"

غالب کے لئے "محض شاعری ذریعۂ عزت" نہ تھی بلکہ وہ خاندانی نواب تھے - امیر تھے - صاحب خلعت تھے - صاحب پنشن تھے - جس طرح ایک سرکار کی مدح سرائی انپر فرض تھی - اسی طرح دوسری حکومت کی مدح گستری بھی واجب تھی - انھوں نے سیاسیات میں کوئی حصہ نہیں لیا - وہ غدر میں شامل نہ تھے - انکو اغراض بغاوت سے ہمدردی نہ تھی - پھر وہ انگریزوں کی تعریف اور اپنی پنشن کے اجراء کی فکر و سعی کیوں نہ کرتے ؟

الزام نمبر ۴ - غالب کا مذہب - اِس موضوع پر میں آپ سے دو سال پہلے "زمانہ" میں ایک بسیط مضمون لکھ چکا ہوں - تحقیق یہی بتاتی ہے کہ وہ عقیدتاً شیعہ اثنا عشری تھے - اور عملاً صوفی - انکے خطوط اور حالاتِ زندگی اسکے شاہد ہیں - میں جس بنا پر عرض کر رہا ہوں وہ غالب کا حسبِ ذیل خط ہے جو انھوں نے نواب مرزا علاؤالدین خاں بہادر کو لکھا ہے -

(اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۴۴)

"حمزہ خاں کو بعد سلام کہنا ع اے بیخبر ز لذتِ شربِ مدام ما + دیکھا ہمکو یوں بتاتے ہیں دریہ کے بنیوں کے لونڈوں کو پڑھا کر مولوی مشہور ہونا اور مسائلِ ابو حنیفہ کو دیکھنا اور مسائلِ حیض و نفاس میں غوطہ مارنا اور ہے اور عرفاء کے کلام سے حقیقت حقہ وحدت وجود کو اپنے دل نشیں کرنا اور ہے - مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں - مشرک وہ ہیں جو مسیلمہ کو نبوت میں خاتم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں - مشرک وہ ہیں جو نو مسلموں کو ابو الائمہ کا ہمسر مانتے ہیں - دوزخ اُن لوگوں کے واسطے ہے میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں - زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ لا مؤثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوا ہوں - انبیا سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت تھے

محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ خاتم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہیں۔ قطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ثم حسن ثم حسین اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام کے۔ برین زیستم ہم برین بگزرم۔ ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھکو دوزخ میں ڈالینگے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا بلکہ دوزخ کا ایندھن ہونگا اور دوزخ کی آنچ کو تیز کرونگا تاکہ مشرکین و منکرین نبوت مصطفوی و امامت مرتضوی اسمیں جلیں"

خط کشیدہ حصہ سے انکا اعتقادی حیثیت سے شیعہ اثنا عشری ہونا ثابت ہے۔ رباعی اسکے متعلق عرض ہی کرچکا ہوں کہ صوفی صافی صلح کل تھے۔ مولانا حالی بھی آخری حصہ پر زور دیتے ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب اسپر خفا ہیں کہ اگر وہ شیعہ تھے تو انھوں نے یہ رباعی بہادر شاہ کے سامنے کیوں پڑھی کہ ؎

جن لوگوں کو ہے مجھسے عداوت گہری | کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
دہری کیونکر ہو جوکہ ہووے صوفی | شیعی کیونکر ہو ماوراء النہری

جس نے بھی غالب کے حالات کا ذرا غور سے مطالعہ کیا ہوگا وہ اس سے واقف ہوگا کہ ظرافت اُن کا خاص حصہ تھی۔ جہاں موقع ملا فقرہ چست کردیا۔ ذرا گنجائش ہوئی اور کوئی چبھتی ہوئی بات چپکا دی۔ غالب کے مذہب سے سب لوگ واقف تھے۔ بہادر شاد اور اُنکے درباری یہ جانتے تھے کہ یہ شیعہ ہیں۔ لیکن موقع موقع سے چھیڑا کرتے تھے اور یہ بھی اپنے خاص انداز میں جواب دیتے رہتے ہونگے۔ یہ رباعی بھی اسی طرح کی ظرافت کا نتیجہ ہے۔ لوگ ہنستے ہونگے اور خوب ہنستے ہونگے۔ اور یہی مقصود تھا۔ اس سے نہ بہادر شاہ کی خوشامد ظاہر ہوتی ہے اور نہ خود غالب کا مذہبی حیثیت سے مذبذب ہونا۔

الزام نمبر ۶۔ اسی سلسلے میں ڈاکٹر صاحب غالب کی صوفیت سے بھی انکار فرماتے ہیں واقعہ یہ ہے کہ اگر صوفی ہونا کوئی مذہب ہے تو غالب ہرگز صوفی نہیں تھے۔ وہ شیعہ اثنا عشری تھے لیکن اگر یہ قلبی صفائی کا نام ہے جس میں کدورت۔ حسد۔ بغض و کینہ کا نام نہو اور جس میں محبت کا عنصر اس طرح غالب آجائے کہ بالآخر سارا عالم محبت ہی محبت ہوکر رہجائے تو یقیناً غالب صوفی تھے۔ اُنکی ساری زندگی اسکی شاہد ہے کہ اُن سے ہندو مسلمان۔ شیعہ سُنی۔ ہر مذہب و فرقہ کے لوگ یکساں طور پر مستفیض ہوتے رہے اور کبھی کسی کو اُنکے اخلاص و محبت میں شک نہ ہوسکا۔ خود حالی حنفی المذہب ہونے کے باوجود انکو "صلح کل" مانتے ہیں اور

صوفی صافی کہتے ہیں۔ رہا غالب کا وہ خط جسکا ڈاکٹر صاحب نے حوالہ دیا ہے تو اُسمیں سے ڈاکٹر صاحب کا نقل کردہ ٹکڑا بلا تشبیہ "لا تقربوا الصلوٰۃ" والی مشہور حکایت یاد دلا دیتا ہے میں خط کے سارے متعلق حصّے نقل کئے دیتا ہوں ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیے تو صوفی ہونے سے انکا محض انکسار سے ہے۔ نواب انوارالدولہ سعدالدین خاں صاحب شفق نے اس زمانے میں کوئی دُمدار ستارہ نکلا تھا اُسکے اثرات دریافت کئے ہیں۔ نواب صاحب کے اس استفسار پر یوں رقمطراز ہیں۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب ضرور آپڑا کہ کچھ حال اِس ستارۂ دُمدار کا لکھوں۔ چنانچہ جس وقت سے وہ خط پڑھا ہے سوچ رہا ہوں کہ کیا لکھوں۔ چونکہ بسبب فقدانِ اسباب یعنی رصد و کتاب کچھ نہیں کہا جاتا ناچار مرزا صاحب کا مصرع زبان پر آجاتا ہے مصرع "ازیں ستارۂ دنبالہ دار مے ترسم"۔ یہ مطلع ہے اور یہ پہلا مصرع ہے۔ مصرع "زخال گوشۂ ابروئے یار می ترسم"۔ کیا آپ مجھکو بے ہنری اور ہیچ میرزی میں صاحب کمال نہیں جانتے اور اس عبارت فارسی کو میرا مصداق حال نہیں مانتے "پیش ملا طبیب و پیش طبیب ملا۔ پیش ہیچ ہر دو و پیش ہر دو ہیچ"۔ آرایش مضامینِ شعر کے واسطے کچھ تصوف کچھ نجوم لگا رکھا ہے ورنہ سوائے موزونی طبع کے یہاں اور کیا رکھا ہے۔ بہرحال علم نجوم کے قاعدے کے موافق جب زمانے کے مزاج میں فساد کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں تب سطح فلک پہ یہ شکلیں دکھائی دیتی ہیں۔ جس پر رو شن نظر آئے اسکا درجہ و دقیقہ دیکھتے ہیں ہزار طرح کی چال ڈالتے ہیں تب ایک حکم نکالتے ہیں۔ شاہجہان آباد میں بعد غروب آفتاب افق غربی شہر پر نظر آتا تھا اور چونکہ اُن دنوں میں آفتاب اول میزان میں تھا تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ صورت عقرب میں ہے۔ درجہ و دقیقہ کی حقیقت نامعلوم رہی۔ بہت دن شہر میں اس ستارے کی دُھوم رہی اب دس بارہ دن سے نظر نہیں آتا۔ دہلی شاید نظر آتا ہے جو آپ نے اس کا حال پوچھا ہے۔ بس میں اتنا جانتا ہوں کہ یہ صورتیں قہر الٰہی کی ہیں اور دلیلیں ملک کی تباہی کی قران النحسین۔ پھر کسوف۔ پھر خسوف۔ پھر یہ صورت پُر کدورت۔ عیاذاً باللہ و پناہ بخدا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

سیاقِ عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ نجوم و صوفیت سے انکار محض انکسار سے تھا۔ اور انکا صوفی نہ ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب کو مزید ثبوت تلاش کرنے کی زحمت اُٹھانا پڑیگی۔

مجھے افسوس کے ساتھ یہ عرض کرنا پڑتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے غالب کے متعلق رائے قائم کرنے میں بہت جلد بازی سے کام لیا ہے اور اس دقت نظر اور تحقیق کا انکی تصنیف میں کہیں پتہ نہیں چلتا جسکی توقع ایک مغربی تربیت یافتہ محقق سے کیجا سکتی تھی۔ رہا یہ امر کہ غالب آیا کوئی بڑا شاعر تھا یا نہیں اسکے متعلق میں فی الحال پروفیسر صلاح الدین خدابخش ایم۔ اے ڈاکٹر

کے اُن زرّیں خیالات کے ترجمے پر اکتفا کرتا ہوں جو انھوں نے مسلم ریویو دسمبر ۱۹۲۸ء میں ظاہر کئے ہیں۔ پروفیسر صاحب فرماتے ہیں:۔

"میرے سفر انگلستان کے دوران میں غالب میرا نہ جدا ہونے والا ہمراہی تھا۔ رنج و افسردگی کی حالت میں وہ (خلوت خانۂ دل کو) روشن کرتا ہے۔ یاس و حرماں میں وہ تسکین دیتا ہے۔ اور صبح سویرے سطح سمندر پر وہ دماغ کو موت و حیات کے اُن مسائل پیچیدہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے جنھوں نے انسان کی قوت ادراک کو مسحور اور عاجز کر رکھا ہے۔ غالب کی نظمیں ولولہ آفرینیوں کا سرچشمہ اور مسرت دائمی کا خزانہ ہیں۔ متانت۔ بشاشت حاضر جوابی۔ ظرافت، طامن، تشنیع و طنز (حدیہ کہ وہ شوخیوں سے خدا بھی محفوظ نہیں) یہ تمام باتیں افراط و بہتات کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ اور پھر عنوان نظم نہایت صاف ستھرا اور چبھنے والا خنجر کا وار و دعوت بیگا۔ میٹھی چٹکیاں۔ تیر اور نشتر ہیں۔ جو جی چاہے آکے کہہ لو۔ یہ ہمارے ادب میں کچھ اپنی طرز کی اور چیز ہے۔ شہرت دائمی کے مالک دوسرے شعرا کی طرح وہ ہر حالت میں پُر از کیف ہے اور ہر جذبہ میں تسلی بخش۔ اسکی نظموں میں ہمیشہ تازگی کا جادو بھرا ہوتا ہے اور اسکا مخاطب انسانی دل ہی ہوتا ہے۔۔۔۔۔ میں اسکے اشعار پڑھنے سے کبھی نہیں تھکتا اور ہر مطالعہ کے بعد مجھے ان میں نئی نئی مخفی خوبیاں اور خیالات کی گہرائیاں ملتی ہیں۔ ان نظموں میں زبان و خیال اس خوبصورتی سے اکٹھا کئے گئے ہیں کہ ہر ایک سرمایۂ داد و تحسین حاصل کرنے میں سبقت کناں نظر آتا ہے۔ غالب کی نظمیں واقعی زندگی کی ترجمان ہیں۔ اور اسکے گوناگوں کوائف و شئوں۔ اسکے عجیب غریب تماشوں اور تعجب خیز ضدوں۔ اسکی خوش طبعی کی چہلوں اور درد انگیز غم کی داستانوں کی تصویر کشی میں حقیقی رفعتوں تک منتہی ہوتی ہیں۔ اور اپنا اصلی مقصد حد درجہ خوش اسلوبی سے پُورا کرتی ہیں۔

مجھ میں ولولہ اور جوش کی کیفیتیں پیدا کرنے والے! میں تیرے سامنے سرِ نیاز جھکاتا ہوں۔ میرے ملک کے غیر فانی شاعر! میں تیری یاد پر پھول اور ہار چڑھاتا ہوں! ابھی تیرے حقیقی مرتبے سے دنیا روشناس نہیں ہوئی ہے لیکن مستقبل تیرا ہے اور بلاشبہ تیرا ہے۔ تو کسی مفتوح ملک کا شاعر نہیں ہے بلکہ ایک آزاد قوم کا شاعر ہے جسکی نگاہوں میں حُریت اور عزت زندگی اسکی تونگریوں سے کہیں زیادہ باعظمت ہیں۔

تو نے اپنی نظم کے مختصر مجموعہ میں ہر جگہ غیر مشتبہ لہجہ میں آسمانی آزادی کے گیت گائے ہیں جو کسی آقا کی رُوحانی ہو یا مادی۔ اطاعت کا حلقہ کانوں میں ڈالنا پسند نہیں کرتا۔ اسلام کے سچے فرزند! تیرے لئے ساری عزتیں ہیں! کیا یہ تیرے ہی زمزمے نہیں ہیں؟ ؎

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم   اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

اور یہ بھی۔ ؎

تشنہ لب بر ساحلِ دریا ز غیرت جاں دہم
گر بموج افتد گمانِ چینِ پیشانی مرا

اور یہ بھی

ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

طاعت میں تا رہے نہ مئے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

تو ایک حریت کیش قوم کا علمبردار ہے اور تیری نظمیں حریت کی واضح منادی! تیری زندگی تیری نظموں کے مطابق ہے۔ تیرا پریم عزت و خود داری کے نشانوں کا حامل۔ تونے کبھی کسی مطلب کے حاصل کرنے اور کسی غرض میں فتح پانے کے لیے عزت ہاتھ سے نہیں دی اور نہ خود داری کو کھویا"

پروفیسر صلاح الدین خدا بخش کے ان جذباتِ عالیہ کے بعد میرے لئے کچھ اپنی طرف سے عرض کرنا چھوٹا منہ بڑی بات کا مصداق ہوگا۔ خدا کرے ڈاکٹر صاحب ہماری شاعری کو مغربی عینک سے دیکھنے کی غیر صحت بخش عادت کو اب سے ترک فرما دیں۔

ادبی دُنیا (لاہور)۔ حال ہی میں ہمارے معاصرینِ پنجاب کی بزمِ ادب میں "ادبی دنیا" کا اضافہ ہوا ہے، جسکو ہمارے مکرم دوست سر عبدالقادر ایسے مشہور ادیب کی نگرانی کا شرف حاصل ہے۔ مولانا تاجور صاحب نجیب آبادی چیف ایڈیٹر اور جناب حفیظ ہاشمی اسکے ایڈیٹر ہیں۔ اس رسالہ کے اجرا کا مقصد بہت اہم ہے۔ اُردو زبان سے عربی اور سنسکرت وغیرہ زبانوں کے مشکل الفاظ نکال کر اُسکو سلیس و عام فہم بنانا۔ اُردو شاعری کو جدید قالب میں ڈھالنا اور موجودہ قواعدِ اُردو میں حسبِ ضرورت ترمیم کرنا وغیرہ اسکے مخصوص مقاصد ہیں۔ پہلا نمبر ہمارے سامنے ہے جو مفید مضامین (جن میں تراجم زیادہ ہیں) غیر ملکوں کی زبانوں کے شاہکاروں کے ترجمے اور ہندوستانی زبانوں کی ادبیات کے دلچسپ اقتباسات سے مزین ہے اور اسکو حقیقی معنی میں "ادبی دُنیا" بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ کم استعداد اصحاب اور طلبہ کی آسانی کے لئے مضامین کے مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی آخر میں شامل ہے۔ سات تصویریں ہیں اور سرورق رنگین و خوشنما ہے۔ تقطیع ۲۰×۲۶/۸ حجم ۹۶ صفحات۔ قیمت سالانہ تین روپیہ۔ محصول ڈاک ۱۲/-

تنقیدِ کُتب

ناٹک کتھا - از نور الٰہی و محمد عمر صاحبان۔ چھوٹی تقطیع۔ ضخامت ۱۴۰ صفحات۔ **قیمت** ۸ر
ملنے کا پتہ:- محمود برادرز۔ تاجران کتب۔ جموں (کشمیر)

منشی نور الٰہی و محمد عمر صاحبان مؤلفان "ناٹک ساگر" اپنے مخصوص دلچسپ اندازِ تحریر کی بدولت ادبی دنیا میں کافی طور پر مشہور ہو چکے ہیں۔ انکو سنسکرت اور بھاشا کی قدیم کتابوں سے واقعات اخذ کر کے نئے طرز سے بیان کرنے میں خاص ملکہ ہے۔ چنانچہ اس کتاب میں ہندوستان کے قدیم ڈراموں کی سات کہانیاں اور ایک تاریخی قصہ ہے جو مہا کوی کالی داس۔ بھو بھوتی۔ شری ہرش دیو وغیرہ مصنفین کے ڈراموں سے ماخوذ ہیں۔ زبان آسان اور طرزِ بیان دلکش ہے۔ حتی الامکان فارسی زبان کے ثقیل الفاظ کے استعمال سے اجتناب کیا گیا ہے اور انکی جگہ بھاشا کے شبد لے لئے گئے ہیں۔ طرزِ تحریر کا اندازہ کرنے کے لئے ذیل کا اقتباس یقیناً دلچسپی سے پڑھا جائیگا:-

"ست جگ کی بات ہے کہ وتس (موجودہ الہ آباد) میں اُدین نامی ایک راجہ راج کرتا تھا۔ اسکی راجدھانی کوسمبھی بستی کبھی ایسی پھیلی پھیلی تھی کہ اجودھیا کی شام اور کاشی کی صبح اسکے سامنے پانی بھرتی تھیں۔ اس اجڑے نگر کو آج کوسم کہتے ہیں اور اس میں دن دہاڑے جاتے ڈر آتا ہے۔ پہلے تو اُدین نے اس آن بان سے حکومت شروع کی کہ پرجا اسے بکرماجیت کا سروپ سمجھنے لگی۔ بخشنے پر آیا تو دھن برسا دیا۔ سبھا میں بیٹھا تو دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دیا۔ رن میں نکلا تو ارجن اور بھیم کی یاد تازہ ہو گئی۔ نربل کی سہائتا، برہمن کی سیوا، گائے کی رکھوالی، پوجا پاٹ کا رکھ رکھاؤ بڑے ٹھاٹھ سے کرتا تھا۔ مگر تھوڑے عرصہ کے بعد اُدین کھل کھیلا۔ راج کاج کو دھتا بتا کر رنگ رلیاں منانے لگا ——————— .."

اگرچہ اُن حضرات کو جو بھاشا سے واقف نہیں ہیں۔ یہ طرزِ تحریر کسی قدر اجنبی معلوم ہوگا اور بعض جگہ بعض الفاظ خلافِ اصولِ فصاحت نیز کہیں کہیں محاورہ کا غلط استعمال بھی نظر آئیگا لیکن مجموعی حیثیت سے یہ کہانیاں نہایت دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہیں۔

ارنسٹ - مترجمہ حضرت تمکین کاظمی و تسعیدی بی - اے - چھوٹی تقطیع - ضخامت ۱۱۲ صفحات - قیمت عمر
ملنے کا پتہ :- مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی - اسٹیشن روڈ - حیدرآباد دکن -

یہ آسکر وائلڈ کے ایک معاشرتی ڈرامہ موسومہ "امپورٹینس آف بی انگ ارنیسٹ" (شوقین مزاج ہونے کی ضرورت) کا لفظی ترجمہ ہے - آسکر وائلڈ کا شمار یورپ کے مشاہیر اہل قلم میں ہے اور اسکی نظم و نثر میں ایک خاص جدت و ندرت پائی جاتی ہے مگر کسی کتاب کو ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا اور اصلی زبان کی خوبیوں کو برقرار رکھنا مشکل ہی نہیں، تو یب قریب ناممکن ہے، چنانچہ اس حقیقت کو سید سلطان حیدر جوش نے "پیش لفظ" کے ذیل میں اس طرح بیان کیا ہے :-

"بذاتِ خود میں ترجمہ پر اخذ کو ترجیح دیتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ ایک زبان کے صحیح خیالات لفظی ترجمہ کی بدولت دوسری زبان میں بہت کچھ مسخ ہو جاتے ہیں"

خود مترجم صاحب کو بھی اسکا احساس ہوا ہے اور "تقریب" کے سلسلہ میں وہ یہ لکھنے پر مجبور ہوئے ہیں :-

"ترجمہ میں ...... انگریزی خصوصیات کو باقی رکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور نا آشنا ترکیبوں نامانوس جملوں کی پروا نکر کے اسلوب بیان کو قائم رکھا گیا ہے ...... محاورہ اور زبان کے شیدائیوں کو اسکے مطالعہ سے ناامیدی ہوگی مگر کیا کیا جائے مجبوری ہے"

مندرجۂ بالا اقتباسات ترجمہ کی زبان و طرز بیان کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہیں - اگرچہ ترجمہ دلچسپی سے خالی نہیں مگر انگریزی زبان سے ناواقف حضرات اسکے مطالعہ سے پورے طور پر لطف نہیں اٹھا سکتے - اگر ڈرامہ کے کیریکٹرز کا ایک دوسرے سے تعلق اور ان کا تعارف کرا دیا جاتا تو اسکی موجودہ دلچسپی میں کچھ اضافہ ہو جاتا - اور صرف اردو داں اصحاب بھی اس سے لطف اندوز ہو سکتے - غالباً مترجمین صاحبان کو "ارنیسٹ" کا مترادف کوئی اردو لفظ یا اسکے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے الفاظ نہیں ملے جبکی وجہ سے اسکا نام بھی اردو داں حضرات کے لئے بالکل اجنبی ہے - کتاب کے شروع میں مصنف اور مترجمین کی تصاویر اور تینوں صاحبان کے مختصر حالات زندگی بھی موجود ہیں "تعارف" کے عنوان سے قوی صاحب کا ایک مختصر تبصرہ بھی ہے "پیش لفظ" "تاثر" اور "تقریب" بھی ہے - غرض اصل ترجمہ پر ان سب کے اضافہ سے اس میں ایک خاص دلچسپی پیدا ہوگئی ہے -

شاہد معنی - از ماسٹر باسط صاحب بسوانی - چھوٹی تقطیع - حجم ۱۶۴ صفحات - قیمت مجلد عمر
ملنے کا پتہ :- حضرت مصنف بسواں - ضلع سیتاپور

حضرت آسط بقول مولانا نیاز فتح پوری "نئے لکھنے والے نہیں کہ تقریب و تعارف کی ضرورت ہو وہ ایک زمانہ سے لکھ رہے ہیں" اور ادبی دنیا میں خاص شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ اس مجموعہ میں آسط صاحب کی وہ نظمیں ہیں جن کی بناء واقعات پر ہے اور واقعاتی نظموں میں شاعرانہ بلند تخیل و مضمون آفرینی کی جستجو کرنا بیکار ہے کیونکہ اس قسم کی نظموں کی خوبی ہی یہ ہے کہ سادگی کے ساتھ اظہار واقعہ کردیا جائے اور یہ خوبی آسط صاحب کی اکثر نظموں میں موجود ہے۔ یہ مجموعہ پانچ ابواب پر منقسم ہے (۱) حمد و نعت (۲) دینیات (۳) اخلاق (۴) مشاہدات فطرت اور (۵) حسن و عشق۔ ہر باب میں متعدد نظمیں ہیں اور نظموں کی مجموعی تعداد اٹھاسی ہے۔ پہلے تین ابواب پر شاعرانہ نقطۂ نظر سے تنقیدی نگاہ ڈالنا بے سود ہے، باقی دو ابواب کی موجودات کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر نظمیں دلکش اور شاعرانہ خوبیوں سے مالامال ہیں اگر بقول حضرت ظہیر لیسوانی "آسط صاحب کو زود گوئی اور پُرگوئی کا ملکہ حاصل ہے" اور بعض نظموں میں اس ملکہ کے جلوہ کی جھلک نظر آتی ہے نیز کہیں کہیں مسلّمہ متروکات مثلاً "صنم" "یعنی" "معشوق" وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان چند خامیوں کے باوجود مجموعی حیثیت سے یہ مجموعہ قابل مطالعہ ہے۔ خصوصاً کم استعداد حضرات اور عوام کے لئے اسکا مطالعہ یقیناً دلچسپی کا موجب ہوگا۔ حضرت مصنف اور قاضی عزیز الدین احمد صاحب بالقابہ دیوان ریاست دتیا (جنکے نام نامی پر یہ مجموعہ معنون کیا گیا ہے) کی تصاویر بھی اسمیں شامل ہیں۔

غالب اور اُسکی شاعری - از مسٹر احمد الدین احمد مارہروی بی۔ اے۔ چھوٹی تقطیع حجم ۹۰ صفحات قیمت ۶ر

ملنے کا پتہ:- سفیر بک ایجنسی۔ سبزی منڈی۔ الہ آباد

اُردو زبان کے اساتذہ میں میر کے بعد جو شہرت و عزت مرزا غالب کو نصیب ہوئی وہ کسی دوسرے کو نہیں ملی۔ حقیقت میں غالب ایک حقیقی شاعر تھا۔ اگرچہ اُسکے زمانہ میں اُسکو وہ عزت حاصل نہیں ہوسکی جسکا وہ مستحق تھا لیکن موجودہ زمانے میں اُسکے کلام کے دلدادگان نے اپنے اپنے مذاق و فہم کے مطابق کلام غالب پر تبصرہ کرکے اُسکو مشہور عالم بنا دیا ہے۔ باوجودیکہ غالب کے بعض اشعار فہم عوام سے بالا ہیں مگر جو آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں وہ کسی طرح تیر و نشتر سے کم نہیں اور خواص سے گزر کر عوام کے قلوب بھی اُن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے یہی وجہ ہے کہ آج غالب کے پرستار ملک کے گوشہ گوشہ میں موجود ہیں۔

زیر نظر مختصر رسالہ میں غالب کے کلام پر ایک اجمالی تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے اور یورپ کے نقادوں کے نظریے اور آراء بیان کرکے اور کلام غالب کو اُن پر منطبق کرکے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ غالب دراصل ایک فطری شاعر تھا جس نے انسانی فطرت و مناظر قدرت کو حقیقی رنگ میں دنیا کے روبرو پیش کیا ہے اور اسکا کلام غیر فانی ہے۔ اگرچہ غالب کے کلام پر اس قدر لٹریچر موجود ہے جسکے ہوتے ہوئے بظاہر اس مختصر تبصرہ کی کوئی ضرورت معلوم

نہیں ہوتی لیکن تبصرہ دلچسپ اور عام فہم ہے اور باوجود اختصار کے ایک حد تک مکمل بھی ہے۔ اس لئے مطالعہ کے قابل ہے۔

تذکرہ مشاہیر کاکوری

مؤلفہ مولوی حافظ محمد علی حیدر علوی متوسط تقطیع ضخامت ۵۱۲ صفحات قیمت ہے،
ملنے کا پتہ: حضرت مؤلف - محلہ گڑھی - کاکوری ضلع لکھنؤ

قصبہ کاکوری (ضلع لکھنؤ) قدیم الایام سے ایک مردم خیز خطہ ہے۔ جہاں کی خاک سے سیکڑوں اہل ہنر وفن پیدا ہوئے اور اُن کے زرّیں کارنامے صفحاتِ تاریخ پر ثبت ہیں لیکن آج تک ان صاحبان کمال کا کوئی جامع ومبسوط تذکرہ مرتب نہیں ہوا تھا۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے مؤلف موصوف نے تمام علماء فضلاء اور شعراء وغیرہ کے حالات۔ اُنکی تصنیفات اور اکثر شعراء کا نمونۂ کلام اسمیں جمع کردیا ہے۔ ایک علیحدہ فصل میں کاکوری کے ہنود وامراء کے حالات بھی لکھے ہیں اور اس طرح اسمیں ۴۰۲ ناموروں کا ذکر موجود ہے۔ حضرت مؤلف کو ان تمام اصحاب کے حالات فراہم کرنے میں جس قدر محنت اُٹھانا پڑی ہوگی اُسکا کچھ اندازہ اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ پچپن مطبوعہ وقلمی کتابوں کے علاوہ شعراء کے متعدد دواوین سے حالات اخذ کئے گئے ہیں اور بعض حضرات سے مستند خاندانی روایات بھی حاصل کی ہیں۔ غرض لائق مؤلف نے جذبۂ حب الوطنی سے متاثر ہوکر جہاں تک ممکن ہوسکا ناموروں کے حالات بہم پہنچائے اور حسن ترتیب کے ساتھ تذکرہ مرتب کیا ہے جسکے لئے وہ مستحق ستائش ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ جو حضرات بزرگانِ سلف کے کارناموں کو پڑھنے اور اُن سے سبق حاصل کرنے سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ اس تذکرہ کے مطالعہ سے ضرور فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرینگے۔

پیام محبت

از پروفیسر رام سروپ کوشل ایم۔ اے۔ چھوٹی تقطیع حجم ۲۳۵ صفحات۔ قیمت - ۱۲
پبلیشرز - دیوان ینڈ اینڈ سنس تاجران کتب - ریلوے روڈ - لاہور۔

پروفیسر رام سروپ کوشل اُن اہلِ دل لوگوں میں ہیں جو اپنے مُلک اور بنی نوع خلق کی بھلائی کا سچا جذبہ دل میں رکھتے ہیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ہندوستان میں جس قدر مختلف مذاہب کے پیرو ہیں دنیا کے کسی ملک میں نہیں اور یہی وجہ ہے کہ بدقسمت ہندوستان آپس کے اختلاف کے باعث ہمیشہ سے غیر مُلکی اقوام کا جولانگاہ رہا۔ اور غلامی کی لعنت میں آج تک گرفتار ہے۔ محبانِ وطن اور ہمدردانِ مُلک برسوں سے اس امر کی کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح ہندوستان کے مختلف العقائد لوگوں میں اتحاد واتفاق ہوجائے جو مُلک کی ترقی وبہبودی کے لئے لازمی ہے مگر آج تک اسمیں پوری کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

اہلِ ہند کے نفاق کا باعث زیادہ تر یہی ہے کہ مختلف مذاہب کے پیرو اپنے اپنے عقائد کی بناء پر ایک دوسرے سے اتحاد عمل نہیں کرتے اور اپنے مذہب کے مقابلہ میں دوسرے کو باطل مانتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے

کہ بالواسطہ یا بلاواسطہ تمام مذاہب صرف ایک معبود کی پرستش پر زور دیتے ہیں اور بھلائی کرنے اور برائی سے بچنے کی تعلیم ہر مذہب میں یکساں ہے۔ یعنی اصل ایک ہے صرف فروعات میں اختلاف ہے۔ اس اختلاف کا سبب ایک یہ بھی ہے کہ ایک مذہب کے پیرو دوسرے مذہب کے بانیوں کے حالات اور اُن کی تعلیم سے عموماً ناواقف ہیں۔ اس ضرورت کو محسوس کرکے پروفیسر کوشل صاحب نے ہندوستان کے تقریباً تمام بڑے بڑے مذاہب کے بانیوں کے حالات اور اُنکی تعلیمات نہایت آسان زبان میں مرتّب کی ہیں جس سے عوام کو اُن بزرگوں کے حالات پڑھنے اور اُن کی تعلیمات کو سمجھنے کا موقع مل گیا ہے۔ شری کرشن۔ سوامی دیانند۔ حضرت محمدؐ۔ گورو نانک۔ حضرت مسیح۔ سوامی مہادیر۔ بھگوان بُدھ۔ راجہ رام موہن رائے اور حضرت زرتشت کے حالات اور تعلیمات اس کتاب میں جمع کی گئی ہیں۔ سوائے حضرت محمدؐ کے اور تمام بزرگوں کی خیالی یا اصلی تصاویر نیز مصنّف کی تصویر کتاب میں شامل ہے جس سے کتاب کی دلچسپی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ حضرت محمدؐ کی تصویر نہ ہونے کے سبب سے مکہ معظمہ کا فوٹو شامل کیا گیا ہے۔ غرض ظاہری و باطنی دونوں صورتوں میں کتاب مطالعہ کے لائق ہے۔

(۱) **صنعت و تجارت کی بربادی** (موجودہ نظامِ حکومت میں) از سید طفیل احمد صاحب ایم۔ ایل سی مجموعی قیمت ۲؎

(۲) **مسلمانوں کی بربادی** ملنے کا پتہ۔ نظامی پریس۔ بدایوں

یہ دونوں مختصر رسالے سید طفیل احمد صاحب کی ایک ضروری و کار آمد تصنیف موسومہ بہ حکومتِ خود اختیاری اور ہندو مسلم مسئلہ کا حل کے دو باب ہیں۔ اِن میں ہندوستان کی قدیم صنعت و تجارت اور مسلمانوں کے تعلیمی و اقتصادی زوال کے اسباب اور اُنکو دوبارہ ترقی دینے کے ذرائع سے بحث کی گئی ہے مختلف مستند کتابوں اور اکثر محبانِ وطن کے اقوال نقل کرکے اپنے بیان کو مستند بنایا گیا ہے۔ بہی خواہانِ ملک کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً اِن رسالوں کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ اِن کے پڑھنے سے سید صاحب کی مذکورہ بالا تصنیف کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے میں آسانی ہوگی۔ جو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں طبع ہوئی ہے۔ اور ہر ایک ایڈیشن کی قیمت جداگانہ عہ ہے۔

خضرِ راہ۔ خوشی کا مقام ہے کہ اب لکھنؤ کی ادبی دُنیا بھی خوابِ غفلت سے بیدار ہو رہی ہے جسکا ثبوت یہ ہے کہ تھوڑی ہی مدت کے اندر متعدد اخبار اور علمی و ادبی رسالے لکھنؤ سے جاری ہوئے ہیں۔ خضرِ راہ ایک ماہوار رسالہ ہے جسکی عنانِ ادارت منشی حامد علی صاحب کے ہاتھوں میں ہے۔ اِس وقت تک اسکے دو نمبر ہماری نظر سے گزرے ہیں جنکو دیکھکر یہ امید کیجا سکتی ہے کہ اگر حالات موافق رہے تو یہ رسالہ آئندہ کافی ترقی کریگا۔ ابتدا اچھی معلوم ہوتی ہے۔ مضامین علمی۔ تاریخی اور تفریحی ہر طرح کے ہیں۔ نظم کا بھی کچھ حصہ ہے۔ ہم اپنے جدید معاصر کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ تقطیع ۲۰×۲۶ حجم ۶۴ صفحات۔ **قیمت** سالانہ چار روپیہ۔ پتہ۔ نیا گانوں۔ لکھنؤ

پیام روح۔ مصنفہ مسٹر حامد اللہ افسر بی۔ اے۔ میرٹھی کتابت و طباعت اعلیٰ۔ قیمت ۸؍ ملنے کا پتہ۔ انڈین پریس الہ آباد۔

یہ جناب افسر کی دلکش ادبی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے اور متعدد رنگین تصاویر سے مزین ہے جیسا کہ ڈاکٹر شاہ محمد سلیمان صاحب نے تقریب میں فرمایا ہے "شاعر کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ نازک سے نازک خیالات کو صاف اور سلیس زبان میں ادا کرے" افسر صاحب کی نظموں کی یہی خصوصیت ہے۔ ان میں نامانوس ترکیبوں اور الفاظ کی بھرمار نہیں ہے بلکہ نازک تخیل کے ساتھ سلاستِ زبان نے انکے کلام میں ایک خاص تاثیر پیدا کردی ہے۔ بچوں کے لئے چھوٹی چھوٹی قومی نظمیں لکھنے میں آپکو کمال حاصل ہے۔ کئی نظموں میں نظیر اکبرآبادی کا رنگ نمایاں ہے۔ مثلاً

رہبر خود گمراہ ہوئے ہیں آج زمانہ ایسا ہے　　ہر اک گام پہ منزل ہوگی وہ بھی زمانہ آئیگا
دولت نے نیکی میں داخل آج زمانہ ایسا ہے　　دولت جُرم میں داخل ہوگی وہ بھی زمانہ آئیگا
آج اندھیرا ہے ہر گھر میں آج زمانہ ایسا ہے　　جگ مگ جگ مگ محفل ہوگی وہ بھی زمانہ آئیگا

افسر صاحب کا کلام حبِ وطن کے جذبات سے معمور ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وطن کا درد، اسکی زبوں و خستہ حالت اسکا نفاق و افتراق آپ کے پہلو میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے۔ مگر آپکے کلام میں کہیں مایوسی اور افسردگی نہیں ہے، بلکہ نئے جوش، تازہ سرگرمی اور امید افزا بشارت سے بھرا ہوا ہے۔ "بھارت" کا راگ بہت دلکشی کے ساتھ گایا ہے۔

جیسا میرا دیش ہے افسر ایسا کوئی دیش نہیں

ایک اور نظم ہے۔

میرے وطن کو تو نے جنت بنا دیا ہے

افسر صاحب کے کلام میں مناظرِ قدرت کی تصویر جا بجا اس نزاکت۔ باریکی اور محبت کے ساتھ کھینچی گئی ہے۔ کہ اس کی کافی داد نہیں دی جا سکتی۔ آپ نے لبِ دریا اور جنگل کی خموشی اور تاروں کا چمکنا اور چاند کا زریں تموج اور کہسار کی دلفریبیاں وغیرہ مناظر کا مصورانہ نگاہ سے مطالعہ کیا ہے۔

یہ دل نواز نغمے جنگل کی خامشی میں　　لرزہ سا آرہا ہے تاروں کی روشنی میں
ستارے جھلملا جاتے ہیں جب میں شب کو روتا ہوں　　کہ موتی ان سے بہتر جب ان کی کھیتی میں بوتا ہوں
ستارے بادلوں میں آج جھولا جھولنے نکلے　　مہیا ہے فلک پر بھی تو کیفیت گلستاں کی

افسر صاحب کے کلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ آپ فلسفیانہ اور روحانی مضامین بھی ایسی ہی بے تکلفی سے نظم کردیتے ہیں جیسے بچوں کی لوریاں۔ آپ کی بعض بچوں کی نظمیں اپنے رنگ میں لاجواب ہیں۔ "میری اماں"

"بچپن کے دن" وغیرہ نظمیں بچوں کے چہروں کی طرح شگفتہ اور انکی آنکھوں کی طرح روشن ہیں۔

ہمارے شعراء زندگی سے بیزار رہتے ہیں۔ انکی نگاہوں میں دنیا فانی اور رفتنی ہے۔ کسی چیز کو قیام نہیں فلک ناہنجار ہے۔ چرخ جفا کار ہے۔ دنیا دار المحن ہے۔ انکے کلام میں پست ہمتی اور بیدلی نمایاں رہتی ہے مگر حضرت افسر کے کلام میں زندہ دلی ہے، مردانہ جوش ہے۔ وہ ہمیں ترک اور توکل کا سبق نہیں سکھاتا، بلکہ کمر ہمت باندھکر میدان میں اترنا سکھاتا ہے۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ انسان سے منھ موڑ دو۔ بلکہ اپنے ہمجنسوں سے محبت کرنے ہی کو زہد اور عبادت کا درجہ عطا کرتا ہے ؎

محبت اور خوشی ہے زندگی تجھکو خبر بھی ہے محبت اور خوشی کا نام ہی دنیا میں نیکی ہے

ضعیفی کا سب شعراء نے رونا رویا ہے۔ کوئی اسے حیات عمر رفتہ کا نقش پا سمجھتا ہے، کوئی اسے حسرت زیست قرار دیتا ہے۔ افسر کی ضعیفی میں بھی زندگی اور کیفیت ہے ؎

افسر ہارے ضعیف لبوں کے لفظ بھی کیسے پیارے ہیں جیسے عجب کچھ رس ہوتا ہے شب کو دور کے گانے میں

ہمیں امید ہے کہ افسر صاحب کا یہ مجموعہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائیگا۔ طلباء کے لئے تو اس سے بہتر تحفہ خیال ہی میں نہیں آسکتا۔ کیونکہ حضرت افسر بچوں کے مخصوص شاعر ہیں۔ اور یہ درجہ ہمارے شعراء میں بہت کم اصحاب کو حاصل ہے۔ آپ کی بچوں کی نظمیں محض تک بندیاں نہیں ہوتیں بلکہ ان میں نزاکت، ندرت لطافت سبھی اوصاف موجود ہوتے ہیں۔

ڈالی کا جوگ

از حضرت افسر میرٹھی۔ چھوٹی تقطیع۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ:۔ انڈین پریس۔ الہ آباد۔

یہ آفسر صاحب کے ان افسانوں کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ کتابت اور طباعت دیدہ زیب ہے۔ ان میں تازگی ہے، حسن بیان ہے، جا بجا نازک خیالیاں ہیں اور کوئی حصہ ایسا نہیں جو خشک ہو۔ ہاں بعض کہانیوں میں نومشقی کی علامتیں نمایاں ہیں۔ فطری نظارے دلآویز ہیں۔ کئی کہانیاں بلحاظ انگریزی سے ماخوذ ہیں، مگر موجودہ حیثیت میں وہ طبعزاد ہوگئی ہیں۔ آفسر صاحب کے بیان میں ایک خاص بے تکلفی ہے۔ جو اکثر مزہ دیجاتی ہے۔

مخزن نکات

مؤلفہ حضرت قائم چاندپوری۔ شائع کردہ انجمن ترقی اردو۔ اورنگ آباد (دکن) مجلد قیمت ۱۲

انجمن ترقی اردو مستحق ستایش ہے کہ وہ اکثر کمیاب و نایاب کتابوں کو فراہم کرنے کے بعد ان کو زیور طبع سے آراستہ کرکے قدر دانان علم و ادب کے روبرو پیش کرنے میں مدت سے سرگرم کار ہے، چنانچہ اس سلسلہ اب تک

ایسی کتابیں جنکا نام ہی نام باقی رہ گیا تھا شائع ہو چکی ہیں، اُن ہی میں سے مذکورہ بالا تذکرہ بھی ہے جو تقریباً پونے دو صدی پہلے یعنی ۱۱۶۸ھ کی تالیف ہے۔

قائم صاحب ایک مسلّم الثبوت سخنور تھے اور میر و میرزا کے بعد اُردو شعراء کی صف میں اُنکو مرتبہ پہلا دیا جاتا ہے۔ اِس لئے اس تذکرہ کا شمار باقیات الصالحات کے ذیل میں ہے۔ یہ تذکرہ تین طبقوں میں منقسم ہے یعنی متقدمین، متوسطین اور متاخرین شعراء کا ذکر کیا گیا ہے اور مع حضرت مؤلف کُل ایک سو انیس شعراء (جن میں مسلمان اور ہندو دونوں شامل ہیں) کا حال اسمیں درج ہے۔ ہر طبقہ کے شروع میں اُس طبقہ کے شعراء کی خصوصیاتِ کلام کا مختصر ذکر کیا ہے پھر ہر شاعر کا مجمل حال، اُسکے کلام پر اظہار رائے اور دو چار اشعار بطور نمونۂ کلام لکھے ہیں، نیز اُردو زبان کے دکھنی شعراء کے حالات پر خصوصیت سے توجہ کی ہے۔ غرض اُردو کے ابتدائی دور کے شعراء کے متعلق یہ ایک دلچسپ تذکرہ ہے اور سخن گو نیز سخن فہم اصحاب کے لئے اسکا مطالعہ دلچسپی اور فائدے سے خالی نہیں۔

مضامینِ شرر۔ مولانا عبدالحلیم صاحب شرر مرحوم لکھنوی اُردو زبان کے ایک نامور، مشاق اور مستند اہل قلم تھے۔ وہ اپنے علمی و ادبی ذوق اور کارناموں کی وجہ سے ہندوستان بھر میں مشہور ہیں اور ہر ایک علمی مجلس میں اُنکا نام عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ غالباً وہ سب سے پہلے شخص تھے جنھوں نے اسلامی تاریخ کے اکثر واقعات کو دلکش افسانوں کے سانچے میں ڈھالا۔ شرر مرحوم کے ناول اہلِ علم کے علاوہ عوام کی بھی دلچسپی اور معلومات میں اضافہ کا موجب ہوئے۔ مناظرِ فطرت کی تصویر کشی اور واقعات کا نقشہ اُتارنے میں اُنکو کمال حاصل تھا۔ ماہ ملک۔ حسن انجلینا۔ ملک العزیز ورجنا وغیرہ ناولوں میں مناظرِ فطرت، میدانِ جنگ، مجالسِ عیش و طرب اور دوسرے واقعات اِس انداز سے بیان کئے ہیں کہ پڑھنے والے کی نگاہوں کے سامنے اصل واقعہ اپنی حقیقی شکل و صورت میں آجاتا ہے۔

مولانا شرر مرحوم کی مستقل تصانیف شائع ہوکر ملک کے گوشہ گوشہ میں پہونچ چکی ہیں۔ تعلیم یافتہ طبقہ میں کوئی ایسا شخص مشکل ہی سے ملیگا جس نے اُنکے ایک دو ناولوں کو نہ پڑھا ہو، مگر مولانائے مرحوم کے وہ علمی و ادبی مضامین اور تاریخی جواہر پارے جو زیادہ تر "دلگداز" اور کچھ دوسرے علمی رسائل میں شائع ہوکر مقبولِ عام ہو چکے تھے ایک مدت تک منضبط و مرتب صورت میں نہ لائے جا سکے بلکہ رسائل کے اوراقِ پریشاں ہی میں منتشر رہے۔ ایسی صورت میں عام شائقین کو اُنکے مطالعہ سے استفادہ کرنے کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔ ضرورت تھی کہ ان تمام متفرق مضامین کو ایک جگہ جمع کیا جاتا اور خوشی کا مقام ہے کہ سید مبارک علی شاہ صاحب گیلانی

نے اس مفید مگر کارِ عظیم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا بیڑا اُٹھایا اور مولانا شرر کے تمام متفرق جواہر ریزے حُسنِ ترتیب کے ساتھ ایک سلک میں منسلک کرکے اُردو زبان کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی - سید صاحب موصوف کی یہ مبارک کوشش اور بلند حوصلگی ہمی داد سے مستغنی ہے - ان مضامین کی ترتیب و تدوین بجائے خود ایک بہت بڑا کام تھا اور پھر انکی طباعت میں ہزار ہا روپیہ کا صرف برداشت کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے - ہر اہلِ علم کا فرض ہے کہ وہ سید صاحب کی اس علمی خدمت کی کما حقہٗ قدر کرے جسکی بہت آسان صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اس مجموعۂ مضامین کو خرید کر "ہم خرما و ہم ثواب" کا لطف اُٹھائے۔

مولانا شرر کے مضامین اپنی نوعیت کے اعتبار سے متعدد جلدوں اور حصّوں میں منقسم ہیں جنکی تفصیل درج ذیل ہے:-

جلد اول (شاعرانہ و عاشقانہ مضامین) اس جلد کے تین حصے ہیں جنکی قیمت علیحدہ علیحدہ - ۱۲ر - ۱۲ر - عہ ہے -

جلد دوم (تاریخی و جغرافی مضامین) اس جلد کے بھی تین حصے ہیں - قیمت علی الترتیب ۸ر - ۱۰ر - ۱۲ر ہے

جلد سوم (سیر و سوانح) جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس جلد میں (جسکے تین حصے ہیں) نامور مردوں اور عورتوں کے حالات ہیں - پہلے حصہ میں صرف مردوں کے سوانح حیات ہیں - دوسرے اور تیسرے حصہ میں عورتوں کے - قیمت علی الترتیب ۸ر - ۱۰ر - عہ ہے -

جلد چہارم (ادب و تحقیق مسائل) یہ محققانہ علمی و ادبی مضامین کا ایک بیش بہا مجموعہ ہے قیمت ۸ر

جلد پنجم (اصلاح قوم و ملت) اس جلد میں وہ مضامین ہیں جو قوم و ملت کی اصلاح کے لئے لکھے گئے ہیں - اسکی قیمت صرف عہ ہے -

جلد ششم (تاریخی واقعات پر خیال آرائی) جیسا نام ہے ویسے مضامین بھی ہیں - قیمت ۱۰ر

جلد ہفتم (نظم و ڈرامہ) اس جلد میں مولانا کی مستقل نظمیں - ڈرامہ اور بعض دوسرے متفرق مضامین ہیں قیمت عہ

مذکورہ بالا سات جلدیں جو تیرہ حصّوں میں منقسم ہیں تقریباً پانچ ہزار صفحات پر مشتمل ہیں - ہر ایک جلد اور ہر حصہ پر علیحدہ علیحدہ تبصرہ کرنے کے لئے ایک دفتر چاہیئے پھر بھی انکی خوبیوں کا احاطہ کرنا دشوار ہے - لہذا "قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا" کو مدنظر رکھکر مندرجہ بالا تفصیل ہی کافی سمجھنی چاہیئے

آخر میں ہم ایک بار پھر سید مبارک علی شاہ صاحب گیلانی کو اُن کی اس اہم و قابلِ قدر علمی و ادبی خدمت پر مبارکباد دیتے ہیں اور ناظرینِ زمانہ سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ اس بے بہا خزانہ کو جلد از جلد حاصل کرکے مستفید ہوں -

دوشیزہ کا راز

از مسٹر آنند نرائن ملا - ایم - اے - ایل - ایل - بی

آج کا دن زیست میں میری ہے سب سے بہتریں   اسکو میں سب سے الگ دل میں کرونگی جاگزیں
قدر کیوں اتنی ہے اسکی؟ میں بتاؤنگی نہیں   یہ مگر سچ ہے دلاتی ہوں تمھیں اس کا یقیں

دہر میں جب تک یہ صبح خوشگوار آئی نہ تھی
گلشنِ جذبات میں میرے بہار آئی نہ تھی

تازگی بادِ صبا میں کل تلک ایسی نہ تھی   آسماں پر یہ چمک میں نے کبھی دیکھی نہ تھی
دل میں یہ ارماں نہ تھے، ارماں میں گرمی تھی   ہاں مگر کل تک میں دل کی آرزو سمجھی نہ تھی

اب کھلا مجھ پر مرادوں پر شباب آتا ہے کیوں؟
آج میں سمجھی کہ غنچہ پھول ہو جاتا ہے کیوں؟

آج کا دن یہ تو ممکن ہے کہ ہو نازِ بہار   ختم اسی پر ہے یہ مانا میں نے موسم کا نکھار
ہے نشاطِ قلب کا پر اور ہی کچھ ذمہ دار   راز اپنا میں نہیں کرنے کی ہرگز آشکار

بات یہ جز گل کسی کو میں نے بتلائی نہیں
رازداں ایسا ہے جس میں تاب گویائی نہیں

میں سمجھتی تھی نہ کل تک مدعائے زندگی   کان تک میرے نہ پہونچی تھی نوائے زندگی
مجھ سے پنہاں تھی شبیہِ جانفزائے زندگی   عشق نے کھولے نہ تھے بندِ قبائے زندگی

دل مرا دنیا کی باتوں میں ذرا لگتا نہ تھا
آئینہ میں حسن تک اپنا بھلا لگتا نہ تھا

بیخبر فطرت سے اپنی خاطرِ معصوم تھی   یہ جو اک دل میں تڑپ ہے کل تلک معدوم تھی
آرزو اپنی نہ مجھے اتنی فقط معلوم تھی   کوئی لذت تھی کہ جس سے زندگی محروم تھی

اب حقیقت زیست کی مجھ پر ہویدا ہو گئی
کل تلک انگور تھی جو آج صہبا ہو گئی

کل بھی دل سینہ میں تھا پر یہ دلِ پرخوں نہ تھا — کل تلک بطنِ صدف میں یہ دُرِ مکنوں نہ تھا
کل بھی تھا مجھکو مذاقِ زیست لیکن یوں نہ تھا — کوئی جادو تھا پیامِ دیدۂ مجنوں نہ تھا
دل میں ہُوک اُٹھی لبوں پہ مُسکراہٹ آگئی
رُخ پہ رنگ آیا۔ نگاہوں میں لگاوٹ آگئی

اب اُمنگیں اور ہیں جوشِ طبیعت اور ہے — زندگی کی خواب ارماں میں حقیقت اور ہے
گلشنِ ہستی کی اب نظروں میں حالت اور ہے — گُل کی نکہت اور ہے، سبزے کی رنگت اور ہے
کیا بتاؤں کونسا جلوہ مری آنکھوں میں ہے؟
اک نئی دُنیا کا نظّارہ مری آنکھوں میں ہے

مجھ سے کہتی ہیں مری ہمجولیاں اکثر یہی — مرد ہیں سارے کے سارے بے وفا، خود مطلبی
آج ہے جسکی خوشامد اُس سے کل ہے بیرُخی — اُنکے بہکانے میں آتی، میں مگر ایسی نہ تھی
یا تو اُن کے حُسن میں میری سی رعنائی نہیں
یا کبھی اُن پہ کسی کی طبع یوں آئی نہیں

خواہشِ محبوب فطرت کا تقاضا ہے اگر — پردہ داری کس لئے جذبات کی ہے اِس قدر
اپنے دل کی آرزوئیں کیوں چُھپاتا ہے بشر — یا الٰہی! کونسا الفت میں ہے ایسا اثر؟
تابِ خاموشی نہیں اور فکر چُپ رہنے کی ہے
شوق بھی کہنے کا ہے اور شرم بھی کہنے کی ہے

تُو! نہ جانے کیا کہے جاتی ہوں اپنے جوش میں — میں نہیں ہوں غالباً اِس وقت اپنے ہوش میں
اب نہ آئیگی صدا میری کسی کے گوش میں — راز کو اپنے چھپاؤں گی لبِ خاموش میں
ہاں مگر جب تک یہ صُبحِ خوشگوار آئی نہ تھی
گلشنِ جذبات میں میرے بہار آئی نہ تھی

آئینۂ روزگار

جناب مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر بی۔ اے۔ لکھنوی

اے فلک یہ کیا تری نیرنگیوں کا رنگ ہے
خرمی مفقود جسکو دیکھئے دل تنگ ہے

دل گرفتہ ہیں شگوفے پھول مرجھائے ہوئے
مائلِ فریاد و شیون مرغِ خوش آہنگ ہے

آنکھ کھلتے ہی ہوا باد مخالف سے دوچار
جامۂ ہستی تنِ گل پر یہاں کتنا تنگ ہے

جنکے سینوں میں کبھی تھا جوش زن حبِ وطن
پست انکے حوصلے ہیں پائے ہمت لنگ ہے

طرح میخانہ ہے جن سے خونِ دل پیتے ہیں وہ
اور کم ظرفوں کی خاطر بادۂ گلرنگ ہے

صاحبِ مقدور جو تھے آج ہیں ایسے ذلیل
خاک ہے انکا بچھونا اور بالش سنگ ہے

ناکسوں کا قدرداں ہے۔ دشمنِ اہلِ کمال
تیری کج رفتاریوں سے عقل بیچاری دنگ ہے

بوالہوس جتنے ہیں ان کو عشق کا سودا ہوا
نام سے اہلِ وفا کے دلبروں کو ننگ ہے

بغض و کینہ دوستوں میں، آشنا نا آشنا
باپ بیٹوں میں عداوت بھائیوں میں جنگ ہے

یاد آتا ہے کہ تھا احباب میں باہم خلوص
اب صفائے قلب کے بدلے دلوں میں زنگ ہے

دوڑ کر جاتے ہیں ہم کوئے ضلالت کی طرف
اور راہِ حق میں ایک اک گام اک فرسنگ ہے

دل کے بدلے ملک پر ہے حکمرانی کا خیال
فکر ہے جاہ و حشم کی حسرت اورنگ ہے

راستی یہ کہہ کے آخر اس جہاں سے اٹھ گئی
ہم نوا اپنا یہاں کوئی نہ ہم آہنگ ہے

گو قصور اپنا مگر شاکوہ ہے چرخ پیر کا
اس زمانے کا اثر یہ بھی نرالا ڈھنگ ہے

چمن کو چھوڑ کر خاموش بلبل ہے نشیمن میں
ترانوں کا نہیں کچھ لطف باقی اب تو گلشن میں

مری فریاد کی ظالم خوشی سے داد دیتا ہے
صدائے ساز ہے یا سوز مضمر میرے شیون میں

اسیرِ رشتۂ الفت کا طالب چھوٹنا کیسا
ارے ناداں مقید تو نہیں زنجیرِ آہن میں

(طالب کاشمیری)

لطفِ سخن

از منشی تلوک چند محروم بی۔ اے

دل ہو تو دل میں تیری تمنا کرے کوئی
بیدل مری طرح ہو تو پھر کیا کرے کوئی

ممکن ہے پھر ہو شعلۂ حسنِ ازل عیاں
مثلِ کلیم مشقِ تقاضا کرے کوئی

جلوے یہ کہہ رہے ہیں تری بزمِ شام کے
تا صبح ماتمِ دلِ دانا کرے کوئی

ان بے نیازیوں پہ تو دل ہے مشتاق
کیا جانے اسکو کیا ہو جو پروا کرے کوئی

ہو گی مآلِ کار پریشانیٔ نظر
پیدا نہ دل میں ذوقِ تماشا کرے کوئی

کل کی نہ ہو امید تو پھر کس امید پر
آباد آرزوؤں کی دنیا کرے کوئی

محروم محوِ شعر ہے، اس سے غرض نہیں
قدرِ سخنوری نہ کرے یا کرے کوئی

حضرت فرخ بنارسی

نشتر فروشِ ناوکِ مژگاں نہیں رہا
تسکینِ اضطراب کا ساماں نہیں رہا

ظالم ترے مظالمِ پیہم کا شکریہ
میں شکوہ سنجِ گردشِ دوراں نہیں رہا

وارفتگی نے نقشِ تصور مٹا دیا
دلچسپیٔ خیال کا ساماں نہیں رہا

رنگینیٔ مذاقِ تصور ترے نثار
کب گوشۂ قفس میں گلستاں نہیں رہا

مستور ہو سکی نہ تجلی حجاب میں
چھپ کر بھی کوئی پردے میں پنہاں نہیں رہا

نظارہ تیرے جلووں کی وسعت نہ پا سکا
کب شکوہ سنجِ تنگیٔ داماں نہیں رہا

دیر و حرم کی جوشِ جنوں نے اٹھا دی قید
اب امتیازِ گبر و مسلماں نہیں رہا

اب میں ہوں اور کاہشِ صد انتظارِ مرگ
کچھ لذتِ حیات کا ساماں نہیں رہا

فرخ ہوا نہ مائلِ اصلاح کارِ دل
کس دن غریقِ لذتِ عصیاں نہیں رہا

حکیم ضبط بسوانی

اظہارِ عشق و حسرتِ تمنا کرے کوئی — کیوں اپنے ضبطِ شوق کو رسوا کرے کوئی
اتنا تو حسن عشق میں پیدا کرے کوئی — خود جسکو دیکھنے کی تمنا کرے کوئی
شکوہ کرے کہ شکر کا سجدا کرے کوئی — ہنگامِ نزع آنے میں وہ کیا کرے کوئی
پھندے ہیں ہر قدم پہ فریبِ نگاہ کے — کیا قدرِ دلفریبیٔ دنیا کرے کوئی
اے شوقِ دید گریۂ پیہم کا کیا گلہ — کیوں دل کو رازدارِ تمنا کرے کوئی
یہ ایک خاص حسن ہے انکی نگاہ میں — وہ جسکو دیکھ لیں اُسے دیکھا کرے کوئی

کھلنے نہ پائے حسرتِ دیدار کا بھرم
ہم خود یہ چاہتے ہیں کہ پردا کرے کوئی

حضرت عرش امروہوی

حسین گل نہیں، یا ماہ و آفتاب نہیں — مگر تمھاری طرح کوئی لاجواب نہیں
لبوں تک انکے کسی طرح مجھکو لے چلتا — شریکِ حال مرا ساغرِ شراب نہیں
مجھے شہید کرو حسرتوں کا خوں نہ کرو — وہ کام کرتے ہو جس میں ذرا ثواب نہیں

جفائیں عرش کو سہنے دو یہ ستم کیا ہے
کبھی عتاب ہے اُسپر کبھی عتاب نہیں

جناب راز چاندپوری

مایۂ زیست و جانِ راحت ہے — ہائے کیا چیز یہ محبت ہے!
حسنِ پنہاں کا ایک مظہر ہوں — کتنی روشن مری حقیقت ہے
جلوۂ بزمِ دہر، اے توبہ! — میری نظروں میں حسنِ فطرت ہے
رازدارِ حریمِ جانانہ — مثلِ تصویر محوِ حیرت ہے

دوست دشمن ہیں یا ہیں دشمن دوست
کیا زمانہ ہے! کیا قیامت ہے!!


زمبک
نہایت مفید و شفا بخش مرہم
اکزیما
اندھوریوں اور
کیڑوں مکوڑوں کے کاٹنے
کے لیے
جانوروں
کی چربی سے
پاک
قیمت
۸؍ فی ڈبیہ
بڑی ڈبیہ
اور
پھوڑوں
پرانے زخموں
زہرباد
پھنسیوں اور پاؤں
میں چھالے پڑ جانے میں
زمبک
استعمال کیجیے
Zam Buk
HERBAL BALM
Zam-Buk
ذمبک سب انگریزی دوا فروشوں کے یہاں دو قسم کی ڈبیوں میں ہوتا ہے قیمت چھوٹی ڈبیہ بڑی ڈبیہ
ایجنٹ میسرس اسمتھ اسٹین اسٹریٹ اینڈ کمپنی لمیٹڈ انٹالی۔ کلکتہ

فریاد جنوں اور ہے بلبل کی فغاں اور
صحرا کی زباں اور ہے گلشن کی زباں اور

حرم سرا

ہر دو جلد مکمل ترجمہ

آف دی حرم مصنفہ بینا لڈس

از

لسان الملک حضرت ریاض خیرآبادی

قیمت ہر دو حصہ ۳ لکھائی ـ چھپائی کاغذ معمولی ـ تکمیل

"ترجیح بالا کن کہ ارزانی ہنوز"

ملنے کا پتہ: ۱) زمانہ بک ایجنسی کانپور

۲) حضرت ریاض خیرآباد اودھ ضلع سیتاپور

ہمارے یہاں ہر قسم کے تیل خالص تلی وگری کے تیلوں سے تیار کئے جاتے ہیں، خالص تیل کی آزمائش پھریری کے ذریعہ جلا کر سکتے ہیں، اگر وائٹ آئل ہوگا تو جلد جل جاویگا اور بدبو دینے لگے گا۔

بلبھ ولاس ہیر آئل

اسکی بھینی بھینی خوشگوار مہک لبھانیوالی اور دیرپا ہے۔ دماغ میں نرمی و تری لاتا ہے بالوں کو چمکیلے و ملائم کرتا اور پکنے سے روکتا ہے۔ قیمت ۱۲ فی شیشی محصول ڈاک ۱۲

نوٹ۔ ماسٹروں اور لڑکوں کے لئے خاص رعایت یعنی ۴ فی روپیہ،

شری ولبھ فارمیسی ـ کان پور



آپکو طاقت اور تندرستی سناٹوجن سے حاصل ہوگی

جسقدر زیادہ زرخیز زمین ہوگی اسمیں جو درخت جڑ پکڑیگا وہ اسیقدر زیادہ مضبوط ہوگا کیونکہ درخت کی صحت و طاقت اس خوراک پر منحصر ہے جو وہ زمین سے حاصل کرتا ہے۔

یہی حالت آپکے جسم کی ہے۔ کمزوری اور سستی اس امر کی یقینی دلیل ہے کہ آپکے جسم میں تندرستی قائم رکھنے کے ضروری اجزا کم ہیں اسلیئے آپکو سناٹوجن کا استعمال شروع کرنا چاہیئے جو ایک مقوی غذا ہے کیونکہ سناٹوجن میں صرف وہی اجزا ہیں جو آپکے جسم میں دیرپا تندرستی اور طاقت پیدا کریں گے۔

سناٹوجن کے چند ہفتہ کے استعمال سے آپ ایک مختلف آدمی بن جائینگے۔ اسکے استعمال سے آپ خود آپکو زیادہ طاقتور اور تندرست محسوس کرینگے۔ بغیر تکان کام کر سکینگے اور اپنی زندگی اور اسکے ہر لمحہ کو نہایت خوشگوار طریقے سے بسر کر سکیں گے۔

تو کیوں آج ہی سے آپ سناٹوجن کا استعمال شروع نہ کریں؟

SANATOGEN

حقیقی و مقوی غذا

تمام انگریزی دوا فروشوں سے ملتی ہے

سناٹوجن کے بنانے اور پیک کرنے میں کسی آدمی کا ہاتھ نہیں لگایا جاتا